# آخرِ شب کے ہمسفر

قرۃ العین حیدر

ایجوکیشنل بک ہاؤس ۔۔۔ علی گڑھ

# آخرِ شب کے ہمسفر

۶۸

قرۃ العین حیدر

ایجوکیشنل بک ہاؤس — علی گڑھ

ایڈیشن ------ ۱۹۸۴ء
تعداد ------- ۱۰۰۰
قیمت ------- ۴۵/۰۰

[ شیروانی آفسٹ پرنٹرز، دہلی ۶ ]

ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
فون نمبر ۳۷۶۸

# پیش لفظ

بنگال کی دہشت پسند اور انقلابی تحریک، ۱۹۴۲ء کا اندولن، مطالبۂ پاکستان، تقسیم ہند اور قیامِ بنگلہ دیش کے تناظر میں لکھے ہوئے اس ناول کے تمام کردار قطعی فرضی ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں ولیم کینٹ ویل نام کا کوئی انگریز ڈھاکہ کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نہیں تھا۔ نہ اس کے بعد چارلس بارلو "بنگال سویلین"۔ اسی طرح سر ایڈورڈ سے لے کر نوجوان رچرڈ تک سارا بارلو خاندان، دیپالی سرکار، ریحان الدین احمد، پادری بنرجی، اومارائے، نواب قمر الزماں چودھری، جہاں آرا بیگم، ناصرہ نجم السحر، یاسمین بلمونٹ وغیرہ وغیرہ سارے کردار اور ان سے منسوب واقعات خیالی اور محض افسانہ ہیں اور کسی ہندوستانی، پاکستانی یا بنگلہ دیشی شخصیات سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

سرورق کی تصویر اسمبلاژ میں ناچیز نے بنائی ہے۔ کسان کا جھونپڑا، مسجد، کالی باڑی، آبی راستے اور نوکائیں، عہد ایسٹ انڈیا کمپنی کا جارجین کولونیل مکان اور دخانی جہاز مشرقی بنگال کا مخصوص نظارہ ہے۔ کولونیل مینشن انگریز حاکم یا پلانٹر یا بڑے بنگالی زمیندار کی جائے رہائش، مشرقی بنگال کے عظیم دریاؤں پر چلنے والا اور مشرقی بنگال کے "سنہرے ریشے" پٹ سن کو کلکتہ اور اسکاٹ لینڈ لے جانے والا جہاز بنگال کے تین سو سالہ سیاسی، ذہنی اور تہذیبی برٹش کنکشن کی علامت بھی ہے۔

بمبئی، مئی ۱۹۷۹ء

قرۃ العین حیدر

# ابواب


| | | |
|---|---|---|
| ۱ | چندر کُنج | ۷ |
| ۲ | طوفان سے پہلے | ۱۴ |
| ۳ | وُوڈلینڈ | ۱۷ |
| ۴ | جوار بھاٹا کا گیت | ۲۱ |
| ۵ | کماری اوما رائے | ۲۴ |
| ۶ | ریورنڈ پال میتھیو بنرجی | ۴۱ |
| ۷ | نیا عہد نامہ | ۵۴ |
| ۸ | ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا بنگلہ | ۵۸ |
| ۹ | کلثوم آپا | ۶۲ |
| ۱۰ | وشنو بیراگی | ۶۶ |
| ۱۱ | للی کاٹج | ۷۳ |
| ۱۲ | شانتی نکیتن | ۸۰ |
| ۱۳ | مس روزی بنرجی اور سولیڈرٹی | ۸۴ |
| ۱۴ | آمار پرانیر آرام مونیر آنند | ۸۷ |
| ۱۵ | سندربن | ۹۰ |
| ۱۶ | ارجمند منزل | ۱۱۰ |
| ۱۷ | گوڑ ملہار | ۱۳۱ |
| ۱۸ | میگھ رنجنی راگنی | ۱۳۲ |
| ۱۹ | بھیرَبی کا خواب | ۱۳۵ |
| ۲۰ | ہرے بنگال کا "آنند کانن" | ۱۴۳ |
| ۲۱ | اگست اندولن اور پیپلز وار | ۱۴۷ |

| | | |
|---|---|---|
| ۲۲ | بدروہی | ۱۵۰ |
| ۲۳ | گنگا اور برہمپتر | ۱۵۸ |
| ۲۴ | چارلس بارلو "بنگال سویلین" | ۱۶۶ |
| ۲۵ | نواب قمرالزماں چودھری | ۲۰۳ |
| ۲۶ | ریحان الدین احمد | ۲۰۸ |
| ۲۷ | جہاں آرا بیگم | ۲۲۸ |
| ۲۸ | رونگیلا نائیر مانجھی | ۲۳۳ |
| ۲۹ | شریمتی رادھیکا سانیال | ۲۳۹ |
| ۳۰ | ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار | ۲۴۵ |
| ۳۱ | دلہن کی پالکی | ۲۵۵ |
| ۳۲ | کمل اور اکمل | ۲۶۲ |
| ۳۳ | برڈز آف پیراڈائز | ۲۷۱ |
| ۳۴ | ایستھر گری بالا بنرجی | ۲۸۳ |
| ۳۵ | یاسمین بلمونٹ "ڈارک ڈانسر" | ۲۸۵ |
| ۳۶ | پائلٹ آفیسر اکمل مرشد زادہ | ۲۸۷ |
| ۳۷ | شنکری کا ناچ | ۲۹۳ |
| ۳۸ | گڈلک ڈائری | ۲۹۴ |
| ۳۹ | شہرزاد کرسٹینا بلمونٹ | ۳۰۷ |
| ۴۰ | سوامی آتم آنند شنکر پریمی | ۳۱۰ |
| ۴۱ | جلسہ گھر | ۳۱۳ |
| ۴۲ | ناصرہ نجم السحر قادری | ۳۲۵ |
| ۴۳ | رچرڈ بارلو | ۳۳۱ |
| ۴۴ | آتمارشانتی ۔ ؟ | ۳۳۷ |
| ۴۵ | ونگالہ راگنی | ۳۴۱ |
| ۴۶ | بھیرو راگ | ۳۴۶ |

# ۱

# چندر کنج

ڈھاکہ شہر کے ایک درمیانہ درجے کے رہائشی علاقے میں آم اور کیلے کے درختوں میں چھپی وہ ایک پرانی وضع کی سفید کوٹھی ہے۔ اس کی دیواریں کائی سے سبز ہو چکی ہیں۔ اور روشن دانوں اور کھڑکیوں میں کئی جگہ شیشوں کی جگہ کنستر کے ٹکڑے اور دفتیاں لگی ہیں۔ سامنے کے برآمدے میں ایک سرے پر باشا کی مضبوط چٹائیاں کھڑی کر کے ایک کمرہ بنا دیا گیا ہے۔ کمرے کے دروازے پر نیلے رنگ کی آدھی ساری کا پردہ ٹنگا ہے۔ اندر ایک بنچ، ایک میز اور طبی معائنے کا اونچا سا پلنگ بچھا ہے، جس کے گدے کا نیلا چمڑا جگہ جگہ سے اُدھڑ گیا ہے۔ دواؤں کی الماریاں اور تام چینی کی چلمچی کا اسٹینڈ ایک دیوار کے برابر لگا ہوا ہے۔ میز کے پیچھے بڑا کیلنڈر آویزاں ہے۔

برآمدے اور کشادہ ہوادار کمروں کے سرخ روغنی فرش با افراط پانی سے دھوئے جانے کی وجہ سے صاف ستھرے اور چمکیلے ہیں۔ برآمدے میں ایک بنچ اور دو تین مونڈھے پڑے ہیں اور دو سائیکلیں کھڑی ہیں۔ برآمدے میں سے اندر "بیٹھک خانہ" صاف دکھلائی دیتا ہے۔ اس میں بید کا ایک صوفہ اور چند بے جوڑ کرسیاں رکھی ہیں۔ کونے کی ایک میز پر کاسنی غلاف سے ڈھکا ہارمونیم اور دیوار کے سہارے ایک ایسراج بھی موجود ہے۔ بیٹھک کی دیواروں پر آمنے سامنے ایک مرد اور ایک عورت کے دو بڑے پورٹریٹ آویزاں ہیں۔ ان پر ایسی دھندلی دھندلی سی کیفیت طاری ہے، جو کسی پُراسرار نامعلوم کیمسٹری کے ذریعے ان لوگوں کی تصویروں پر آپ سے آپ چھا جاتی ہے، جو مر چکے ہیں۔ عورت نوعمر اور دلکش، ریشمی ساری سے سر ڈھانپے اور ایک انگلی اپنی ٹھوڑی پر رکھے۔ خاصی خواب ناک آنکھوں سے کیمرے کو دیکھ رہی ہے۔ دوسری تصویر میں سفید شال لپیٹے ایک خوش شکل نوجوان سر جھکائے غور سے ایک موٹی سی کتاب

پڑھ رہا ہے۔ چند ضخیم کتابیں مخملیں میز پوش پر ٹکی اس کی ایک کہنی کے نزدیک رکھی ہیں۔ دونوں تصویروں پر گوٹے کے ہار پڑے ہیں، جن کا جھوٹا گوٹا تقریباً کالا پڑ چکا ہے۔

"بیٹھک خانے" کے دروازے پہلو کے دو کمروں میں کھلتے ہیں۔ دائیں جانب والے کمرے میں کھانے کی میز اور نعمت خانے کے نزدیک برابر برابر تین چارپائیاں۔ کونے میں بید کی تین میزوں پر اسکول کی کتابوں کے انبار۔ کھونٹی پر نیکریں اور قمیصیں۔ کینوس کے نئے اور پرانے جوتوں کا ڈھیر دوسرے کونے میں پڑا ہے۔ ادھ کھلے ٹین کے بکس چارپائیوں کے نیچے ٹھنسے ہیں۔ کھانے کی میز کھڑکی کے پاس بچھی ہے۔ یہ کھڑکی پہلو کے ہرے بھرے احاطے میں کھلتی ہے۔ اسی کمرے کے برابر میں ایک اور چھوٹا کمرہ ہے جس کی ایک دیوار پر لکڑی کے تختے لگا کر کارنس سی بنا دی گئی ہے۔ اس پر دواؤں کی شیشیاں، پرانے خط پتر، قلم دوات، چند زنانہ بنگالی رسالے اور سلائی کی ٹوکری رکھی ہے۔ کارنس کے نیچے پتلے سے تخت پر شفاف بستر لگا ہے۔ ایک کونے میں مختصر سا مندر ہے۔ صندل کی چوکی پر رکھی ہوئی مورتیوں پر گیندے کے تازہ ہار پڑے ہیں۔ مورتیوں کے سامنے انجلی رکھی ہے۔ ایک پہلو میں ایک چھوٹی تصویر، جس میں ایک وکیل صاحب گاؤن پہنے بیٹھے ہیں۔ اس تصویر پر بھی تازہ ہار پڑا ہوا ہے۔ چوکی کے سامنے سیتل پاٹی بچھی ہے۔ جس کے ایک کنارے پر کھڑاؤں کی جوڑی رکھی ہے۔ کمرے کے دوسرے کونے میں ستلی کی الگنی پر بغیر کنی کی چند سفید ساریاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس کمرے کا دروازہ پچھلے برآمدے میں رسوئی گھر کے عین مقابل میں کھلتا ہے۔

"بیٹھک خانے" کے بائیں جانب والے کمرے میں جو مطب سے ملحق ہے، صرف ایک پلنگ اور ایک آرام کرسی پڑی ہے۔ کونے میں دو ٹرنک رکھے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کمرے کا مکین دنیاوی ضروریات سے خاصا بے نیاز اور بے پروا ہے۔

اس کمرے کے پیچھے ایک اور کمرہ ہے۔ اس میں سلاخوں والی کھڑکی کے نیچے کھادی کی چادر سے ڈھکا پلنگ بچھا ہے۔ سرہانے ایک الماری ایک میز پائینتی کی دیوار کے ساتھ ایک بڑا ٹرنک اور اس کے اوپر چمڑے کا اٹیچی کیس۔ کھونٹی پر چند سوتی ساریاں۔ الماری کے ایک خانے میں آئینہ، کنگھی، ناریل کے تیل کی کٹوری فرش پر ایک کونے میں بچھی خوش رنگ دری پر کتابوں اور کاپیوں کا ڈھیر۔

پچھلے برآمدے کے ایک سرے پر رسوئی گھر اور دوسرے پر گودام ہے، جس کے دروازے میں بھاری تالا پڑا ہے۔ غسل خانے برآمدے سے باہر آنگن میں ایک قطار میں بنے ہیں۔ جن تک پہنچنے کے لئے ایک چوبی تختے پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ غسل خانوں کے برابر سے زینہ کوٹھی کی چھت پر بنے کمرے اور ٹین کے سائبان کی طرف جاتا ہے۔ سرسبز آنگن کے وسط میں تالاب، جس میں روہو

مچھلیاں پلی ہیں۔ تالاب کے سامنے تلسی کا منقش گملہ دور ایک گوشے میں آم کے گھنے درخت کے نیچے جھلملیوں والی بند گاڑی کھڑی ہے۔ جس کی کھڑکیوں میں چڑیوں نے گھونسلے بنا لئے ہیں آنگن کے تین طرف سُرخ اینٹوں کی دیوار ہے۔ ڈیوڑھی کے چوڑے دروازے کے باہر اونچی اونچی گھاس میں سے گذرتی ایک پگڈنڈی پچھواڑے کی سنسان سڑک سے جا ملتی ہے۔ آنگن میں کپڑوں کی خالی الگنی پر کوّے آن بیٹھے ہیں۔

مہاوٹ ابھی برس کر کھلی ہے۔ کوٹھی میں بڑا سناٹا ہے۔ خالی کمروں میں بھیگی ہوا کھلے دروازوں سے گذرتی منڈلاتی پھر رہی ہے۔ ایک غسل خانے میں سے پانی گرنے کی آواز آ رہی ہے۔ پھاٹک کے باہر ایک کہار اکڑوں بیٹھا چلم پی رہا ہے۔ جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں اس کی چلم کی روشنی کبھی کبھی تیزی سے چمک اٹھتی ہے۔ پھاٹک کے اِک ستون پر جو برسہا برس کی بارشوں کی بوچھاڑ سے ترچھا ہو کر ایک طرف کو دھنس سا گیا ہے۔ "ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار ایم۔ بی۔ بی۔ ایس" کا بورڈ لگا ہے۔ دوسرے ستون پر سنگ مرمر کے ٹکڑے پر بنگالی میں "چندر کنج" نقش ہے۔

اندر مطب کی دیوار پر لگے چرخہ کاتتے گاندھی جی اور متبسم جواں سال نہرو کی بھدّی رنگین تصویروں والے کیلنڈر کے ورق بوڑھی گنگا پر سے آتی ہوئی اس بھیگی ہوا میں آہستہ آہستہ پھڑپھڑا رہے ہیں۔

اس روز، دسمبر ۳۹ء کی اس تاریک شام، جب سارا گھر سنسان پڑا تھا۔ چندر کنج کے پچھلے برآمدے والے گودام میں چوری ہو گئی۔

سیند لگانے والی، اس گھر کی انیس سالہ بیٹی دیپالی تھی۔

ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار مطب بند کر کے حسب معمول ہوا خوری کے لئے باہر جا چکے تھے اُن کے تینوں لڑکے کھوکھو، شونو اور ٹونو ابھی فٹ بال کے میدان سے نہیں لوٹے تھے۔ اور غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر سرکار کی بیوہ بہن بھوتارنی دیبی اشنان کے چند منٹ بعد پوجا میں مصروف ہونے والی ہیں۔

اس وقت ڈاکٹر سرکار کی اکلوتی لڑکی دیپالی لالٹین ہاتھ میں لئے زینے سے نیچے باغ میں اُتری، اُس کے دوسرے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اور وہ اندھیرا پڑے تک کوٹھے والے کمرے میں جہاں بجلی کی روشنی نہیں تھی "ہوم ورک" کرتی رہی تھی۔ نیچے آ کر اس نے لالٹین تلسی کے گملے کے پیچھے چھپا دی۔ اور دبے پاؤں برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں گئی۔ جو بیٹھک خانے کے بائیں جانب تھا۔ دروازے کی آڑ سے اس نے دیکھا کہ اس کی پھوپھی بھوتارنی دیبی غسلخانے

سے نکل کر کھڑاؤں پہنے کھٹ کھٹ کرتی چوبی پُل پر سے گذر کے اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہیں۔

دیپالی دم سادھے کواڑ کے پیچھے کھڑی رہی اور چند منٹ بعد پنجوں کے بل چلتی بھوتارنی دیبی کے کمرے میں گئی جو ستیل پاٹی پر آلتی پالتی بیٹھ کر لوبان سُلگانے کے بعد آنکھیں بند کر کے دنیا دمافیہا سے بے خبر ہو چکی تھیں۔ ان کی پُشت دروازے کی طرف تھی۔ دیپالی نے چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد آگے بڑھ کر کنجیوں کا موٹا گچھا ان کی پُشت پر پڑے پلّو سے کھولا اور باہر آ گئی۔ تلسی کے پیچھے سے لالٹین نکال کر گودام تک پہنچی اور ڈرتے ڈرتے تالا کھولا۔ اندر جا کر لالٹین ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر رکھ دی اور چاروں طرف دیکھا۔ گودام میں شدت کا حبس اور سیلن تھی۔ آنگن کے رخ والی مقفل کھڑکی کے شیشوں پر امرت بازار پتریکا کے پیلے کاغذ چپکے ہوئے تھے۔ متفرق فالتو سامان کے علاوہ کوٹھری میں ایک بہت بڑا چوبی صندوق اینٹوں کے اوپر رکھا تھا۔ اس صندوق میں بنارسی اور بالُوچر بوٹے دار ساریاں اور دوسرا قیمتی سامان مقفل تھا۔ ہر سال جاڑوں میں بھوتارنی دیبی صندوق کھول کر بڑے اہتمام سے بالُوچر ساریاں باہر نکالتیں اور آنگن میں چارپائیوں پر پھیلا کر اُن کو دھوپ میں سکھایا جاتا۔ اس کے بعد یہ بالُوچر ساریاں پھر نیم کے پتوں کی تہہ دے کر اسی احتیاط سے بکس میں واپس رکھ دی جاتیں۔

دیپالی نے سانس روک کر صندوق کا تالا کھولا۔ اس کے کپڑوں پر بچھی کشمیری شال سرکا کر تہہ میں سے ساریاں نکالیں اور اُن کو جلدی جلدی فرش پر رکھتی گئی۔ بنارسی اور جامدانی کی ساریاں ایک طرف کر کے اس نے "بالُوچر بوٹے دار" ساریاں علیحدہ کیں جو تعداد میں تین تھیں۔ باہر کی آواز پر کان لگاتے ہوئے اس نے لالٹین کی لَو اونچی کر کے ساریوں پر ہاتھ پھیرا۔ ساریاں بے حد پرانی ہونے کے باوجود بالکل نئی معلوم ہو رہی تھیں جیسے ابھی ابھی نوابی کے مرشد آباد کے کرگھوں سے اتری ہوں۔ موقع کی نزاکت کے باوجود وہ ان کے آنچلوں پر بنے نقش و نگار کو دیکھنے میں محو ہو گئی۔ کاسنی، نارنجی، فیروزی ـــــ کاسنی ساری سب سے بیش قیمت تھی۔ اس کے آنچل پر ایک قطار میں مُرشد آباد کے نواب پیچوان نوش کر رہے تھے۔ نارنجی ساری کے پلّو پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ناؤ میں بیٹھے تھے۔ فیروزی ساری کے آنچل پر مغل بیگمات ہاتھی کے ہودے پر بیٹھی گلاب کا پھول سونگھنے میں مصروف تھیں۔ دقت ریشم کے اس تانے بانے میں الجھ کر تھم چکا تھا۔

اچانک برآمدے میں آہٹ ہوئی۔ دیپالی نے پھرتی سے تینوں ساریاں سفید ململ کے ٹکڑے میں لپیٹیں۔ باقی سامان صندوق میں واپس رکھا۔ اور سہم کر دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہوئی۔ مگر اب پھر خاموشی چھا چکی تھی۔ صحن میں کیلے اور سیتا پھل کی ڈالیاں سرسرا رہی تھیں۔ بہت دور سڑک پر ایک گھوڑا گاڑی کھڑکھڑاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس گھپ اندھیرے میں نہ جانے کہاں

جا رہی تھی۔

دیپالی نے لمبا سانس لیا اور ساریوں کا بنڈل اپنے آنچل میں چھپا کر باہر نکلی۔ گودام میں تالا لگایا۔ بنڈل برآمدے کی سیڑھیوں پر ڈال دیا اور بھوتارنی دیبی کے کمرے میں جا کر نہایت صفائی سے کنجیاں ان کے پلو میں باندھ دیں۔ بھوتارنی دیبی چڑچڑی اور تنک مزاج ہونے کے علاوہ کنجیوں کے معاملے میں حد سے زیادہ سخت گیر اور محتاط تھیں۔ وہ ڈولی تک کا تالا صرف اپنے ہاتھ سے کھولتی تھیں۔ کنجیاں ان کے پلو میں باندھنے کے بعد دیپالی نے پوری طرح آنکھیں کھول کر بھگوتی کی مورتی کو دیکھا اور دروازے سے نکلی۔ سیڑھیوں پر سے بنڈل اٹھا کر آنگن میں سے بھاگتی ڈیوڑھی سے تیر کی طرح نکل کر پچھلی سڑک پر پہنچ گئی۔ پھاٹک پر بیٹھا کہار چلم ختم کر کے کہیں غائب ہو چکا تھا۔ دیپالی نے چاروں طرف دیکھا اور چند قدم آگے بڑھی۔ سڑک کی پلیا کے نزدیک ایک نوجوان سائیکل سنبھالے کھڑا بے نیازی سے آسمان کو تک رہا تھا۔ دیپالی کو دیکھ کر اس نے ہاتھ کا ہلکا سا اشارہ کیا۔

دیپالی دوڑ کر اس کے قریب پہنچی اور اُچک کر سائیکل کے پیچھے کیریر پر بیٹھ گئی۔

نواب پورے کی ایک گلی کے سرے پر ایک قدیم مکان کی بیٹھک میں چند نوجوان فرش پر بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں اُن میں سے ایک نے نظر اٹھا کر دیکھا دیپالی سرکار سامنے کھڑی تھی اس نے جھک کر بنڈل نوجوانوں کے سامنے رکھ دیا۔ ایک نوجوان نے بنڈل کھولا۔

"دادا۔ اس سے زیادہ قیمتی چیز میرے گھر میں نہیں ہے"۔

اس نوجوان نے جسے دیپالی نے مخاطب کیا تھا۔ ساریاں الٹی پلٹیں۔ "بالوچر ساریاں" اُس کے منہ سے نکلا۔ اس نوجوان نے اپنے شانوں پر زلفیں جھٹکار کھی تھیں۔

"بالوچر ــــ!" دوسرے نوجوانوں نے حیرت اور اشتیاق سے ساریوں پر ہاتھ پھیرا۔

"مگر بھائی ان کو خریدے گا کون ــــ؟ ہمیں تو فوراً چھ سو روپے چاہئیں"۔

"چار سو تک میں نہیں بک جائیں گی؟" دیپالی نے متفکر ہو کر پوچھا۔

"بالوچر بوٹے دار ساریاں؟ آج کل دیپالی اپر کلاس لیڈیز انگریزی جارجٹ پہنتی ہیں ــــ"

"مگر یہ ــــ یہ تو بے مثال چیز ہے اور نایاب"۔ دوسرے نوجوان نے کہا۔

"ہندوستان کا بیشتر پرانا فن نایاب اور بے مثال ہے"۔ پہلے نے چڑ کر جواب دیا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے"۔ پھر وہ دیپالی سے مخاطب ہوا۔ "تمھارے پاس اور کچھ نہیں؟"

دیپالی نے تاسف سے سر ہلایا۔ "ان کو بیچنے یا گروی رکھنے کی کوشش تو کیجئے اکشے دادا"۔

زلفوں والا نوجوان گہرا سانس لے کر فرش پر سے اٹھا۔ "اچھا۔ تھینک یو۔ دیپالی۔ اب تم واپس بھاگ جاؤ فوراً ــــ" اور دفعتاً وہ تینوں نوجوان، جن میں سے تیسرا بالکل خاموش رہا تھا بنڈل سمیت کوٹھری کے پچھلے دروازے سے نکل کر باہر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

اب رات کے نو بج رہے تھے اور میز پر کھانا چنا جا چکا تھا۔ بھوتارنی دیبی حسب عادت بڑبڑاتی ہوئی رسوئی گھر اور کھانے کے کمرے کے پھیرے کر رہی تھیں۔ کھوکھو، شونو اور ٹونو میچ سے واپس آکر تندہی سے کھیل پر بحث کرنے میں مشغول تھے۔ ڈاکٹر سرکار چہل قدمی سے لوٹ آئے تھے اور اپنے کمرے میں آرام کرسی پر نیم دراز حسب عادت ایک پاؤں ہلاتے ہوئے سوچ بچار میں مصروف تھے۔

"دیپالی ــــ" انھوں نے آواز دی۔

دیپالی اپنے کمرے سے نکلی۔ ڈاکٹر سرکار آرام کرسی سے اٹھ کر بیٹھک خانے سے گذرتے کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے۔ وہ ایک بھاری جسم کے متین چہرے اور سوچتی ہوئی آنکھوں والے انسان تھے۔ ان کے چہرے کے سکون سے ظاہر ہوتا تھا کہ خاموشی اور صبر کی دوسرا تھ میں زندہ رہنا انھوں نے سیکھ لیا ہے۔

کھانے کی میز پر جا کر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے انھوں نے دیپالی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ وہ اسی وقت اندر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر سرکار نے ذرا تعجب سے اس کا جائزہ لیا۔

"کیا بات ہے؟ طبیعت خراب ہے؟ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو"۔

"جی نہیں ــــ بابا ــــ میں روزی ــــ روزی کے گھر گئی تھی۔ واپس آ رہی تھی تو پُلیا کے پاس ایک بھینسہ مل گیا ــــ اُس کے ڈر سے دوڑتی دوڑتی آ رہی ہوں ــــ" اس نے گلے پر ہاتھ رکھ کر ہنسنا چاہا۔

"اتنی رات گئے روزی کے گھر سے اکیلی آ رہی ہو؟" ڈاکٹر سرکار نے ذرا درشتی سے اسے ڈانٹنے کی کوشش کی۔

"جی ــــ جی نہیں ــــ جوزف ساتھ آیا تھا۔" وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی اس کے تینوں چھوٹے بھائی شور مچاتے ہوئے کھانا کھانے میں جُٹ چکے تھے۔

"ایک خوش خبری تمھارے لئے ــــ" ماچھی بھات کھاتے ہوئے ڈاکٹر سرکار نے دیپالی سے کہا۔

وہ دھک سے رہ گئی۔ "کیسی خوش خبری ــــ بابا؟"

"اشیت بابو ــــ" ڈاکٹر سرکار نے کرسی پیچھے سرکا کے جواب دیا۔ "میں ابھی اشیت بابو

کے یہاں گیا تھا۔ وہاں ان کے بہنوئی آئے ہوئے ہیں۔"

"کلکتے والے ـــــ؟ جیوتی بابو۔؟"

"جیوتی بابو۔ وہ تمھارے ریکارڈ بھرنا چاہتے ہیں۔ ایچ۔ ایم۔ وی ریکارڈ۔"

"میرے ریکارڈ! سچ بابا ـــ سچ بتائیے ـــ!؟"

تینوں لڑکوں نے کھانا چھوڑ کر غل مچانا شروع کر دیا۔

"دیدی کے ریکارڈ بجیں گے ـــ گھر گھر دیدی کے ریکارڈ بجیں گے۔" کھوکھو نے گمبھیرتا سے اعلان کیا۔

"دیدی امیر ہو جائے گی۔" منجھلا شونو زور سے چلایا۔

"دیدی ہم کو پیسے دے گی۔" ٹونو نے سر جھکا کر نرمی سے کہا۔

"ہمارے سائنس ماسٹر شنیل بابو کی بڑی دیدی کے ریکارڈ سارے انڈیا میں بجتے ہیں۔ وہ اتنی امیر ہو گئی ہیں۔ اُن کے پاس تو موٹر بھی ہے۔" شونو بولا۔

"دیدی ریڈیو سے جتنے پیسے ملتے ہیں لا کر تم لوگوں پر خرچ کر دیتی ہے۔" کھوکھو نے ڈانٹ بتائی۔

"دیدی اتنے پیسے کیا کرے گی؟ سب سے چھوٹے ٹونو نے جو سب سے لاڈلا تھا مطالبہ کیا۔

"اپنا جہیز بنائے گی، اور کیا تمھارا سر کرے گی۔" بھوتارنی دیبی نے جواب تک تیوری پر بل ڈالے چپ چاپ کھانا کھانے میں مشغول تھیں، گرج کر کہا۔

دیپالی ذرا سی سرخ ہو گئی اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ اس سارے ہنگامے میں وہ شام کی مہم کو تقریباً بھول چکی تھی۔ وہ میز پر سے اٹھنے لگی تو ڈاکٹر سرکار نے اس سے کہا۔ "جیوتی بابو ـــ انھوں نے تم سے کل ریڈیو اسٹیشن پر ملنے کو کہا ہے۔ تم کو ریکارڈنگ کے لئے کلکتہ جانا ہوگا۔ تم ریڈیو اسٹیشن کل کس وقت جاؤ گی؟"

"صبح کو بابا ـــ دس بجے۔"

"کالج پھر ناغہ ـــ؟"

"بابا۔ اب تو چھٹیاں شروع ہونے والی ہیں۔ اور (لڑکے اب ہلڑ مچاتے ہاتھ دھونے کے لئے باہر جا چکے تھے۔ بھوتارنی دیبی چپ چاپ برتن سمیٹنے میں مصروف تھیں) بابا ـــ پروگرام کے پیسے جمع کر کے بچوں کے کپڑے بنا دیئے تھے ـــ" وہ ٹھٹھک گئی ـــ "بابا۔ میری ساریاں بھی بالکل پھٹنے والی ہو رہی ہیں۔" اس نے جھینپ کر بات ختم کی۔

ڈاکٹر سرکار نے سر جھکا لیا۔ پھر وہ آہستہ سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اور گودام کے نزدیک

والے نل کے پاس کھڑے ہو کر کُلّا کرنے لگے۔ دیپالی چپکے چپکے پیچھے آئی اور گودام کے بند کواڑوں کو غور سے دیکھا جن میں لگا لوہے کا وزنی تالا بے حد ساکت اور پُراسرار معلوم ہو رہا تھا۔

## ۲

# طوفان سے پہلے

"ابانی گنگوپادھیائے"۔

"پریزنٹ"۔

"مولینا گھوشال"۔

"پریزنٹ"۔

"روزی بنرجی"۔

"پریزنٹ"۔

"جہاں آرا چودھری"۔

"پریزنٹ"۔

"دیپالی سرکار"۔

"ایبسنٹ"۔

سوکس (CIVICS) کی لیکچرر مسز بوس نے سیکنڈ ایر آرٹس کی حاضری لیتے ہوئے روزی بنرجی اور جہاں آرا چودھری کے برابر والی تیسری خالی کرسی پر نظر ڈالی۔

"دیپالی پھر غائب ہے"۔ انھوں نے کہا۔

"دیکھئے کرونا دی۔ جہاں آرا نے پلّو منھ پر رکھ کر کھی کھی کرتے ہوئے مسرور ہنسی چھپانے کی کوشش کی ــــ "دیپالی بیمار ہے"۔

"تم کو کیسے معلوم۔؟ تم تو اس کے گھر سے اتنی دور رہتی ہو ــــ؟"

"وہ کل ــــ میرا مطلب ہے، کل مجھے معلوم ہوا تھا کہ بیمار پڑ گئی ہے بے چاری"۔

"لڑکیو ــــ" مسز بوس نے کلاس کو بڑے دکھ سے مخاطب کیا۔ "فائنل امتحان سر پر ہیں اور تم سب کی سب ہو گی فیل ــــ اور روزی ــــ"

"یس کرونادی ـــ"

"تم دونوں ـــ تم اور دیپالی ہر وقت ڈرامے کرنے میں جُٹی رہتی ہو۔ ہر وقت۔ ایکٹریس بنو گی؟"

"کبھی کبھی ـــ" روزی اور جہاں آرا نے ہنسی روکی۔

"کہہ دوں۔؟" روزی نے چپکے سے جہاں آرا سے پوچھا۔

"کہہ دو ـــ"

"کرونادی ـــ دیکھئے کرونادی ـــ اصل میں دیپالی کلکتے جا رہی ہے۔ ایچ۔ ایم۔ وی ریکارڈ بھروانے۔"

"ایچ۔ ایم۔ وی ریکارڈ۔" ساری کلاس نے نعرہ لگایا۔

"آج وہ گراموفون کمپنی کے ڈائرکٹر سے ملنے جا رہی تھی تو راستے میں میرے گھر پر چھٹی کی عرضی چھوڑ گئی۔" روزی نے کہا۔

"کہاں ہے عرضی ـــ؟"

"بھول آئی کرونادی ـــ کبھی کبھی ـــ"

مسز بوس ایک نیک دل اور شریف خاتون تھیں۔ انھوں نے ذرا جھلا کر روزی کو گھورا اور باقیماندہ کلاس کی حاضری لگانے کے بعد فوراً اپنا کلاس روم والا بے رنگ لہجہ اختیار کر کے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "صفحہ ۲۱۸ کھولو ـــ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء۔"

"اوہ ـــ ہو ـــ ہو ـــ اوہ ـــ دیپالی کی خوشی میں کرونادی۔ آج جلدی چھٹی پلیز ـــ پلیز ـــ پلیز۔"

"جاؤ ـــ بھاگو ـــ منھ جلی چڑیلیں ـــ" آدھ گھنٹہ پڑھانے کے بعد مسز بوس نے مصنوعی غصّے کے ساتھ کتاب زور سے بند کی۔ لڑکیاں بھد بھد کرتی کمرے سے نکل کر باہر گھاس پر بکھر گئیں۔

روزی اور جہاں آرا نے ٹاک شاپ پر جا کر چاٹ خریدی۔

ابانی نے قریب آ کر چپکے سے روزی سے کہا۔ "پھاٹک پر کوئی لڑکا دیپالی کو پوچھ رہا ہے۔"

"دہی ـــ؟"

"ہاں ـــ"

"میں جاتی ہوں ـــ"

روزی بھاگتی ہوئی دور پھاٹک پر پہنچی ـــ نوجوان جو کل شام دیپالی کو سائیکل پر بٹھا کر نواب پور لے گیا تھا، اطمینان سے درخت کی آڑ میں کھڑا پان چبا رہا تھا۔ قریب ہی ایک

گائے گھاس پر بکھرے چاٹ کے خالی دونوں پر منہ مارنے میں مصروف تھی۔

"دیپا کی نہیں آئی ہے ــــ کوئی پیغام ــــ؟"

"ہاں ــــ" لڑکے نے کہا ــــ "اس سے کہنا ۱۹ تاریخ کی شام کو، ریڈیو اسٹیشن کی برساتی میں ٹھیک سات بجے ضرور پہنچ جائے۔ اور دوسری بات یہ کہ وہ جس کام کے لئے کل گئی تھی وہ امید ہے ایک دو دن میں ہو جائے گا۔"

"اور کچھ ــــ؟"

"بس ــــ نو مشکار ــــ" لڑکا سائیکل کے پیڈل پر پاؤں مارتا ہوا ہوا ہو گیا۔

روزی جو بے حد تیزی سے دوڑتی پھاٹک پر آئی تھی۔ اب سر جھکائے سوچ میں ڈوبی ٹک شاپ واپس پہنچی۔ جہاں بہت سی لڑکیاں اکٹھی ہو کر کسی نئی خبر پر زور زور سے تبصرہ کر رہی تھیں۔

"اور سنا تم نے روزی ــــ" سندھیا نے کہا ــــ "مس ہیڈ نے آج کہہ رہی تھیں کہ مس ادما رائے لندن سے واپس آ گئی ہیں اور شاید پھر یہاں پڑھانا شروع کر دیں۔"

"مارے گئے ــــ دیدی کو انھوں نے پڑھایا تھا۔ دیدی کہتی ہیں کہ بس جان نکال لیتی تھیں۔" شکتی نے کہا۔

"ہمارے تو بھیا مزے ہیں۔ ہم تو انٹر کے بعد گھر بیٹھ جائیں گے۔ ابا نے حکم دے دیا ہے!" جہاں آرا نے کہا۔ "تم لوگ اپنے مرتی رہو۔"

"تیرا تو ــــ اس کا جہاں آرا کا تو کسی ڈھیل مولوی سے بیاہ ہوگا ــــ جناب مولوی نوجیر الدین احمد صاحب۔!" موٹی مسخری رد مولا نے منہ پھاڑ کر ہاہا کرتے ہوئے کہا۔ اور چنے پھانکتی رہی۔

"ارے ہٹ بھاگ۔"

"تو خود بھاگ۔"

سہ منزلہ عمارت میں پانچویں پیریڈ کی گھنٹی بجی۔

"چلو بھائی ــــ آ گیا مس گرین فیلڈ کا گھنٹہ۔" روزی نے منہ بنا کر کہا۔

"دیں دیں دیں ــــ" رد مولا منہ ٹیڑھا کر کے مس گرین فیلڈ کی نقل کرتی چنے پھانکتی آگے آگے چلنے لگی۔ اس کے پیچھے پیچھے روزی، بنرجی اور جہاں آرا چودھری لڑکیوں کے غول میں شامل ہو کر عمارت کی سمت روانہ ہو گئیں۔

اس وقت جاڑوں کی سُہانی دھوپ ساری زندگی پر بکھری ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ ایڈن گرلز کالج کی بلند عمارات پڑھائی کی سنجیدہ خاموشی میں ڈوب گئیں۔ جس طرح جہاز آہستہ آہستہ گہرے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ ان عمارتوں کے روشن کمروں کی دیواروں پر لگی برطانیہ کے شاہی خاندان اور بنگال کے سابق گورنروں کی منجمد آنکھیں چپ چاپ سامنے کے منظر کو دیکھتی رہیں۔ جہاں بھانت بھانت کے سماجی اور اقتصادی پس منظر سے آئی ہوئی، قدیم بنگال کی نئی بیٹیاں اپنی اپنی کتابوں پر جھکی حصولِ علم میں منہمک تھیں اور کون کہہ سکتا تھا کہ باہر بیکراں فضا پرانی جنگوں کی جھنکار سے گونج رہی ہے۔ ان جنگوں میں لڑنے والے جو زبانیں بولتے تھے، وہ بھلا دی گئیں۔ وہ قومیں اور نسلیں ختم ہو چکیں۔ جن وجوہات پر اور جن مقاصد کے لئے وہ لڑائیاں لڑی گئیں۔ وہ فراموش کر دیئے گئے۔ پرانے فیصلوں پر نظرِ ثانی کرنے کی مہلت دنیا کو نہیں لیکن بیکراں زندگی میں ہر آواز، ہر کرب اور وقت کا ہر عکس موجود ہے۔ اور زندہ ہے اور باقی ہے۔

دفعتاً کالج پر پھیلا ہوا سناٹا اتنا گہرا ہو گیا کہ اسے بآسانی سنا جا سکتا تھا۔ طوفان سے پہلے چھانے والا سناٹا۔

## ۳

# وُوڈ لینڈز

رمنا کی ایک عالیشان کوٹھی کے ایک سائیڈ روم کے فرانسیسی دریچے میں سے صرف باغ اور نیلا آسمان نظر آسکتا تھا۔ کیونکہ حدِ نظر تک ہریالی کے علاوہ وہاں کچھ اور نہیں تھا۔ اِکا دُکا پوربی مالی پھولوں کے تختوں میں چھپے چپ چاپ اپنے کام میں مصروف تھے۔ دریچے کی سیٹ پر، جو سُرخ گلاب کے پھولوں والے جھالر دار غلاف سے ڈھکی ہوئی تھی، ایک نوجوان خاتون عینک لگائے محویت کے عالم میں بیٹھی خط لکھ رہی تھیں۔ سیزر ان کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ دریچے کے قریب برمی لکڑی کی رائیٹنگ ٹیبل پر چھوٹے چھوٹے بیضوی فریموں میں چند ارسٹوکریٹک بنگالی خواتین کی تصاویر جھلملا رہی تھیں۔ کمرہ جو انگریزی اصطلاح میں مورننگ روم کہلاتا تھا ـــــ اس کی دیواروں پر گلاب کی بیل کے ہلکے گلابی اور زرد، اور کاسنی اور سبز پیٹرن والا وال پیپر منڈھا تھا۔ اس طرح کا وال پیپر ایک زمانہ میں امرائے کلکتہ خاص طور پر ولایت سے منگوا کر اپنے کمروں میں لگواتے تھے۔ دیواروں پر سنہری فریموں والی بڑی بڑی تصویریں تھیں۔ لارڈ بائرن یونان کے ساحل پر

پر کشتی سے اتر رہے ہیں۔ کانسٹیبل کا ایک دیہاتی منظر۔ آبری بیرڈزلے کی مشہور سلومے آسکر وائلڈ والی۔ جو سیاہ کپڑوں میں ملبوس، تھالی میں دھرے یوحنا پیغمبر کے بریدہ سر کے بال پکڑ کر آہیں بھر رہی ہے۔ ایک تصویر مسٹر پک وِک کی تھی۔

دروازوں پر اور دریچوں میں موٹی ریشمی ڈوریوں سے بندھے پھندنوں والے دبیز ریشمی پردے پڑے تھے۔ آتش دان پر ڈریسڈ چائنا کی چرواہی بیٹھی تھی۔ اس کمرے کا اور سارے گھر کا طرز آرائش مکمل طور پر مغربی اور وکٹورین تھا۔

لیکن جو خاتون اس مورننگ روم میں موجود تھیں وہ وکٹورین نہیں تھیں۔ وہ ایک جوشیلی اور باشعور اور سنجیدہ سیاسی کارکن تھیں: جس پیڈ پر وہ خط لکھ رہی تھیں اس کے اوپر کے ایک کونے میں "وُوڈ لینڈز، رمنا، ڈھاکہ" گوتھک پرنٹ میں ثبت تھا۔ مگر مکتوب الیہ لندن اسکول آف اکنامکس کا ایک برطانوی یہودی، کمیونسٹ پروفیسر تھا۔

خط لکھتے لکھتے دفعتاً انھوں نے غصّے سے تڑ مڑ کر اسے دور پھینک دیا۔ فربہ سیزر ذرا دقت سے اٹھ کر اخلاقاً اس کی طرف لپکا۔ لیکن خاتون اسی طرح دل گرفتہ اور جھنجھلائی ہوئی بیٹھی رہیں۔ کیونکہ ان کو یاد آگیا تھا کہ یہ خط سارا کا سارا سنسر کی نذر ہو جائے گا۔

چند منٹ بعد سر ہاتھوں میں لے کر وہ دریچے سے باہر دیکھنے لگیں اور بے حد کرب سے انھوں نے سوچا۔ اب مجھ پر دورہ پڑنے والا ہے۔ انھوں نے عینک اتار کر آنکھیں زور سے میچ لیں۔ اور اسی طرح ساکت بیٹھی رہیں۔ اب وہ دانتے گیبریل روزیٹی کی داموزیل معلوم ہو سکتی تھیں۔

جب بیرسٹر پری توش کمار رائے نے اپنی وسیع و عریض کوٹھی کا نام "وُوڈ لینڈز" رکھا تو وہ اس رواج کی تقلید کر رہے تھے۔ جس کے تحت ہندوستان کا نیا مغربی تعلیم یافتہ اوپری طبقہ تقریباً سو برس سے اپنی کوٹھیوں کے انگریزی نام رکھنے میں مصروف تھا۔ مہاراجہ کوچ بہار کے کلکتے والے محل کا نام بھی وُوڈ لینڈز تھا۔ مگر بیرسٹر رائے کو یہ نام اس قدر پسند تھا کہ انھوں نے اسے تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

بیرسٹر رائے برہمو تھے۔ بنگال کے رائے اور ٹھاکر خاندان چودھری پریواروں کی مانند زمیندار تھے۔ اور مذہبی لحاظ سے قدامت پسند ہندو۔ زیادہ تر دت، سین اور گپتا۔ غیر برہمن جاتیاں برہمو ہو چکی تھیں۔ لیکن بیرسٹر رائے کے دادا کیشپ چندر سین کے چیلے بن گئے تھے۔ اور ان کا خاندان اب تقریباً پون صدی سے برہمو اور آزاد خیال تھا۔ بیرسٹر رائے کی والدہ اور پھوپھیوں

تک نے اسکول اور کالج میں پڑھا تھا۔ بیرسٹر رائے کی بیوی مشہور "سوشل فگر" تھیں۔ ان کا بڑا لڑکا نریلندو، برڈ اینڈ کمپنی کلکتہ میں اعلیٰ ایگزیکیٹو اور "کنفرمڈ بیچلر" تھا۔ اور زیادہ وقت ریس کورس پر اور شراب نوشی میں گذارتا تھا۔ بیرسٹر رائے کو فکر تھی کہ ان کی لڑکی بھی کہیں کنفرمڈ اسپنسٹر نہ بن جائے۔ آثار یہی نظر آتے تھے۔ مگر اس صورت حال کا مداوا اُن کے پاس نہیں تھا۔ اُن کے باپ کی نسل نے بچپن کی شادی اور دوسری سماجی خرابیوں کے خلاف جہاد کیا تھا۔ اور آزادیٔ نسواں کا پرچار کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے تھے۔ اور اب اُدما اُن کی لڑکی اٹھائیس سال کی ہونے کو آئی تھی اور شادی سے منکر تھی۔ اور وہ ان کی بیوی اُدما کی خلاف مرضی اسے شادی پر مجبور نہ کر سکتے تھے۔ انقلاب اپنے ہی بچوں کو کھاتا ہے۔ بیرسٹر رائے اکثر دکھ سے سوچتے ہماری اِن "پائنیر" خواتین کا جن میں اُدما بھی شامل ہے، کیا انجام ہوگا؟ نیا بنگال سو برس سے ایک ترقی یافتہ سماج، مگر پرانی اور نئی اقدار کی اس آویزش کی زد خود اپنی زندگی پر پڑے تو کیا کرنا چاہئے۔؟

اُدما کی شکل بہت معمولی تھی۔ باپ کی دولت و ثروت کی وجہ سے اچھے رشتے اس کے لئے آسکتے تھے۔ لیکن وہ سیاست کے چکر میں مبتلا تھی۔ اُدما دیبی ایک گول مٹول چہرے والی گدبدی سی لڑکی تھی۔ خلیق اور متواضع۔ گمبھیر اور تیز بین۔ لیکن اسے غصہ بہت جلد آجاتا تھا۔ اور ماں باپ سمیت کوئی بھی اس کی خلاف مرضی کوئی بات اس سے کہتا تو وہ فوراً آگ بگولہ ہو جاتی تھی۔ میری بیٹی اپنی زندگی میں ایک "بیک بنچر" کبھی نہیں بنے گی۔ بیرسٹر رائے اکثر سوچتے اور مزید فکر مند ہوتے رہتے۔ ڈھاکہ یونی ورسٹی سے ایم۔ اے کرنے کے بعد اس نے کچھ عرصہ گرلز اسکول میں پڑھایا تھا اور اسی زمانے میں صوبے کی کمیونسٹ تحریک میں شامل ہو گئی تھی۔ پھر بیرسٹر رائے نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا تھا۔ وہاں کرشنا مینن کی انڈیا لیگ اور رجنی پام دت کی برطانوی کمیونسٹ پارٹی کی وجہ سے کڑوا کریلا نیم چڑھ چکا تھا۔ لندن اسکول آف اکنامکس سے ڈگری حاصل کر کے اُدما چند روز قبل ڈھاکہ واپس آئی تھی اور بیرسٹر رائے کی ملاقات ایک قدرے اجنبی لڑکی سے ہوئی تھی۔ بیرسٹر رائے یک لخت بے حد پریشان ہو گئے تھے۔ اب تک انھوں نے ایک "مغربی ذہن پرست رویہ" سمجھ کر اُدما کے سیاسی مشاغل پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ کیونکہ بیٹی کی محبت کے علاوہ وہ خود چالیس برس قبل کے انگلستان سے لبرل ازم کا سبق سیکھ کر آئے تھے زندگی میں کتنے بہت سے رویے آپس میں گڈمڈ رہتے ہیں مگر اب حالات بے حد مختلف تھے۔ جنگ چھڑ چکی تھی اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی تھی۔ بیرسٹر رائے کے سالے اور اُدما کے ماموں دھریندر موہن سین ڈی۔ آئی۔ جی پولس نے کئی بار اپنی بہن اور بہنوئی کو سمجھایا تھا کہ لڑکی کو قابو میں رکھیں۔ مسز رائے عرصہ ہوا قیصر ہند کا تمغہ حاصل کر چکی تھیں۔ اور بیرسٹر رائے کو سر کا خطاب ملا چاہتا تھا عنقریب

ہائی کورٹ جج بننے والے تھے۔

اوما کی سرگرمیاں اب ذہنی تفریح کی حدود سے آگے بڑھ کر بڑی خطرناک صورت اختیار کر سکتی تھیں۔

اُوما رائے نے مورننگ روم کے دریچے کی سفید چوکھٹ پر سے سر اٹھا کر زور سے کنپٹیاں دبائیں اور دوبارہ عینک لگا کر باہر جھانکا۔ دو کانسٹیبل آپس میں باتیں کرتے گھاس پر سے گزر کر سامنے برساتی کی سمت جا رہے تھے۔ اوما صرف تین روز قبل لندن سے ڈھاکے واپس پہنچی تھیں۔ اُن کے ماموں دھریندر موہن سین ڈی۔ آئی۔ جی پولس، بھانجی کے سواگت کے لئے شمالی بنگال سے دُوڈ لینڈز ڈھاکہ آئے ہوئے تھے۔ اور ان کے عملے کے کانسٹیبل اور پولس انسپکٹر دوڈ لینڈز کے احاطے میں ہر طرف ٹہلتے پھر رہے تھے۔

ابھی ڈائننگ روم میں لنچ کا سریلا گھنٹہ بجے گا۔ ماں اور بابا اور ماما کھانے کی طویل میز پر بے حد شائستگی سے آکر بیٹھیں گے اور کھڑکھڑاتے سفید نیپکن کھولتے ہوئے اس سے بحری سفر کے حالات دریافت کریں گے۔ جنگ چھڑنے کے بعد اوما کے بخیریت وطن واپس آجانے کی سارے کنبے میں خوشیاں منائی جائیں گی۔ اوما آدھے سر کے درد کی مریض تھیں۔ لندن جانے سے قبل اکثر و بیشتر جب دردِ سر کا دورہ پڑتا تھا تو وہ تبدیل آب و ہوا کے لئے رائے خاندان کے گارڈن ہاؤس چلی جاتی تھیں۔ جو دریائے میگھنا کے ایک خوبصورت جزیرے پر پلاش کے درختوں میں چھپا کھڑا تھا۔ آج صبح بریک فاسٹ کی میز پر ماموں نے ان کی مضمحل صورت دیکھ کر تجویز کیا تھا کہ وہ سفر کی تھکان دور کرنے کے لئے چند روز کو گارڈن ہاؤس چلی جائیں، لیکن خود اوما رائے کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بہت سخت بیمار پڑنے والی ہیں۔ اور بہت سی متوقع اور غیر متوقع مصیبتوں، کلفتوں اور پریشانیوں کا انھیں بہت جلد سامنا کرنا ہے۔ سفید کشمیری شال کندھوں سے اچھی طرح لپیٹ کر وہ ونڈو سیٹ پر سے اٹھیں اور آہستہ آہستہ قدم رکھتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

# ۴

# جوار بھاٹا کا گیت

ڈھاکے کے ایک مسلمان رئیس کی دو منزلہ کوٹھی کرائے پر لے کر حکومت نے حال ہی میں اس میں ریڈیو اسٹیشن قایم کیا تھا۔ یہ کوٹھی بھی ڈھاکے کی ساری عمارتوں کی طرح قدیم، دقیانوسی اور ماضی میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جب دیپالی نے ریڈیو پر گانا شروع کیا۔ ڈاکٹر سرکار بڑی باقاعدگی سے اس کے ساتھ آتے تھے اور چھڑی کی موٹھ پر ہاتھ دھرے برآمدے کی ایک کرسی پر چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے۔ لیکن تین چار بار آنے کے بعد وہ اُکتا گئے تھے۔ مطب کے حرج کی پرواہ انہیں نہیں تھی، مگر انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ ریڈیو اسٹیشن غیر اخلاقی شے نہیں ہے۔ کلکتہ شہر میں بڑی آزادی تھی۔ لیکن فیوڈل ڈھاکہ ابھی بے حد قدامت پسند اور پسماندہ تھا۔ اور خود ڈاکٹر سرکار غفار گاؤں ضلع میمن سنگھ کے جس مفلوک الحال زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس میں لڑکیوں کا تنہا گھر سے باہر نکلنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب دیپالی اکیلی ریڈیو اسٹیشن آتی تھی یا کبھی کبھار کھوکھو اس کے ساتھ آجاتا تھا ــــ وہ عباس الدین احمد کی شاگردی میں مشرقی بنگال اور بالخصوص میمن سنگھ کی لوک سنگیت کی ماہر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے نشریہ پروگرام نہایت مقبول ہو چکے تھے۔

۱۹ر دسمبر کی شام، وہ اپنا پروگرام ختم کر کے اسٹوڈیو سے نکل رہی تھی کہ برابر کے ایک دروازے پر ڈاکٹر سرکار کے پرانے دوست اور شانتی نکیتن کے پروفیسر، ماہر لسانیات سید مرتضیٰ حسین اس سے ٹکرا گئے۔ انھوں نے تیوری پر بل ڈال کر اور چھڑی اٹھا کے گویا ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "تمھارے بابا کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں کاکا!" وہ تیزی سے پھر آگے بڑھی۔ لیکن سید مرتضیٰ حسین اس کے پیچھے لپکے۔

"اور سنو لڑکی، تم نے ہمارے ہاں آنے کے متعلق کیا فیصلہ کیا؟" سید مرتضیٰ حسین نے چھڑی ہوا میں لہرائی۔ دیپالی نے غیر یقینی انداز میں سر ہلا دیا۔ اور گیلری کے سرے پر آویزاں کلاک پر نظر ڈالی۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ اب وہ دونوں صدر دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ چاروں

طرف ایک تارا اور ایسراج اٹھائے فن کاروں اور ریڈیو کے اراکین کی آمد و رفت جاری تھی۔

پروفیسر سید مرتضیٰ حسین جو ہندوستان اور یورپ کی قدیم و جدید بیس پچیس زبانوں کے ماہر تھے۔ برآمدے میں پہنچ کر ٹھٹھک گئے۔ "بیوقوفوں کی طرح سر کیوں ہلا رہی ہو؟" انھوں نے درشتی سے مطالبہ کیا۔

اندر عباس الدین احمد نے گانا شروع کر دیا تھا اور ان کی خوبصورت جان لیوا آواز پدما کی لہروں کی طرح سارے میں پھیلتی جا رہی تھی — پدما کے مانجھی کا گیت — بھاٹا کا نغمہ۔ عباس الدین احمد کی امر سنگیت — بھٹیالی —!!

دیپالی نے برآمدے کے ایک در سے ٹک کر پل کی پل کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

"تم خوش قسمت ہو دیپالی کہ تم کو عباس الدین احمد کی شاگردی میسر ہے۔ زندگی کا ہر لمحہ غنیمت جانو۔" دور پدما کی تاریک پُرسکون لہروں پر سے بہتی سید مرتضیٰ حسین کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ یہ میرا دیس، یہ پدما اور میگھنا اور برہم پتر یہ سنگیت۔ یہ جہان کلاکار۔ یہ سب اسی طرح رہے گا۔ مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تاریک راتوں میں اہم سازشیں ہو رہی ہیں۔ پروفیسر مرتضیٰ حسین کو بھی شاید پوری طرح معلوم نہیں کہ ہم کیا کرنے والے ہیں! وہ خود اور ہم سب کہاں ہیں۔ اس کی ہمت دوبارہ عود کر آئی اور اس نے ذرا بشاشت سے کہا۔ "کاکا اب فرنچ میں ڈانٹئے تو — یا —"

"کیا بات ہے۔ اتنی جلدی میں کیوں ہو —؟" پروفیسر نے دریافت کیا۔ اور اسے بڑے غور سے دیکھا — "کبھی ایسا موقع زندگی میں نہ آنے دینا کہ بعد میں پچھتاؤ کہ تم نے اپنے خواب کیوں نہ پورے ہونے دیئے۔" انھوں نے باہر نظر ڈالی — "وہ دیکھو تم کو کوئی بلا رہا ہے شاید — جاؤ — بھاگو —" اتنا کہہ کر وہ جھپاک سے برابر کے کمرے میں گھس گئے۔

دیپالی سرعت سے برساتی میں اُتری۔ پیغامبر نوجوان نیم تاریک لان پر مزے سے ٹہل رہا تھا اسے دیکھ کر وہ سڑک پر آگیا۔ وہ دونوں عمارت کے پھاٹک سے نکل کر باہر سڑک پر پہنچے۔ نوجوان نے کُرتے کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر اُسے تھما دیا — ریحان دا — ریحان دا نے کہا ہے یہ خط دیپالی سرکار کے ذریعے کماری اُدما رائے کو پہنچا دیا جائے۔ جلد از جلد —"

"ادما رائے —؟" دیپالی نے چپکے سے پوچھا۔ "لیکن میں تو ان کو جانتی بھی نہیں۔"

"ادما دیبی بیمار پڑی ہیں۔ ان کے ڈی۔ آئی۔ جی ماموں اُن کے یہاں مقیم ہیں۔ اس وجہ سے وڈ لینڈر پر پولس کا پہرہ ہے۔ ادما دیبی کے بیڈ روم تک دیپالی صرف تمھاری رسائی ہو سکتی ہے —" نوجوان نے پھر بات شروع کی۔ چلو تم کو سریندر دا سے ملواؤں۔ میری جگہ یہ اب تم

سب سے رابطہ رکھیں گے۔ میں باریسال جا رہا ہوں"۔

وہ دونوں تنگ اور نیم تاریک سڑک پر ذرا اور آگے بڑھے۔ ایک دیوار کے سائے میں ایک اور نوجوان اُن کا منتظر تھا ـــــ "ہلو دیپالی۔!" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"سریندر دا۔!" دیپالی نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ "آپ کھلے خزانے گھوم رہے ہیں! کیا معافی مانگ لی۔؟" اُس نے غصّے سے پوچھا۔

نوجوان ہنس پڑا۔ "تم نے دیپالی میرے متعلق غلط افواہ سنی تھیں۔ میں ابھی بلیک لسٹ پر نہیں ہوں۔ تم وہی کلاسیکل ریولیوشنریز (REVOLUTIONARIES) کے زمانے کی بات کرتی ہو! اب تکنیک بدل چکی ہے"۔

"میرے کاکا کلاسیکل ریولیوشنری تھے"۔ دیپالی نے اداسی سے کہا۔

وہ تینوں سر جھکائے تیز تیز چلتے گھوڑا گاڑی اسٹینڈ کی طرف بڑھنے لگے۔

"وہ ساڑیاں تمھاری ـــــ بک گئیں۔ پورے ساڑھے پانچ سو میں"۔ سریندر مکرجی نے سیگریٹ سلگانے کے بعد دیا سلائی جھٹک کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

"اچھا ـــــ" دیپالی کا دل ڈوب گیا۔

"ہاں ـــــ" سریندر مکرجی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "جن صاحب کے پاس ہم یہ ساریاں لے کر گئے وہ تو ان کو دیکھ کر بالکل اُچھل پڑے۔ کہنے لگے بھائی یہ تو میوزیم پیس ہیں۔ فوراً کلکتہ میوزیم کے لئے خرید واتا ہوں۔ اور مزے کی بات یہ ـــــ" سریندر مکرجی نے سیگریٹ کی راکھ جھٹک کر بات جاری رکھی ـــــ مزے کی بات یہ کہ قیمت ـــــ جانتی ہو ـــــ کس نے ادا کی ـــــ؟ خود ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ـــــ"

"مسٹر کینٹ ویل نے ـــــ؟"

"مسٹر کینٹ ویل آئی۔ سی۔ ایس نے ـــــ!" سریندر نے جواب دیا۔

"او ـــــ ماں ـــــ!" خاندانی یادگاروں کے بکنے کا وقتی غم بھول کر دیپالی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"روپیہ ریحان دا کو وقت پر پہنچ گیا۔ کام شروع ہو چکا ہے"۔ سریندر مکرجی نے بات ختم کی۔

وہ پالکی گاڑیوں کے اڈّے پر چوراہے کے مدھم لیمپ کے نیچے پہنچ چکے تھے۔ سریندر مکرجی یک لخت چھلاوے کی مانند رات کے کہرے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دیپالی سرکار جو اس کی طرح چھلاوں کی عادی ہو چکی تھی۔ سکون سے ایک گھوڑا گاڑی کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہوئی پیغامبر

نوجوان مقابل کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مسلمان کوچوان نے نحیف و نزار گھوڑے پر چابک لہرایا۔ گاڑی چرخ چوں کرتی کچی سڑک کے گڑھوں پر سے گذرتی دیپالی کے گھر کی سمت روانہ ہو گئی۔

## ۵

# کماری اُوما رائے

دُور ڈاب کے سبک پیڑوں کی قطار سے مزین نارنجی افق پر بے حد سُرخ سُورج بہت آہستہ آہستہ اس طرح ڈوب رہا تھا۔ گویا شاہ باغ کی سنسان، سایہ دار سڑک پر سے گذرتی بند گاڑی میں بیٹھی دیپالی سرکار کے مسرور چہرے کا اچھی طرح نظارہ کرنا چاہتا ہو۔ کیونکہ شاید ایسا بے فکر چہرہ اسے دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملے گا۔

سال، شیشم اور نیم کے پتے رمنا کی چوڑی سڑکوں پر نرم روی سے اڑتے پھر رہے تھے۔ فضا میں خنکی آگئی تھی۔ پگڈنڈیوں پر گلہریاں دوڑ رہی تھیں۔ پھاٹکوں کی سفید پلیوں پر بیٹھے اِکا دکا ملازم بیڑی پینے میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد ان سڑکوں پر مدھم مدھم لیمپ جھلملا اٹھیں گے۔ مکان گھاس اور درختوں اور ہواؤں اور چاندنی رات کی ہمفی سنتے سنتے آرام سے سو جائیں گے۔

گھوڑے کی ٹاپیں سڑک کی کنکریلی سطح پر بڑا پر سکون سا شور پیدا کر رہی تھیں۔ عبدالقادر کوچوان سر جھکائے نہ جانے ان بہت ساری دنیاؤں میں سے کون سی دنیا میں کھویا ہوا تھا ــــــ اُس کی دنیا کون سی تھی؟ (ایک باشا کا جھونپڑا یا شہر کی غلیظ گلی میں ایک تنگ و تاریک مکان، یا ایک شکستہ شاگرد پیشہ۔ دس آدمیوں کا کنبہ اور مسلسل فکرِ معاش اور مسلسل غمِ زیست) عبدالقادر کوچوان جو محکمہ مردم شماری کے لئے ایک عدد اور اہل سیاست کے لئے ایک ووٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اَن دیکھے طوفانوں میں گھرا دیپالی سرکار کو وُوڈ لینڈز لئے جا رہا تھا۔

موڑ پر پہنچ کر جھلملیوں والی بند گاڑی دوسری سڑک پر اس طرح نمودار ہوئی جیسے کہانی کا نیا باب کھلتا ہو۔ (چاروں طرف زندگی کی کہانیوں کے باب کھلتے ہیں۔ اور ختم ہو جاتے ہیں۔ اور کردار صفحات میں سے نکل کر قبروں میں جا لیٹتے ہیں۔ چتاؤں میں پھونک دیئے جاتے ہیں۔ نیا صفحہ پلٹ کر قاری آگے بڑھتا ہے۔)

اب دیپالی نے کھڑکی کی جھلملی چڑھا کر باہر جھانکا۔ اسی راستے پر آگے جا کر ارجمند منزل تھی جس میں جہاں آرا رہتی تھی۔ جہاں آرا بیگم، جو اس دھندلی داستان کے آخری صفحات پر زندہ تھی جس کے مصنفوں نے جہانگیر نگر[1] آباد کیا تھا۔ اسی راستے پر، اونچے اونچے مغرور درختوں کے پیچھے ڈی۔ ایم کا بنگلہ تھا۔ اس بنگلے میں رہنے والا ولیم کینٹ ویل اُس داستان کا ایک اہم کردار تھا۔ جس کے مصنفوں نے جہانگیر نگر اجاڑا تھا۔ اسی راستے کے اختتام پر "وودلینڈز" تھا۔ نئی داستان کے مصنفوں نے جہانگیر نگر کے فاتحین کے تعاون سے اپنے لئے کیسے کیسے "وودلینڈز" تعمیر کئے تھے۔

دیپالی شاداں و فرحاں تھی کہ ایک نئے ڈرامے میں حصہ لے رہی تھی۔ جس کے لیکھک ارجمند منزل اور ڈی۔ ایمز ہاؤس اور وودلینڈز کی بنیادیں ہلانے والے تھے۔ دیپالی کی آدرش وادی زندگی اس وقت بڑی مکمل تھی۔ جس زندگی میں مہربان، سمجھ دار، دردمند، رفیق اور ساتھی موجود تھے۔ سب مل کر خطروں کا چیلنج قبول کر رہے تھے۔ آگے قدم بڑھا رہے تھے۔ اوما دیبی سے ملنے کی خوشی میں وہ رات بھر سو نہیں سکی تھی۔ اَن دیکھے ریحان دا نے ایک اہم پیغام رسانی اُس کے سپرد کی تھی۔ ریحان دا جیسے بڑے نیتا اسے اب گویا اپنے اندرونی حلقے میں شامل کر چکے تھے۔ خوشی کے مارے اس کا بس نہ چلا کہ پر لگا کر اوما رائے کے پاس پہنچ جائے۔

لیکن وودلینڈز کے پھاٹک پر کانسٹیبل کھڑا دیکھ کے وہ دھک سے رہ گئی۔ بیگ مضبوطی سے تھام کر جلدی سے نیچے اتری اور کانسٹیبل سے کہا کہ اوما رائے کی پرانی شاگرد ہے۔ کانسٹیبل نے بے پروائی سے سر ہلایا۔ غالباً دیپالی کو اتنا گھبرانے کی ضرورت نہ تھی۔ عبدالقادر کو کرایہ ادا کرنے کے بعد وہ چند لمحوں کے لئے پھاٹک پر ٹھٹکی اور گاڑی کو واپس جاتے دیکھتی رہی۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس اجنبی جگہ پر غیر محفوظ اور تنہا رہ گئی ہے۔ عبدالقادر کوچوان، حکام اور امراء کی اس انجانی دنیا میں اسے اکیلا چھوڑ کر سر جھکائے جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں ٹخ ٹخ کرتا دور چلا جا رہا تھا ـــــ وہ پلٹ کر باغ کی سرخ سڑک پر آئی تو سامنے گھاس پر پولس کا وردی پوش اعلیٰ افسر (ہندوستانی) اور ایک وردی پوش اعلیٰ افسر (انگریز) باتوں میں منہمک گھاس پر ٹہلتے نظر آئے۔ تیز تیز برساتی میں پہنچی تو سینئر اس پر بھونکا۔ اس نے سراسیمگی سے "اوماں" کا ہلکا سا نعرہ لگایا تو ایک عالی شان چپراسی اس کی سمت لپکا۔ اس نے اپنے الفاظ دہرائے: اوما دیبی کی پرانی شاگرد دیپالی سرکار عیادت کے لئے آئی ہے۔

چپراسی اندر گیا۔ اور چند منٹ بعد سفید چپکن اور سبز پیٹی والا بیرہ باہر آیا اور منہ سے کچھ بولے بغیر سر کی جنبش سے اس نے دیپالی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ذرا جھجکتے ہوئے طویل

[1] ڈھاکہ کا پرانا مغل نام

گیلری میں داخل ہوئی، جس کی دیواروں پر دو درجن بارہ سنگھوں کے سر اپنی کانچ کی آنکھوں سے ہر آنے جانے والے کو گھور رہے تھے۔ سیاہ اور سفید ٹائیلوں کے فرش پر سے گذرتے ہوئے دیپالی کو یاد آیا۔ بیرسٹر رائے کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے موکل اشرفیوں سے بھری تھیلیاں لا لا کر ان کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں اور ان کی بیوی مسز ارچنا رائے اپنی سینڈلز میں ہیرے جڑواتی ہیں ـــــ دیپالی سوچنے لگی۔ اتنی دولت مند اوما دیبی تحریک کی مالی مدد کیوں نہیں کرتیں۔ جب ضرورت پڑتی ہے تو ہم جیسے غریب کارکنوں کو اپنے گھر میں سیندھ لگانا پڑتی ہے۔ اکثر ڈاٹیوشن کرتے ہیں۔ ستیندر مزدور ہے محمود الحق پریس میں پروف ریڈر ہے۔ اور دن رات اپنی کمزور آنکھیں پھوڑتا ہے۔ اس طرح جو کچھ بن پڑتا ہے یہ سب لا کر تحریک کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ اوما رائے ایک محل میں رانیوں کی طرح رہتی ہیں اور ریحان دا کسی پراسرار دیوتا کی طرح کہیں چھپے بیٹھے ہیں اور "اوپر" سے ریحان دا کی طرف سے جو حکم ملتا ہے۔ ہم سب اسے بجا لانے کے لئے مستعد ہیں۔

اب وہ بیرے کے پیچھے پیچھے ایک ہال میں داخل ہوئی۔ جس کے وسط میں سنگ مرمر کی گول میز پر کسی یونانی دیبی کا مرمریں مجسمہ استادہ تھا۔ فرش پر شیر کی کھالیں اور بخارا کے قالین بچھے تھے۔ دیواروں کے برابر برابر لحیم شحیم صوفے رکھے ہوئے تھے۔ دیپالی نے ایسی شان و شوکت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ارجمند منزل میں بھی نہیں۔ ارجمند منزل بھی بڑی عالی شان کوٹھی تھی۔ مگر وہاں کی ہر چیز بوسیدہ اور مضمحل سی معلوم ہوتی تھی۔ اوما دیبی سے ملاقات کی خوشی نے اسے راستے میں جس قدر مضطرب کیا تھا اس پُر کیف اور جگمگاتے ماحول کو دیکھ کر وہ یک لخت اتنی ہی دل گرفتہ ہو گئی۔

کریم خان بیرے نے اُسے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا کہ یہیں ٹھہر جائے (بیرا ملاقاتیوں کی اوقات پہچان کر بات کرتا تھا۔ اور ہما شما کو اشاروں ہی پر ٹرخاتا تھا) وہ ایک دروازے کا عنابی پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ دیپالی ایک کرسی کے کنارے پر ٹک گئی۔ اور وہاں کی آرائش کو غور سے دیکھنے لگی۔ انسانوں کی زندگیوں میں اتنا شدید تفاوت بھی ممکن ہے۔ اسے عبدالقادر کوچوان کا شکستہ قبر ایسا مکان یاد آیا، جو چندر گنج کے کھنڈر شاگرد پیشے میں ٹاٹ اور ٹین کے ٹکڑوں اور باشا کی بوسیدہ چٹائیوں کی مدد سے رہنے کے قابل بنایا گیا تھا۔ اس نے اپنے اُجاڑ چندر گنج کا تصور کیا۔ جس کے خالی مطب میں بابا ان مریضوں کے انتظار میں صبر سے بیٹھے ہوں گے، جو کبھی کبھار اس طرف آ نکلتے تھے۔ ڈھاکہ شہر کے ہزاروں، لاکھوں نیم تاریک مفلس مکان اور جھونپڑے، جن میں لالٹین اور مٹی کے دیئے ٹمٹما رہے تھے۔ دور غفار گاؤں میں اس کا آبائی مکان جو تقریباً ڈھے چکا تھا۔ ایسا افلاس، ایسی ویرانی اس ملک پر۔ اس ہندوستان پر طاری ہے۔

مگر وہ دفعتاً ایک نئے جوش اور خود اعتمادی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی ـــــ انقلاب آنے

والا ہے۔ اس انقلاب کے لانے والے ہم خود ہیں۔ اور ہم کامران ہوں گے۔ اس انقلاب ہی کی عظمت ہے۔ جس کی وجہ سے وڈلینڈز کے مالک کی بیٹی دھارے میں شامل ہو چکی ہے۔ جواہر لال نہرو بھی تو آنند بھون میں پروان چڑھے تھے۔

بیرے نے باہر آکر پہلی بار اس سے بات کی۔ "مس صاحب پلنگ میں تھیں۔ اب اندر جائیے۔"

"کس طرف ــــ؟" اس نے دریافت کیا۔

"مس صاحب مورننگ روم میں ہیں۔ اِدھر۔"

دیپالی کی سمجھ میں نہ آیا ــــ شام کے وقت اگر مورننگ روم میں ہیں تو اسے ایوننگ روم کیوں نہ کہنا چاہئے۔ خیر بہر حال۔

بیرے نے بھاری عنابی پردہ اٹھایا۔ وہ اندر گئی۔ پردہ اس کے پیچھے برابر ہو گیا۔ اب وہ اس بڑے کمرے میں کھڑی تھی، جس کے فرانسیسی دریچے کے نزدیک ایک کوچ پر کماری اُدما رائے شال اوڑھے آنکھیں بند کئے کشنوں کے سہارے نیم دراز تھیں۔

ارے تو یہ ہیں اُدما دیبی ــــ اُسے ذرا سی مایوسی ہوئی۔ مگر فوراً اس نے اپنے آپ کو سمجھایا یہ میری بورژوا رومانیت ہے۔ میں کسی ناول کی ہیروئن کی متوقع کیوں تھی ــــ اُدما دیبی ایک فالتو رومانی ہیروئن کی بجائے نئے ہندوستان کی نئی عورت ہیں۔ ہمیں اپنے نیتاؤں کو خواہ مخواہ گلیمرائز نہیں کرنا چاہئے

آہٹ سن کر اُدما دیبی نے آنکھیں کھولیں اور نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔

بڑے بڑے دریچوں والے کمرے میں شفق کی سُہانی روشنی پھیل گئی تھی۔ کمرہ ایسا لگتا تھا، جیسے باہر باغ میں شامل ہو گیا ہے۔ ہر شے ساکت اور متحیّر اور منتظر تھی۔

"نومشکار ــــ اُدما دیبی ــــ"

"نومشکار ــــ آؤ ــــ آؤ ــــ بیٹھو ــــ"

دیپالی کوچ کے مقابل ایک کرسی پر ٹک گئی۔

تب اُدما رائے نے تپائی پر سے اٹھا کر عینک لگائی اور نووارد اجنبی لڑکی کو تیکھی، گہری ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔

"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے اُدما دیدی؟"

"کیا نام بتایا تھا تم نے ــــ دیپالی سرکار ــــ؟"

"جی ــــ"

"تم ــــ اسکول میں کون سی کلاس میں تھیں؟" اُدما رائے نے عینک اتار کر ساری کے

پلّو سے صاف کرنے کے بعد دوبارہ ناک پر جمائی۔ "سوری میں تم کو پہچان نہیں سکی ــــ"

"جی ــــ میں ــــ اُوما دیدی ــــ مجھے سریندر دا نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ سریندر کرجی نے" اُس نے اپنے بیگ پر ہاتھ رکھ کر نیچی آواز میں کہا۔

"اوہ ــــ" اوما دیبی چونک کر اٹھ بیٹھیں۔ ہاتھ بڑھا کر کیوپڈ اور سائیکی کے سروں پر پھیلے سبز جھالردار شیڈ والا لیمپ روشن کیا۔ شفق کا اُجالا تیز برقی روشنی میں ڈوب گیا۔ اب باغ میں پرندے بسیرا لینے کے لئے چہچہا رہے تھے۔

"بڑی سردی ہے"۔ اوما دیبی نے شال لپیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ کھڑکی بند کر دو"۔

دیپالی نے اٹھ کر فرانسیسی دریچے کے سلسلے وار پٹ بند کر دیئے۔ اور واپس آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُوما دیبی اسے بڑے دھیان سے دیکھ رہی تھیں۔

"تم کون ہو ــــ"

"دیپالی سرکار ــــ"

"صرف نام دُہرانے سے کام نہیں چلے گا ــــ اس نام کے میرے لئے ابھی تک کوئی معنی نہیں ہیں۔ تفصیل سے بتاؤ ــــ" اُوما رائے نے جھنجھلا کر کہا اور انگلیوں سے کنپٹیاں دبائیں۔ دیپالی جو کالج میں اُوما رائے کی سخت گیری کی حکایتیں سن چکی تھی۔ اس اندازِ گفتگو سے زیادہ نہیں گھبرائی اور اطمینان سے دوبارہ مزاج پُرسی شروع کی ــــ "آپ کی طبیعت کیسی ہے اُوما دیدی؟"

وہ خاموش رہیں۔ پھر کہا ــــ "کوئی پیغام لائی ہو ــــ؟"

"جی ــــ سریندر دا میرا کونٹیکٹ ہیں ــــ میں کالج میں سیکنڈ ائیر میں پڑھتی ہوں میرے بابا بنوئے چندر سرکار پرائیویٹ پریکٹس کرتے ہیں"۔ اس نے اپنے گھر کا پتہ بتایا۔

"کیا پیغام ہے۔؟" اوما دیبی نے پوچھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"ریحان دا نے آپ کو خط بھجوایا ہے"۔

"ریحان دا ــــ" وہ اب چونک کر پھر سیدھی ہو بیٹھیں۔ ریحان کا خط ہے تو اتنی دیر سے فضول باتوں میں وقت کیوں ضایع کر رہی ہو ــــ لاؤ ــــ"

دیپالی نے بڑے اطمینان سے بیگ کھولا۔

عین اسی وقت عنابی پردے کو جنبش ہوئی۔ سفید ساری میں ملبوس ایک باوقار معمر خاتون نے اندر جھانکا۔ اور آواز دی۔ "ہاؤ آر یو اُوما ــــ"

"آئی ایم فائن ــــ" اوما نے خاصی بیزاری سے جواب دیا۔ "میری ایک پرانی شاگرد آئی ہوئی ہے ذرا چائے بھجوا دیجئے ــــ"

"اچھا ــــ" لیکن واپس جانے کے بجائے مسز رائے اندر آگئیں۔ دیپالی نے تعظیماً کھڑے ہو کر اُن کو نمسکار کیا۔

"جیتی رہو ــــ" دیپالی پر سرسری سی نظر ڈال کر انھوں نے اُوما کو فکرمندی سے دیکھا۔

"دوا پی لی ــــ؟ ڈاکٹر چٹرجی کہہ رہے تھے۔ جب تک مرض کی تشخیص نہیں ہو جاتی ــــ"

"کتنی بار کہوں گی ماں ــــ" اُوما نے چڑ کر مسز رائے کی بات کاٹی ــــ "مجھے کوئی مرض ورض نہیں۔ خالی سفر کی تکان ہے۔ آپ سب جانے کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں"۔

مسز رائے نے اس تلخ لہجے کی پرواہ کئے بغیر پھر کہا۔ "ہم لوگ کلب جا رہے ہیں۔ وقت پر کھانا کھا لینا ــــ" اُوما نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مسز رائے چند سیکنڈ تک اسی طرح کھڑی رہیں۔ اور پھر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"اوہ ــــ والدین ــــ!" اوما نے پہلی بار مسکرا کر دیپالی کو دیکھا ــــ "تمھارے والدین بھی اتنے صبر آزما ہیں ــــ؟"

دیپالی اوما دیبی کے مزاج کی اس تبدیلی سے خوش ہوئی اور ہنس پڑی۔

"اچھا۔ اٹھو اور دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دو ــــ"

"لیکن ابھی تو اُوما دی آپ نے چائے منگوائی ہے"۔

"ارے ہاں ــــ بہت سمجھ دار بچی ہو واقعی!"

"بچی ــــ! اُوما دی، میں اس اپریل میں انیس برس کی ہو جاؤں گی"۔

"صرف انیس[۱۹] برس!"

"ذرا میری پشی[۱] ماں سے پوچھئے۔ اُن کو یہی غم کھائے جا رہا ہے کہ میری بیاہ کی عمر ہی نکل گئی ــــ!!" دیپالی اپنے رو میں کہے گئی۔ اوما دفعتاً پھر تیوی پر بل ڈال کر سنجیدہ ہو گئیں اور سُرعت سے لفافہ چاک کیا۔

سائے کی طرح بیرے نے اندر آکر چار کی کشتی میز پر رکھی اور واپس چلا گیا۔ دیپالی نے چار بنائی اور دروازہ اندر سے بند کیا۔ اُوما پیالی سے ایک گھونٹ بھر کر طویل خط پڑھنے میں محو ہو گئیں۔

اپنی پیالی ختم کر کے دیپالی کرسی سے اٹھی اور ٹہل ٹہل کر دیواروں پر لگی تصویریں دیکھنے لگی۔ لارڈ بائرن، جن کے عقب میں طوفانی سمندر تھا۔ اور ملاح ان کی کشتی کنارے سے باندھ رہا تھا۔ اور وہ فاتح قلوب اپنی مغرور اور توانا مسکراہٹ کے ساتھ گویا اپنے قدموں پر جھکی ہوئی دنیا کا نظارہ کرنے میں مصروف تھا۔ دینس اور ایڈونس ــــ مسٹر پک وک ــــ اور سیاہ پوشاک میں ملبوس

---

[۱] پھوپھی

ایک لرزہ خیز عورت جو ایک باریش مردہ کا بریدہ سر ہاتھوں میں لئے چیخیں مار رہی تھی۔ یہ بڑی بھیانک تصویر تھی۔

دیپالی چند لمحوں تک اس تصویر کو دیکھتے رہنے کے بعد ذرا خوفزدہ سی ہو کر اپنی کرسی پر واپس آ بیٹھی۔ اُدما دیبی خط ختم کر کے گہری فکر اور پریشانی میں مبتلا آنکھیں بند کر چکی تھیں۔ باہر گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ اور دریچے کے نزدیک املتاس کی ڈالیاں سرسرا رہی تھیں۔ دور سے سینزر کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اُدما دیبی نے آنکھیں کھولیں اور دیپالی کو بڑی سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"یہ کس کی تصویر ہے اُدما دی ـــــ ؟" دیپالی نے پوچھا۔

"کون سی ؟"

"یہ والی ـــــ" اُس نے اشارہ کیا۔

"نہیں جانتیں ؟ انٹرمیڈیٹ میں انگریزی پڑھتی ہو یا گھاس کھودتی ہو ؟"

اس ڈانٹ سے واقعی وہ سہم گئی۔

"یہ آسکر وائلڈ کی سلومے ہے۔" اُدما دیبی نے ترشی سے کہا۔

"یہ کر کیا رہی ہے اُدما دی ؟"

"تم مجھے بہت بیوقوف معلوم ہوتی ہو۔" اُدما دیبی اٹھ کر بیٹھ گئیں ـــــ "یا بیوقوف ہو، یا بن رہی ہو۔" مجھے اِترانے والی چبلی لڑکیاں بہت ہی بُری معلوم ہوتی ہیں۔ انھوں نے دل میں اضافہ کیا اور کہا۔ "کیا تم کو نظر نہیں آیا کہ یہ کیا کر رہی ہے ؟"

"مگر اس کی کہانی کیا تھی اُدما دی۔"

"مجھے یاد نہیں ـــ مجھے مذہبی اساطیر سے مطلق دلچسپی نہیں ہے۔" وہ کوچ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "تم مجھ سے ڈیکیڈنٹ تصاویر پر گفتگو کرنے آئی ہو یا کچھ کام کرنا ہے ؟"

"جی اُدما دی !ـــــ" دیپالی پھر ہنس دی۔

یہ لڑکی خوبصورت ہے اور بیوقوف ہے۔ اس لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اُدما دی نے خط کو چوہرا کر کے مٹھی میں بھینچا۔ مگر حصول مقصد کے لئے رِسک لینے ناگزیر ہیں۔ انھوں نے ایک گہری سانس لی اور دنڈ سیٹ پر جا بیٹھیں۔

"اِدھر آؤ۔ اور غور سے جو کچھ میں کہنے والی ہوں سنو۔" انھوں نے درشتی سے کہا۔

یکایک دیپالی کو اسی کیفیت نے آن دبوچا، جو اس پر ہال میں طاری ہوئی تھی۔ یہ میری اُستانی کبھی نہیں رہیں۔ عمر میں بہت بڑی البتہ ہیں۔ مگر مجھ پر اس طرح حکم کیوں چلا رہی ہیں ـــ ؟ اِس لئے کہ رئیس زادی ہیں ؟ اس نے بڑی بے خوفی سے جواب دیا۔ "جی ہاں ـــ اُدما دی، مگر پہلے

میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"کہو ــــ"

"آپ اتنی بے تحاشا دولت مند ہیں۔ چپکے چپکے تحریک کی مالی مدد کیوں نہیں کرتیں؟"

بیوقوف ہے۔ اسی لئے نڈر اور منہ پھٹ بھی ہے۔ اوما نے دل میں سوچا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر اُسے جواب دیا ــــ دیپالی۔ یہاں آن کر بیٹھو۔ ایک ایک منٹ بہت قیمتی ہے۔ (یہ لوگ ابھی تک میرے سماجی پس منظر کو معاف نہیں کر سکے۔ انھوں نے دل میں کہا) تمھارے سوال کا سیدھا سا جواب دیپالی یہ ہے کہ میں تین برس سے لندن میں تھی۔ اور چند روز قبل ڈھاکے واپس پہنچی ہوں۔ اور آتے ہی بیمار پڑ گئی۔ ساتھیوں سے میرا پہلا رابطہ اس وقت تمھارے ذریعے قایم ہوا ہے اور ایک انتہائی اہم کام کے سلسلے میں۔ چنانچہ غور سے سنو۔"

"اوہ ــــ" دیپالی نے بے حد نادم ہو کر کہا۔ "آئی ایم سوری اوما دیدی ــــ" وہ شرم سے پانی پانی ہوتی ونڈو سیٹ پر جا بیٹھی۔

"اب میں چند سوال تم سے کرتی ہوں۔ سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ کیونکہ ایک بڑی خطرناک مہم ہمارے سامنے ہے جس میں برسوں کی جیل کے علاوہ جانیں بھی جا سکتی ہیں۔" پھر وہ چند لمحوں کے لئے چُپ ہو کر پیشانی پر انگلیاں پھیرتی رہیں۔

"بتائیے اوما دی ــــ"

"بہت جلد اس علاقے میں کمیونسٹوں کی عام گرفتاری شروع ہونے والی ہے۔ گرفتاریوں کے متعلق اور دوسرے خفیہ احکام کی خبر لگانے کے لئے ریحان الدین احمد نے لکھا ہے کہ کہ دیپالی سرکار کی مدد لی جائے۔"

"میری ــــ میری مدد ــــ؟" دیپالی ہکا بکا رہ گئی ــــ "مگر ریحان دا تو مجھے جانتے بھی نہیں۔ شاید میرے نام سے بھی واقف نہیں ہوں گے وہ ــــ اور ــــ میں کیا کر سکتی ہوں بھلا ــــ اوما ــــ"

"تم یہ سارا کام کس طرح کرو گی۔ اس کی تفصیل ریحان نے مجھے لکھ بھیجی ہے۔" اُوما نے لفافے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "پہلے یہ بتاؤ انگریزی بولنی آتی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"انگریز جب آپس میں تیز تیز بولیں تو سمجھ لو گی ــــ؟"

"جی ہاں۔ مس جنگز اور مس ہیڈلے ہم کو انگریزی پڑھاتی ہیں۔ اس لئے عادت ہو گئی ہے۔"

"گڈ۔ ہمت ہے ــــ؟"

"جی ہاں۔ کافی ہمت ہے"۔

"ابھی تم یہاں آئیں تو تم کو کس کس نے دیکھا تھا ـــــ میرے اور میری والدہ کے علاوہ"۔

"ایک کانسٹیبل اور ایک چپراسی نے ـــ"

"میرے ماما کو پہچان سکتی ہو؟"

"شاید وہی باہر ٹہل رہے تھے۔ ایک انگریز کے ساتھ ـــ"

"ہاں۔ اسپیشل آرمڈ کانسٹیبلری والا کرسٹفر ہیگ بھی ان سے ملنے آیا ہوا ہے۔ لو یہ خط پڑھو۔ بہت غور سے پڑھنا"۔

دیپالی نے اوما کے ہاتھ سے خط لیا اور پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ اوما دیبی دریچے سے باہر دیکھنے لگیں۔ باغ پر جاڑوں کی دھند چھا چکی تھی۔ دیپالی نے خط ونڈو سیٹ پر رکھ دیا۔ اور چپکی بیٹھی رہی۔ اوما نے مڑ کر اس پر نظر ڈالی۔

"مجھے خود تعجب ہے کہ ایک ناتجربہ کار اور کمسن لڑکی پر اتنی بڑی ذمہ داری ریحان نے کس طرح ڈال دی۔ ریحان کے اس خط سے ظاہر ہے کہ وہ تم کو اچھی طرح جانتا ہے اور اسے یقین ہے کہ صرف تم ہی یہ کام بآسانی کر سکتی ہو ـــ"

"مگر اوما دی ـــ ریحان دا مجھے بالکل نہیں جانتے ـــ میں نے تو آج تک ان کی شکل کیا تصویر بھی نہیں دیکھی"۔

"تم کو مجھ سے جھوٹ بولنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے"۔

"اوما دی۔ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ ریحان دا کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے"۔

اوما پھر جھلا گئیں۔ "تم مجھے سکھلاؤ گی کہ انڈر گراؤنڈ کا کام کس طرح کیا جائے ـــ؟ یا ریحان کس طرح کی ہدایات کس کو دے؟ میں ریحان کو بہت قریب سے جانتی ہوں۔ یہ بھی مت سوچ بیٹھنا کہ وہ کوئی رومینٹک ہیرو ہے۔ گو میں جانتی ہوں کہ سارے بنگال میں کالج کی لڑکیاں بہت دنوں سے اس پر زہر کھا رہی ہیں ـــ خیر ـــ تو یاد رکھو کہ وہ رومینٹک نہیں ہے۔ بے حد پریکٹیکل اور انتہائی سمجھ دار انسان ہے۔ وہ کوئی ڈرامہ نہیں کھیل رہا ہے۔ دو مرتبہ اس کے عزیز دوست اس کو شدید دھوکا دے چکے ہیں۔ اس لئے وہ بے انتہا محتاط ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود اس نے تم پر بھروسہ کیا ہے۔ سارے بنگال کی نوجوان لڑکیاں ـــ" انھوں نے سپاٹ، مضبوط آواز میں دہرایا ـــ "ریحان الدین احمد پر عاشق ہیں۔ مگر اس کو جانتی صرف میں ہوں۔ صرف میں اس کی رفیق اور دوست ہوں۔ مجھ سے زیادہ کوئی اسے نہیں جانتا۔ وہ ڈھاکہ یونی ورسٹی میں مجھ سے جونیر تھا۔ مگر لندن میں بھی ہم دونوں ایک ہی کالج میں تھے۔ اکٹھے ہم نے وہاں کی تحریک میں کام کیا ہے۔

وہ رپورٹر کی حیثیت سے اسپین بھی گیا۔ مجھے یہی افسوس مرتے دم تک رہے گا کہ میں محاذ پر نہ جا سکی۔ خیر ـــ تو اس نے لکھا ہے کہ تم سیدھی اور قابل اعتماد ہو ـــ ریحان انسان کو خوب پہچانتا ہے۔ پہلی نظر میں آدمی کو پہچان لیتا ہے۔ امید ہے کہ اس نے تم کو پہچاننے میں بھی غلطی نہ کی ہوگی ـــ"

"مگر وہ تو مجھ سے کبھی ـــ" دیپالی نے کہنا شروع کیا اور پھر ڈر کر چپ ہو گئی۔

"وہ تم کو پہچان سکتا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ تمہارا اسے پہچاننا قطعی ضروری نہیں ـــ" اوما دیبی نے بات ختم کی۔

کمرے کے ریشمی پردے آبشاروں کی طرح سرسرانے لگے۔ دفعتاً دیپالی کو بڑا بے تکا خیال اس وقت آیا۔ اوما دی کے پاس بھی بالوچر بوٹے دار ساریاں ہوں گی ـــ ایک سے ایک نایاب ـــ ذہن کیا کیا بھٹکتا ہے۔ اور میں ایک پُرخطر مہم پر جا رہی ہوں۔

"مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔" اوما کی آواز دور سے اس کے کان میں آئی۔

"کلاس کی بیک گراؤنڈ ـــ؟"

"ہاں ـــ"

"مڈل کلاس ـــ"

"اوما دیبی نے غور سے سننا شروع کیا۔ گویا ہسپتال میں کیس ہسٹری سن رہی ہوں۔

"تم نے کیا عمر بتائی تھی ـــ؟"

"انیس سال اور اب تک سکنڈ ایئر ہی میں ہوں۔" دیپالی نے تاسف سے کہا۔

"وجہ ـــ؟"

"میں بارہ سال کی تھی جب ماں مر گئیں ـــ ان کو ـــ کینسر ہو گیا تھا۔ بابا پٹنہ لے کر گئے۔ وہیں ہسپتال میں مر گئیں۔ میں سب سے بڑی تھی۔ تینوں بھائی چھوٹے ہیں۔ اُن کی دیکھ بھال کے لئے میں نے اسکول چھوڑ دیا۔"

"ہاں ـــ ہاں کہے جاؤ ـــ" اُوما دیبی کُشنوں پر کہنیاں رکھ کر غور سے سنتی رہیں۔

"بابا ماں پر عاشق تھے۔ ان کے مرنے کے بعد بجھ کر رہ گئے۔"

"پوئر مین۔"

یک لخت دیپالی نے اوما پر نظر ڈالی۔ اور اسے خیال آیا۔ بابا کی بقیہ عمر بھی اسی طرح تنہا اور اداس گذر جائے گی۔ کاش انھیں اُوما دی جیسی سمجھ دار اور دردمند عورت کی رفاقت میسّر ہو سکتی۔ پھر اس نے بے ساختہ بڑے فخر اور پیار سے کہا۔ "میرے بابا بہت خوبصورت ہیں۔ دکھوں نے انھیں وقت سے بہت پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ مگر اب بھی بہت اچھے لگتے ہیں ـــ اور میرے

کاکا ــــ میرے کاکا تو بابا سے بھی زیادہ ــــ" پھر اس کی آواز رندھ گئی۔

"اتنی جذباتیت سے کام نہیں چلے گا۔ دیپالی سرکار ــــ" اوما رائے نے درشتی سے کہا "تمھارے کاکا کو کیا ہوا ــــ؟"

"پھانسی ــــ" دیپالی نے مضبوطی سے جواب دیا۔

"اوہ ــــ آئی ایم سوری ــــ" اوما دیبی نے آہستہ سے کہا۔

"کیا نام تھا تمھارے چچا کا ــــ؟"

"دنیش چندر سرکار ــــ"

"گڈ گاڈ" ــــ اوما دیبی سنبھل کر بیٹھ گئیں "تم ــــ تم دنیش چندر سرکار کی بھتیجی ہو؟"

"جی ہاں۔ وہ بابا کے اکلوتے چھوٹے بھائی تھے۔ جب ۳۱ء میں ماں ریڈیم ہسپتال میں تھیں تب کاکا کو دہشت پسندوں کے اس مشہور کیس میں پکڑ لیا گیا ــــ بابا نے ــــ بابا نے پٹنے سے غفار گاؤں جا کر ساری آبائی کھیتی باڑی بیچ کھونچ پٹنے کا ایک بڑا بیرسٹر کھڑا کیا (اسے یاد آیا بابا کہتے تھے کہ وہ شری پری توش کمار رائے کو کھڑا کرنا چاہتے تھے مگر ان کی فیس زیادہ تھی) مقدمہ چلتا رہا۔ مگر وہ بیرسٹر کاکا کو بچا نہ سکا۔ اور ان کو پھانسی ہو گئی۔ جس سال ماں مری ہیں، اس کے چھ مہینے بعد ہی کاکا کو پھانسی ہو گئی۔"

"تم کو یاد ہیں ــــ؟"

"خوب اچھی طرح یاد ہیں۔ چھ سال پہلے ہی کی تو بات ہے۔" دیپالی کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ کمرے کا کلاک ٹک ٹک کرتا رہا۔ چند لمحوں بعد دیپالی نے کہا۔ "اوما دی بعض دفعہ صبح منہ اندھیرے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ جب ابھی پوری طرح اجالا نہیں پھیلتا۔ اور پلنگ پر پڑے پڑے کھڑکی سے باہر اندھیرے آسمان کو دیکھ کر سوچتی رہتی ہوں، بالکل ایسے ہی وقت میں، پو پھٹنے کے وقت میں، کاکا انقلاب اور ہندوستان کی آزادی کے نعرے لگاتے تختے پر چڑھ گئے تھے ــــ اور میں خوب روتی ہوں اور سوچتی ہوں کاکا اور ان کے ہزاروں ساتھیوں کا خون رائیگاں نہ ہونے دوں گی ــــ" وہ خاموش ہو گئی۔

سوئس کاٹج کی شکل کا کلاک ٹک ٹک کرتا رہا۔ اب رات کے پونے دس بج رہے تھے۔ دیپالی نے وقت پر نظر ڈالی اور جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ "کاکا کی شہادت کے بعد بابا کا دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ اگر ہم بچوں کا بکھیڑا نہ ہوتا تو وہ شاید سنیاس لے لیتے۔ مگر وہ مذہبی بھی نہیں ہیں۔ وہ کانگریس میں شامل تھے اور جیل بھی کاٹ چکے تھے، مگر لاڈلے بھائی کی موت کے بعد سے ان کو ایک عجیب طرح کا ری ایکشن ہو گیا ــــ"

"سیاست سے نفرت ہو گئی ؟"

"تقریباً ـــ اب وہ دن بھر چپ چاپ کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ غریبوں کا مفت علاج کرتے پھرتے ہیں۔ پریکٹس چلتی نہیں۔ بس اتنا کما لیتے ہیں کہ گھر چل جائے۔"

"تم ابھی کھیتی باڑی کی کیا بات کر رہی تھیں ؟"

"غفار گاؤں کے نزدیک ہمارے یہاں مغلوں کی دی ہوئی زمینداری تھی۔ وہ بابا کے پرکھوں نے ناچ گانے اور شراب پینے میں اڑا دی۔ اس غصے میں کہ نو دولتے بنیوں کے آگے نہیں جھکیں گے۔"

"فیوڈل ڈکیڈنس جو انیسویں صدی کے برطانوی بورژوا نظام سے ٹکرا کر ہار گیا۔" اومارائے نے سر ہلا کر کہا۔ دیپالی نے ذرا آنکھیں پھیلا کر انھیں دیکھا۔

"اب تمھارے کنبے میں کون کون باقی ہے ؟"

"تھوڑے سے رشتہ دار ہیں۔ وہ غفار گاؤں میں چھوٹی موٹی سرکاری ملازمتیں کرتے ہیں بابا کے ایک چچازاد بھائی ہیں۔ وہ بھی ڈاکٹر ہیں۔ چند سال ہوئے وہ ٹری نیڈاڈ ہجرت کر گئے۔ وہاں ہزاروں کما رہے ہیں۔ بس اور کوئی نہیں۔ ٹھاکر ماں کا پچھلے سال انتقال ہو گیا۔ میری ماں کا میکہ سراج گنج میں ہے۔ وہ بھی ملازمت پیشہ لوگ ہیں ـــ اور کیا بتاؤں ـــ ہاں۔ یہ "چندر گنج" ہماری کوٹھی کنبے کی خوشحالی کے زمانے میں ٹھاکر دا نے بنوائی تھی۔ ٹھاکر دا کی زندگی ہی میں بابا اور کاکا قومی تحریک میں شامل ہو کر جیل یاترا کے لئے چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے یہاں ایسی غربت چھائی کہ بعض دفعہ رات کو مٹی کا تیل خریدنے کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔ صرف اسی امید نے ہم سب کو زندہ رکھا کہ انگریز سے چھٹکارا ملنے کے بعد دیس کے ان سارے اندھیرے گھروں میں اجالا ہو جائے گا۔"

"ایسا ضرور ہوگا ـــ دیپالی ـــ ایسا ضرور ہوگا ـــ" اور اُومارائے نے آہستہ سے کہا ـــ "تم مایوسی کا شکار کبھی نہ ہونا ـــ"

"میں مایوس بالکل نہیں ہوں اومادی ـــ" دیپالی نے دفعتہً ہنس کر کہا۔

"تم نے دوبارہ پڑھائی کیسے شروع کی ؟"

"بابا کی ایک ہی سگی بہن ہیں۔ عمر میں ان سے بہت بڑی۔ چار سال ہوئے وہ بیوہ ہو گئیں۔ اُن کے شوہر فرید پور میں وکالت کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد پشی ماں ہمارے یہاں آ گئیں۔ وہ لاولد ہیں۔ انھوں نے آن کر گھر سنبھال لیا۔ تو میں نے ہائی اسکول پاس کیا۔ اور کالج میں داخل ہو گئی۔ ساتھ ہی عباس الدین احمد کے ہاں جا کر سنگیت بھی سیکھتی رہی۔ میں بابا کی مدد کے لئے ڈاکٹری پڑھنا

---

[1] دادی [2] دادا

چاہتی تھی۔ لیکن بابا جانتے ہیں کہ ڈاکٹری کی تعلیم میں میرا جی بالکل نہیں لگے گا، اس لئے انھوں نے سائنس نہیں لینے دیا۔ اب اس جولائی میں وہ مجھے شانتی نکیتن بھیج رہے ہیں ـــــ ان کے دوست پروفیسر مرتضیٰ حسین کا بھی سخت اصرار ہے کہ میں شانتی نکیتن چلی جاؤں ـــــ" دیپالی نے پھر کلاک پر نظر ڈالی۔

"تحریک میں کس طرح شامل ہوئیں؟" اومارائے کے سوالات ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔

دیپالی پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"پھر وہ اسکول گرل گگلز ـــــ" اومارائے نے غصے سے کہا۔

دیپالی نے گلے پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی۔ "اس کا قصہ بہت دلچسپ ہے اومادی۔ ایک روز ایک روز شام کے وقت ـــ"

دفعتاً اومارائے نے اس کی بات کاٹی۔ "تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے کاکا اگر زندہ رہ جاتے تو ہندوستان کے بہت بڑے مورخ بنتے؟"

"جی ہاں ـــــ میں نے ان کی کتاب کئی بار پڑھی ہے۔ مگر سمجھ میں نہیں آتی۔ بابا کہتے ہیں ابھی میرے سمجھنے کے لئے وہ موضوع ہی بہت ٹھوس ہے ـــــ بنگال کی اقتصادی تاریخ۔"

"تم تحریک میں کس طرح شامل ہوگئیں؟" اومادیبی نے سوال دہرایا۔

"پچھلے سال میں ایک روز شام کو برآمدے میں اکتائی ہوئی کھڑی اپنے بھائیوں کا انتظار کر رہی تھی، جو رات کے کھانے سے ذرا قبل فٹ بال کھیل کر لوٹتے ہیں۔ پشی ماں رسوئی میں تھیں اور بابا مطب بند کر کے نہانے کے لئے غسل خانے میں جا چکے تھے۔ اتنے میں برآمدے میں سے کیا دیکھتی ہوں کہ ایک مسلمان فقیر پھاٹک پر کھڑا ہے۔ ایک تارہ لئے۔ مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس نے جھن سے ایک تارہ چھیڑا اور بڑی دلدوز آواز میں باؤل گانا شروع کر دیا۔ پشی ماں فقیروں اور سنیاسیوں کو بڑی عقیدت سے دیتی دلاتی رہتی ہیں، اس لئے میں نے اُسے آواز دی کہ پچھواڑے آنگن کی ڈیوڑھی پر چلا جائے۔ مگر میری بات سن کر وہ جھپاک سے برآمدے میں آگیا اور کہنے لگا کہ ڈاکٹر سرکار سے ملنا چاہتا ہے۔ میں ابھی کوئی جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ اس کی نظر اندر بیٹھک خانے میں لگی کاکا کی بڑی تصویر پر پڑ گئی۔ اور اس نے جلدی سے کہا کہ اسے اس تصویر کی مدتوں سے تلاش تھی۔ اور میری گھبراہٹ اور احتجاج کی مطلق پروا کئے بغیر جھٹ سے کمرے میں گھس گیا۔ اور دیوار کے پاس جا کر بڑی محویت سے پورٹریٹ کو دیکھنے لگا۔ میں ہڑبڑا کر اندر گئی تو اس نے پوچھا اس تصویر کی ایک کاپی مل سکتی ہے؟ اور پھر اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنے جھولے میں سے کچھ کاغذ نکالے اور چاروں طرف دیکھ کر بولا۔

"تم کون ہو؟ دینیش بابو کی لڑکی ہو۔

"میں ان کی بھتیجی ہوں، ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔ تو کہنے لگا ـــــ اچھا اپنے بابا کو بلاؤ۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں ایک دم بہت ڈر گئی۔ اور پچھلے برآمدے میں جاکر بابا کو آواز دی ـــــ بابا جلدی آئیے، ایک عجیب سا فقیر آکر بیٹھک خانے میں بیٹھ گیا ہے۔ جلدی آئیے ـــــ بابا تولیہ کندھے پر ڈالے جلدی سے باہر نکلے اور کمرے میں گئے تو وہ فقیر فوراً کھڑا ہو گیا۔ اور چپکے چپکے ان سے باتیں کرنے لگا۔ بابا اسے دیکھتے رہے پھر اداسی سے مسکرا دیئے۔ میں دروازے میں سے جھانک رہی تھی۔ انھوں نے مجھے آواز دی کہ چائے بناؤں۔ میں چائے بنا کر لے گئی۔ اب وہ اور بابا پرانے دوستوں کی طرح صوفے پر بیٹھے باتوں میں منہمک تھے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اس نے اپنا نام نورالرحمٰن میاں بتلایا۔ اور کہنے لگا کہ باریسال میں اس کا تکیہ ہے۔ جب میں اس کا مطلب نہ سمجھی تو ہنس پڑا۔ اور کہنے لگا کہ وہ ایک بنگالی دیکلی کا ایڈیٹر ہے۔ اور کاکا کے متعلق ایک خاص نمبر نکال رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے آیا ہے ـــــ کاکا کے نجی حالات، ان کے پرانے مسودے، جیل سے لکھے ہوئے خط۔ پرانی تصویریں، یہی سب۔ مجھے اس کی جھاڑ جھنکار داڑھی پر بڑی ہنسی آئی۔ کہ ایڈیٹر لوگ تو باؤل فقیروں کا حلیہ بنا کر ایک تارہ نہیں بجاتے پھرتے۔"

"پھر کیا ہوا ـــــ؟" اوما نے جواب بڑے غور سے یہ داستان سن رہی تھیں، سوال کیا۔

"تو بابا نے اس سے کہا کہ وہ ساری چیزیں بکسوں میں سے تلاش کر کے اس کے لئے نکال رکھیں گے اور اسے دو دن بعد آنے کے لئے کہا۔ اتنے میں میرے تینوں بھائی آگئے اور ایک عجیب سے مہمان کو اندر بیٹھا دیکھ کر کھڑکی میں سے جھانکنے لگے۔ تو فقیر نے یعنی نورالرحمٰن میاں نے مجھ سے کہا کہ میں دروازے بند کر کے کھڑکیوں کے پردے گرا دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اور بچوں کو بھگانے کے لئے باہر گئی۔ اتنی دیر میں نورالرحمٰن میاں ـــــ یعنی باؤل فقیر بھی ایک تارہ بجاتا باہر آکر جھپاک سے پھاٹک پر پہنچ گیا۔ ہمارے برآمدے اور پھاٹک کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے ـــــ دو دن بعد وہ کاغذات اور تصویریں لینے کے لئے اسی وقت اندھیرا پڑے آیا۔ بابا کو کسی مریض کو دیکھنے کے لئے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ اور وہ ساری چیزیں میرے حوالے کر گئے تھے۔ فقیر پھر بڑی بے تکلفی سے بیٹھک خانے میں آگیا۔ اور میں نے جلدی سے دروازے بند کر کے کھڑکیوں کے پردے گرا دیئے۔ صوفے پر بیٹھ کر وہ مجھے اس طرح دیکھتا رہا گویا بہت محظوظ ہو رہا ہو۔" اتنا قصہ سنا کر دیپالی پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اس قدر ہنستی کیوں ہو؟" اُوما نے ناگواری سے کہا۔ وہ بھول چکی تھیں کہ اس عمر میں بات بے بات ہنسی کے فوارے چھوٹتے ہیں۔

"سوری اُوما دی ـــــ"

"تم نے اتنے دکھ اٹھائے ہیں پھر بھی اتنی مسرور اور بشاش ہو۔" اُوما رائے کے لہجے میں رشک کی تلخی کے علاوہ بڑی عجیب سی آزردگی تھی جو دیپالی نے محسوس نہیں کی۔ وہ اپنی بشاشت پر نادم نظر آنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔

"پھر کیا ہوا ــــ" اُوما نے سختی سے پوچھا۔

"بس پھر میں نے بابا کا دیا ہوا بڑا فائیل اس کے حوالے کر دیا۔ اور وہ کہنے لگا کہ مجھے جو کچھ کاکا کے بارے میں یاد ہو اسے بتاؤں۔ میں نے کاکا کا ذکر کیا تو ایک دم رونے لگی۔ وہ بہت گھبرا گیا۔ خیر پھر اس نے جلدی جلدی نوٹ لئے۔ اور اپنے رسالے میں میری دلچسپی دیکھ کر اس نے کہا کہ اگلے مہینے سے پرانا پلٹن کے فلاں مکان میں ایک اسٹڈی سرکل قایم ہو رہا ہے میں اس میں ضرور جایا کروں۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے ایک باؤل گیت سکھا دے۔ کیونکہ میں نے عباس دا سے بہت سے باؤل گیت سیکھے ہیں۔ مگر یہ والا باؤل جو وہ گا رہا تھا میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ اس نے کہا آج تو دیر ہو جائے گی۔ اگر میں اجازت دوں تو وہ کل شام کو اسی وقت آسکتا ہے۔ میں بے حد خوش ہوئی۔"

"چنانچہ وہ تیسرے روز بھی آیا۔" اُوما دیبی نے آنکھیں بند کر کے سپاٹ آواز میں کہا۔

"جی ہاں اُوما دی۔ اور میں نے حسب معمول جلدی جلدی دروازے بند کئے اور پردے گرا دیئے۔ مجھے بڑی ہنسی آرہی تھی۔ اس نے مجھے باؤل گیت سکھایا۔ اور مجھ سے بھی دو تین گانے سنے۔ اور کہنے لگا کہ وہ ریڈیو پر ہمیشہ جب موقعہ ملتا ہے تو میرے گانے ضرور سنتا ہے۔ بہت ہی سُوئیٹ فقیر تھا اُوما دی۔ میرا مطلب ہے ــــ فقیر نہیں ــــ نورالرحمٰن میاں ــــ"

"ہُوں ــــ"

"بابا اتفاق سے اس روز بھی باہر گئے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کے مریض کی حالت خطرناک ہو چکی تھی۔ خیر جب وہ واپس آئے تو میں نے ان کو بتایا۔ وہ اچانک ایک دم اُداس ہو گئے اور کہنے لگے ــــ دیپالی ــــ اپنے عزیز از جان بھائی کا بلیدان دے چکا ہوں۔ اب تم تو اس خطرناک راستے پر نہیں چلو گی؟ میں نے دل میں کہا۔ ماں[1] مجھے معاف کر دینا۔ میں بابا سے جھوٹ بول رہی ہوں۔ اور میں نے بڑی صفائی سے جواب دیا کہ میں اس راستے پر ہرگز نہیں چلوں گی۔ وہ مطمئن ہو گئے۔

"اس کے بعد نورالرحمٰن میاں ایک مرتبہ اور آئے تھے۔ رات کے وقت۔ یہ بتانے کے لئے وہ کہیں اور جا رہے ہیں۔ انھوں نے جاتے جاتے مجھے ایک مرشدی گان اور ایک ودیا پتی کا گیت بھی سکھا دیا۔ جو میتھلی میں ہے۔

"دیدی میں اگلے مہینے بابا کے ساتھ کلکتے جاؤں گی اپنے گانے ریکارڈ کرنے۔ وہاں وہ مرشدی

---

[1] کالی

گان اور ودیا پتی کا گیت بھی ریکارڈ کرواؤں گی۔ آپ کو سناتی مگر اب بہت دیر ہو جائے گی ـــــ او ـــــ ماں ـــــ دس بج گئے ـــــ؟"

"بہت خوب ـــــ" اُوما دیبی نے کچھ اور سوچتے ہوئے بے دھیانی سے جواب دیا۔

"مگر وہ رسالہ تو شایع ہوا نہیں اور نورالرحمٰن میاں بھی غائب ہو گئے۔ اس کے بعد میں پرانا پلٹن اسٹڈی سرکل میں جانے لگی۔ وہاں نورالرحمٰن میاں کبھی نظر نہیں آئے۔ مگر دوسرے ساتھیوں سے ملاقات ہوئی۔ میں بابا سے کہہ کر جاتی تھی کہ روزی کے گھر جا رہی ہوں اور میں اور روزی سیدھے پہنچتے تھے پارٹی آفس۔ جب سے میں، ہمدرد کی حیثیت سے تحریک میں ہوں۔ اور تھوڑا بہت کام جو مجھ سے بن پڑتا ہے۔ کرتی رہتی ہوں۔

"پچھلے مہینے سریندر دا نے تشویش ناک خبر دی کہ اس غیر قانونی رسالے اور اس کے پریس پر چھاپہ مار کر پولس نے سارے اسٹاک پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور ریحان دا اور ان کے ساتھی راتوں رات اپنے خفیہ مستقر سے فرار ہونا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے انھیں فوری دو ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ روپیہ فوراً فراہم کیا گیا۔ اس میں پانچ سو کی کمی پڑ رہی تھی ـــــ تو میں نے ـــــ میں نے اپنی ماں کی چھوڑی ہوئی بالوچر بوٹے دار ساریاں بکوا دیں۔ اب ریحان دا نے جانے کون سے گاؤں میں جا کر نیا ہینڈ پریس لگا لیا ہے اور کسانوں کی تنظیم کے لئے پرچے اور پمفلٹ چھاپ رہے ہیں۔ اب جا کر وہ کا کا والا نمبر بھی شایع ہو جائے گا۔ مگر دیدی مجھے تعجب تو یہی ہے کہ ریحان دا مجھ سے آج تک نہیں ملے۔ انھوں نے آپ کو یہ کیسے لکھا ہے کہ مجھ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور اتنا ذمہ داری کا کام آج میرے اوپر ڈال دیا۔ کمال ہے۔"

اُوما نے بے حد اکتاہٹ کے ساتھ ونڈو سیٹ پر نیم دراز ہو کر کروٹ بدلی۔ اور چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد بیزاری سے کہا۔

"دیپالی سرکار۔ تم ایک برس سے انڈر گراؤنڈ کے لئے کام کر رہی ہو اور تم کو یہ تک پتہ نہیں کہ انڈر گراؤنڈ کے لیڈر طرح طرح کے بھیس بدلتے رہتے ہیں ـــــ وہ مسلمان بزرگ جنھوں نے تم سے خلوص بڑھایا۔" اُوما کی آواز پر اب شدید تکان غالب تھی ـــــ "ریحان الدین احمد تھے ـــــ"

"او ـــــ ماں ـــــ" دیپالی گم سم رہ گئی۔ چند لمحوں تک بالکل حواس باختہ رہنے کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن انھوں نے تو اپنا نام نورالرحمٰن بتلایا تھا ـــــ"

"اکثر کامریڈ، موقع پڑنے پر باری باری ایک فرضی نورالرحمٰن میاں، بنتے رہتے ہیں۔"

"او ماں ـــــ" دیپالی مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ اسے لگا، جیسے اس کی زبان گنگ ہو گئی ہو۔ اُوما نے کروٹ بدلی۔ بڑے دھیان سے اس کی صورت دیکھی اور خستگی سے انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اور دفعتاً کاروباری اور کرخت آواز میں پوچھا۔ "تم نے اپنی اس ہمراز سہیلی کا کیا نام بتایا جو تمھارے ساتھ تحریک میں شامل ہو گئی ہے؟"

"روزی بنرجی۔"

"قابل اعتماد ہے؟"

"بے حد قابل اعتماد ــــ ریحان دا ــــ اس کے متعلق جانتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انھوں نے یہ اسکیم بنا کر آپ کو بھیجی ہے۔"

"ہوں ــــ اچھا آئینے کے سامنے جاؤ۔"

دیپالی نے تعمیل حکم کی۔

اُدما رائے نے سر نہوڑا کر اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔

"اب اپنے میمن سنگھ کے دیہاتی لہجے میں بولو تو ــــ میں شام کو تمھیں سب سمجھا چکی ہوں ریحان نے لکھا ہے کہ تم بہت بڑھیا ایکٹریس ہو۔ یہ مہم کامیابی سے سر کر لوگی۔"

وہ چپ رہی۔ کوئی تعجب نہیں کہ "باؤل فقیر" نے کسی اور بھیس میں جا کر اس کے کالج کے ڈرامے بھی دیکھ لئے ہوں۔ آئینے میں اس نے دیکھا کہ اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا ہے۔

"کیا نام ہے ــــ؟" اُدما رائے نے اسٹیج ڈائرکٹر کی طرح ڈپٹ کر دریافت کیا۔

"جی ــــ جی ــــ ہم ــــ؟ ہم کلثوم بی بی۔"

"کہاں سے آئی ہو ــــ؟"

"جی ــــ میمن سنگھ ضلع سے ــــ"

"سرٹیفکٹ ہیں؟"

"جی نہیں ــــ ہمارے خالو نواب صاحب بوگرہ کے خانساماں ہیں۔ انھوں نے بھیجا ہے۔"

"شاباش ــــ! مگر نواب صاحب بوگرہ نہ کہہ دینا ــــ آفت آجائے گی۔" اُدما رائے نے دفعتاً ہنس کر کہا۔

"سوری ــــ کچھ اور سوچ لوں گی۔ آگے پوچھئے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ ریحان ــــ نے غلط نہیں کہا ــــ ہاں ــــ اور برقعہ ــــ؟"

"کل حاصل کر لوں گی ــــ عبدالقادر کی بی بی سے ــــ"

"عبدالقادر کون ہے؟"

"گاڑی والا ــــ ہمارا کوچوان نہیں۔ ہماری گاڑی تو کب کی ٹوٹ پھوٹ کے برابر ہوئی۔ بابا نے اسے ہمارا شاگرد پیشہ دے رکھا ہے۔ مجھے کہیں جانا ہو تو بڑے خیال سے لاتا لے جاتا ہے۔"

"جولی گڈ ــــ فائن ــــ اوہو ــــ بہت رات ہوگئی۔ بابا سے کیا کہہ کر آئی تھیں؟"

"بابا روزی اور جہاں آرا کے گھر سے میرے دیر سے لوٹنے پر کچھ نہیں کہتے۔ اور ہمیشہ وہاں کا ملازم مجھے گھر پہنچا آتا ہے۔ ڈھاکے میں میری یہی دو عزیز سہیلیاں ہیں۔ اُوما دی ــــ میں ان کے علاوہ اور کسی کے گھر نہیں جاتی۔"

"رائٹ ــــ" اوما نے برقی گھنٹی کا سوئچ دبایا۔ "یہ بھی اچھا ہوا کہ یہاں سب لوگ اس وقت کلب گئے ہوئے ہیں۔" سیزر نے بند دروازے پر دستک دی۔ اُوما دی نے آگے بڑھ کر چٹخنی کھولی اور جھک کر سیزر سے باتیں کرنے لگیں۔ بیرہ آیا۔ "ڈرائیور سے کہو ــــ ٹھہرو ــــ کون سی موٹر ہے؟"

"میم صاحب کی۔"

"اچھا۔ گوپال سے کہو برساتی میں لگا دے۔ جلدی ــــ ایک دم ــــ" سلوے کی تصویر پر غیر ارادی طور سے ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر دیپالی۔ اوما کے ساتھ مورننگ روم سے باہر آئی۔ ہال کے دروازے پر پہنچ کر اوما رائے نے کہا۔ "موٹر اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر رکوانا۔" پھر انھوں نے دیپالی کی پیٹھ تھپک کر کامیابی کی اُمید ظاہر کی اور سر جھکائے گیلری میں چلی گئیں۔

دیپالی برآمدے میں نکلی۔ اور برساتی میں اتر کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ موٹر ایک جھونک کے ساتھ طویل ڈرائیو کا چکر کاٹ کر پھاٹک پر پہنچی۔ اب اس لمحے سے میں اپنی نئی ذمے داری کی معیت میں بالکل تنہا ہوں۔ اس نے سوچا۔ موٹر تیزی سے رمنا کی چوڑی، سنسان سڑک پر آئی۔ روشن وُوڈ لینڈز اچانک اندھیرے میں ڈوب گیا۔

دیپالی نے آگے جھک کر ڈرائیور سے کہا۔ "ذرا مشن کمپاؤنڈ کی طرف سے ہوتے چلو۔"

## ۶

# ریورنڈ پال میتھیو بنرجی

مشن کمپاؤنڈ کے دیسی گرجا گھر کے اندر کرسمس کی تیاریوں کے سلسلے میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ بڑے دن میں صرف چار روز رہ گئے تھے۔ کمپاؤنڈ میں سخت گہما گہمی اور رونق تھی کرسمس ویک کے دوران دیسی مشنریوں کی سالانہ کانفرنس منعقد ہونے والی تھی۔ جس میں شرکت کے لئے الہ آباد، سیتاپور

آگرہ، شاہ جہاں پور، لدھیانہ، انبالہ، لاہور اور دوسرے بڑے بڑے مشنری مراکز کے نمائندہ مبلغین ڈھاکے آن پہنچے تھے اور کیمپاؤنڈ میں لگے خیموں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس وقت گرجاگھر میں نمائندوں کی ٹولیاں اپنے اپنے کرسمس کیرلز کی مشق میں جُٹی تھیں۔ ڈھاکے مشن کمپاؤنڈ کے انچارج ریورنڈ پال میتھیو منوموہن بنرجی گرجاگھر کے اندر اپنے دفتر میں بیٹھے دوات میں نب ڈبو ڈبو کر کرسمس کا وعظ لکھنے میں مصروف تھے۔ گرجا کے عقب میں ان کا مکان جو "لِلی کاٹج" کہلاتا تھا۔ غباروں، کاغذی ربنوں اور مصنوعی ستاروں سے سجایا جا رہا تھا۔ مسز بنرجی کچن میں فرش پر بیٹھی کرسمس کیک اور کرسمس پڈنگ کے لئے خشک میوہ صاف کرنے میں منہمک تھیں۔ باہر باغ میں باشا کے سائبان کے نیچے کمپاؤنڈ کی عورتیں اور لڑکے بالے سب مل کر مُنّا سا اصطبل تیار کرنے میں لگے تھے۔ ولادتِ مسیح کے ٹیبلو کے لئے حضرت مریم، سینٹ جوزف، چرواہوں اور بیل گاڑیوں کی مُنّی مُنّی مورتیاں سنواری جا رہی تھیں۔ ربڑ کا بوا یسوع مسیح بڑی احتیاط سے بھوسے کے ننھے سے ڈھیر پر رکھ دیا گیا تھا۔

اچانک گرجا کے ہال میں لُدھیانہ مشن کی ٹولی نے اونچی باریک آواز میں ایک پنجابی حمد شروع کر دی۔ رب خداوند بادشاہ اے ــــ او جلال دا بادشاہ اے۔ اے خداوند ــــ اپنی راہ اپنے بندے ــــ نُوں دکھا ــــ آ ــــ آ

پادری بنرجی نے اپنے دفتر میں وعظ لکھتے لکھتے قلم ایک طرف رکھ دیا اور عینک ماتھے پر چڑھا کر چھت کو دیکھنے لگے۔ الماریوں میں مشن کے رجسٹر اور موٹی موٹی کتابیں رکھی تھیں۔ سامنے دیوار پر ایک بڑی سی سیاہ صلیب آویزاں تھی۔ میز پر پھولوں سے بھرا گلدان رکھا تھا۔ باہر سے گانے، ہارمونیم اور بچوں کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بڑا پرسکون اور سہانا وقت تھا۔ خدا کے خوف سے ہر وقت ڈرنے والے، نیک دل پادری بنرجی نے آنکھیں بند کیں اور زندگی کی نعمتوں کے لئے خدا باپ کا شکر ادا کیا۔ پھر انھوں نے اٹھ کر الماری میں سے ایک رجسٹر نکالا اور وعظ کے کاغذات ایک طرف رکھ کر مشنری کانفرنس میں پیش کرنے کے لئے رپورٹ مکمل کرنے کا ارادہ کیا۔ پچھلے چند برسوں میں بپتسمہ لینے والوں کی تعداد میں کمی آتی جا رہی تھی۔ بہت عرصے سے قحط نہیں پڑا تھا۔ اور ہندو تجدیدیت اور مسلم تجدیدیت نے الگ اودھم مچا رکھی تھی۔ مسلمان تو خیر یوں بھی شاذ و نادر ہی عیسائی ہوتے تھے۔ یہ بھی بڑی ہٹیلی اور خود پسند قوم تھی۔

پچھلی صدی میں سیرام پور مشن نے کلکتے میں بڑا عہد آفریں کام کیا تھا۔ وہ جفاکشی، دُھن کے پکّے عظیم مشنریوں کا دور تھا۔ بشپ ریجنالڈ ہیبر۔ ولیم ٹیٹس۔ کیری اور مارش مین۔ ان لوگوں نے اس دیس کی کتنی خدمت کی۔ پریس کھولے۔ کتابیں چھاپیں۔ تعلیم پھیلائی۔

جواں مرگ بشپ ہیبر، پادری بنرجی کا محبوب کردار تھا۔ وہ انگلستان سے آیا ہوا روحوں کا جیالا رکھوالا، جو اسی سنہرے بنگال کی دھرتی پر گھوما تھا۔ رجسٹر کے ورق گردانی کرتے ہوئے پادری بنرجی کو دفعتاً خیال آیا کہ وہ کرسمس کے وعظ میں بشپ ہیبر کی مختصر لیکن درخشندہ زندگی کی مثال پیش کریں۔ انھوں نے بنگلہ میں تحریر شدہ اپنے وعظ کے کاغذات اپنی طرف سرکا کر دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ "وہ مبارک زمانہ، جب آج سے سوا سو سال قبل، مادر کلیسا کا لاڈلا سپوت، بہ نفس نفیس ڈھاکے آیا تھا۔ وہ جواں سال، خوبصورت، پادری شاعر پدما کے کنارے ٹہل کر، میرے بچو تمھاری روحانی نجات کی دعائیں مانگتا تھا۔ اور تمھارے غم میں گھلتا تھا ــــ"

پادری بنرجی نے اٹھ کر ایک اونچی الماری میں سے "ہیروز آف آور انڈین ایمپائر" نکالی۔ بشپ ہیبر کا باب کھولا۔ اور اس شاعر پادری کی تحریر کا ایک اقتباس پڑھنے لگے ــــ "دریا کے کنارے سے بندھی میری ناؤ ــــ رات میں مہکنے والے پھول ــــ تاڑ کے پتوں کی مدھم سرسراہٹ۔ کویل کی پکار۔ بانس کے تاریک جنگلوں میں جگمگاتے جگنو ــــ عظیم دریا کی سطح پر منعکس استوائی چاند ــــ اور میں نے محسوس کیا کہ اس دیس میں موجود ہونا بہت خوب ہے"۔

پادری بنرجی نے ورق اُلٹا ــــ اور ان کی بشپ ہیبر کی ایک نظم پر پڑی۔ "اپنی بیوی سے"۔

اگر تم میرے ساتھ ہو
تو سرسبز بنگال کے آنند کانن میں
شام کا اندھیرا بڑی تیزی سے چھا جائے

پادری بنرجی نے کتاب ایک طرف سرکا دی اور بھوؤں پر انگلیاں رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ بشپ ہیبر کو بھول کر وہ یکایک دور شمال کے رنگ پور ضلع میں اپنے دور افتادہ گاؤں پہنچ گئے تھے۔ جہاں بانس کے جھنڈ میں چھپے کالی کے مندر کے پیچھے کوئلیں چلا رہی تھیں۔ اور ان کی پڑوسن اور محبوبہ شونا اُن کے ماں کے ساتھ پوجا کے لئے مندر آتی تھی۔ اور وہ سامنے دریا پر اپنے نوکے میں چھپے اس کے منتظر رہتے تھے۔

وہ وقت اور یہ آج کی رات ــــ یہ مطمئن بڑھاپا ــــ یہ محفوظ خانۂ خدا ــــ سکون قلب ــــ انھوں نے پرانے خواب جھٹک کر اپنی ماں کو یاد کیا۔ نجات جس کی قسمت میں نہ تھی ــــ ماں ــــ تو تو بت پرستی کی گمراہی میں مبتلا ہی دوسری دنیا چلی گئی۔ اب تیری روح اس اندھیرے میں۔ اس اندھیرے میں جانے کہاں ہوگی۔ یہ سب کیا ہے؟

اسرارِ الٰہی۔

پادری بنرجی پھر کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ مگر سرمن کے الفاظ اور سالانہ رپورٹ کے

علاوہ شمار میں ان کا دل نہ لگا ـــــ روحوں کے اعداد و شمار۔ نجات یافتہ روحیں۔ گمشدہ روحیں انھوں نے رجسٹر زور سے بند کیا۔ اور قریب کی الماری میں سے ایک اور پرانی کتاب اپنی طرف کھینچی۔ "انگلستان میں راجہ رام موہن رائے کے آخری ایام۔ از میری کارپینٹر" انھوں نے بے دھیانی سے ورق گردانی کرتے ہوئے ضمیمے کے آخری صفحات کھولے۔

"چار قابلِ قدر نیٹو کرسچین"۔

۱۔ سُرجو کمار چکر برتی۔ اونچی ذات کا برہمن۔ خود اپنی درخواست پر لندن میں بپتسمہ حاصل کیا۔ لندن یونی ورسٹی سے ڈگری لینے کے بعد کلکتہ میڈیکل کالج سے وابستہ ہوا۔ ۱۸۵۵ء میں لندن واپس گیا۔ وہ پہلا نیٹو تھا جو کمپنی کی نئی کووینٹڈ میڈیکل سروس میں شامل کیا گیا۔ ۲۔ بھولو ناتھ داس۔ معرکۂ ستلج کے موقع پر کمپنی کی افواج کا اسسٹنٹ سرجن تھا۔ بعد میں ڈھاکہ کا سول سرجن بنا۔ ۳۔ دوارکا ناتھ بوس۔ کلکتہ میں ڈاکٹر تھا۔ ۴۔ گوپال چندر سیل ـــــ"

آخری نام پر پہنچ کر پادری بنرجی ٹھٹھک گئے۔ اور گذشتہ صدی میں مس کارپینٹر کی لکھی ہوئی کتاب (جس میں مصنفہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ رام موہن بابو دراصل عیسائی ہو گئے تھے) آہستہ سے بند کر دی۔

یہ محض اتفاق تھا یا اسی کو ہندو کرم اور سنسکار کہتے ہیں۔ اور مسلمان نوشتہ تقدیر۔ لیکن ہم عیسائی اُس حسنِ اتفاق کو گریس آف گوڈ کہیں گے۔

لیکن ـــــ زندگی کا دھارا اچانک، ایک دم کس طرح اپنا رخ بدل لیتا ہے۔ ایک انسان کے کسی ایک مخصوص سمت قدم اٹھانے سے اُس کی ساری آنے والی نسلوں کا مستقبل مختلف ہو جاتا ہے۔ اور مستقبل کیا ہے؟

اس غیر اہم، بھولے ہوئے نام "گوپال چندر سیل" کو دیکھو۔ یہ آج سے سو برس قبل میرے گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ وہ عیسائی ہو کر ڈاکٹری پڑھنے ولایت گیا۔ اور وطن واپس آکر بے چارہ نوجوان دریا میں ڈوب کر مر گیا۔

اور ایک روز میں، منو موہن بنرجی۔ ایک مفلس سولہ سالہ طالب علم لال منیر ہاٹ سے اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ جب اسٹیمر پر ایک بوڑھا انگریز مشنری مجھے ملا۔ اور اس نے مجھ سے میرے گاؤں کا نام پوچھا اور بڑی مسرت سے بتایا کہ اسی گاؤں کے ایک قابلِ فخر نیٹو نوجوان گوپال چندر سیل کو اس کے باپ نے بپتسمہ دیا تھا۔ لیکن میں نے اس نوجوان کا کبھی نام بھی نہ سُنا تھا۔ (پادری بنرجی عادتاً دل میں اس انداز میں سوچنے لگے، جس طرح وہ منبر پر وعظ کہتے تھے) برہمپتر کے طویل سفر کے دوران اس مہربان مشنری نے پہلے صفحہ پر اپنا پتہ لکھ کر انجیل مقدس مجھے دی اور جب میں گاؤں پہنچا، میری ماں

بسترِ مرگ پر پڑی تھی ـــــ اور دیکھو اس کے بُت اسے نہ بچا سکے۔ اور میں، جو انجیل مقدس سے بے حد متاثر ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے باپ کو بنگلہ انجیل پڑھنے کو دی۔ اور سال بھر بعد میں، میرا باپ، چچا، بہن بھائی، سارا کنبہ رنگ پور اس انگریز مشنری کے ہاں پہنچ کر اس کے ہاتھ پر ایمان لائے۔ چنانچہ پادری بنرجی نے کرسی پر پہلو بدلا اور اپنے غیر مرئی سامعین سے مخاطب رہے ایک سچا نیٹو کرسچین جو آج سے مدتوں قبل مُوا ایسے اَن دیکھے اور بالواسطہ طریقہ سے میرے خاندان کے یسوع تک پہنچنے کا وسیلہ بنا۔

اگر میں اس روز اس اسٹیمر پر اس مشنری سے نہ ملتا۔ یہ کرم کا کھیل تھا ـــــ ؟ یا محض اندھا اتفاق ـــــ ریورنڈ بنرجی نے سر ہلایا اور متحیر سے بیٹھے دروازے سے باہر مشن کمپاؤنڈ کا نظارہ کرنے لگے۔

ہندوستان کے ہر ضلع میں ایک مشن کمپاؤنڈ موجود ہے۔ بلکہ مختلف کلیساؤں کے مختلف مشن کمپاؤنڈ موجود ہیں۔ جس میں ڈیڑھ دو سو سال سے سفید فام مشنری خواتین سفید سائے اور سفید سولا ہیٹ پہنے ہاتھ میں بائیبل لئے نیٹو لوگوں کی روحوں کو بچانے کے لئے دن رات کوشاں رہی ہیں۔ اور کالا پادری ہندوستانی معاشرے کے ایک کنارے پر اپنی انجیل لئے کھڑا ہے۔

شروع شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت مشنریوں کو ایک نیوسنس سمجھتی تھی۔ سیرام پور میں بپٹسٹ مشن کی طرف سے شایع ہونے والا انتہائی دلآزار لٹریچر پہلے فورٹ ولیم میں سنسر کیا جاتا تھا۔ کہ ابھی ہندوستان میں مسیحی مشن کو یونین جیک کی سرپرستی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لارڈ منٹو نے سیرام پور کے لٹریچر کے متعلق کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کو مطلع کیا تھا۔ کہ یہ ہندوؤں کے لئے بے حد اشتعال انگیز ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے جواب میں سیرام پور کے مشہور مشنری ڈاکٹر مارش مین نے لکھا تھا کہ ہندوستانی انتہائی کمزور اور احمق کردار کا مالک ہے۔ اور اس کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ کسی نہ کسی غیر قوم کا محکوم رہے گا۔ اور اس کے اس بودے پن کو عیسائیت بھی دور نہیں کر سکتی۔ لیکن برطانیہ کے زیر سایہ زندہ رہنا اس کے لئے برکت الٰہی کا موجب ہے۔ اس وجہ سے جو ہندو یا محمڈن عیسائی ہو جائے وہ اپنے تحفظ کی خاطر برطانیہ کا انتہائی وفادار ثابت ہوگا۔ کیونکہ محض اس ایمپائر کی سلامتی اور توسیع پر اس کے وجود کا انحصار ہے۔

سیرام پور والوں کو راجہ رام موہن رائے کی طرف سے بڑی امیدیں تھیں۔ مگر انھوں نے عیسائی ہونے کے بجائے اُلٹے اُن سے مناظرے شروع کر دیئے کہ آخر گوڈ کو برہما ہی کیوں نہ کہا جائے؟ مشنری اُن کی روح کو بالآخر نہ بچا سکے۔

یہ انگریز مشنری۔ واقعی بہت بھولے تھے۔ بشپ ہیبر ۱۸۲۵ء میں ہندوستان کے دورے کے بعد لنکا گئے اور کینڈی کے شاہی محل کے دربا ہال میں ڈیوائن سروس منعقد کی۔ اور ان کے ساتھی مسٹر روبنسن نے اس موقع کے متعلق بعد میں لکھا "سروس کے بعد میں اور بشپ ہیبر گھر لوٹے اور میں نے بشپ سے کہا۔ عبادت کے دوران مجھے خیال آیا کہ صرف چند سال قبل اسی ہال میں ایک جابر ایشیائی بادشاہ اپنی مظلوم رعایا کو درشن دیتا تھا۔ اور آج اس میں ایک عیسائی بشپ سچے دین کا پیغام سنا رہا تھا، جب میں نے یہ کہا تو بشپ ہیبر نے سر جھکا لیا۔ اور رو پڑے۔"

ان مشنریوں نے کالے مبلغ اور پادری تیار کئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد عیسائیت کو حکومت کا مکمل تعاون حاصل ہو چکا تھا۔ (انگریزوں کا عبادت خانہ — گرجا — بے چارے مسلمان جل کر کہتے تھے) کالا پادری چوراہوں اور سڑکوں پر تبلیغ کرتا پھر رہا تھا۔ اور مولویوں سے مناظرے کر رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان۔ دیسی عیسائیوں کو کالٹین، چمریشین اور پلپلی صاحب کہہ کر خوش ہو لیتے تھے۔ لیکن تبدیلی مذہب کے بعد مظلوم اچھوتوں اور افلاس زدہ تعلیم یافتہ افراد کی زندگی بدل جاتی تھی۔ سری رام کرشن کے چیلے اور سوانح نگار مہندر ناتھ گپتا نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے مائیکل مدھوسودن دت سے دریافت کیا کہ وہ عیسائی کیوں ہو گئے۔ تو انھوں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا — اس کی خاطر۔

بھوک کے علاوہ ذہنی بے چینی بھی بنگال میں عیسائیت کے فروغ کی ایک وجہ تھی اٹھارویں صدی میں بنگال اور سارے ہندوستان کا ہندو سماج تنزل کی آخری حدود تک پہنچ چکا تھا۔ رام موہن رائے نے ۱۸۱۸ء میں ہندو کالج قایم کیا۔ اس کے طلبا اپنے مذہب سے برگشتہ ہوتے جا رہے تھے۔ متعدد انگریزی تعلیم یافتہ برہمن خاندان عیسائی ہو گئے۔ عیسائیت ایک فاتح، عقلیت پرست، حیرت انگیز، شاندار قوم کا بڑا معقول مذہب تھا۔ نئے بنگالی مصلحین، ہندو، برہمو، عیسائی سبھی انگریز کے حامی تھے، جو اس اندھیرے ملک میں نئی روشنی پھیلا رہا تھا۔ صرف بنگالی مسلمان، جن کو انگریز نے کچل دیا تھا، اور جو اس کے باوجود مجاہدین کی صفوں میں شامل ہو کر اس سے لڑے جا رہے تھے۔ انگریزی دور اور انگریزی تعلیم کے دشمن تھے۔ اور بنگال کا پسماندہ طبقہ بن چکے تھے۔

کلکتہ میں بھدرا لوگ، کرانی اور بابو لوگ کی ایک نئی دنیا آباد ہو چکی تھی۔ اور انگریز بنگالی بابو کا بے طرح مذاق اڑاتا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں ایک انگریز طنز نگار نے انڈین ایمپائر کے متعلق اپنی ایک کتاب "سر علی بابا کا سفر نامہ" میں لکھا تھا۔ "ہم بابو ازم کو ایمپائر میں کتنا ہی فروغ دیں۔ بابو کے وجود پر ہمیں آنسو بہانا چاہئیں کہ بابو ایک سخت قابل رحم شے ہے۔ یہ بابو نئے مذہب، نئی موسیقی، آرٹ اور سائنس سے خوب پیٹ بھر کے جب موٹا ہو جائے گا تو اسی دولتی جھاڑے گا کہ ہم

اس کا مذاق اڑانا بھول جائیں گے۔ اس کے پیٹنٹ لیڈر جوتے، اس کی ریشمی چھتری، اس کے ہزار ہارس پاور کے انگریزی الفاظ اور جملے ـــــ اس کی مغربی خیالات کی جگالی ـــــ یہ سب ایک روز بے حد خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ سائینس، مغربی فلسفے اور مشنریوں نے اس کے دماغ کو اتنا چکا چوند کر دیا ہے کہ اب اس کا اپنی پرانی حیثیت پر واپس جانا مشکل ہے ـــــ"

"سر علی بابا کے سفرنامے" کا یہ مضمون پادری بنرجی کو ایک مرتبہ ارجمند منزل میں نواب قمرالزماں چودھری نے اپنے کتب خانے کی ایک الماری سے نکال کر دکھلایا تھا۔

"یہ دیکھئے بنرجی بابو ـــــ ہمارا صاحب بہادر ہم ہندوستانیوں کا کس بے پناہ حقارت سے ذکر کرتا ہے"۔ نواب صاحب نے کہا تھا۔

ارجمند منزل ـــــ

پادری بنرجی ارجمند منزل میں سیاسی بحث مباحثے سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے لیکن جب کبھی وہاں جاتے ڈرائنگ روم میں مسلم لیگ اور صوبجاتی سیاست کا تذکرہ چھڑا ملتا۔ اور ریورنڈ بنرجی چپکے بیٹھے سنا کرتے۔ ارجمند منزل ڈھاکے کی پرانی مسلم تہذیب، اردو شاعری، تھیٹر، راگ رنگ کے جلسوں، قدامت پرستی اور مسلم سیاست کا مرکز تھی۔ اور پادری بنرجی کو مسلم سیاست یا ہندو سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صدق دل سے انگریزی حکومت کے وفادار تھے۔

ارجمند منزل ـــــ یہ بھی کیا اتفاق تھا کہ ان کی قابلِ قدر لائقِ احترام اور نیک بخت بیوی ایستھر اُن کو ارجمند منزل کے وسیلے سے ملی۔ خداوند خدا کے وسیلوں کے اسرار کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

نواب قمرالزماں چودھری ضلع فریدپور کے زمیندار تھے۔ اور گری بالا چٹوپادھیائے ان کے علاقے کے ایک غریب برہمن کی لڑکی تھی۔ اور پانچ برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد پندرہ سال کی عمر تک اس نے سسرال میں ہر طرح کے ظلم سہے۔ اور ایک رات چپکے سے ناؤ میں بیٹھ کر ڈھاکے بھاگ آئی۔ اور ارجمند منزل پہنچ کر نواب قمرالزماں کی والدہ بیگم نورالزماں سے فریادی ہوئی۔ بڑی بیگم صاحبہ نے اسے فوراً اپنی پناہ میں لے لیا۔ اور کچھ عرصے تک اسے ارجمند منزل کے زنان خانے میں رکھا۔ جب نوجوان نواب زادے نے اس میں دلچسپی لینا شروع کی تو بیگم صاحبہ نے سوچا کہ کلمہ پڑھا کر زمینداری کے کسی اہلکار کے ساتھ اس کا نکاح کروا دیں۔ مگر تقسیم بنگالہ کے بعد ہندو مسلم تعلقات بے حد کشیدہ ہو چکے تھے۔ اور گری بالا کے تبدیلی مذہب سے فوراً فرقہ وارانہ فساد کا خدشہ تھا۔ (گو یہ بات بے حد دلچسپ تھی کہ عیسائی ہو جانے پر ہندو عیسائی فساد نہیں ہوتے تھے) اس موقع پر ڈھاکے کے انگریز بڑے پادری رائٹ ریورنڈ والفرڈ براؤن کی میم آڑے آئیں۔ میم صاحب ہفتے میں دو مرتبہ نواب زادیوں کو انگریزی پڑھانے ارجمند منزل آیا کرتی تھیں۔ بڑی بیگم نے گری بالا کو میم صاحب

کے ذریعہ اُن کے مشن اسکول میں داخل کروادیا۔ بڑے پادری دالفرڈ براؤن صاحب نے اُسے بپتسمہ دے کر اپنی بیوی کے نام پر اس کا نام ایستھر میرین رکھا اور جب اس نے میٹرک کرلیا تو اس کی شادی پال میتھیو من موہن بنرجی سے کردی۔ پال بنرجی ایستھر سے عمر میں بیس برس بڑے تھے۔ مگر ایستھر بے حد خوش تھی کیوں کہ اسے عمر میں پہلی بار عزت اور آرام ملا تھا۔ اور ایسا شریف شوہر۔

رنگ پور میں بپتسمہ لینے کے بعد من موہن بنرجی ایک ہونہار مبلغ ثابت ہوئے تھے۔ انھیں مشن کی طرف سے برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی میں ٹریننگ کے لئے لندن بھیجا گیا تھا۔ واپس آکر وہ صوبے کے مختلف دیسی پروٹسٹنٹ گرجاؤں میں کیوریٹ رہے تھے اور اب ڈھاکہ میں اس دیسی گرجا کے پادری تھے۔

ریورنڈ بنرجی نے کھڑکی کے شیشے میں اپنا عکس دیکھا۔ شمالی بنگال کے ایک گاؤں کا وہ سولہ سالہ برہمن لڑکا۔ گھسا ہوا سیاہ کوٹ پتلون پہنے، بغیر فریم کی عینک لگائے، سنجیدہ، نوجوان مبلغ۔ جو کبھی اپنی سائیکل پر مسلمان بستیوں کی طرف نکل جاتا تو لونڈے اس کے پیچھے دوڑ کر تالیاں بجاتے اور وہ یسوع کی خاطر یہ سب ذلتیں سہتا ـــــ اور آج، ۲۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کی رات، ڈھاکہ چرچ کا یہ بزرگ پادری ـــــ خداوند خدا کی برکتوں کا مشکور پال میتھیو بنرجی ـــــ راستہ طے کرتے کرتے ایک وقت ایسا آتا ہے، جب انسان پیچھے مڑ کر اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے۔ اور اپنے ماضی کو سکھ اور دکھ کے ترازو میں تولتا ہے اور کتنے لوگ ہیں، جن کے ہاں سکھ کا پلڑا بھاری ہو؟

ریورنڈ بنرجی نے عینک اتار کر پلکوں پر انگلیاں پھیریں۔ خداوند خدا نے مجھے کیا کچھ نعمتیں نہیں دیں۔ ایک سعادت مند گلہ، ایک محبت شعار بیوی۔ ایک پیاری اور فرمانبردار بیٹی۔

انھوں نے ایک گہرا سانس لے کر دوبارہ قلم اٹھایا اور نب دوات میں ڈبو کر کرسمس کا وعظ لکھنا شروع کردیا۔

پادری بنرجی کی اکلوتی لاڈلی بیٹی روزی لی کالج کے سٹنگ روم میں بیٹھی مریمؑ کی مورتی کے لئے مُنی سی نیلی ساری پر سچا لپکا ٹانک رہی تھی۔ جو وہ کالج سے لوٹتے میں جہاں آرا کے گھر سے لیتی آئی تھی کہ ارجمند منزل کے زنان خانے کی الماریوں میں سچے گوٹے لچکے کی افراط تھی ـــــ یوں وہ ارجمند منزل بہت کم جاتی تھی۔ وہ جہاں آرا کی بڑی پکی سہیلی تھی۔ مگر جب سے وہ بڑی ہوئی تھی اور اس کی ایک پھوپھی نے اسے اس کی ماں کی زندگی کی داستان سنائی تھی اُسے ارجمند منزل جاتے ہوئے جھینپ سی آتی تھی ـــــ جہاں آرا نے کبھی اس سے اس داستان کا ذکر نہیں کیا تھا اور وضعداری کی وجہ سے کالج میں بھی اس نے روزی کی ماں کا وہ المناک پس منظر کسی کو نہیں بتایا۔ اس کے باوجود

روزی کو لاشعوری طور پر نوابوں اور زمینداروں کے مسلمان معاشرے اور قدیم وحشیانہ رسوم سے جکڑے تنگ نظر ہندو سماج سے نفرت تھی۔ ساتھ ہی اسے اپنے دیسی عیسائی طبقے کی مضحکہ خیز حیثیت کا بھی خاصا احساس تھا۔ ہندو سماج نے اُس کی بھولی ماں کو تین سال کی عمر میں بیاہ کر اور پانچ سال کی عمر میں بال ودھوا بنا کر اس پر ظلم توڑے تھے۔ مسلمان زمینداروں کے نونہالوں نے یعنی خود جہاں آرا کے باپ اور ان کے دوستوں نے اس کی بے سہارا ماں کو اپنا کھلونا بنانا چاہا تھا۔ لیکن اس کے برعکس عیسائی سوسائٹی نے اُس کی ماں کو عزت، تعلیم و تربیت اور گھر عطا کیا تھا۔ ان سارے آپس میں الجھے ہوئے حقائق کے باوجود بیس سالہ حساس اور ذہین روزی بنرجی جذباتی اور ذہنی طور پر خود کو ایک دوراہے پر موجود پا رہی تھی۔ وہ خود کو خالص ہندوستانی کلچر اور قومی سیاسی عزائم سے مماثل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا عیسائی سماج انگریز کا تخلیق کردہ تھا۔ اور انگریز کا نمک حلال تھا۔ اور یہ باتیں وہ اپنے شفیق اور نیک طینت باپ سے کسی طرح نہ کہہ سکتی تھی۔ کسی سے نہ کہہ سکتی تھی۔ اور اس کی ماں ایستھر گری بالا بنرجی عیسائی ہونے کے باوجود ایک خالص بنگالی پتی ورتا گھریلو عورت تھی۔ جسے ان مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

تبدیلی مذہب کے باوجود جنوبی ہند کے عیسائیوں کی مانند بنگالی عیسائیوں پر بھی اپنے صوبے کی کلچر کا گہرا اثر باقی تھا۔ مسز ایستھر بنرجی کی سسرالی عورتیں بنگال کی بیشتر برہمن اور دوسری اونچی ذات کی عیسائی خواتین کی طرح مانگ میں سیندور لگاتی تھیں اور مذہبی رسوم کے علاوہ ساری پرانی ریت رسموں کی پابند تھیں۔

روزی اسکول کی آٹھویں کلاس سے دیپالی سرکار کی ہم جماعت تھی۔ بڑی ہونے پر چھٹی کے گھنٹوں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر وہ سینیئر لڑکیوں سے سیاسی گفتگو سنتی۔ تحریکِ آزادی کا ہر طرف چرچا تھا۔ بہت سی باتیں ابھی پلے نہیں پڑتی تھیں۔ لیکن بنگال انقلابی تحریک کا پرانا گڑھ تھا۔ اور ان نوعمر لڑکیوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ انگریز کو مار مار کر بھوسہ بھر کے دیس سے نکال دو۔

پرانی دہشت پسند پارٹی انوشیلن کے ہیڈ کوارٹرز بردوان ضلع سے آئی ہوئی ابانی اپنے ماں باپ سے سنے ہوئے اور بندو گھوش اور سوامی ودیکانند کے انقلابی بھائی بھوپندر دت کے قصے چھیڑتی۔ اس صدی کے شروع میں ہندوستانی انقلابی آئرلینڈ کے SIN FEIN روس کے سوشل ڈیموکریٹس اور میزنی کے "ینگ اٹلی" سے متاثر ہوئے تھے۔ جنھوں نے اسی زمانے میں تہلکہ مچا رکھا تھا وہ ڈبلیو بی ایٹس کا آئرلینڈ ـــــ ایٹس جو اپنے ملک کی آزادی کا نقیب تھا۔ اور ساتھ ہی عارفانہ نظمیں لکھتا تھا ـــــ اور جو ہندوستانی روحانیت کا مداح تھا۔ ودیکانند، ٹیگور، ایٹس ـــــ وہ بھی کیا زمانے تھے۔ رومینٹک اور ولولہ خیز اور دلکش۔ روزی ان سب باتوں کو سن کر سوچا کرتی۔

اور ۱۹۰۵ء کے ان انقلابیوں نے لیفٹیننٹ گورنر کو مارنے کے ارادے سے ریلوے لائن پر ایک چھوڑ تین تین بار بارود بچھائی تھی۔ اور علی پور سازش شروع ہوئی تھی۔ اور سی۔ آر۔ داس نے اور بندو گھوش کا مقدمہ لڑا تھا۔ اور اسی وقت برین گھوش نے کہا تھا۔ ہم انگریزوں کو مار کر آزادی حاصل کرنے کے خواب نہیں دیکھ رہے۔ ہم صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہم میں مارنے اور مرنے کی ہمت ہے ——

یورپ میں ہندوستانی طلبار نے انقلابی گروہ بنائے تھے۔ سکھ کسانوں نے امریکہ اور کینیڈا میں غدر پارٹی قایم کی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں سر کرزن ولی کو جو ہندوستان کے خلاف قانون بنا رہا تھا۔ لندن میں ایک ہندوستانی طالب علم مدن لال نے گولی کا نشانہ بنا دیا تھا اور پھانسی پر چڑھا تھا۔ دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا گیا تھا۔ اور چار نوجوان دار پر جا لٹکے تھے۔ آج سے پچیس سال پہلے مغربی سامراجیوں نے آپس میں اسی طرح کی ایک بھیانک جنگ لڑی تھی۔ اور اس زمانے میں ہندوستانی انقلابیوں نے برلن کمیٹی بنائی تھی۔ جس میں سروجنی دیوی کے بھائی ویریندر چٹوپادھیائے، اور راجہ مہیندر پرتاپ اور بھوپیندر ناتھ دت اور سوہن سنگھ اور برکت اللہ اور چمپک رمن پلّے اور ایم۔ این رائے شامل تھے، بنگالی، پنجابی، مدراسی، ہندو، مسلمان، سکھ، کون کہتا ہے کہ ہندوستانی قوم متحد نہیں ہو سکتی —— ؟ اور غدر پارٹی کے اراکین امریکہ سے ہندوستان پہنچے تھے۔ اور ۲۱ فروری ۱۹۱۵ء نئے غدر کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ اور فوجی سپاہی، یو۔ پی اور پنجاب میں غدر شروع کرنے والے تھے۔ جب کسی میر جعفر نے پھر حکومت سے مخبری کر دی۔ پھر کتنوں کو پھانسی لگی۔ کتنے کالے پانی گئے۔

عدم تعاون اور خلافت کی تحریک کی ناکامی کے بعد ۱۹۲۴ء میں تشدد پسند تحریک دوبارہ شروع ہوئی۔ اور پھانسی کی کوٹھریاں آباد ہوئیں۔ یو۔پی میں انقلابیوں نے کاکوری میں سرکاری خزانہ لوٹا اور اشفاق اللہ اور اس کے ساتھی پھانسی پر چڑھے —— آندھرا میں الوری سیتارام راجو کے گوریلا دستے حکومت سے لڑتے پھرے اور مارے گئے۔ سردار بھگت سنگھ نے مرکزی اسمبلی میں بم پھینکا اور کہا کہ ان کا مقصد ملک میں اشتراکی حکومت قایم کرنا ہے۔ اور پھانسی پر چڑھے۔ ہندوستانی سوشلسٹ ری پبلکن آرمی کے کمانڈر الہ آباد میں پولس سے لڑے اور مارے گئے۔ چاٹ گام میں ۲۲ اپریل ۱۹۳۰ء کو آئرلینڈ کے ایسٹر سنڈے کی طرح کی معرکہ آرائی ہوئی اور انقلابیوں کی نئی "نوجوان ترک پارٹی" جگانتر نے سرکاری اسلحہ خانے پر حملہ کیا اور جگانتر کے لیڈر سوریہ سین اور اُن کے ساتھی جلال آباد کی پہاڑیوں پر برطانوی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مشین گنوں سے شہید ہو گئے۔ نوجوان کلپنا دت کو قید کر لیا گیا۔ اور کالج گریجویٹ پرتی لتا، چاٹ گام کے یورپین کلب پر مسلح حملے کی قیادت کرتی ہوئی پکڑی گئی۔ اور پولس کے قبضے میں آنے سے پہلے اس نے خودکشی کر لی۔ نوجوان شانتی دیبی اور سُمتی دیبی کو کومیلا کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو پستول کا نشانہ بنانے کی سزا میں کالے پانی بھیج دیا گیا —— کماری بینا داس

نے بنگال کے گورنر پر گولی چلادی ـــــ چند سال قبل ہی کی بات ہے کہ بنگال کے انسپکٹر جنرل پولیس، انسپکٹر جنرل آف پرزنز اور سیشن جج علی پور سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ضلع مدناپور کے تین انگریز جج ایک کے بعد ایک مارے جا چکے تھے۔ یورپین ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ، اسٹیٹسمین کے ایڈیٹر اور سر چارلس ٹیگارٹ پر قاتلانہ حملے افسوس کہ ناکام رہے تھے۔

جگانتر کا ہیڈ کوارٹر چاٹ گام کے نزدیک دھول گھاٹ میں آج بھی موجود تھا۔ سوریہ سین، یعنی ماسٹر دا آج بھی بنگال کے ہیرو تھے۔ خودی رام باسو سے لے کر دیپالی کے چچا دینیش چندر سرکار کے زمانے تک ملک میں پھانسیوں کے سیاہ درختوں کا کتنا بھیانک جنگل کھڑا کھڑا رہا تھا۔ جس کے ایک طرف کالا پانی تھا اور دوسری طرف اونچے قید خانے ـــــ اور یہ سارے انقلابی نوجوان بنگال کے ہیرو تھے۔ بھدرا لوگ ـــــ! متوسط ہندو بنگالی طبقے نے ایسے ایسے بہادر نوجوان پیدا کئے تھے! بھدرا لوگ۔!! اور روزی سوچا کرتی کیا میں کلپنا دت۔ پرتی لتا، شانتی۔ سمتی اور بینا داس جیسی ہیروئن نہیں بن سکتی؟ پچھلے چند برسوں میں سارے دہشت پسند انقلابی کمیونسٹ ہو گئے تھے۔ اور اب کالج میں لڑکیاں ان نئے انقلابیوں کا تذکرہ کرتیں۔ ریحان الدین احمد اور اکشے مکرجی اور اومارائے ـــــ لڑکیوں کے دل و دماغ میں ماسٹر دا کی جگہ اب ریحان الدین احمد لے چکے تھے۔

سال بھر قبل دیپالی نے بڑے مضطرب لہجے میں روزی سے کہا تھا ـــــ "روزی۔ سنو تو ـــــ کل میں ایک خفیہ اسٹڈی سرکل میں گئی تھی۔ اب کے سے تم بھی میرے ساتھ چلو۔ وہاں بہت اچھی اچھی باتیں معلوم ہوتی ہیں"۔ روزی چپ رہی تو دیپالی نے کہا تھا۔ "اپنے پاپا سے کہہ دینا میرے گھر جا رہی ہو۔ کالج کی پڑھائی کرنے ـــــ"

آئندہ اتوار کو روزی دیپالی کے ہمراہ پرانا پلٹن کے اس پُراسرار مکان میں گئی۔ اور چند ہفتوں بعد بین الاقوامی اشتراکی تحریک کی بڑی سخت حامی ہو گئی تھی۔ خود اپنے وجود کے متعلق بہت سے پریشان کن سوالوں کا جواب اسے مل گیا تھا۔ سیدھی سی بات یہ تھی کہ برطانیہ کی اقتصادی بالادستی کی وجہ سے جب ملک میں قحط پڑتا تھا اور کساد بازاری چھاتی تھی اور بے روزگاری پھیلتی تھی تو مشنری لوگ بھوکے ننگے ہندوستانیوں کو عیسائی بنا لیتے تھے۔

پھر اس ستمبر میں جنگ چھڑی تو اسٹڈی سرکل میں اکشے دا نے روزی کو سمجھایا کہ مغربی سامراجیوں کی اس جنگ کو ہندوستان میں خانہ جنگی میں تبدیل کرنا ہمارا فرض ہے۔ تاکہ سُرخ انقلاب فی الفور آسکے۔ اب ہم اس مقصد کے حصول کے لئے کام کریں گے۔ اور اس جنگ کے خلاف اور خانہ جنگی کے پرچار کی خاطر خفیہ طور پر لٹریچر چھاپ کر جنتا میں تقسیم کریں گے۔ روزی اس مجوزہ خانہ جنگی کے لئے بھی بہ خوشی تیار ہو گئی تھی۔

پادری بنرجی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ روزی اتوار کے روز کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ "کہہ دو بھائی روزی تم نے شہر کے ایک محلے میں سنڈے اسکول کھولا ہے"۔ پچھلی مرتبہ اکشے نے ہنس کر اس سے کہا تھا۔

لیکن ابھی چند روز قبل وہ خفیہ اسٹڈی سرکل ٹوٹ گیا۔ ساتھی پل کے پل میں انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ دیپالی بے حد خاموش رہنے لگی۔ اب وہ روزی کو کچھ نہ بتاتی تھی۔ شاید یہ لوگ مجھ پر پوری طرح بھروسہ نہیں کرتے۔ کیونکہ میرا سارا خاندان انگریزوں کا پروردہ ہے۔ ڈھاکہ کا موجودہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ولیم کینٹ ویل پاپا کو بے حد مانتا ہے۔ مسز کینٹ ویل بھی کبھی کبھی لِلی کاٹج آتی رہتی ہیں۔ میں ساتھیوں پر کبھی یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ میں برٹش راج کی وفادار نہیں ہوں۔ شاید وہ یہی سمجھتے ہوں کہ میں ان کی مخبری کر دوں گی۔ روزی کو پچھلے روز سے اندازہ تھا کہ دیپالی کے پاس انڈر گراؤنڈ سے اہم پیغام آرہے ہیں۔ مگر دیپالی نے اس سلسلے میں بالکل چپ سادھ رکھی تھی۔

حضرت مریمؑ کی ساری پر لچکا ٹانک کر اور سلمٰی ستارے کا منا سا تاج بنا کر روزی ایک لمبا سانس لے کے کوچ پر سے اٹھی۔ اور شال لپیٹ کر باہر صحن میں آگئی۔ سائبان کے اندر ٹیبلو تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ روزی در میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ کمپاؤنڈ کی غریب بنگالی عیسائی عورتیں کتنی شردھا سے مورتیاں سجانے میں منہمک تھیں۔ اندر جا کر اس نے مریمؑ کی مورتی کو کپڑے پہنائے اور تاج سر پر رکھا۔ اور یک لخت اس نے سوچا۔ اس سائبان اور دُرگا پوجا کے پنڈال میں کیا فرق ہے؟ ان غریب عورتوں کے لئے کیا مریمؑ بھی لاشعوری طور پر دُرگا کی مانند ایک اور دیبی نہیں؟ اور کیا ہم عیسائی لوگ بت پرستی نہیں کرتے؟ پھر ہندو کافر اور گمراہ کیوں ہیں؟ اگر خدا فاختہ کا روپ دھار کر دنیا میں آسکتا ہے تو کچھوے اور مچھلی میں اوتار کیوں نہیں لے سکتا؟ میرے بے چارے پاپا ـــــ ہائے میرے پیارے بے چارے بوڑھے پاپا۔ تم نے ساری زندگی ان بے معنی بحثوں میں کیوں ضایع کی؟ فاختہ اور روح القدس ـــــ!

وہ یکایک بے حد دل گرفتہ ہو کر آہستہ آہستہ قدم رکھتی گرجا گھر کی طرف بڑھی اور ہال میں جھانکنے لگی۔

ہال کے ایک کونے میں پنجابی ٹولی زور زور سے گا رہی تھی۔

رب خداوند بادشاہ اے۔ او جلال دا بادشاہ اے۔

اُچے کرو سُر جان جلال دا بادشاہ آے۔

وہ دبے پاؤں اندر پہنچی۔ لدھیانہ مشن کے پادری ریورنڈ ہنری بسواس کا نوجوان بیٹا مسٹر لوتھر بسواس پیڈل والے ہارمونیم پر بیٹھا تندہی سے حمد کی سنگت کر رہا تھا۔

"اے خداوند اپنی راہ اپنے بندے نوں دِکھا۔ آ ــ آ ــ آ ــ" روزی کو اپنے قریب کھڑا دیکھ کر مسٹر لوتھر بسواس گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ بھجن منڈلی بھی چپ ہو گئی ــ چند لڑکیاں سفید شلواروں، سُرخ سوئیٹر اور سفید دوپٹوں میں ملبوس شرما کر کبھی کبھی ہنس پڑیں۔

مسٹر لوتھر بسواس ذرا جھینپ کر مسکراتے ہوئے روزی کو دیکھنے لگے۔

یہ لوگ سب کسی دوسری دنیا کے باشندے تھے۔ روزی اخلاقاً مسکرائی۔ "سوری۔ میں نے آپ لوگوں کی پریکٹس کو ڈسٹرب کر دیا۔ پلیز کیری اون ــ"

"آپ ــ آپ بیٹھیں نا روزی سسٹر ــ" ایک پنجابی لڑکی نے کہا ــ

"نہیں بھئی ــ مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے۔ گڈ نائٹ۔"

مسٹر لوتھر بسواس نے سامنے مسکرا کر سر ذرا سے خم کرتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔ اور دروازے پر پہنچ کر اس نے محسوس کیا کہ گو بھجن منڈلی نے دوبارہ گانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن مسٹر لوتھر بسواس کی دزدیدہ نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی ہیں ــ اور وہ بے طرح شرما رہے ہیں۔

او مائی گاڈ ــ اُس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور عمارت کا چکر لگا کر پادری بنرجی کے دفتر کی کھڑکی کے نیچے پہنچی۔ اور اندر جھانک کر دیکھا۔ پاپا عینک ناک کی نوک پر رکھے میز پر جھکے لیمپ کی روشنی میں تندہی سے وعظ لکھنے میں مصروف تھے۔ اسے اپنے بوڑھے باپ پر بے اختیار پیار آ گیا۔ خدایا ان کو زندہ رکھ۔ خدایا ان کو میرے سر پر زندہ سلامت رکھ۔ اس نے دعا مانگی۔ اور دروازے کی طرف جا کر چپکے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔

قلم سرعت سے چل رہا تھا۔ سر۔ سر۔ سر۔

روزی کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ اور جھانک کر پڑھنا چاہا۔ اور دل میں مسکرائی۔ گڈ اولڈ پاپا۔ پاپا اور اُن کے سالانہ کرسمس سرمن۔

"ــ کفارے کی نسبت جو ہمارے خداوند یسوع نے اے لوگوں تمھارے لئے کیا اُس نے جان کھوئی کہ تم اس کو دوبارہ حاصل کرو ــ گیہوں کا دانہ جو مرنے کے بعد ــ"

قلم کی رفتار تیز ہو گئی ــ "وے جو مسیح پر ایمان لائے ــ خداوند تیری برکت تیرے بندوں پر ہے۔ وے روح القدس میں غوطہ دلائے جاویں گے کہ وہ جو ہمارے لئے مُوا اور مدفون ہوا۔ اور جی اٹھا اور وہ خداوند خدا کا اکلوتا بیٹا، جو ہماری تمھاری خاطر صلیب پر لٹک گیا۔ اس کا مبارک یوم ولادت منانے ہم آج جمع ہوتے ہیں اور اس خداوند خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اس ملک میں امن و امان کی حکومت کے زیر سایہ ــ"

"دیدی ــ" کھڑکی کے نیچے سے کمپاؤنڈ کے ایک بچے نے اُسے آہستہ سے پکارا۔ وہ سُرعت

سے باہر نکلی۔ بچے نے اس سے کہا ــــ "پھاٹک پر یہ بڑی کالی موٹر کھڑی ہے۔ اس میں دیپالی دیدی بیٹھی ہیں۔ آپ کو بلا رہی ہیں۔ ایک دم جلدی ــــ"

"دیپالی موٹر میں بیٹھی ہے؟" روزی نے حیرت سے دہرایا۔ اور چاروں طرف نظر ڈال کر تیزی سے بھاگی....

اُدھارائے کی موٹر اندھیرے برگد کے نیچے کھڑی تھی۔

"روزی ــــ تمھارے ہاں تو بڑا ہنگامہ ہے۔" دیپالی سرکار نے کار کی کھڑکی میں سے جھانک کر گھبراتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ فکر مت کرو۔ کیا بات ہے؟"

"بے حد سیریس۔ تم کل سویرے میرے گھر پہنچ جاؤ ــــ وقت بالکل نہیں ہے اور بالکل خاموش رہو۔ ٹوپ سیکرٹ۔" دیپالی نے سرگوشی میں جواب دیا ــــ کار زن سے آگے چلی گئی۔

روزی چپ چاپ اور متفکر پھاٹک کے اندر واپس آئی اور کنکریوں کو پیروں سے ٹھکراتے ٹھکراتے للی کاٹج کی سمت روانہ ہوگئی۔ سامنے گرجا گھر میں سے پنجابی ٹولی کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

اے خداوند میرا دل اک پاسے کر۔ تاں میں رکھاں تیرا ڈر ــــ

اور اب لوتھر بسواس کی بھاری آواز حمد میں شامل ہوئی۔ ہارمونیم زور زور سے بجنے لگا ــــ تُسی گاؤ ثنا ــــ گاؤ ــــ ثنا تُسی رب دی ــــ سچیاں دی ٹولی وِچ دل نال گاواں ــــ ثنا سناواں رب دی۔ رب خداوند بادشاہ اے۔ او جلال دا بادشاہ اے۔ اے خداوند اپنی راہ اپنے بندوں نوں دِکھا ــــ آ ــــ آ ــــ آ ــــ

## ۷

# نیا عہد نامہ

چندر کنج کے کوٹھے والے سائبان میں کھڑی دیپالی سرکار صبح کے ناشتہ کے بعد سے روزی کا انتظار کر رہی تھی۔ دور سڑک کے موڑ پر روزی کی سائیکل آتے دیکھ کر وہ تیزی سے نیچے اتری اور بیٹھک خانے کا دروازہ کھولا۔ جوں ہی روزی اندر آئی دیپالی نے اسے اپنے کمرے میں لے جا کر جھٹ پٹ دروازہ بند کیا۔ اور چٹخنی لگا دی ــــ اور بڑے ڈرامائی انداز سے الماری پر سے بائیبل اتار کر

(جو ایک مرتبہ پادری بنرجی نے اسے دی تھی) روزی کے ہاتھ میں ٹھونس دی۔

"آنکھیں بند کرو روزی ـــ"

حیران و پریشان روزی نے آنکھیں بند کیں۔

"کہو ـــ ملک و قوم کی خاطر حلف اٹھاتی ہوں۔ گوڈ دی فادر ـــ گوڈ دی سن اور گوڈ دی ہولی گھوسٹ کے نام پر ـــ"

روزی نے ایک آنکھ کھولی ـــ "مس ہیڈلے نے پرسوں ہی بتلایا ہے کہ صحیح تلفظ گھوسٹ نہیں گوسٹ ہے"۔

"اچھا ـــ اچھا۔ ہولی گوسٹ کے نام پر۔ چلو۔ بولو تو ـــ"

روزی نے دونوں آنکھیں کھول لیں اور ٹھٹھک کر کہا ـــ "دیپالی۔ میرے پاپا پر تو کوئی آفت نہیں آئے گی؟ وہ بہت بوڑھے ہیں"۔

دیپالی چپ ہو گئی۔ اسے بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ "میں ـــ میں مستقبل کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ روزی۔ مگر ـــ مگر تم سچی ہندوستانی ہو کہ نہیں"۔ اس نے لمحہ بھر کے بعد کہا۔

"ہاں ـــ" (میں کالٹین نیٹو کرسچین سچی ہندوستانی ہوں۔ اس نے دل میں تلخی سے کہا۔ پھر اس نے فوراً اپنے آپ کو ڈانٹا۔ اس خود رحمی کی کیا ضرورت ہے۔ تحریک آزادی میں ان گنت عیسائی شامل ہیں۔ ایک سے ایک بڑے محبِ وطن ـــ حُبِ وطن کیا کسی ایک ہی فرقے کی میراث ہے؟ اس وقفے میں دیپالی سانس روکے متوقع نظروں سے روزی کو دیکھے جا رہی تھی۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو ـــ؟ تو کیا ہوگا ـــ؟ دیپالی کو محسوس ہوا جیسے ہندوستان کا سارا مستقبل اس وقت محض روزی بنرجی کے ہاں یا نہ کرنے پر منحصر ہے۔ دیپالی کو کپکپی سی محسوس ہوئی۔ اتنے میں روزی نے فرش پر دوزانو بیٹھ کر زیرِ لب حلف دُہرایا اور بائیبل سر اور آنکھوں سے لگا کر کہا۔

سو ہیلپ می گوڈ ـــ"

دیپالی اطمینان کا گہرا سانس لے کر اپنے پلنگ پر جا بیٹھی۔

"روزی۔ ادھر آؤ ـــ" اب گویا وہ گرو یا لیڈر تھی۔ روزی اس کی چیلی۔ "غور سے سنو روزی"۔ دیپالی کی آواز میں تحکم آ گیا تھا۔ اُدما رائے کی طرح اقتدار اور احساسِ ذمہ داری انسان کو پل کی پل میں بدل دیتا ہے۔

"روزی ـــ ڈی ایم کے بنگلے پر تمھارے کمپاؤنڈر کا کوئی آدمی ملازم ہے۔ تم نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا"۔

"مسز کینٹ ویل کی آیا ہمارے ہاں کی عورت ہے۔ لیلا ـــ ممی نے ہی اسے وہاں رکھوایا

تھا۔"

"کہاں کی رہنے والی ہے؟"

"پالا تو ممی نے اسے کمپاؤنڈ میں ہے۔ مگر اس کی نانی نرسنگھ دی میں رہتی ہے۔"

دیپالی چند لمحوں تک سوچا کی۔ پھر پوسٹ کارڈ اور قلم نکال کر روزی سے کہا۔

"میں اس کی نانی کی طرف سے تمھاری ممی کو خط لکھ رہی ہوں۔ نانی بہت سخت بیمار ہے۔ لہٰذا لیلا دیبی ایک ہفتے کے لئے فوراً نرسنگھ دی پہنچے۔ آج کھو کھو نرسنگھ دی جائے گا اور یہ کارڈ وہاں ڈاک میں ڈال دے گا۔ اچھا ٹھہرو۔ جوزف بے حد قابل اعتبار ہے نا۔؟"

"تم دیپالی جوزف کو برسوں سے دیکھ رہی ہو"۔

"اچھا ــــ جوزف ایک لفافہ لے کر لیلا کے نام ڈی۔ ایمز ہاؤس جائے گا اور اس سے کہے گا کہ گاؤں سے آدمی یہ چھٹی لایا ہے ــــ وہی نانی کی بیماری والی ــــ اور کہے گا کہ ہفتے بھر کی عیوضی کا انتظام بھی کرتا آیا ہے۔ یہ لیلا جو ہے تمھاری۔ یہ میم صاحب سے چھٹی مانگے گی۔ میم صاحب کیسی آدمی ہیں؟"

"اچھی خاصی ہیں۔ شریف عورت ہیں"۔ روزی نے جواب دیا۔ مگر الجھن سی محسوس ہوئی۔ میں مسز کینٹ ویل سے واقف ہوں۔ ان سے ملتی رہتی ہوں۔ اور اب ان کو دھوکا دینے جا رہی ہوں۔

"اچھی خاصی ہیں ــــ" اس نے دُہرایا۔

"اُس کے بعد شام کو ایک برقعہ والی ملازمہ کلثوم بی بی ڈی ایمز ہاؤس پہنچ جائے گی۔ لیلا کی عیوضی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ خط لے کر تم جاؤ اور لیلا کو چھٹی دلا دو اور بعد میں کلثوم بی بی کو پہنچا دو۔ تو منٹوں میں کام بن جائے گا۔ مگر پھر خیال آیا کہ تم کو مصیبت میں نہ ڈالوں"۔

"کیوں ــــ؟ روزی نے غصّے سے پوچھا۔ "پھر حلف کس لئے اٹھوایا ہے؟"

"تم خود چلی جاؤ گی؟"

"اف کورس"۔

"اوہ ــــ ونڈرفل ــــ روزی ــــ" دیپالی خوشی سے اچھل پڑی۔

"مگر دیپالی ــــ یہ سب کس لئے ــــ؟ تم مسٹر کینٹ ویل پر بم تو نہیں پھینکو گی؟"

"روزی۔ تم کو پتہ ہے، ہم لوگ بم نہیں پھینکتے ــــ"

"ہم لوگ ــــ" دیپالی نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ اور روزی مرعوب ہوئی۔ مگر اچانک اس نے کہا۔ "ایک بڑا سخت لُوپ ہول ہے تمھاری اسکیم میں۔ پوچھو کیا ــــ؟ لیلا ایک ہفتے کے لئے کہاں جائے گی؟ خط تو فرضی ہے"۔

"اس کا انتظام بھی کر لیا گیا ہے۔ فکر مت کرو۔ یہ بہت معمولی بات ہے۔ اچھا۔ روزی۔ آج ہے ۲۱، تاریخ ـــــ ۲۷، دسمبر سے پہلے کلثوم بی بی کا ڈی۔ ایمز ہاؤس میں پہنچ جانا لازمی ہے"۔

"مگر کیوں آخر ـــــ؟"

"یہ تمھیں نہیں بتایا جا سکتا"۔

"کیوں؟"

"روزی بنرجی۔ تم نے انڈر گراؤنڈ میں کام کرنے کے لئے حلف اٹھایا ہے نا۔ اب زبان بند رکھنے اور سوال نہ کرنے کی عادت ڈالو ـــــ"

"تم تو واقعی ڈکٹیٹر بن گئیں"۔ روزی نے منہ لٹکا کر کہا۔

دیپالی بچوں کی سی لکھائی میں لیلا بتی آیا کی نانی کی طرف سے مسز ایستھر بنرجی کو پوسٹ کارڈ لکھنے میں مصروف ہو گئی ـــــ

۲۴، دسمبر کی صبح روزی لِلی کاٹج کے برآمدے میں بیٹھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور لاٹ پادری کے ہاں سے آئے ہوئے کھلونوں اور گرم کپڑوں کے پارسل بنانے میں مصروف تھی۔ جو کمپاؤنڈ کے یتیم بچوں میں تقسیم کئے جانے تھے۔ اسی وقت ڈاکیے نے ایک پوسٹ کارڈ لا کر دیا۔ پڑھ کر روزی نے اپنی والدہ کو آواز دی، جو کانفرنس کے نمایندوں کی صبح کی چائے کے انتظام میں سرگرداں پھر رہی تھیں۔

"ممی ـــــ بے چاری لیلا بتی کی نانی کا خط آیا ہے۔ بڑی سخت بیمار ہے"۔

"ارے کیا ہوا؟" مسز ایستھر بنرجی نے پوچھا۔

"یہ نہیں لکھا۔ یہ دیہاتی لوگ تو صرف ایک ہی بات جانتے ہیں۔ پران نکلنے والے ہیں فوراً پہنچو"۔

"خدا باپ رحم کرے"۔ ایستھر بنرجی نے کہا۔ "روزی تم خود جا کر مسز کینٹ ویل کو خط دکھا دو۔ ورنہ وہ شاید چھٹی نہ دیں۔ لیلا مجھ سے کئی بار کہہ چکی ہے کہ گاؤں جانا چاہتی ہے۔ مگر میم صاحب ابھی چھٹی نہیں دے رہی ہیں"۔

"کیوں؟ اُن کے ہاں آیا کا کام ہی کیا ہے؟"

"نہیں، مگر ان کے ہاں مہمان آنے والے ہیں۔ پرسوں چیرٹی بازار کے لئے آئی نہیں تھیں تو مجھے بتا رہی تھیں"۔

"کون مہمان آنے والے ہیں۔ ماما؟"

"مجھے کیا معلوم۔ مسز کینٹ ویل سے میری اتنی بے تکلفی نہیں ہے کہ مجھے تفصیلات بتائیں۔ ہوں گے کوئی۔"

روزی نے پارسل اکٹھے کر کے اندر سٹنگ روم میں کرسمس ٹری کے پاس رکھ دیئے۔ چند لمحوں کے لئے چپ کھڑی رہی۔ پھر غیر ارادی طور سے عیسیٰ کی تصویر پر نظر ڈالی، جو آتشدان کے اوپر لگی تھی (کمرے کی ایک دیوار پر بشپ ہیبر کی تصویر بھی آویزاں تھی) باہر آکر اس نے سائیکل نکالی اور رمنا کی سمت روانہ ہو گئی۔

## ۸

# ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا بنگلہ

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پُر فضا بنگلے کا وسیع باغ موسم سرما کے روشن پھولوں سے جگمگا رہا تھا۔ بنگلے کے اندر چھوٹا حاضری کے بعد ملازمین بڑے دن کی تیاریوں میں سرگرمی سے مصروف ہو چکے تھے۔ روزی بنرجی نے سائیکل ایک گل مہر کے نیچے کھڑی کی اور برآمدے میں جا کر ڈرائنگ روم کے دریچے سے اندر جھانکا۔ بیرہ گول میز کی جھاڑ پونچھ کرتا نظر آیا۔ روزی نے ذرا ڈرتے ڈرتے دریچے پر دستک دی۔ غفور بیرہ روزی مس صاحب کو پہچانتا تھا۔ اس نے باہر آکر کھیسیں نکال دیں۔ مگر جھک کر سلام نہیں کیا کہ بڑے صاحب کا بیرہ تھا۔

"میم صاحب ہیں؟" روزی نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔ اس کا حلق سوکھ رہا تھا۔

"اندر ہیں۔"

"اور صاحب ــــ؟"

"صاحب کچہری جانے والا ہے۔"

اندر سے بوٹوں کی چاپ اور ہلکی سی سیٹی کی آواز آئی۔ اور کسی نے پکارا۔ "ڈارلنگ ــــ"

"یس ڈیر ــــ" یہ مسز کینٹ ویل کی آواز تھی۔

بجلی کے کوندے کی طرح روزی کو خیال آیا کہ واپس چلی جائے۔ وہ کس زبردست حماقت

میں پھنس گئی ہے۔ قوم پرستی وغیرہ بالکل ٹھیک ہے ـــــ مگر یہ خطرناک سازشیں ـــــ وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔

کہ اتنے میں فریڈا کینٹ ویل کتے کو آواز دیتی خود ہی باہر نکل آئیں۔

"گڈ مارننگ مسز کینٹ ویل"۔

"گڈ مارننگ ـــــ گڈ مارننگ ـــــ ہاؤ آر یو روزی ـــــ؟"

"فائن۔ تھینک یو۔ مسز کینٹ ویل۔ ہاؤ از ڈسکی۔؟"

ڈسکی کتا تھا۔ جو بھاگتا ہوا برآمدے میں آیا۔

"یس روزی ـــــ؟" مسز کینٹ ویل نے سوالیہ انداز سے اسے دیکھا۔ انھوں نے اسے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔ اُسے ڈرائنگ روم میں نہیں لے گئیں۔ وہ اس سے اس طرح مخاطب تھیں۔ جس طرح ڈاکئے پھیری والے یا اخبار فروش سے کھڑے کھڑے بات کی جاتی ہے۔

"ہاؤ از دی اولڈ پادرے ـــــ؟" فریڈا کینٹ ویل نے جھک کر ڈسکی کو گود میں اٹھاتے ہوئے دریافت کیا ـــــ "تم کسی خاص کام سے آئی ہو ـــــ؟"

میں۔ روزی شریلا بنرجی۔ ریورنڈ پال میتھیو بنرجی کی بیٹی۔ انسان ـــــ محض ایک حقیر ہندوستانی ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ حقیر ہندوستانی جہاں آرا بھی ہے۔ مگر نواب قمرالزماں چودھری اور بیرسٹر پری توش رائے اعلیٰ طبقے کے افراد ہیں اور ڈی۔ ایم سے برابری سے ملتے ہیں۔ جہاں آرا بیگم اور اوما رائے کو فریڈا کینٹ ویل اپنے ہاں ڈنر پر بلاتی ہیں اور ان کے گھر جا کر ڈنر کھاتی ہیں۔ اور میں محض ان کے پروردہ نیٹو پادری کی لڑکی ہوں۔

چند سیکنڈ قبل روزی نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ یہ کہہ کر کہ انھیں "میری کرسمس" وش کرنے آئی تھی۔ واپس بھاگ جائے گی۔ جہنم میں جائے انڈر گراؤنڈ ـــــ مگر اب اس نے یک لخت سر اٹھا کر دھڑلے سے انھیں جواب دیا ـــــ "جی ہاں ایک ضروری کام ہے"۔ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اس نے پوسٹ کارڈ سوئیٹر کی جیب سے نکالا اور بولی۔ "لیلا بتی کی نانی کا کارڈ ماما کے پاس آیا ہے۔ وہ بوڑھی عورت بہت سخت بیمار ہے"۔

"اوہ ـــــ ڈیم ـــــ عبدالغفور ـــــ آیا کو بلاؤ ـــــ" فریڈا کینٹ ویل نے کہا اور ٹہلتی ٹہلتی جا کر گملوں کے پاس کھڑی ہو گئیں۔

آیا باہر آئی ـــــ روزی نے اُسے بنگالی میں نانی کی خبر سنائی۔ اور پوسٹ کارڈ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ بے چاری عورت کا رنگ فق ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"گھبرانے کا بات نہیں آیا ـــــ" فریڈا کینٹ ویل نے مڑ کر کہا۔ "جیاستی بیمار ہوتا تو ٹیلی گرام

دیتا تمھارا گرینڈ مدر ـــــ ڈونٹ یو تھنک سو روزی ؟"

" ہم کو چھٹی دے گا میم صاحب ۔ ؟" لیلا نے کہا۔

" جاؤ ـــــ مگر عیوضی کا انتظام پہلے کرنا مانگتا۔" کمر پر ہاتھ باندھے پیچھے کھڑے عبدالغفور نے لقمہ دیا۔ ظاہر تھا کہ عبدالغفور میم صاحب کے منہ چڑھے ملازم ہیں۔

" عیوضی ـــــ ؟ او خدا باپ ـــــ مس صاحب ـــــ ادھر کمپاؤنڈ میں ڈیزی یا سوشیلا ابھی ہیں گی ؟" لیلا نے گھبرا کر پوچھا۔

" ادھر بنگلے پر ٹرینڈ آیا مانگتا مس صاحب ۔ عیوضی میں۔" عبدالغفور نے روزی سے کہا۔ مسز کینٹ ویل معاملہ عبدالغفور پر چھوڑ کر مالی کو ہدایات دینے کے لئے برآمدے کے دوسرے سرے پر چلی گئیں جو ایک آویزاں گملے کے نیچے کھرپی لئے کھڑا کچھ سٹر پٹر کر رہا تھا۔

روزی ان کے پیچھے پیچھے گئی۔ "مسز کینٹ ویل ۔ ماما نے لیلا کو اپنی اولاد کی طرح پالا ہے اس لئے ان کو اس کی بڑی فکر ہے ۔ ابھی یہ کارڈ آیا تو ماما کو بھی عیوضی کا خیال آیا تھا۔ ہمارے درزی کی بھانجی آیا کا کام جانتی ہے ۔ اگر آپ کہیں تو بھیج دوں ـــــ"

فریڈا کینٹ ویل روزی کی طرف مڑیں۔ یہ نازک ترین لمحہ تھا۔

" درزی کی بھانجی ـــــ ؟ کون سا درزی ۔ ہمارا حسن علی ؟" انھوں نے پوچھا۔ ظاہر تھا کہ فریڈا کینٹ ویل ایک خالص گھریلو بی بی یعنی ہاؤس وائف تھیں اور درزیوں اور نوکروں کے سلسلے میں انھیں گہری دلچسپی تھی۔

اب روزی ہڑبڑائی ـــــ "جی نہیں ـــــ مشن کا ایک پرانا درزی تھا۔ کریم اللہ ۔ وہ اب چلا گیا ہے ۔ اس کی بھانجی کلثوم کچھ روز ہوئے ماما کے پاس کام کی تلاش میں آئی تھی ۔ انگریزی نہیں جانتی ۔ مگر بڑی ایماندار لڑکی ہے ۔ بیوہ ہے ـــــ" لاشعوری طور پر روزی نے اپنی ماں کی کہانی دہرا دی۔

" اگر تم اس کی ذمہ داری لیتی ہو تو بھیج دو۔ میرے کمروں میں سارا سامان کھلا پڑا رہتا ہے۔ بل کے بکس تک کھلے رہتے ہیں ۔ ہمیں اپنے نوکروں پر اتنا بھروسہ ہے۔"

" اچھا ۔ لیلا میں جوزف کے ساتھ کلثوم کو بھیج دوں گی ۔ تم اسے سارا کام سمجھا دینا۔" روزی نے آیا کو مخاطب کیا۔

" اچھا۔ روزی بابا۔ گاڈ بلیس یو روزی بابا ـــــ" لیلا نے سر ہلا کر کہا۔

فریڈا کینٹ ویل اب سیڑھیاں اتر کر کیسنتھیم کی ایک کیاری کا معائنہ کر رہی تھیں ۔ روزی نے ان کو "بائی" کہا اور سائیکل پر بیٹھ کر فراٹے سے باہر نکلی۔

جب وہ سڑک پر پہنچی تو پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔
اُس وقت صبح کے گیارہ بجے تھے۔

چندر کنج جا کر دیپالی کو تفصیل بتانے کے بعد روزی کمپاؤنڈ واپس آ گئی اور اس کے جانے کے ایک گھنٹے بعد اومارائے کی کار چندر کنج کے پھاٹک پر آ کر رکی۔ اومارائے شال لپیٹے نیچے اتریں۔ وہ حسب معمول بہت مضمحل نظر آ رہی تھیں۔

ڈاکٹر سرکار برآمدے میں کھڑے اخبار پڑھ رہے تھے ـــــ اجنبی مہمان خاتون کو دیکھ کر ذرا گھبرا سے گئے اور نمسکار کیا ـــــ اومارائے نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا۔ اور اپنا تعارف کرایا۔

ڈاکٹر سرکار ان کو بیٹھک خانے میں لے آئے۔ دیپالی کواڑ کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔ اومانے آواز دی۔

"دیپالی"۔

"جی اومادی"۔

"وہ جو مضمون میں نے تم کو لکھنے کو دیا تھا۔ کچھ کامیابی ہوئی ـــــ؟"

"جی اومادی۔ پوری کامیابی"۔

"گڈ ـــــ" اومارائے نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر وہ ڈاکٹر سرکار سے مخاطب ہو گئیں۔ اور کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولیں۔ "بنوئے بابو ـــــ میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آئی تھی۔ دراصل ـــــ"

"کہیے"۔

"میں ہفتہ بھر کے لئے کومیلا اپنے گاؤں جا رہی ہوں ـــــ اگر آپ اجازت دیں تو دیپالی کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ اس کا کالج بند ہوا ہے۔ ذرا یہ بھی سیر تفریح کر لے بے چاری"۔

ڈاکٹر سرکار چُپ ہو گئے۔ مگر اپنی قدامت پسندی کے باوجود وہ ایسی اعلیٰ خاندان اور بلند سیرت خاتون سے انکار نہ کر سکتے تھے۔ انھیں یہ بھی احساس تھا کہ تنگدستی کی وجہ سے وہ دیپالی کو کسی قسم کی سیر تفریح نہیں کرا پاتے۔

اب تینوں لڑکے اندر آ چکے تھے۔ اور کان لگا کر مکالمہ سن رہے تھے۔

"ہم بھی چلیں گے"۔ چھوٹے دونوں نے شور مچایا۔

"تمھارا میچ ہے۔ کیسے جاؤ گے؟" دیپالی نے اندر سے نکل کر ڈانٹا۔

"تو گویا پروگرام پہلے سے بن چکا ہے"۔ ڈاکٹر سرکار نے کہا۔

"پرسوں نرسوں اُدما دی نے ذکر کیا تھا۔" دیپالی نے ذرا گھبرا کر جواب دیا۔ "میں چلی جاؤں بابا؟"

"جاؤ ــــ ہو آؤ ــــ کیا آج ہی جا رہی ہو؟"

"جی ہاں ــــ رات کے اسٹیمر سے داؤد کندی پہنچنے کا ارادہ ہے۔ اچھا۔ دیپالی۔ تم تھوڑا سا سامان باندھ لو۔ میں تیسرے پہر کو کار بھیج دوں گی۔" اوما نے کہا اور ڈاکٹر سرکار سے باتوں میں مصروف ہو گئیں۔

دیپالی نے اچانک اپنے باپ پر نظر ڈالی۔ بابا مدتوں بعد، خلاف معمول ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ اتنی آسانی سے اجازت دے دی! ــــ بابا ــــ! تم پر اُوما دی کا جادو چل گیا! کومیلا کی رہنے والی ہیں۔ ضرور کوئی منتر جانتی ہوں ہوگی۔ سارے کامریڈ ان کی غیر حاضری میں بھی ان کا وظیفہ پڑھتے تھے۔ اب دیکھو کس طرح بابا کو منٹوں کے اندر شیشے میں اتار لیا۔ بے چارے بابا۔ اس نے تاسف سے پوچھا۔ اوما دی کی زندگی میں سیاست کے علاوہ اور کسی بات کی گنجائش بھی ہوگی؟ اس نے سر اٹھا کر اپنی ماں کی تصویر کو دیکھا، جس کے نیچے اوما رائے کرسی پر بیٹھی ڈاکٹر سرکار سے مخاطب تھیں اور بار بار حسب عادت عینک اتار کر آنکھیں جھپک کر ڈاکٹر سرکار کو دیکھتی تھیں۔ اور پھر عینک پلّو سے صاف کر کے لگا لیتی تھیں۔ اوما دیبی کی آنکھیں بڑی بڑی اور سرمگیں تھیں۔ کاش بابا اور اوما دی ــــ لیکن کوئی تک نہیں ہے۔ اوما دیبی بڑی سخت دل معلوم ہوتی ہیں۔ حالانکہ اتنی نرم دل بھی ہیں

اُوما رائے کے جانے کے بعد اپنے کمرے میں اٹیچی کیس پیک کرتے ہوئے وہ دیر تک یہ سب سوچنے میں ایسی کھوئی رہی کہ آنے والے دنوں کے خطرے اور نزاکت کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آیا۔

ٹھیک ساڑھے تین بجے اوما رائے کی کار آ گئی۔ دیپالی دری کا چھوٹا سا بستر اور اٹیچی کیس اٹھائے چندر کنج سے نکلی اور کار میں جا بیٹھی۔

## ۹

# کلثوم آپا

ساڑھے چار بجے شام مشن کمپاؤنڈ کا بوڑھا اور معتبر چوکیدار جوزف اپنے ہمراہ کلثوم آپا کو لے کر

ڈی ایمز ہاؤس پہنچا۔ میم صاحب ابھی سو رہی تھیں۔ صاحب کچہری سے نہیں آیا تھا۔ لیلا بتی سامان باندھے نرائن گنج جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ اُس نے کلثوم بی بی کو اندر بُلا لیا۔ اور کام سمجھانے میں مصروف ہو گئی۔ کوٹھی کے سارے کمرے دکھائے اور اس کے فرائض سے روشناس کیا۔

"شام کے ٹیم"۔ لیلا بتی اپنا انگوٹھا اٹھا کر منہ تک لے گئی۔ "صاحب، میم صاحب دھت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد چھٹی۔ میم صاحب رات کو کپڑا خود بدلی کرتا ہے۔ بچہ کوئی نہیں ہے۔ صاحب، میم صاحب دونوں بہت شریف آدمی ہے۔ تم خوش رہے گا۔ ہفتہ دس روز کا تو بات ہے"۔ لیلا اسے پچھلے برآمدے کے سرے پر اپنی کوٹھری میں لے گئی۔ کلثوم نے اپنا اٹیچی کیس چارپائی کے نیچے سرکا دیا۔ کوٹھری میں سر کے تیل کی عجیب سی بو بسی تھی۔ اسے اُبکائی سی آئی۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔

شام کی چائے کے وقت میم صاحب نے طلبی کی۔ لیلا اسے اپنے ساتھ لے کر گئی۔ صاحب، میم صاحب لان پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کلثوم نے جُھک کر سلام کیا۔

"پہلے کہیں کام کیا ہے؟" میم صاحب نے انٹرویو شروع کیا۔

"کلکتے میں میم صاحب"۔

"کدھر کا رہنے والا ہے؟"

"میمن سنگھ ـــ ادھر لال باغ میں ہمارا ماموں ہے۔ اس کے پاس رہتا ہے"۔

"بل ـــ پادرے کی لڑکی نے یہ آیا بھیجی ہے۔ آئی تھنک شی وِل ڈو ـــ" مسز کینٹ ویل نے شوہر کو مخاطب کیا۔

ولیم کینٹ ویل نے بے پرواہی سے سر خم کیا اور اسٹیٹسمین پڑھنے میں مصروف رہے۔

کلثوم بی بی نے اپنی مستعدی اور خدمت گذاری سے فریڈا کینٹ ویل کو منٹوں میں رام کر لیا اور فریڈا کینٹ ویل کو خاصی سیدھی تھیں۔ فوراً اس کے آگے لیلا بتی کی شکایتیں کرنے لگیں۔ کاہل اور کام چور ہے دن بھر سوتی ہے۔ پادرے کی بیوی کی سفارش پر اتنے دنوں سے رکھا ہوا ہے۔ اگر وہ گاؤں سے واپس نہ آئے تو تم یہیں رہنا کُھل سُم۔

کلثوم نے اقرار میں سر ہلایا۔ اور میم صاحب کے پاؤں دباتی رہی۔

وہ پردے کی وجہ سے شاگرد پیشے کی طرف بالکل نہیں گئی۔ نہ دوسرے ملازموں کے سامنے آئی۔ بوڑھے عبدالغفور میاں ہم مذہبی کے ناطے اس کے متعلق خاصی دلچسپی لے رہے تھے۔ ان کا بڑا لڑکا نواب پورے میں سائیکلوں کی دوکان پر نوکر تھا۔ مگر آوارہ ہوتا جا رہا تھا۔ عبدالغفور چاہتے تھے کوئی نیک بے زبان لڑکی ملے تو دو بول پڑھوا دیں۔ چنانچہ کلثوم کے گھر کے حالات اور اس کی بیوگی کی المناک داستان سن کر انھیں اس سے اور زیادہ ہمدردی ہو گئی اور وہ اس کی خاطر مدارات میں

لگے رہے۔

"کرسمس ایو" کی وجہ سے وہ شام بے حد مصروف اور ہنگامہ خیز گزری۔ کلثوم رات گئے تک کام میں لگی رہی۔ دوسری صبح بڑا دن تھا۔ سویرے ہی سے سامنے کا برآمدہ ڈالیوں سے بھر گیا۔ سلام کے لئے آنے والے ہندوستانیوں کا تانتا بندھا۔ شام کو صاحب لوگ آئے۔ وہ دن بھی بڑا مصروف گزرا۔

تیسرے روز کلکتے سے مہمان آنے والے تھے۔ عبدالغفور بڑے دن اور مہمانوں کی آمد کی وجہ سے کام کی زیادتی کا شکوہ کرتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے تو کلثوم نے ان سے کہا۔ "چچا لاؤ جھاڑ پونچھ میں کئے دیتی ہوں۔ اتنے میں تم کٹلری صاف کر ڈالو"۔ بنگلے پر اَن گنت ملازم تھے۔ مگر گول کمرے صاحب اور میم صاحب کے کمرے اور کھانے کمرے کی صفائی عبدالغفور خود کرتے تھے۔ جھاڑن کندھے پر ڈال کر عبدالغفور پیٹھ پر ہاتھ رکھے جھکے جھکے پینٹری کی طرف چلے گئے۔ پھر واپس آکر انھوں نے کلثوم سے کہا۔ "سب چیز بست اچھی طرح جھاڑنا۔ میم صاحب گرد کا ایک ذرّہ بھی دیکھ لیں تو مار ڈالیں گی"۔

میم صاحب صبح کے ٹیم ملنے ملانے باہر جا چکی تھیں۔ کلثوم ڈرائنگ روم کی صفائی کرنے کے بعد سب سے پہلے صاحب کے دفتر کے کمرے میں گئی۔ جس کے سب دروازے اندر سے بند تھے۔ اس نے صاحب کی میز کے کاغذات سنوارے، فائیل سلیقے سے رکھے۔ ایک آدھ دراز جو ادھ کھلی پڑی تھی اسے بھی ٹھیک کر دیا۔ اور آدھ پون گھنٹے تک کمرے کی جھاڑ پونچھ میں مصروف رہی۔

میم صاحب کی واپسی سے ذرا قبل وہ ان کے ڈریسنگ روم میں آکر ان کے کپڑوں پر استری کرنے میں مشغول ہو گئی۔

مہمان کلکتے سے رات کو پہنچے۔ اس وقت کلثوم اپنی کوٹھری میں جا کر سو چکی تھی۔

بریکفاسٹ کی میز پر اس نے مسٹر گل برٹ پلومر انسپکٹر جنرل پولس اور ان کی میم کی جھلک دیکھی۔ مگر ڈائننگ روم میں اس کا کوئی کام نہ تھا۔ ناشتے کے بعد میم صاحب نے اس سے کہا کہ مسز پلومر کے پاس جائے

چنانچہ وہ گیسٹ روم میں پہنچی اور جھک کر سلام کیا۔ مسز پلومر ادھیڑ عمر کی خوش مزاج خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے کپڑے نکال کر کرسی پر رکھے۔ مسٹر پلومر کا اردلی ابھی کمرے میں نہ آیا تھا۔ کلثوم نے دھوبی کو بلایا۔ سفر کے کپڑے دھوبی کو دینے کے لئے مسز پلومر نے گنگناتے گنگناتے سارا سامان تلپٹ کر دیا۔ بہت سے سرکاری کاغذات تتر بتر ہو گئے۔ کلثوم نے سلیقے سے ان سب کو سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔

"گڈ گرل ــــ!" مسز پلومر نے کہا۔ "ہمارے ساتھ کیل کٹا چلے گا؟" (مسز کینٹ ویل

نے ان کو بتا دیا تھا کہ یہ آیا عارضی ہے)

کلثوم نے شرما کر منہ میں پلو ٹھونس لیا۔ "میم صاحب ہمارا سادی ہونے والا ہے۔"

"سادی! ویری گڈ ـــــ لو کھل سُم ـــــ یہ صاحب کا بکسا اِدھر رکھو۔ اس میں بڑا جروری کاگج رکھا ہے۔ صاحب اس کی چابی مانگے گا تو ہم کو آکر بولنا۔ چابی ہمارے اس نیلے بیگ میں ہے۔ ٹھیک ہائے؟"

"ٹھیک ہے میم صاحب ـــــ" کلثوم نے جواب دیا۔

رات کو کھانے کے بعد مسٹر کینٹ ویل اور مسٹر پلومر شراب کے گلاس ہاتھ میں لے کر ڈرائنگ روم کے دروازے اندر سے بند کئے آہستہ آہستہ گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ اتفاق سے کلثوم برابر والے اندھیرے کمرے میں ہی موجود تھی۔ جس کا دروازہ پہلے سے کھلا رہ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد صاحب نے پکارا ـــــ "کوئی ہائے ـــــ عبدل"۔

کلثوم دبے پاؤں پینٹری میں گئی ـــــ جہاں عبدالغفور عشاء کی نماز میں مصروف تھے (میم صاحب اور مسٹر پلومر اپنے اپنے کمروں جا کر سو چکی تھیں) صاحب نے دوبارہ آواز دی تو کلثوم بھاگی بھاگی ڈرائنگ روم کے گیلری والے دروازے پر پہنچی اور دستک دی۔ صاحب نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اور اس پر اس طرح نظر ڈالی جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ وہ ذرا جھینپ گئی۔ مگر اس نے فوراً کہا۔

"صاحب عبدل نماز پڑھ رہا ہے۔ کیا کام ہے؟"

"تم اب تک کیوں جاگ رہی ہو کھل سُم۔؟" مسٹر کینٹ ویل نے پوچھا۔ ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"میں میم صاحب کے پاؤں دبا رہی تھی۔ صاحب"۔

"اوہ اچھا"۔

کلثوم نے ایش ٹرے خالی کی۔ سیگرٹ کا نیا ٹن کھول کر مہمان کے قریب تپائی پر رکھا۔ اس دوران میں دونوں صاحب لوگ پھر گفتگو میں محو ہو چکے تھے۔ لیکن جب وہ کمرے سے باہر نکل رہی تھی تو دفعتاً مسٹر پلومر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور شگفتگی سے کہا۔ "آئی سے بل۔ دیٹس اے پرٹی گرل"۔ کلثوم ہڑبڑا کر گیلری میں پہنچی اور سرپٹ دوڑتے ہوئے اپنی کوٹھری میں جا کر کھاٹ پر لیٹ رہی۔

مسٹر پلومر صوبے کے اعلیٰ پولیس اور رسول حکام کی ہنگامی کانفرنس کے لئے ڈھاکے آئے تھے۔ ایک روز ایک اہم میٹنگ ڈی۔ ایم کے بنگلے پر بھی ہوئی۔ جس میں بیرسٹر رائے کے سالے دھریندر موہن سین ڈی۔ آئی۔ جی بھی شامل تھے۔ بنگلے پر پولیس اور سی آئی ڈی والوں کی ریل پیل

تھی۔ کلثوم مستعدی سے اس دوران میں مسز پلوُمر کی حاضری میں رہی۔ کلکتے واپس جاتے وقت مسز پلوُمر نے اس کو دس روپے بخشیش دیئے۔

دسویں دن لیلا بتی اپنے گاؤں سے واپس آگئی۔ آتے ہی اس نے کلثوم کے کان میں کہا "نانی بیمار نہیں تھی۔ مجھے بہانے سے بلوایا تھا ورنہ میم صاحب چھٹی نہ دیتیں"۔

جس دن لیلا بتی ڈی۔ ایم کے بنگلے پر اپنی ڈیوٹی بجانے واپس پہنچی۔ اسی روز شام کو اُدما رائے کی موٹر دیپالی سرکار کو چندر کنج واپس چھوڑ گئی ـــــ دیپالی نے ڈاکٹر سرکار کو بتایا کہ اس نے کومیلا میں اُدما رائے کے کنٹری ہاؤس میں بے حد خوشگوار وقت گذارا۔

۹ر جنوری ۱۹۴۰ء کو پولیس نے دریائی راستوں کی ناکہ بندی کر کے ریحان الدین احمد اور اس کے ساتھیوں کے خفیہ مستقر اور خفیہ پریس پر چھاپہ مارا۔ مگر ریحان الدین احمد اور اس کے ساتھی وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ اور اب کی مرتبہ وہ ایسے غائب ہوئے تھے کہ پانچ اضلاع کی پولیس ان کو تلاش کرتے کرتے عاجز آگئی۔ مگر ان کا سراغ کہیں نہ ملا۔ یورپ میں جیسے جیسے جنگ نے زور پکڑا اور برطانیہ کمزور پڑتا گیا۔ ہندوستان میں پولیس کی سرگرمیوں میں تیزی آگئی۔ بنگال میں ریحان الدین احمد اور ان کے ساتھیوں کی تلاش بھی تندہی سے جاری رہی۔ مگر وہ سب شاید فضا میں تحلیل ہو چکے تھے۔

لیکن جنگ کے خلاف اور خانہ جنگی کے پرچار میں ان کا لٹریچر اسی طرح خفیہ ٹھکانوں سے چھپتا اور تقسیم ہوتا رہا۔

## ۱۰

# ویشنو بیراگی

کلپ ترو دیو مالا کا وہ درخت ہے جو سمندر منتھن سے نکلا تھا۔ اور اس کے پھولوں میں اپنی مرضی کے مطابق کوئی سی بھی خوشبو سونگھی جا سکتی تھی۔ اور جو ہر خواہش پوری کر دیتا تھا۔

شانتی نکیتن میں برہمو مندر کے پاس ایک پرانا برگد کھڑا ہے۔ دیپالی سرکار اسے اپنا کلپ ترو سمجھتی ہے۔ کیونکہ ایک روز اس درخت نے بڑے انوکھے اور غیر متوقع انداز میں اس کی ایک

خواہش پوری کردی۔

ایسٹرن ریلوے کی صاحب گنج لوپ لائن پر کلکتے سے سو میل کے فاصلے پر سنتھال پرگنہ کے نزدیک بول پور ایک جگہ کا نام ہے۔ بول پور آج سے سو برس پہلے اپنے ڈاکوؤں کے لئے مشہور تھا۔ کیونکہ اس علاقے کی کنکریلی زمین میں کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور یہاں کے باشندے ڈاکے ڈال کر اپنا پیٹ پالتے تھے۔ وہ چھری، جس سے یہ ڈاکو مسافروں کا گلا کاٹتے تھے بول کہلاتی تھی اور اسی وجہ سے اس ویرانہ کا نام بول پور پڑ گیا تھا۔

ہمالیہ پر شانتی کی تلاش سے ناکام لوٹنے کے بعد ایک مرتبہ مہارشی دیویندر ناتھ ٹیگور زمیندار سنہا سے ملنے پالکی میں بیٹھے رائے پور جا رہے تھے۔ جب بولپور کا یہ سنسان بیہڑ راستے میں پڑا۔ اس میدان میں مہارشی کو ایک بڑا سایہ دار درخت نظر آیا۔ انھوں نے پالکی وہیں رکوالی۔ اور درخت کی چھاؤں میں قالین بچھا کر مراقبے میں مصروف ہو گئے۔ وہاں انھوں نے "یو دیو دگر دیو پسو دشوم بھون مادیو یشھ یہ اوشدھی شو یو و نسپتی شو تسمیٔ دیوا یہ نمو نماہ ــــ" والی ویدک حمد دہرائی۔ اور مہارشی کو اس درخت کے نیچے وہ شانتی مل گئی۔ جس کی کھوج میں وہ سارے ہندوستان میں گھومے تھے۔

انھوں نے رائے پور جا کر زمیندار سنہا سے یہ علاقہ خرید لیا۔ درخت اور باغ لگوائے۔ ڈاکوؤں نے ڈاکہ ڈالنے سے توبہ کی۔ اور ۱۸۶۳ء میں مہارشی نے اپنی آرام و آسائش کی زندگی تیاگ کر یہاں شانتی نکیتن آشرم قایم کیا۔ شانتی نکیتن وِلا تعمیر کروائی اور یہاں رہنے لگے۔ برگد کے اس درخت کے نیچے انھوں نے ایک مرمریں معبد بنوا کر اس کے پھاٹک پر لکھوایا۔

آمار پرنیر آرام
مو نیر آنند
آتمار شانتی۔

اس درخت کے نیچے مہارشی کو خدا مل گیا تھا۔

آج یہ شانتی نکیتن ہند قدیم کی جنگل کی درس گاہوں کی طرز پر بنے ہوئے دارالعلوم وشوا بھارتی انٹرنیشنل یونی ورسٹی کے نام سے دنیا میں مشہور ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے گاندھی اور واردھا آشرم، نہرو اور آنند بھون اور ٹیگور اور شانتی نکیتن والے ہندوستانی کو قومی جدوجہد کے ایک انتہائی نازک موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ اور گو شانتی نکیتن کی فضائیں ہمیشہ کی طرح پر سکون اور نغمہ بار ہیں۔ اور گرودیو ابھی زندہ ہیں۔ اور ڈاکٹر نند لال بوس اور اپندر ناتھ ٹیگور اور

ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے دوسرے عظیم مصوّر کلا بھون میں موجود ہیں۔ مگر بیرونی دنیا کے معاملات تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں۔

آمار پرانیر آرام
مونیر آنند
آتمار شانتی۔

ستمبر ۱۹۴۰ء کی ایک شام شانتی نکیتن کی ایک نئی طالب علم تھرڈ ائیر کی دیپالی سرکار برگد کے نیچے بیٹھی مرمریں پھاٹک پر منقش ان سحر انگیز الفاظ پر نظر ڈال کر سوچ رہی تھی۔ کمال ہے مہارشی کو اتنی آسانی سے یہ سب کچھ حاصل ہو گیا تھا۔ مگر مہارشی کبھی بیس برس کے بھی تو رہے ہوں گے۔

اپنی نوٹ بک بند کر کے وہ برگد کے پتوں کی ناؤ بناتے بناتے سوچنے لگی۔ کلپ ترو! زندگی کے پتے گرتے جا رہے ہیں۔

"الکھ نرنجن ــــ!" دور سے آواز آئی۔ اُس نے چونک کر جنگل کی طرف دیکھا۔ دور ایک پگڈنڈی پر چند ویشنو بیراگی نعرہ لگاتے تیز تیز چلے جا رہے تھے۔

دیپالی کو یاد آیا کہ یہ بیر بھوم ہے۔ چنڈی داس کی سرزمین۔ اس نے جھک کر سُرخ مٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔ چنڈی داس کی سرزمین۔

وہ کتابیں سمیٹ کر ہوسٹل واپس جانے کے ارادے سے اٹھنے لگی۔ کہ اچانک سامنے پگڈنڈی پر پتے کھڑکھڑائے۔ اس نے نظریں اٹھا کے دیکھا۔ ایک لمبی سیاہ داڑھی اور سیاہ زلفوں والا ویشنو سنیاسی عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور سنیاسی کو پرنام کیا۔ تب اس نوجوان بیراگی نے بڑی شگفتگی سے کہا۔ "دیپالی۔ ہم یہاں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جائیں؟ ہمیں لگتا ہے تمھیں روحانیات کے درس کی اشد ضرورت ہے۔"

دیپالی کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ پھر اس نے جھولے میں سے سیگرٹ نکال کر جلایا مگر فوراً ہی بجھا دیا۔

"بچہ ــــ ہم تجھ سے بہت زیادہ خوش ہیں۔ تو نے ہماری بہت سیوا کی ہے۔ اور ہم تیری بہادری کے سخت قائل ہو گئے ہیں۔ تو واقعی کمال کی لڑکی ہے۔"

دیپالی نے بھویں جوڑ کر کہا۔ "آپ۔؟"

"ہاں بٹیا!"

دیپالی سراسیمہ ہو گئی۔ "آپ کو اس قدر ریک لیس نہ ہونا چاہئے۔ اب میں کسی کی آیا وایا

بننے نہیں جاؤں گی"۔

"ریک لیس ـــــ؟ یہ شانتی نکیتن تو اپنا پرانا اڈہ ہے بچہ"۔

برگد کے نزدیک مرمریں عبادت گاہ میں کسی نے چراغ جلا دیا۔ پھر قدموں کی چاپ دور ہو گئی۔

"تو پوجا پاٹ نہیں کرتی بٹیا۔؟"

دیپالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سنیاسی نے پھاٹک پر لکھے ہوئے الفاظ پر نظر ڈالی پھر وہ بھی کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ اب شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔

"آپ ـــــ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں اس وقت یہاں مل جاؤں گی؟" چند لمحوں بعد دیپالی نے سر اٹھا کر اس سے پوچھا۔

وہ اپنے خیالوں سے چونکا اور دفعتاً ہنس پڑا۔ "اپنے علم کے زور سے۔!" پھر کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔ "ہمیں تیرے متعلق سب معلوم رہتا ہے۔ بچہ ہم جانتے ہیں کہ تو روز شام کو یہاں بیٹھ کر اپنا ہوم ورک کرتی ہے"۔

"تو بتلائیے اب میرے لئے کیا کام ہے۔" دیپالی نے ذرا درشتی سے کہا۔

"کیا ہم کسی کام کے بغیر تجھ سے نہیں مل سکتے۔؟" سنیاسی نے اطمینان سے جواب دیا اور چبوترے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا رہا۔ اندھیرے میں اس کی شکل صاف نظر آ رہی تھی۔

ہوا کے ایک جھونکے نے شرائن میں لگے ایک درخت کے سُرخ پھول چبوترے پر بکھیر دیئے بہت دور سال کے ایوینو میں گرو دیو کسی سے باتیں کرتے ہوئے گذر رہے تھے۔

"گرو دیو جا رہے ہیں"۔ سنیاسی نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ دیپالی بھی چبوترے پر سے اٹھی۔ گرو دیو اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

دفعتاً دیپالی کو محسوس ہوا کہ یہ شام منفرد ہے۔ پھر کبھی واپس نہ آئے گی۔

سنیاسی نے جھولے میں سے نکال کر گھڑی دیکھی اور پہلی دفعہ سنجیدگی سے کہا۔ شوکتی[1]، لو تمھیں ایک کام بتا ہی دیں"۔

دیپالی نے تیوری پر بل ڈال کر اسے دیکھا۔ "میرا نام دیپالی ہے"۔

"ہاں، لیکن تم میری شوکتی ہو۔ چلو جلدی سے ایک اور کام کر دو تھوڑا سا"۔

دیپالی گم سُم کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ "کہئے"۔ اس نے پھاٹک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمیں کہیں سے سیگرٹ لا دو۔ ہمارے پاس یہی ایک سگرٹ بچا ہے اور بہت دور جانا ہے"۔

---

[1] شکتی

"بہت اچھا۔ لیکن آپ محض سگریٹ لینے ــــ"

"ہم تمھیں درشن دینے آئے تھے بچہ ــــ"

"سگریٹ کے علاوہ اور کچھ تو نہیں چاہیے؟" دیپالی نے فکرمندی سے دریافت کیا۔

"فی الحال نہیں"۔ وہ پھر چبوترے کے کنارے پر ٹک گیا۔ اور بڑی گمبھیر آواز میں کہنے لگا۔

"دیپالی۔ میں اس لئے آیا تھا کہ تمھیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اب تک تم میرے لئے محض ایک اور "رابطہ" محض ایک اور نام رہی ہو۔ یا دھندلکے میں سنی ہوئی ایک اور آواز۔ تمھارے گھر پر بھی ــــ"

"میں آپ کا سگریٹ لے آؤں"۔ دیپالی نے گھبرا کر اس کی بات کاٹی۔

"ہم سے ڈرو مت بچہ۔ ہم ایک بہت شریف سادھو ہیں"۔

دیپالی ہنس پڑی اور یک لخت اسے اوما رائے کی ڈانٹ یاد آئی۔ اسکول گرل گِگلز ــــ اور اوما رائے کے خیال نے اسے اچانک دل گرفتہ اور پریشان کر دیا۔

"تمھارے صاحب اور میم صاحب کیسے ہیں؟"

"اُن کا تبادلہ ہو گیا۔ ان کی جگہ چارلس بارلو آئے ہیں۔ ریورنڈ بنرجی کے ان سے بھی بہت اچھے تعلقات ہیں۔ کیونکہ مسٹر بارلو کی بڑی بہن باریسال میں مشنری ہیں۔ چاٹ گام سے تبدیل ہو کر آئے ہیں"۔

"روزی خیریت سے ہے؟"

"جی"۔

"کسی کو اس کے متعلق کوئی شبہ تو نہیں ہوا؟"

"جی نہیں"۔

"اسے خط لکھ کر پوچھو کہ چارلس بارلو کُھلنا کس روز پہنچ رہا ہے۔ چارلس بارلو کے نام کا کوڈ یاد ہے۔؟" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"جی ہاں"۔

"بتاؤ تو"۔

دیپالی نے بتلایا۔

"ونڈرفل"۔ سنیاسی نے خوش ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر گھبرا کر جلدی سے ہٹا لیا۔

"اوما سے کب سے نہیں ملیں؟" سنیاسی نے دیپالی کا رنگ بدلتے نہیں دیکھا۔ اس نے اوما کا نام جس انداز سے لیا تھا۔

"آپ لوگوں کے غائب ہونے کے دوسرے ہفتے ہی تو وہ کلکتہ چلی گئی تھیں۔ ابھی تک وہیں ہیں۔ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں بابا کے ساتھ کلکتہ گئی تھی۔ گانے ریکارڈ کروانے۔ مگر اومادی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ اور انھوں نے مجھے کوئی خط پتر کبھی بھیجا نہیں ـــــ وہ کلکتے میں کسی کالج میں پڑھا رہی ہیں۔ اپنے بھائی کے ساتھ بالی گنج میں رہتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ چونکہ پارٹی کی باقاعدہ ممبر نہیں اس لئے نہ انڈر گراؤنڈ میں گئیں نہ جیل۔ ٹھیک ہے نا؟ اور سنا ہے ان کے ڈی آئی جی ماموں نے گورنمنٹ کو ضمانت دی ہے کہ وہ گڑبڑ نہیں کریں گی۔ آپ کو تو یہ سب معلوم ہی ہوگا۔"

"ہاں۔ معلوم ہے ـــــ" پھر اس نے ذرا توقف سے کہا۔ اچھا جاؤ۔ بھاگو۔ سگریٹ لے کر آؤ۔ جو بھی ملیں۔"

"آپ اس راستے پر جائیے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

"اچھا ـــــ" سنیاسی چلنے لگا۔ پھر ٹھٹھک گیا۔ "ایک بات اور۔ کیپٹن ویل تازہ وارد اور ناتجربہ کار نوجوان تھا۔ بارلو پرانا گھاگ ہے۔ اس کے باپ دادا تک بنگال سویلین تھے۔ اس چیز کا تم لوگ خیال رکھنا۔ بڑا سخت گیر افسر ہے۔ ٹررسٹ تحریک کے زمانے میں کئی نوجوان کو پھانسی کے تختے پر بھجوا چکا ہے۔"

دیپالی کو کپکپی سی آئی۔ سنیاسی کہتا رہا۔ "روزی سے کہنا بے حد احتیاط سے کام لے کر ہمیں اطلاعات پہنچوائے اور اپنے باپ کو کسی طرح ناراض یا ناخوش نہ کرے۔ یہ بے حد ضروری ہے۔"

"بہت اچھا۔" دیپالی نے جواب دیا۔ سنیاسی پگڈنڈی پر آگے بڑھ گیا۔ دیپالی بھاگتی ہوئی عمارتوں کی طرف چلی گئی۔

چند منٹ بعد وہ واپس آئی اور برگد کے سنسان چبوترے پر ایک نظر ڈال کر سال کے ایونیو پر دوڑنا شروع کر دیا۔ سنیاسی سر جھکائے آہستہ آہستہ کلا بھون کے سامنے والی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ دیپالی نے پھولی ہوئی سانس سے اس کے قریب جا کر کہا۔ "لیجئے"

سنیاسی نے پلٹ کر دیکھا۔ "اوہ تھینکس۔!" اس نے بڑی خوشی سے سگرٹوں کے پیکٹ اپنے جھولے میں گرا دیئے اور مسکرایا۔

اب چاند طلوع ہو رہا تھا۔

بہت دور سے "الکھ نرنجن" کی آواز آئی۔ سڑک کے کنارے سمندر کے سُریلے شور کی مانند سدا بہار ولایتی جھاؤ کی نازک ڈالیاں ہوا میں سرسرا رہی تھیں۔ شیشم کے جھنڈ کے پرے طلبار کے جھونپڑوں میں روشنیاں جھلملائیں۔

دیپالی سر جھکا کر سڑک کو دیکھنے لگی۔ مٹی میں کانچ کی سرخ چوڑیوں کے چند ٹکڑے چمک رہے تھے۔ اس نے انگوٹھے کی نوک سے ایک ٹکڑے کو چھوا اور ایک قدم پیچھے ہٹی۔ باڑ پر پھیلی بیل پر سے ایک گرگٹ اچھل کر پتوں کے اندر چلا گیا۔ دور سری سدن میں چند لڑکیوں نے گانا شروع کر دیا تھا۔ نتائی ڈاکے آئی آئی گوڑ ڈاکے آئی آئی

"یہاں اونل کمار داس تم سے رابطہ رکھے گا۔" سنیاسی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

"بہت اچھا۔"

"سنتھال پرگنہ سنیاس لینے کے لئے آئیڈیل جگہ ہے۔ مگر ہم یہاں سے بھی ڈیرا ڈنڈا اٹھا کر کوچ کر گئے ہیں۔ اگر ہمیں تمھاری مدد کی ضرورت پڑی تو تیار رہنا۔ شوکتی۔"

"بہت اچھا۔"

قریب سے چند سنتھال عورتیں سروں پر ٹوکرے اٹھائے گذر گئیں۔ ان کے پیچھے طلبار کی ایک ٹولی ٹہلتی ہوئی آ رہی تھی۔

"اچھا۔ جیتی رہو۔ بچہ خوش رہو۔ ہم جاتے ہیں۔" سنیاسی نے آشیرواد دی اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

دیپالی اُسے چاندنی کے خنک دھندلکے میں غائب ہوتے دیکھتی رہی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ واپس ہوئی۔ برگد کا چبوترہ اب بھی سنسان پڑا تھا — آج شام — آج شام میں سوچ رہی تھی کہ کاش — اس نے ایک پتہ اٹھا کر ناک سے چھوا۔ اور اپنے آپ سے کہا۔ کلپ ترو!

پھر اس نے درختوں کے اس جھنڈ کا چکر لگایا۔ برہمو معبد میں چراغ سکون سے جل رہا تھا۔

آمار پرانیر آرام
مونیر آنند
آتمار شانتی

اس نے چپکے سے دل میں دہرایا۔ اور دل ہی دل میں مسکراتی، روزی بنرجی کو خط لکھنے کے ارادے سے اپنے کمرے کی سمت روانہ ہو گئی۔

# (۱۱)

# لِلی کاٹج

لِلی کاٹج میں سہ پہر کی چائے کے انتظامات بڑے زوروں پر کئے جا رہے تھے۔ ایستھر بنرجی کیک پر سفید اور گلابی آئسینگ کر رہی تھیں۔ ڈیزی آیا سینڈوچ بنانے میں مشغول تھی۔ گلدانوں میں تازہ پھول لگے تھے۔ سٹنگ روم میں کراس اسٹیچ کی نفیس کڑھت کے دُھلے ہوئے ٹیبل کلاتھ میزوں پر پڑے تھے۔ چائے کا نیا سیٹ سلہٹ کی بید کی کشتی میں سجا وسطی میز پر رکھا تھا اور اس پر ہری کانچ کے موتیوں کی جھالر والی بڑی جالی ڈھانپ دی گئی تھی۔ ٹی کوزی اور کُشنوں کی کشیدہ کاری قابل دید تھی۔

پادری بنرجی سیاہ سوٹ پہنے ذرا متفکر سے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ اور بار بار واسکٹ کی جیب سے زنجیر والی گھڑی نکال کر دیکھ لیتے تھے۔

روزی اپنے کمرے میں دروازے بند کئے چٹخنیاں لگائے قلعہ بند بیٹھی تھی۔

ٹھیک چار بجے گھوڑا گاڑی سامنے آن کر رکی اور پادری ہنری بسواس، مسز میری بسواس اُن کا فرزند مسٹر لوتھر بسواس اور چھوٹی لڑکی ایڈتھ بسواس نیچے اترے۔ ایڈتھ بسواس نے ایک اٹیچی کیس اٹھا رکھا تھا۔

ایستھر بنرجی لپکی ہوئی باہر آئیں۔ دونوں میاں بیوی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور سٹنگ روم میں لے کر آئے۔ بسواس خاندان ذرا سیلف کانشس سا ہو کر کرسیوں پر ٹکا۔ پادری اور مسز بسواس اور مسٹر لوتھر بسواس صوفے پر ایک قطار میں اس طرح سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ جیسے پہلے زمانے میں لوگ تصویر کھنچوانے کے لئے فوٹوگرافر کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ایڈتھ البتہ اطمینان سے گراموفون کے پاس جا کھڑی ہوئی ——

مسز بسواس نے ناقدانہ نظروں سے کمرے پر نظر ڈالی۔ جو گھر کی غربت، مگر سلیقہ کا آئینہ دار تھا۔ دونوں کالے پادریوں نے آپس میں اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں۔

"یہ کُشن میری روزی نے کاڑھے ہیں ——" ایستھر بنرجی نے مسز بسواس کو صوفے کے کُشنوں کا دزدیدہ نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے دیکھ کر فوراً کہا۔

مسز بسواس اخلاقاً مسکرائیں۔ انھوں نے یہ بھی نوٹس کیا کہ ایستھر بنرجی گلے میں ایک بے حد پتلی سنہری زنجیر کے علاوہ سونے کا ایک بھی زیور نہیں پہنے ہیں۔ اور سرخ کنارے والی سفید بنگالی ساڑھی میں ایک جگہ پر باریک کھونپ بھی بھری گئی ہے۔ خود مسز بسواس کروشیا کی چوڑی لیس والے سفید پیٹی کوٹ کے اوپر تیز گلابی جارجٹ کی ساری باندھ کر اور سیاہ ساٹن کا بلاؤز پہن کر آئی تھیں اور سونے کی چوڑیاں ان کے ہاتھوں میں چمچما رہی تھیں۔ سبک سا رومال ایک آستین میں گھُرس رکھا تھا۔ کانوں میں ایک ایک موتی والے بندے پہنے تھیں۔ پندرہ سالہ ایڈتھ اودے ریشمی فراک میں ملبوس تھی۔ سفید موزے، کالے جوتے بن بیاہی دیسی عیسائی شریف زادیوں کی مانند فراک پر دوپٹہ بھی اوڑھ رکھا۔ پادری بسواس سیدھے سادے آدمی معلوم ہوتے تھے اور ظاہر تھا کہ بیوی ان پر حاوی ہیں۔ لوتھر بسواس ایک منحنی مسکین صورت اور شرمیلا نوجوان تھا۔ دونوں باپ بیٹے پورے سوٹ میں ملبوس تھے۔ پچھلے کرسمس ویک میں آل انڈیا مشنری کانفرنس ختم ہونے کے بعد جب لوتھر بسواس پنجاب واپس گئے تو روزی بنرجی پر عاشق ہو کر واپس گئے تھے۔ وہ لدھیانہ مشن اسکول میں سائنس ماسٹر لگے ہوئے تھے۔ ایک دو سال بعد سینٹ جانز کالج آگرہ میں لیکچرر ہو کر جانے کا "چانس" بھی تھا۔ انھوں نے لدھیانہ واپس جا کر کچھ عرصے بعد اپنے پاپا ریورنڈ ہنری بسواس کے ذریعے پادری بنرجی کو شادی کا پیغام بھجوایا تھا۔ دیسی عیسائی فرقے میں اچھے لڑکوں کی ہمیشہ سے کمی رہی ہے۔ عیسائی لڑکیاں عموماً اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اسمارٹ ہو جاتی ہیں۔ بیشتر عیسائی لڑکے اسٹینو گرافر یا سیلز مین سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ اس وجہ سے عیسائی لڑکیاں عام طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں سے شادی کر لیتی ہیں۔

چنانچہ جب لوتھر بسواس کا پیغام آیا تو پادری بنرجی خوش ہوئے۔ جب سے روزی بڑی ہوئی تھی انھیں اس کے بیاہ کی فکر نے آگھیرا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی زندگی میں ان کی چہیتی بیٹی اپنے گھر چلی جائے۔ انھوں نے روزی سے تذکرہ کئے بغیر، اپنی بیوی سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد روایتی ہندوستانی ماں باپ کی طرح پیغام منظور کر لیا۔ وہ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کی فرماں بردار اور سعادت مند بیٹی کو ان کے انتخاب پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔ پادری بنرجی کی خواہش تھی کہ روزی کا رشتہ کسی ہم پلہ برہمن کرسچین خاندان میں ہوتا۔ روزی ماں اور باپ دونوں کی طرف سے نجیب الطرفین کلین برہمن زادی تھی۔ مگر آج کل خاندانی لڑکے ملتے کہاں ہیں۔ اور پادری بسواس بھی اچھی ذات کے آدمی تھے (حالانکہ بسواس عموماً شیڈولڈ کاسٹ والوں کا نام بھی ہوتا تھا) اُن کے مشنری باپ دادا بنگال سے جا کر لدھیانے میں سیٹل ہو گئے تھے۔ پادری بسواس کو بنگالی زبان بھی نہیں آتی تھی۔ کیونکہ ان کی ماں پنجابی تھیں۔ خود میری بسواس بھی پنجابی تھیں اور واقعی اپنے انداز اور

وضع قطع سے کچھ چمریشین معلوم ہوتی تھیں۔ مگر بہرحال بہت معقول خاندان تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مشنری کانفرنس کے زمانے میں پادری بنرجی، لڑکے کی عادات و خصائل سے خود واقف ہو چکے تھے۔ لڑکا انھیں پسند آیا تھا۔ شریف، حلیم الطبع اور بے حد مذہبی نوجوان تھا۔ روزی کو بڑے آرام سے رکھے گا۔

پچھلے ہفتے پادری بسواس کا خط آیا تھا کہ وہ اور ان کی بیوی لڑکی کو دیکھنے اور بات پکی کرنے کے لئے ڈھاکہ آ رہے ہیں۔ اور روزی کو جب ایستھر بنرجی نے یہ اطلاع دی تھی تو ایسا لگا تھا، جیسے اس کے اوپر بم کا گولہ آن گرا ہو۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن اس لمحے سے بالکل چپ سادھ لی تھی (دیپالی اتنی دور شانتی نکیتن میں تھی۔ جس سے وہ اپنا دکھ درد کہہ سکتی۔ جہاں آرا کے پاس وہ اپنا دکھڑا لے کر جانا نہ چاہتی تھی) اس کی اس خاموشی کو اس کے والدین نے بچیوں کی شرم و حیا پر محمول کیا تھا۔ کس لڑکی کو میکے سے اتنی دور کالے کوسوں بیاہے جانے کا غم نہ ہوگا۔

لیکن آج جب کہ بسواس فیملی واقعی آن پہنچی تھی۔ روزی نے بڑا ہی عجیب اور غیر متوقع رویہ اختیار کر لیا تھا۔ ایک تو وہ ساری رات روتی رہی تھی۔ اور پھر صبح سے اپنا کمرہ اندر سے بند کر کے بیٹھ گئی تھی۔ پادری بسواس مع اپنے خاندان شہر میں اپنے کسی دور کے رشتے دار کے یہاں اترے تھے۔ اور ٹھیک چار بجے بلی کاٹج پہنچ گئے تھے۔ اور اب پادری اور مسز بنرجی کو روزی کے متعلق پہلی بار گھبراہٹ شروع ہوئی۔

ڈیزی چائے دانی لے کر کمرے میں آئی اور ایستھر بنرجی کے رس گلے اور چم چم ملائی جو انھوں نے خود بنائے تھے مہمانوں کو پیش کئے۔ وہ بے چاری ہونے والے داماد کی بے انتہا خاطر کر رہی تھیں۔ اور ابھی سے اُن کو اس کے بھولے پن اور شرافت پر ممتا بھرا پیار آنے لگا تھا۔ مگر مسز بسواس بڑی خوفناک ساس ثابت ہوں گی۔ اس کی انھیں پریشانی تھی۔

روزی کا کمرہ ڈائننگ روم کے دوسری طرف تھا اور سٹنگ روم میں سے اس کا بند دروازہ نظر آ رہا تھا۔ پادری بنرجی مہمانوں سے باتیں کرتے کرتے بے چینی سے اس دروازے پر نظر ڈال لیتے۔ دروازے پر پڑا نیلا پردہ ہوا میں لہرائے جا رہا تھا۔

"روزی سسٹر کہاں ہیں؟" ایڈتھ بسواس نے نزاکت سے سینڈوچ اٹھا کر "تھینک یو آنٹی" کہنے کے بعد مسز بنرجی سے دریافت کیا۔

"ابھی آتی ہے ـــــ ذرا اس کی طبیعت ـــــ" ایستھر بنرجی نے یک لخت ذرا ہکلا کر بے بسی سے اپنے شوہر کو دیکھا۔

"کیا ہوا اسے۔؟" مسز بسواس نے ابرو اٹھا کر سوال کیا۔

"کچھ نہیں بہن۔ وہ دن رات پڑھائی میں لگی رہتی ہے۔ آج صبح سے سر میں درد ہے"۔
پادری بنرجی نے فوراً پادری بسواس کو مخاطب کیا۔
"لدھیانے میں مہنگائی کا کیا حال ہے؟ یہاں تو وار کی وجہ سے"۔
لوتھر بسواس نے ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے سر گھما کر دزدیدہ نظروں سے نیلے پردے والے دروازے کو دیکھا۔ انھیں معلوم تھا کہ یہ روزی کا کمرہ ہے۔ اور مشنری کانفرنس کے دنوں میں روزی نے اسی سٹنگ روم میں بیٹھ کر ان کے ساتھ کیرم بھی کھیلا تھا۔ اور کیرم کے پاؤڈر کا ڈبہ لانے کے لئے وہ اس کمرے میں بھی ہو آئے تھے۔
"اوہ آنٹی ـــ میں یہ ریکارڈ دیکھ سکتی ہوں؟" ایڈتھ نے چائے کی پیالی ختم کر کے گراموفون کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔
"ضرور ضرور ـــ" مسز بنرجی نے کہا۔ وہ بے ساختہ یہ بھی اضافہ کرنا چاہتی تھی کہ روزی کو میوزک کا بہت شوق ہے۔ مگر چپ ہو گئیں۔ ایڈتھ فرش پر اکڑوں بیٹھ کر میز کے نچلے خانے میں رکھے ہوئے ریکارڈ الٹنے پلٹنے لگی۔ زیادہ تر وہ گھسے پٹے پرانے ریکارڈ تھے۔ جو ایک مرتبہ ڈھاکہ کے ایک انگریز افسر نے ولایت جاتے وقت مشن کمپاؤنڈ بھجوا دیئے تھے۔
ڈیزی نے جا کر روزی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب نہیں ملا۔
چھ بجنے والے تھے۔ مسز بنرجی اٹھیں۔ ڈائننگ روم اور سٹنگ روم کا درمیانی دروازہ بھیڑا اور جا کر روزی کے دروازے پر زور سے دستک دی۔ "روزی ـــ روزی بیٹے ـــ بات تو سنو"۔ وہ اب روہانسی ہو رہی تھیں۔
مسز بنرجی چند منٹ تک دروازے پر کھڑی رہیں۔ پھر سر جھکائے سٹنگ روم میں واپس آ گئیں اور شوہر کو ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا۔ پادری بنرجی آہستہ سے اٹھے اور اپنے پیچھے سٹنگ روم کے کواڑ بند کرتے ہوئے روزی کے دروازے پر پہنچے اور دھیرے سے دستک دی۔
"روزی۔ روزی بیٹا ـــ دروازہ کھولو۔ میں تمھارا پاپا ہوں۔ بات تو سنو"۔ انھوں نے بے حد لجاجت سے کہا۔ روزی نے دروازہ کھولا۔ پادری بنرجی اندر گئے۔
روزی کندھوں پر بال بکھرائے سفید ساری پہنے تصویر کی مانند سامنے کھڑی تھی۔ اچانک ان کی آنکھوں کے سامنے ایک اور تصویر آ گئی۔ بالکل اسی طرح انھوں نے پہلی بار نوجوان ایستھر گری بلا کو دیکھا تھا۔ جو کندھوں پر لمبے لمبے بال بکھرائے سفید ساری پہنے رائٹ ریورنڈ والفرڈ براؤن کی کوٹھی کے برامدے میں خاموش کھڑی تھی، جب وہ اس سے ملنے کے لئے بلائے گئے تھے۔ اس ایستھر اور اس روزی میں اتنا فرق کیوں؟ کیا زمانہ اتنا بدل گیا تھا؟ اُس ایستھر کی آنکھوں میں محض لاج تھی

اور سپردگی۔ اس روزی کی آنکھوں سے ضد اور ہٹ اور خودسری کی چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ اس خودسری کو آج کل کے زمانے میں خوداعتمادی کہا جاتا ہے مگر وہ تو اپنی لاڈلی بچی کی بھلائی ہی تو چاہتے ہیں۔ وہ اپنے بوڑھے باپ سے اس قدر خفا کیوں ہو گئی۔؟

یک بیک روزی آگے بڑھی اور ان کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہنے لگی۔ "پاپا ــــ پاپا ــــ مجھے لے جا کر دریا میں ڈبو دیجئے۔ مجھے مار ڈالئے جان سے۔ مگر میں اس چغد سے ــــ اس ــــ اس کالٹین سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ مجھے وہ بالکل پسند نہیں ہے پاپا ــــ" اب وہ سسکیوں سے رو رہی تھی۔

کالٹین ــــ؟ پادری بنرجی ہکا بکا رہ گئے ــــ "روزی بیٹیا ــــ" انھوں نے ہڑبڑا کر کہا ــــ "میری ناک کا تو خیال کرو۔ میری بچی ــــ لوتھر بڑا اچھا لڑکا ــــ"

"نہیں ــــ نہیں ــــ نہیں ــــ" روزی نے بچوں کی طرح مچل کر روتے ہوئے ان کی بات کاٹی۔

"پھر کیا کرے گی ــــ احمق ــــ" پادری بنرجی کو ایک دم غصہ آگیا۔ "کسی ہندو سے شادی کرے گی؟ یہ ارادہ ہے تیرا۔؟ مسلمان سے بیاہ رچائے گی؟ اپنی ماں کا حشر بھول گئی۔ بدبخت۔؟" انھوں نے گرج کر کہا اور ان کو بالکل خیال نہ رہا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے اور سٹنگ روم تک آواز جا رہی ہے۔ انھیں اپنی پرسکون زندگی میں ایسا قیامت خیز وقت بھی دیکھنا پڑا۔ اور اپنی اولاد کے ہاتھوں۔ خداوند۔ میں نے تیرا کیا گناہ کیا تھا۔ خداوند ــــ؟

پادری بنرجی کو پتہ بھی نہ چلا کہ مسز میری بسواس پیچھے آن کر کھڑی ہو گئی ہیں۔ اور باپ بیٹی کا سارا مکالمہ سن چکی ہیں۔ ایستھر بنرجی سہمی ہوئی ان کے عقب میں کھڑی تھیں۔ مسز بسواس کو دیکھ کر روزی فرش سے اٹھی اور تیر کی طرح غسل خانے میں گھس کر دروازہ زور سے بند کر لیا۔ پادری بنرجی نے مڑ کر مسز بسواس کو دیکھا اور سکتے کے عالم میں کھڑے رہ گئے۔

چند لمحوں تک مکمل سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد مسز بسواس نے زہر میں بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ "اچھا تو ہم کالٹین ہیں ــــ ہنری"۔ انھوں نے سٹنگ روم کی طرف مارچ کرتے ہوئے للکارا۔ "ہم اپنی انسلٹ کروانے لدھیانے سے آئے تھے۔ چلو اٹھو"۔

ایستھر بنرجی روتی ہوئی ان کے پیچھے لپکیں۔ سٹنگ روم میں آکر انھوں نے کہا۔ "بہن خدا باپ کے لئے ہمیں معاف کر دیجئے۔ روزی بڑی ضدی لڑکی ہے۔ آج کل کی اولاد ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سے کیا کہوں"۔

اس دوران میں پادری ہنری بسواس اور مسٹر لوتھر بسواس صم بکم کھڑے باقی لوگوں کو

تک رہے تھے۔ مسز بسواس بلاؤز کی آستین میں سے رومال نکال کر ناک سنکتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اور شعلہ بار نگاہوں سے میزبان خاتون کو گھورا۔ پادری بنرجی اس اثنا میں سٹنگ روم سے گذرتے ہوئے جاکر برآمدے کے ایک در میں کھڑے ہو گئے تھے اور سر جھکا کر فرش کو دیکھ رہے تھے۔

اب مسز بسواس نے رومال آنکھوں پر رکھ لیا اور آنسو بہانے پر آمادہ ہوئیں۔

"چلو ڈیر — واپس چلیں —" پادری بسواس نے آگے بڑھ کر نرمی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مسز بسواس نے غصہ سے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور چلاتے ہوئے بولیں — "ہم امیر لوگ نہیں ہیں۔ لدھیانے سے چل کر راج کماری کو دیکھنے آئے۔ آپ نے خود بلایا تھا۔ چار آدمیوں کا انٹر کلاس کا کرایہ —"

"اوہ شٹ اَپ مائی ڈیر —" پادری بسواس نے کوفت کے ساتھ کہا۔ لوتھر بسواس چھت کو تک رہا تھا۔

"چار آدمیوں کا انٹر کلاس کا کرایہ۔ لدھیانے سے ڈھاکے — ہم امیر نہیں ہیں۔ آپ کی طرح چرچ فنڈ کا روپیہ نہیں کھاتے۔"

"اوہ کیپ کوائٹ ماما —" لوتھر بسواس نے انتہائی خفت اور جھنجلاہٹ کے ساتھ والدہ کو خاموش کرنا چاہا۔

"تم چپ رہو جی — میں ان سے مسز بنرجی سے بات کر رہی ہوں۔ آپ نے ہمیں خط لکھا۔ آپ نے مسز برکت مسیح کے ذریعے ہمیں کہلوایا کہ آکر لڑکی دیکھ جاؤ۔"

"اوہ شٹ اَپ — ماما — پلیز —" لوتھر بسواس نے پسینہ پسینہ ہوتے ہوئے دوبارہ استدعا کی —

"یو شٹ اَپ ایڈیٹ — ڈیم فول —" مسز بسواس اب ہسٹریکل ہونے والی تھیں۔ ادھر ایڈتھ نے۔ "اِٹ واز اِن دی آئیل آف کیپری دیٹ آئی فاؤنڈ ہر —" کا دقیانوسی ریکارڈ گراموفون پر لگا رکھا تھا۔ جو ریں ریں کئے جا رہا تھا۔ لوتھر بسواس نے اٹھ کر غصے کے ساتھ ریکارڈ پر سے سوئی ہٹا دی اور بہن کو گھور کر دیکھتا ہوا کرسی پر آن بیٹھا۔

"ہم نے انکوائری کی —" مسز بسواس کہے گئیں۔ "میں نے ڈھاکے اپنی سسٹر ان لاکو — ہنری کے کزن برادر کی وائف کو خط لکھا کہ لڑکی کے حالات معلوم کرو۔ انھوں نے ہم کو لیٹر لکھا میں نے ہنری کو بولا۔ مارجری سسٹر نے لکھا ہے لڑکی کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ لڑکی کے ہندو بوائے فرینڈ ہیں۔ لڑکی کانگریسی اور کمیونسٹ ہو گئی ہے۔"

"اوہ ماما — پلیز —"

"مگر یہ گدھے کا بچہ ـــــ مس صاحب پر لٹو ہو چکا تھا ـــــ کیا آگرہ۔ کیا سیالکوٹ۔ کیا لاہور۔ ہر جگہ سے اس کے لئے رشتے آرہے ہیں۔ مسٹر ایڈورڈ منور خان تو ڈپٹی کلکٹر ہیں میرٹھ میں۔ ان کی لڑکی آئی۔ ٹی کالج میں پڑھ رہی ہے۔ اس تک کی بات آئی تھی۔ ایسا میرا ہیرا بیٹا ہے۔ آپ کی لڑکی میں ہے کیا ـــــ ذرا سنوں تو ـــــ؟"

پادری بنرجی کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے برآمدے میں کھڑے رہے۔ ایک دم ان کی کمر جھک سی گئی تھی۔

مسز بسواس کی تقریر جاری رہی ـــــ "ہم تو اس گدھے کے بچے کی ضد پوری کرنے اتنی دور چل کر آئے۔ ہے کیا آپ کے پاس۔ یہ فقط گھر ـــــ میرا بیٹا تو سینٹ جانز کالج میں لیکچرر ہونے والا ہے۔ ایم۔ ایس۔ سی پاس ہے۔ کسی خچر پادری مشن اسکول میں نہیں پڑھاتا۔" (حالانکہ وہ خچر پادری مشن اسکول ہی میں پڑھا رہا تھا)

"مائی ڈیر"۔ پادری بسواس نے کہنا چاہا۔

"ماما ـــــ" ایڈتھ نے آواز نکالی۔

"دیکھوں تو کون سا آئی۔ سی۔ ایس مل جائے گا آپ کی لڑکی کو، جو ان کے لچھن ہیں ڈھلکے آکر سُن لئے۔"

"میری ـــــ کیوں اپنی جیبھ خراب کرتی ہو ـــــ" پادری بسواس نے پھر احتجاج کیا۔

"بڑا لِلی کاٹج کا شہرہ سنا تھا۔ دیکھ لی آکر لِلی کاٹج ـــــ میں تو اپنے گھر میں ایک دن بھی ایسا سڑا ہوا فرنیچر نہ رکھوں اور بھئی ہم کوئی دیسی پادری کی تنخواہ پر گذر تھوڑے ہی کر سکتے ہیں۔ ہماری تو گھر کی زمینداری بھی ہے۔ خدا باپ کا ہر طرح سے فضل ہے۔ مس صاحب اگر آتیں ہمارے ہاں۔ نصیبہ کھل جاتا۔ رانی بن کر رہتیں"۔ مسز بسواس یہ بالکل بھول گئیں کہ صرف چند منٹ قبل انھوں نے اپنی غربت کا شکوہ کیا تھا۔ مگر اب پھر انھیں اپنا مالی نقصان یاد آگیا۔ اور انھوں نے چلا کر کہا۔ "پانچ سو روپیہ خرچ ہو گیا ہمارا"۔ اتنے میں لوتھر بسواس جلدی سے باہر جا کر گھوڑا گاڑی لے آیا تھا۔ اس نے اندر آکر پہلی بار غصے سے بات کی۔

"ماما ـــــ کم اَن ـــــ ڈونٹ کری ایٹ اے سین۔ بی ہیویور سیلف پلیز ـــــ اب بس کرو"۔

اپنی ماما کا ہاتھ پکڑ کر انھیں تقریباً کھینچتا ہوا وہ باہر لے گیا اور گاڑی میں بٹھا دیا۔ پادری ہنری بسواس سر جھکائے ان کے پیچھے پیچھے باہر آئے۔ ایڈتھ بسواس نے میز پر سے اٹیچی کیس اٹھایا، جس میں سنہری بیل لگی ریشمی ساری اور منگنی کی انگوٹھی مقفل تھی۔ باہر آکر وہ اُچک

کے گاڑی میں سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پادری بسواس واپس پلٹے اور برآمدے کے در میں کھڑے پادری بنرجی سے ہاتھ ملایا۔ "سوری ریورنڈ ــــ آئی ایم ویری سوری ــــ ناٹ یور فالٹ ــــ" انھوں نے رسان سے کہا۔ پادری بنرجی ہاتھ پیچھے باندھے سر جھکائے خاموش کھڑے رہے۔ ایستھر بنرجی سٹنگ روم کے دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا لوتھر بھی جیسے تلے قدم رکھتا برآمدے کی سیڑھی پر آیا اور سر خم کر کے کہا۔ "آئی ایم سوری انکل۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ مائی مدر ــــ گڈ بائی۔"

"گوڈ بلیس یو مائی سن ــــ" پادری بنرجی نے آہستہ سے جواب دیا۔

لوتھر جلدی سے واپس لوٹا اور گاڑی میں ایڈتھ کے برابر بیٹھ گیا۔ مشن کمپاؤنڈ کے سارے بچے اور عورتیں گاڑی سے ذرا فاصلے پر جمع ہو گئے تھے۔ ڈیزی کے ذریعہ خبر سارے کمپاؤنڈ میں پھیل چکی تھی۔ کل تک ڈھاکے کی نیٹو کرسچین سوسائٹی میں نشر ہو جائے گی۔

گھوڑا گاڑی لِلی کاٹج کا چکر کاٹ کر پھاٹک کی طرف بڑھی۔ لوتھر بسواس کھڑکی میں سے سر نکال کر تازہ ہوا نتھنوں میں داخل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب گاڑی کمپاؤنڈ سے باہر جانے لگی تو اس نے دیکھا کہ روزی بنرجی لِلی کاٹج کے پچھواڑے اپنے غسل خانے کی سیڑھیوں پر سنگی مورت کی مانند ساکت بیٹھی ہے۔ لوتھر بسواس نے احمقوں کی طرح ہاتھ اٹھا کر اُسے ویو کرنا چاہا۔ مگر ہاتھ مفلوج سا ہو گیا تھا۔ گاڑی چرخ چوں کرتی کچی سڑک پر آ گئی۔

لِلی کاٹج کے اندر پادری بنرجی اپنے کمرے میں جا کر ایک کونے میں بیٹھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ انھیں روزی کے انکار سے زیادہ اس انکشاف سے دھکا لگا تھا کہ انھیں معلوم بھی نہیں ہوا مگر دنیا بدل چکی ہے۔ ہمیشہ کی طرح صابر و شاکر گری بالا بنرجی آنسو خشک کر کے چار کا سامان سنگوانے میں مصروف ہو گئیں۔

## (۱۲)

# شانتی نکیتن

اپریل ۱۹۴۱ء۔ دیپالی سرکار سری سدن کے سامنے گھاس پر بیٹھی تھرڈ ایر کے آخری پرچے کی تیاری میں مصروف تھی۔ جب ایک لڑکی نے قریب سے گذرتے ہوئے چند لفافے اس کے

سامنے گرا دیئے۔ روزانہ جب ڈاک آتی تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھتا تھا۔ اس شام کے بعد سے وہ ایسا غائب ہوا کہ اس کی طرف سے نہ کوئی خط آیا۔ نہ کوئی سندیش۔ نہ کوئی بادل۔ نہ کوئی راج ہنس اور جب انل کمار داس نے چارلس بارلو کے متعلق دریافت کیا تو وہ کچھ نہ بتا سکی۔ کیونکہ روزی بنرجی نے ڈھاکے سے کسی خط کا جواب نہ دیا تھا۔ اس کے لئے اتنا غم، اتنی فکر، اتنی پریشانی سب بے کار ہے نا۔ آج اتنے مہینے گذر گئے۔ ستمبر میں اس شام کو چھ مہینے گذر گئے۔

دیپالی نے پہلا لفافہ کھولا۔ جہاں آرا کا خط تھا۔ دُرگا پوجا کی چھٹیوں میں جب وہ ڈھاکے گئی۔ جہاں آرا اپنے علاقے پر فرید پور گئی ہوئی تھی۔ روزی کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ پادری صاحب نے اسے چھٹیاں گذارنے اپنی بہن کے پاس لال منیر ہاٹ بھیج دیا ہے۔ اوما دیبی کلکتے میں تھیں۔ دیپالی نے ساری چھٹیاں اپنے بھائیوں کے ساتھ لوڈو کھیلنے میں گذار دی تھیں۔ اب امتحان کے بعد گرمیوں کی تعطیلات شروع ہوں گی۔ اور پھر وہ چندر کنج واپس جائے گی۔ جولائی میں کالج کھلے گا۔ پھر یہاں آجائے گی۔ اگلے سال بی۔ اے کرے گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا ــــ؟

جہاں آرا نے لکھا تھا:۔

"روزی کا قصہ تو اب خاصا پرانا ہو گیا ــــ جب ملو گی پوری داستان سناؤں گی۔ مسز بنرجی امی کے پاس آکر رونا رو رہی تھیں۔ روزی تو اس بات کا بالکل ذکر ہی نہیں کرتی۔ لال منیر ہاٹ سے واپس آکر پڑھائی میں مصروف ہو چکی ہے۔ خیر تھرڈ ایر کی ایسی پڑھائی بھی کیا۔ تم لوگ مجھ پر خواہ مخواہ رعب جھاڑتے ہو۔ بڑی آئیں بے چاریاں بی اے اسٹوڈنٹس ــــ اور بھئی ہم نے جو کہا تھا انٹر کے بعد گھر بیٹھے مزے کر رہے ہیں۔ مزے کیا کر رہے ہیں دیپالی، یہ تو بالکل غلط ہے۔ مگر ابا کا حکم کیسے ٹالا جا سکتا ہے۔ ابا اعلیٰ تعلیم کے حامی نہیں تو پھر ایف اے تک ہی کیوں پڑھایا تھا۔ پچھلے سال مارچ میں جب ابا مسلم لیگ کے اجلاس کے لئے لاہور گئے تھے نا جب پاکستان ریزولیوشن پاس ہوا تھا۔ تو لاہور سے واپسی پر علی گڑھ ہوتے آئے تھے۔ اور آکر کہنے لگے کہ میں تم کو بی۔ اے کے لئے علی گڑھ بھیج دوں گا۔ مگر اس کے بعد پھر ارادہ بدل دیا۔ جانے ابا کے دل میں میرے لئے کیا پروگرام ہے۔ ان سے کون پوچھ سکتا ہے۔

"مگر روزی نے کمال کر دیا۔ مسٹر لوتھر بسو اس بے چارے کو ہری جھنڈی دکھا دی۔ میں نے روزی سے کہا کہ تم میں دونوں اپنے اپنے ماحول کے پروردہ ہیں۔ تم بغاوت کر کے کہاں جاؤ گی۔ اور یہ اونچی ذات کے بنگالی کرسچین اگر قدامت پرست ہونے پر آئیں تو ان کا کوئی جواب نہیں۔ کہنے لگی۔ سولیڈرٹی مجھے سہارا دے گی۔ میں نے اپنے آپ کو سولیڈرٹی کے لئے وقف کر دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اور روزی کس قسم کی باتیں کرتی ہو۔ اور کیا کرنے والی ہو ــــ اللہ تم لوگوں کی عقلیں

ٹھکانے پر رکھے۔

"باقی ڈھاکے کے حالات بدستور ہیں۔ تمھاری ادمارائے کلکتہ ہی میں ہیں۔ ایک خبر یہ ہے کہ نیّر بھائی کی منگنی ہو گئی۔ وہ شمسہ خالہ نہیں ہیں۔ امّی کی پرانی سہیلی۔ جو سگن بگیچے میں رہتی ہیں ان کی جیٹھ کی لڑکی سے۔

"ہاں اس پر یاد آیا کہ شمسہ خالہ کے پڑوس میں جل پائے گوری سے ایک مولوی صاحب آکر رہے ہیں۔ مولوی عبدالمجید خاں۔ ان کی لڑکی یاسمین میٹرک میں پڑھ رہی ہے تو بیگم عبدالمجید نے خالہ سے کہا کہ یاسمین کی انگریزی کمزور ہے کوئی استانی اس کے لئے لگوادیں۔ شمسہ خالہ نے مجھ سے ذکر تو مجھے ایک دم روزی کا خیال آیا۔ اور میں نے روزی سے ان کی بات چیت کرادی۔ یاسمین میرے ہاں آئی تھی۔ خاصی دلچسپ لڑکی ہے۔ مگر مجھے کچھ خبطی سی معلوم ہوتی ہے۔ جب اس کی امّی کمرے سے چلی گئیں تو مجھ سے چپکے سے بولی۔ آپا۔ یہ امّی اور ابا بیکار مجھے آگے پڑھانے کی فکر میں ہیں۔ میں تو ڈانسر بنوں گی۔ میں بھونچکی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اور میں نے کہا۔ بی بی۔ اتنا قدامت پرست خاندان تو تمھارے باپ کا ہے تم کس طرح ڈانسر بنو گی۔ ذرا یہ تو بتاؤ۔ اور ڈھاکے میں جہاں ایک ہزار مسجدیں اور بیس ہزار مولوی ہیں یاسمین بی بی تم نے ناچ سیکھ بھی لیا، تو ناچو گی کہاں جاکر۔ مگر وہ سر ہلا کر کہنے لگی۔ آپا۔ دیکھ لینا۔ ایک دن میں ڈانسر بن کر ہی دکھادوں گی۔ میں سمجھتی ہوں اگر اس کے ابا یہ بات سن لیں تو اس کا گلا ہی گھونٹ دیں۔ واقعی۔ مگر یہ آج کل کی لڑکیاں ہیں بھائی ــــ بہر حال تو اب روزی ہفتے میں چار دن سگن بگیچے جاکر یاسمین کو انگریزی پڑھا رہی ہے۔ اچھا ہے اس کا جیب خرچ نکل آیا۔ روزی کے لئے بڑا دل دکھتا ہے۔ چپ چپ سی رہتی ہے اور اکثر بہت پریشان نظر آتی ہے۔

اب تم امتحان دے کر آؤ۔ تو اطمینان سے گپ شپ رہے گی۔

تمھاری۔ جہاں آرا"

اس خط سے دیپالی کو کچھ اندازہ ہوا کہ اب تک روزی نے اس کے خط کا جواب کیوں نہیں دیا تھا۔

دوسرا خط بابا کا تھا۔

"میں خیریت سے ہوں۔ کھوکھو، شونو، ٹونو بھی اچھی طرح ہیں۔ تمھاری گھر سے غیر حاضری کی وجہ سے ٹونو پر نگرانی رکھنے والا کوئی نہیں رہا۔ اس لئے وہ بے حد شیطان ہوتا جا رہا ہے۔

"تم کو پیسوں کی ضرورت ہو تو فوراً لکھ دیا کرو۔ کبھی یہ نہ سوچو کہ میں تمھیں پیسے نہ بھجوا سکوں گا۔

"کل ایک بڑی افسوس ناک بات معلوم ہوئی۔ تم کو بھی معلوم ہو کر رنج ہوگا۔ دیدی نے

گودام کھول کر دھوپ میں سکھانے کے لئے پرانے کپڑے باہر نکالے۔ ڈیڑھ دو سال سے بڑا صندوق نہیں کھولا تھا۔ اسے کھولا تو تمھاری ماں کی تین بالوچر ساڑھیاں غائب تھیں۔ چور کدھر سے آئے۔ کب چوری ہوئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے بھی بے حد صدمہ ہوا۔ کیونکہ یہ میری ماں کی ساریاں تھیں۔ جو انھوں نے تمھاری ماں کو دی تھیں یہ ساریاں تمھیں معلوم ہوگا۔ پرانے خاندانوں میں دلہنوں کو دی جاتی تھیں۔ اور تمھاری بے چاری ماں نے اپنی تینوں بہوؤں کے لئے رکھ چھوڑی تھیں۔ انھیں بُننے والے مرشد آباد کے سلمان کاری گر کب کے مر کھپ گئے۔ اور یہ فن بھی ان کے ساتھ گیا۔ اب یہ ساریاں ملتی نہیں ہیں۔ دیدی تو چوری کے غم اور دہشت سے تقریباً بیمار پڑ گئی ہیں۔ تم جانتی ہو وہ پہلے ہی سے اعصاب زدہ ہیں۔ ان کو فکر ہے کہ چوروں نے گھر دیکھ لیا تو باقی سامان بھی نکل جائے گا۔ اور مجھے یہ اطمینان ہے کہ ہمارے گھر میں اور کوئی شے چوری کے لائق ہے ہی نہیں!"

بابا کا خط لفافے میں واپس رکھ کر دیپالی گم سم سر جھکائے بیٹھی رہی اور گھاس کی پتیاں توڑا کی۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی اور لائبریری جانے کے ارادے سے یونی ورسٹی کی طرف روانہ ہوگئی۔

شام تک دیپالی لائبریری میں اپنی مخصوص چھوٹی سی کھڑکی میں بیٹھی پڑھنے میں منہمک رہی کھڑکی کی سلاخوں کے باہر اونچی اونچی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ کتابوں کی الماریوں میں پرانے کاغذوں کی مہک رچی تھی۔ بیشتر طالب علم ہال سے باہر جا چکے تھے۔ دیپالی کتاب بند کر کے سوچنے لگی۔ صبح ڈاکخانے جا کر ٹکٹ خریدے گی۔ بابا کو خط لکھے گی (جہاں آرا کا خط فوری طور پر جواب طلب نہیں تھا) ساریوں کے چوری کے متعلق اپنے رنج کا اظہار کرے گی۔ مگر یہ دوہری زندگی جو وہ دو ڈھائی برس سے گذار رہی ہے۔ اس کا انت کیا ہے؟ وقتی جوش و خروش گذر جانے کے بعد جب ضمیر ملامت کرتا ہے کہ بابا کو اس طرح دھوکے میں نہ رکھو تو اس ضمیر کا کیا علاج کیا جائے؟ ضمیر کیا ہے؟ میں کون ہوں ــــ؟ وشوا بھارتی کی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی یہ لڑکی کون ہے؟ ریحان دادا کون ہیں؟ ادما رائے اور روزی نبرجی کون ہیں؟ گرودیو اور اکشے اور جہاں آرا۔ ڈاکٹر بنوے چند سرکار؟ آتمائیں؟ پچھلے سنسکاروں کے بنائے ہوئے ذہن؟ کیا ایک ایک قدم ایک ایک حرکت پہلے سے مقدر ہے یا محض حادثے کا نتیجہ ہے۔ "اقتصادی، سماجیاتی تاریخی عوامل ــــ؟"

ایک مور نہایت غرور سے سر اٹھائے کھڑکی کے نیچے سے گذر گیا۔ عرفانیت اور رومان اور فلسفے کے اس گڑھ میں یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر اس سرخ آرٹسٹک مکان کے اندر گرودیو بھی میرے سوالات کا جواب دینے کے لئے موجود ہیں۔

لیکن راستہ کسے معلوم ہے؟

سولیڈرٹی ــــ! سولیڈرٹی میں جواب ــــ شاید ــــ موجود ہے۔

اٹھو ـــــ دیپالی ـــــ وہ اکثر، چوبیس گھنٹے وقت کے اندرونی سفر میں خود سے کہتی رہی ـــــ اٹھو ـــــ اب یہ کام کرنا ہے۔ اب یہاں سے جانا ہے۔ اب یہ پڑھنا ہے۔ اب اس سے بات کرنی ہے۔ جھکو مت ـــــ

وہ کھڑکی میں سے اٹھی اور کتابیں سمیٹ کر باہر نکلی۔

## (۱۳)

# مِس روزی بنرجی اور سولیڈرِٹی

روزی بنرجی بسواس فیملی کی گاڑی کمپاؤنڈ سے باہر نکل جانے کے بعد غسل خانے کی سیڑھی پر ساکت و صامت بیٹھی رہ گئی تھی۔ جس وقت مسز بسواس سٹنگ روم میں دہاڑ رہی تھیں۔ وہ غسل خانے کے کواڑ سے کان لگائے کھڑی تھی۔ اور اس نے سنا تھا۔ "ہم نے انکوائری کی۔ میری سسٹر ان لا نے لکھا لڑکی کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ اس کے ہندو بوائے فرینڈز ہیں۔ لڑکی کانگریسی کمیونسٹ ہو گئی ہے"۔

وہ دھک سے رہ گئی ـــــ یہ خبر کس طرح پھیلی؟ اب پاپا اس کا کس طرح قیمہ اور بھرتہ بنائیں گے۔ مگر اسے بڑا تعجب ہوا جب اس نے رات کو اپنے کمرے سے باہر نکل کر دیکھا کہ پاپا اور ماما دونوں نے اس سے ایک لفظ نہیں کہا۔ پاپا روتے رہے تھے (یہ دیکھ کر اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔) اور ماما کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ مگر وہ دونوں خاموش تھے۔

پادری بنرجی کی یہ خاموشی وقتی نہیں تھی۔ اس روز کے بعد سے انھوں نے اپنی اکلوتی لڑکی سے بول چال تقریباً بند کر دی۔

ریورنڈ بنرجی کی خفگی روزی سے محض اس بنا پر نہیں تھی کہ اس نے لوتھر بسواس اور اس کے خاندان کے سامنے ان کو اس بُری طرح شرمندہ کیا۔ انھوں نے دوسرے ہی روز مختلف ذرائع سے روزی کی سرگرمیوں کے متعلق معلوم کروایا تھا۔ اور ان کو پتہ چلا تھا کہ مسز بسواس کی "مارجری سسٹر" کی اطلاع صحیح تھی۔ روزی بنرجی اکثر رات برات شہر کے کونوں کھدروں میں چند مفسد، فتنہ پرداز اور حکومت کے باغی اور غدار ہندو اور مسلمان نوجوانوں کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔ اس اطلاع نے ریورنڈ بنرجی کا سر جھکا دیا تھا۔

اسی دوران میں چارلس بارلو کے متعلق دیپالی کا خط پہنچا۔ روزی نے وہ خط پُرزے پُرزے کر کے

نذرِ آتش کر دیا۔ اور لرز کر سوچا۔ مجھے جیل بھیجا جا سکتا ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ میرے ذریعے دیپالی آیا کے بھیس میں کینٹ ویل کے بنگلے پر پہنچی تھی: تو مجھے جیل ہو سکتی ہے۔ میں اپنے سیدھے اور نیک دل باپ کو کس قصور کی سزا دے رہی ہوں؟ کیا یہ ان کا قصور تھا کہ ماما کو بال ودھوا بننا پڑا۔ یا خود انھوں نے پیٹ کی خاطر مذہب تبدیل کر لیا۔ میری سمجھ میں یہ چند باتیں آ گئی ہیں۔ تو کیا دنیا کے حالات بدل جائیں گے؟

وہ اب خاموشی سے کالج جاتی اور واپس آ کر اپنے کمرے میں پڑ رہتی۔ تعطیلات میں ایستھر بنرجی نے شوہر کو سمجھا بجھا کر اس کے لئے لال منیر ہاٹ کا ٹکٹ منگوا دیا۔ شمالی بنگال سے واپس آ کر وہ پھر اپنی پڑھائی میں لگ گئی۔ کبھی کبھار جہاں آرا کے اصرار پر ارجمند منزل چلی جاتی۔ مگر ارجمند منزل کی امارت اور آسائش اسے اور زیادہ مضطرب کرتے۔ یہ لوگ اتنے امیر اور باعزت ہیں۔ میں غریب اور کم حیثیت۔ وہ گھٹیا چمریشین لوگ میرے گھر آ کر میرے ماں باپ کو ان کے افلاس کا طعنہ دے کر چلے جاتے ہیں اور میرا باپ میری خاطر آنسو بہاتا ہے۔ آخر یہ سب کیوں۔ میں اس کا حل کس طرح تلاش کروں۔ پھر جہاں آرا نے اس کے لئے مولانا صاحب کے ہاں سگن بگیچے میں ٹیوشن لگا دیا۔ (وہ لڑکی یاسمین بھی خاصی باؤلی سی تھی۔ جانے ہم لوگوں کا کیا حشر ہوگا۔) اور وہ شام کو وہاں جانے لگی۔

ایک روز وہ ٹیوشن لگوانے کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ارجمند منزل گئی تو جہاں آرا نے بڑی حیرت سے اُسے دیکھا۔ شمالی بنگال کی برہمن عورتیں بے حد گوری ہوتی ہیں۔ اور روزی بھی اپنے سفید اور حسین رنگ روپ کے لئے مشہور تھی۔ جہاں آرا نے اس سے کہا۔ "روزی تم بالکل پیلی پڑ گئیں۔ تم نے ان کو چلتا کیا۔ بہت اچھا کیا۔ اب کیوں کلس رہی ہو؟ سوچو۔ تم میں اتنی ہمت ہے کہ انکار کر دو مگر جب میری اس طرح شادی طے کی جائے گی تو میں سر جھکا کر ہاں کر دوں گی۔"

"تمھاری شادی۔ جہاں آرا ــــ؟" روزی نے پوچھا۔

اچانک جہاں آرا گاؤ تکیہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"جیزس کرائسٹ ــــ تم کو کیا ہو گیا جہاں آرا ــــ" روزی نے گھبرا کر کہا۔

"کچھ بھی تو نہیں"۔ جہاں آرا نے آنسو پونچھ کر کہا۔ اور سیدھی ہو بیٹھی۔

روزی نے پہلی بار جہاں آرا کو تعجب سے دیکھا۔ یہ خوش قسمت، باعزت، پردہ نشین رئیس زادی جو بیرونی دنیا کے خطروں اور مصیبتوں سے محفوظ و مامون اپنی محل سرا میں آرام سے بیٹھی ہے۔ اسے کیا فکر ہے، صرف یہی کہ نہ جانے کیسے آدمی سے شادی ہو گی۔ ساری پردہ نشین لڑکیوں کا محض یہی ایک مسئلہ تھا۔ جہاں آرا، روزی اور دیپالی دونوں سے بڑی تھی۔ اور روزی کو یاد آیا۔ پچھلے سال

ایک مرتبہ ماما کہہ رہی تھیں۔ بیگم قمرالزماں اس فکر میں گھلی جا رہی ہیں کہ جہاں آرا چوبیس سال کی ہوگئی۔ اپنے ہم پلہ رؤسا کے لڑکے جاہل اور نکمے ہیں۔ متوسط طبقے میں بیاہ دینے سے ناک کٹ جائے گی۔ اس کے علاوہ جہاں آرا کی شادی کے سلسلے میں اور کیا مسائل تھے۔ ان کا ذکر بیگم قمرالزماں نے مسز بنرجی سے نہیں کیا تھا۔ خود جہاں آرا نے اپنے نجی معاملات کے بارے میں اپنی سہیلیوں سے آج تک کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ جہاں آرا کی اچھی خاصی شکل تھی گو وہ دیپالی کی طرح دلکش اور روزی کی طرح گوری نہ تھی۔ لیکن وہ سمجھ دار حساس اور خاموش طبیعت لڑکی تھی۔ اس کا ایک بڑا بھائی اور دو چھوٹی بہنیں تھیں لیکن وہ ان سب سے مختلف اور علیحدہ معلوم ہوتی تھی۔

روزی نے آج تک جہاں آرا کی ذاتی زندگی کے متعلق نہ سوچا تھا۔ اسے اور دیپالی کو کالج کے ڈراموں اور اب سیاسی مسائل ہی سے فرصت نہیں تھی۔ ہم سب اپنی اپنی دلچسپیوں اور اپنے آئیڈیلز کے سلسلے میں کتنے خود غرض ہیں۔ روزی کو اس وقت پہلی بار خیال آیا۔ اس نے دوبارہ جہاں آرا پر نظر ڈالی، جو اپنی شاندار خواب گاہ میں مسند پر نیم دراز پھر چپکے چپکے رو رہی تھی۔

"جہاں آرا ——" روزی نے الجھن سے کہا۔ وہ پچھلے چند مہینوں میں بڑی ہوگئی تھی اور خود کو بوڑھی عورت سمجھنے لگی تھی۔ چند ماہ قبل اگر وہ جہاں آرا کو اس طرح روتے دیکھ لیتی تو فیوڈل رومینٹک ہیروئین، کہہ کر کس کس طرح اسے نہ چڑاتی۔

پھر روزی نے سوچا۔ میں اور دیپالی خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پاس سولیڈرٹی موجود ہے۔ جو ہمارے ذاتی اور جذباتی مسائل سلجھانے میں ہماری مدد کرے گی۔ مگر بے چاری جہاں آرا، واقعہ یہ ہے کہ اپنے جاگیری مذہبی رجعت پسند تمدنی حصار میں قید ہے۔ اور اسے سہارا دینے والا کوئی نہیں۔ نہ یہ کچھ سمجھنا چاہتی ہے۔

پھر جہاں آرا مسند سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اپنی جامدانی کی ساری کے پلو کو ایک بازو پر لپیٹتے ہوئے اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "روزی —— ذرا اپنی صورت دیکھ آئینے میں۔ اتنے دنوں میں ایسی زرد پڑ گئیں تو ابھی سے سوچ لو کہ کس حد تک بغاوت کرو گی۔؟"

"سولیڈرٹی ——" روزی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"وہ کس بلا کا نام ہے"۔ جہاں آرا نے غصے سے کہا۔ پھر اس نے ملازمہ کو چائے لانے کے لئے آواز دی۔

"میں نے سولیڈرٹی کے لئے خود کو وقف کر دیا ہے۔ وہی مجھے سہارا دے گی۔" روزی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

جہاں آرا نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔

"تم کو کچھ معلوم نہیں جہاں آرا بیگم کہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے"۔ روزی نے اب ذرا باہمت آواز میں کہا۔

"تمھیں معلوم ہے؟" جہاں آرا نے سوال کیا۔

روزی خاموش ہو گئی۔

مالا نقرئی کشتی میں چائے لے کر حاضر ہوئی۔ جہاں آرا کی چھوٹی بہنیں انجم آرا اور اختر آرا شور مچاتی اندر آگئیں۔ جہاں آرا فوراً ہنس ہنس کے اور مصنوعی بشاشت سے ان کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ روزی چپ چاپ کشتی کے گنگا جمنی نقش و نگار کو دیکھتی رہی۔

"اور سناؤ روزی"۔ جہاں آرا نے چائے بنا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "تمھاری شاگرد اور مستقبل کی مشہور رقاصہ یاسمین حمید کے کیا احوال ہیں"۔

## (۱۴)

# آمار پرانیر آرام مونیر آنند

بی اے پریویس کے امتحانات ختم ہو چکے تھے۔ مگر دیپالی موسیقی کے ایک اعلیٰ امتحان کی تیاری کے سلسلے میں مزید چند ہفتوں کے لئے شانتی نکیتن میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ساری درس گاہ تقریباً سنسان تھی۔

آخر مئی کی ایک گرم شام وہ کلا بھون کے باغ میں گھاس میں ڈوبے گوتم بدھ کے مجسمے کے نیچے بیٹھی قدیم راگوں کے ایک "شجرے" پر سر کھپا رہی تھی۔ جب درختوں میں سے نکل کر انل کمار داس اُس کے سامنے نمودار ہوا۔ انل ایک خوش مزاج لڑکا تھا۔ ہر وقت باچھیں کھلیں رہتی تھیں۔ سامنے آکر نمسکار کرنے کے بعد اس نے ایک کتاب دیپالی کو دی۔

دیپالی نے کتاب کھولی۔ اس میں سے حسبِ توقع ایک پرچہ نکلا۔ دیپالی کا دل بڑے زور سے دھڑک اٹھا۔ پرچے میں لکھا تھا۔

"پیاری بچی۔

معاف کرنا تم کو اتنے طویل عرصے تک کوئی خیر خبر نہ بھجوا سکا۔ (اندازِ تحریر کس قدر غیر شخصی تھا۔ کمال کی تکنیک ہے۔ واقعی دیپالی نے سوچا) تم نے اس بار ہمیں خاصی بری طرح لیٹ ڈاؤن کر

دیا۔ مگر ظاہر ہے کوئی زبردست مجبوری رہی ہوگی۔ بہرحال۔ اب انل تم سے جو کہتا ہے اس پر جلد از جلد عمل کرو۔ اس میں تمہارا بہت فائدہ ہے۔ فقط۔"

"ریحان دا دسمبر کے مہینے سے کھلنا اور اس کے بعد سے نواکھالی میں تھے۔ آج کل وہ خاص الخاص سندربن میں ایک جگہ چھپے ہوئے ہیں۔ میں اُن کے پاس سے کل ہی واپس آیا ہوں۔ ریڈیو کی نئی بیٹری لے کر گیا تھا ــــ" انل اطمینان سے گھاس پر بیٹھ گیا۔

"مگر ریحان دا نے مجھے کیا کرنے کو کہا ہے۔" دیپالی نے پوچھا۔

"بتاتا ہوں دیدی۔ بتاتا ہوں۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ ڈھاکے واپس گئیں۔ مگر راستے میں معلوم ہوا کہ آپ ابھی ــــ"

"انل بات بتاؤ۔" دیپالی نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔

"بات ــــ؟ بات کچھ بھی نہیں ــــ" انل نے کھیسیں نکال کر جواب دیا۔ "ریحان دا نے آپ کو سندربن بلایا ہے۔"

"کیا ــــ؟"

"ہیں۔ دیدی۔؟"

"مجھے سندربن کیوں بلایا ہے؟ وہاں پہنچنا آسان ہے؟ اور کس لئے؟"

"پہنچنا آسان بالکل نہیں ہے۔ بڑا خطرناک سفر ہے دیدی اور کیوں بلایا ہے۔ یہ مجھے کیا معلوم۔ صرف اتنا ہی کہا تھا۔ اپنی دیپالی دی کو فوراً یہ سندیسہ دو کہ ایک بے حد اہم میٹنگ میں ان کی شرکت ضروری ہے۔"

"اور کون کون جا رہا ہے۔"

"دادا نے کہا تھا دیپالی کو بتا دینا کہ سریندر دا، محفوظ الرحمٰن میاں، اور ان کی بیوی عائشہ آپا آئیں گے۔ باریسال سے۔ یہاں سے آپ ہوں گی۔ اور محمود الحق دا ڈھاکے سے پہنچیں گے۔ کانفرنس ہے۔ اور انھوں نے تھوڑی سی چیزیں بھی منگوائی ہیں۔ لیتی جائیے گا۔" انل نے کُرتے کی جیب سے ایک فہرست نکال کر تھما دی۔ فہرست میں چند نئے اخباروں اور برطانوی رسالوں کے نام لکھے تھے۔

"دادا کو بس ان کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہئے؟" دیپالی نے تعجب سے پوچھا۔ "اُن کا دل کبھی اچھے کھانے کھانے کو بھی تو چاہتا ہوگا۔ میں ــــ"

"یہ کچھ نہیں بتایا۔ لے جائیے ایک آدھ اچار چٹنی۔"

"اور میں جاؤں گی یہاں سے کس طرح؟"

"آپ یہاں سے رانا گھاٹ اسٹیشن تک اکیلی جائیے۔ ریحان دا کا ایک آدمی آپ کو رانا گھاٹ

اسٹیشن پر ملے گا۔ وہ آپ کو جیسور کے راستے سے کھلنا پہنچائے گا۔ وہاں سے ایک اور آدمی آپ کو باگھیر ہاٹ تک لے جائے گا۔ باگھیر ہاٹ سے ــــ" اگلے پندرہ منٹ اس نے دیپالی کو ریحان تک پہنچنے کا پیچ دار راستہ سمجھانے میں صرف کئے اور ایک تنکے سے مٹی پر دریاؤں اور ٹرینوں کا نقشہ بنایا۔ دیپالی آنکھیں پھیلائے نقشہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔

پھر انل جلدی سے اٹھا اور مداری کی طرح جیب سے نکال کر دو سو کے نوٹ اسے تھما دیئے۔

"یہ کیا ہے؟"

"ریحان دا نے بھجوائے ہیں کرائے کے لئے وہ کہہ رہے تھے۔ دیپالی سے کہنا آج کل ہم بہت سخت رئیس ہو رہے ہیں۔ اسی لئے تم لوگ جلدی سے آکر جنگل میں تھوڑا سا جشن منا جاؤ۔ پھر پیسے ختم ہو جائیں گے۔ اور اس کے بعد اور بھی نہ جانے کیا ہو جائے۔"

"یہ بیکار کی بات ہے۔" دیپالی نے متانت سے کہا۔ "تمہارے ریحان دا بعض مرتبہ ایسی میلو ڈریمٹک باتیں کیوں کرنے لگتے ہیں۔" اُس نے نوٹ اپنے بیگ میں رکھ لئے۔

"اچھا اب میں بھاگتا ہوں دیدی۔ آپ کو جس دن روانہ ہونا ہو، مجھے ایک پوسٹ کارڈ ڈال دیجئے گا۔ میں آپ کو یہاں سے رانا گھاٹ جانے والی ٹرین پر بٹھا دوں گا ــــ" انل سر سے اوپر ہاتھ اٹھا کر اسے نمسکار کرتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا سڑک کی طرف چلا گیا۔ دیپالی گوتم بدھ کے کالے اونچے مجسمے کے پیروں کو غور سے دیکھنے لگی۔ کلا بھون کے جس فن کار نے یہ مجسمہ بنایا تھا وہ واقعی بڑا زبردست ماہر اناٹومی تھا۔ کیونکہ پاؤں کی ایک ایک انگلی کا ایک ایک جوڑ اور ناخن بے حد حقیقی معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے دوسرے شیاملی جھونپڑوں کی دیواروں پر بنے ہوئے سیاہ مجسمے بھی بڑے جاندار سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ میگھ دوت کے اسٹیج پر وسط میں کھڑی ہے۔ اور ڈیکور کی مورتیاں اُسے گھور کر دیکھ رہی ہیں۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سیاہ بادل خلیج بنگال اور سندر بن کے اوپر سے بہتے بیر بھوم کی سمت بڑھتے چلے آرہے تھے۔ اس نے آنکھوں پر زور ڈال کر دھیان سے دیکھا تو سیاہ بادلوں میں ایک سفید بگلہ اوپر اڑتا جا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوب مسکرائی اور اس کا چہرہ بھی متبسم تھا۔ پھر اس نے جلدی جلدی ہوسٹل کی سمت قدم بڑھانے شروع کئے۔

رات کو اپنے کمرے میں لیمپ کے سامنے بیٹھ کر خود سے کہا۔ اب میں اپنے باپ کو ایک اور زبردست دھوکا دیتی ہوں۔ اُس نے لکھا ــــ بابا۔ یہاں سے لوک گیت جمع کرنے والوں کی ایک ٹولی سنتھال پرگنہ کے گاؤں میں جا رہی ہے۔ انھوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کے لئے کہا ہے۔ کیونکہ یہ ٹور میری تھیوری آف میوزک کے دوسرے پرچے کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوگا۔ میں جلد ہی گھر

پہنچنے کی کوشش کروں گی۔ آپ فکر نہ کیجئے ــــ آپ کی بیٹی، دیپالی۔

خط بند کر کے وہ باہر آئی۔ نیم تاریک روشوں اور سنسان باغ میں سے گذرتی سڑک تک پہنچی۔ اور آنکھیں بند کر کے خط لیٹر بکس میں گرا دیا۔

## ۱۵

# سُندربن

سندربن کا سلسلہ جنوبی بنگال میں چوبیس پرگنہ سے لے کر باقر گنج اور کھُلنا کے اضلاع تک پھیلا ہوا ہے۔ ان گھنے اور پُرخطر جنگلوں میں مشہور عالم رائل بنگال ٹائیگر اور چیتے اور ہرن دوڑتے پھرتے ہیں۔ اور دن کے وقت رات کا سا اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ لاتعداد ندیوں اور جزیروں اور سمندری کھاڑیوں اور دلدلوں اور سندری درختوں کی اس لرزہ خیز حسین وجمیل کائنات میں اِکا دُکا مچھیروں اور لکڑہاروں کی بستیاں گھنے جھرمٹوں میں پوشیدہ ہیں۔ سندربن کا یہ وسیع وعریض علاقہ دنیا کے حسین ترین اور خطرناک ترین خطوں میں سے ہے۔

دیپالی سرکار کی کشتی باگیرہاٹ سے روانہ ہو کر ایک نامعلوم منزل کی طرف بہتی جا رہی تھی۔ دیپالی چاروں طرف کے ہیبت ناک حد تک خوبصورت مناظر کو دیکھ دیکھ کر سکتے میں بیٹھی تھی اور اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ ریحان دا سے ملنے جا رہی ہے۔

ریحان دا ــــ چپوؤں کی چپ شپ اور کائنات کی اس آبی اور سبز سمفنی میں یہی نام مرتعش تھا ــــ وہ ریحان دا سے ملنے جا رہی ہے۔

دن بھر چلتے رہنے کے بعد کشتی شام کو ایک گاؤں کے گھاٹ پر پہنچی۔ سنسان جیٹی پر ایک بوڑھا مسلمان جس کی سفید داڑھی ہوا میں لہرا رہی تھی لالٹین ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ دیپالی اپنا اٹیچی کیس (یہ تاریخی اٹیچی کیس!) اور تھیلا اٹھا کر بانس کی جیٹی پر اتری۔ ملاح نے کھُلنا کی ساحلی بنگلہ میں بوڑھے مولوی سے کوئی بات کہی۔ مولوی نے لالٹین اٹھا کر دیپالی سے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ بیٹی"۔

کشتی پانی پر واپس چلی گئی۔ دیپالی اب ہُو کے عالم میں اس ازلی جنگل میں تنہا کھڑی تھی۔ میں کہاں سے کہاں آ گئی۔ اس نے حیرت اور خوف کے ساتھ سوچا۔ لیکن ریحان اس راستے کے سرے پر موجود ہیں۔ میں محفوظ ہوں۔

بوڑھے نے اس کا بکس اور تھیلا اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ وہ اس کے ساتھ جیٹی پر سے اتر کر پگڈنڈی پر آگئی۔ بوڑھا بلا کی پھرتی سے قدم اٹھا رہا تھا۔ شاید اس بوڑھے نے اپنی ساری عمر اسی جگہ پر گذاری ہے۔ اور اسی جگہ اسی حالت میں مر جائے گا۔ ہم نے اس کے لئے کیا کیا ہے اور کیا کر پائیں گے؟ یہ سوچ کر دیپالی نے حسب عادت نئے جوش کے ساتھ اپنی رفتار تیز کر دی۔

"باقی لوگ آگئے؟" دیپالی نے بوڑھے سے پوچھا۔

وہ چُپ رہا۔ دیپالی کو یک لخت ڈر سا لگا۔ پھر اس نے سوچا۔ شاید یہ میرا شہری لہجہ نہیں سمجھ سکا۔ اس نے اپنا سوال دُہرایا۔ "دوسرے لوگ جو آنے والے تھے۔"

بوڑھے نے نفی میں سر ہلا دیا۔ دیپالی متفکر ہو گئی۔ مگر ___ کیا ہو سکتا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا مگر میں اتنی دہشت زدہ کیوں ہو رہی ہوں۔ حد ہے۔ اگر میں نے کوئی حماقت کی ہے تو۔ تو اُسے بھگتنا پڑے گا ___ او ماں ___ او ماں ___ ماں ___ دیپالی نے بے طرح ہڑبڑا کر دیوی سے دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔

آدھ گھنٹے میں وہ لوگ درختوں کے ایک جھرمٹ میں پہنچ گئے۔ جس کے ایک طرف ندی بہہ رہی تھی۔ سائیکلوں کے تھپیڑوں سے شکستہ لیکن خوبصورت بانس کا جھونپڑا سامنے کھڑا تھا۔ برآمدے پر پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور طاق میں دیا جل رہا تھا۔ مولوی نے بکس اور تھیلا برآمدے کے کچے فرش پر رکھ کر آواز دی۔ "زینب!"

ایک بوڑھی عورت پیوندوں سے بھری اُودی ساری لپیٹے اندر سے نکلی۔ اس نے جھک کر دیپالی کو غور سے دیکھا اور مسکرائی۔ "آؤ ___ آجاؤ۔"

دیپالی نے اسے نمسکار کیا اور اس کے پیچھے پیچھے تین کمروں کی صاف ستھرے جھونپڑے میں داخل ہوئی۔

"تمہاری کھاٹ میں نے اپنی کوٹھری میں بچھا دی ہے۔ برابر والے کمرے میں مولوی صاحب اور میرے دونوں بیٹے رہتے ہیں۔ وہ دونوں کام سے کھلنا گئے ہوئے ہیں۔"

دیپالی کھاٹ پر بیٹھ گئی۔

"تم کو بھوک لگی ہوگی۔ راستے میں کچھ کھایا تھا؟ یہ لو ___" بوڑھی عورت نے بُھنے ہوئے چاول کے میٹھے لڈو ایک رکابی میں رکھ کر اسے پیش کئے اور پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھا۔ یہ غربت اور یہ مہمان نوازی ___ دیپالی کے حلق میں کوئی چیز آ اٹکی۔ اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر بوڑھی عورت نے کہا ___ "ریحان میاں باہر ندی پر بیٹھے ہیں ادھر ___"

دیپالی نے غربت کا دور سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ سفید پوش طبقے کی ناداری سے واقف تھی جو

اس کی اپنی ناداری تھی۔ اس نے شہر کے غربار کا افلاس دیکھا تھا مگر ایسی غربت اسے آج تک نظر نہیں آئی تھی۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ مولوی صاحب زینب بی بی کے شوہر برآمدے میں چٹائی بچھا کر مغرب کی نماز میں محو ہو چکے تھے۔ اس نے زینب بی بی سے چند باتیں کیں۔ ایک لڈو دانتوں سے کترا اور لالٹین ہاتھ میں لے کر پچھلے برآمدے میں نکلی۔ جس کے عین نیچے ندی رواں تھی۔

ندی کے کنارے، جھونپڑے کی طرف پشت کئے وہ بیٹھا تھا۔

وہ آہستہ سے نیچے اتری اور اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ وہ کہنی پر سر رکھے اپنی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھایا اور مسکرا کر کہا۔ "شوکتی! آگئیں"۔

"ہاں"۔

وہ اُسے شاباشی دینے کے انداز میں مسکرایا۔ "گڈ گرل۔ بریو لٹل گرل"۔

اُس کے چہرے سے داڑھی غائب تھی۔

"آپ نے ——" دیپالی نے اپنے چہرے پر انگوٹھا اور انگلی پھیری۔

"ہاں بھائی۔ دو ڈھائی برس سے کسی طرح اس کمبخت داڑھی سے پیچھا ہی نہیں چھٹتا تھا۔ مسلمان داڑھی۔ ہندو داڑھی۔ بے حد جھاڑ جھنکاڑ ہو گئی تھی۔ یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آزادی سے سارے میں گھومتا ہوں۔ آج صبح تمہارے آنے کی تقریب میں مولوی صاحب کے بڑے لڑکے سے اُسترا لے کر شیو کیا۔ دیکھو ٹھیک ہے نا"۔ اُس نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے ایک بائیں رخسار پر اُسترے کا خفیف سا زخم تھا اور خون کی بوند جم گئی تھی۔

ندی کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ دور سے شیروں کے گرجنے کی آواز آ رہی تھی۔ ریحان نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ پھر کہا۔

"ابھی تمہارے آنے سے پہلے میں سوچ رہا تھا"۔ پھر اس نے ٹھٹھک کر پوچھا۔ "تم نے علاول[1] پڑھا ہے؟"

"تھوڑا سا"۔

"کوئی نظم یاد ہے؟"

"رات سُرخ اور تاریک تھی ——؟"

"ہاں۔ ادھر دیکھو ——" ریحان نے دور اُفق کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں سمندر اور دریا اور جنگل ایک ہو گئے تھے۔

---

[1] سید علاول۔ سترہویں صدی بنگال کا عظیم شاعر جس کی کشتی پرتگالی قزاقوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرتی اراکان پہنچی۔

"سُرخ اور تاریک رات میں ایک ہری ناؤ۔" اس نے پانی میں انگلیاں ڈبو کر آہستہ آہستہ اپنی خوب صورت آواز میں کہنا شروع کیا۔ "ہلتی، ڈولتی، طوفان زدہ، متحیّر، خائف، اراکان کے ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی ــــ"

"لیکن طوفان آیا ــــ" دیپالی نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن طوفان آیا ــــ" ریحان کہتا رہا۔ "اور ناؤ ساحل کے بجائے ایک دور دراز جزیرے سے جا لگی اور ناؤ میں سے وہ نوجوان نکلا۔ بھوکا۔ زخمی۔ نڈھال ــــ وہ ریت پر پڑا تھا۔ جب وہ لڑکی وہاں پر آئی اور اس نے کہا ــــ"

"اُس نے کہا۔ میں تمھیں اپنے گھر لے جاؤں گی۔ انسان کو بے آسرا اور مایوس نہ ہونا چاہئے"۔ دیپالی نے کہا۔

"تم انسان ہو نا۔ تاریک تنہا غضب ناک سمندر کی روح تو نہیں؟"

وہ ٹھٹھک گئی اور ریحان کو دیکھ کر علاؤل کے الفاظ میں سوال دہرایا۔

ریحان نے اقرار میں سر ہلایا۔

"کیونکہ ــــ" دیپالی کہتی رہی۔ "سمندر اپنے غیض میں مبتلا سارے کرۂ ارض کے ساحلوں سے ٹکراتا ہے۔ مگر زمین تک نہیں پہنچ پاتا ــــ زمین مضبوط ہے۔ اس نے انسانیت کے مظالم کا بوجھ اپنے اوپر اٹھا رکھا ہے۔ سمندر تو ایک چھوٹی سی نوکا کو بھی سہارا نہیں دے سکتا۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑے بڑے سیور پنکھی جہاز چاہئیں۔ ایسے بجرے، جن کو چودہ چودہ مانجھی کھیتے ہیں"۔

"اور اس لڑکی نے علاؤل سے کہا تھا ــــ دھرتی پر گھر بنے ہیں۔ آسمان خوبصورت ہے۔ چاند خوبصورت ہے۔ مگر چاند میں گھر نہیں ہے۔ گھر ناریل کے سائے میں بنتے ہیں۔ میں تمھارا گھر ہونگی"۔

ہوا ساکت رہی۔ کائنات تھم گئی ــــ ندی نے بہنا بند کر دیا۔ ایک ازلی، ابدی لمحے کے لئے سارا وجود خلا میں تحلیل ہو گیا۔

پھر ہوا چلی۔ سندری کے درخت سرسرائے۔ ندی بہنے لگی۔ دیپالی اپنی گود میں ہاتھ رکھے اسی طرح ساحل پر بیٹھی رہی۔

"پھر کیا ہوا شوکتی؟ علاؤل نے اسے کیا جواب دیا؟" ریحان کی آواز سناٹے میں لہروں کے ساتھ گونجی۔

"مجھے پتہ نہیں آگے مجھے یاد نہیں آرہا"۔ دیپالی نے جواب دیا۔ پھر اس نے سادگی سے پوچھا "آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے"۔

"ایک اہم کانفرنس کے لئے"۔ ریحان نے سنجیدگی سے کہا۔

"باقی لوگ ابھی نہیں پہنچے۔ سریندر دا وغیرہ اور عائشہ آپا۔"

"نہیں، بس اب آتے ہی ہوں گے۔"

"میں آپ کی ساری چیزیں جو منگوائی تھیں لیتی آئی ہوں۔"

"گڈ۔"

"دیپالی نے بیگ میں سے دو سو کے نوٹ نکال کر اُس کی طرف بڑھائے۔" یہ آپ کے پاس کہاں سے آگئے تھے۔"

اس نے چونک کر نوٹوں پر نظر ڈالی۔ "ہمیں اپنی کتاب کی رائلٹی ملی تھی۔ مگر تم کیسے آئیں یہاں تک۔"

"ہم بھی رئیس ہو گئے ہیں۔ ہمیں اپنے ریکارڈوں کی رائلٹی ملی تھی۔"

"افوہ۔ تو اس وقت گویا دو سرمایہ دار سندر بن میں آؤٹنگ کر رہے ہیں۔" اس نے شگفتگی سے ایک کنکر پانی میں پھینکا۔

دیپالی پھر بڑی متفکر نظر آئی۔ "ریحان دا۔"

"کہو۔" وہ کنکر اٹھا اٹھا کر ندی میں پھینکتا رہا۔

"باقی لوگ کہاں ٹھہریں گے؟"

"ارے بھئی۔" اُس نے چونک کر جواب دیا۔ "کیا باقی لوگ باقی لوگ کر کے بور کر رکھا ہے۔"

"کیوں؟"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دیپالی نے بھونچکی ہو کر اسے دیکھا۔ "تو آپ نے اونل سے جھوٹ بولا تھا۔"

"بالکل۔"

"اور آپ کا خیال تھا۔ میں چلی آؤں گی۔"

"میرا خیال صحیح تھا۔!"

"دیپالی غصے سے دوسری طرف مڑ گئی۔

"شوکتی۔!"

اس نے جواب نہیں دیا۔ اور ندی کے کنارے کنارے چلنے لگی۔

"شوکتی۔!"

وہ اور آگے بڑھ گئی۔

"ایسے ہی چلتی چلی جاؤ تو سیدھی ڈھاکے پہنچ جاؤ گی۔ مگر ذرا خیال رکھنا۔ وہ تمھارے سامنے

ایک عدد آدم خور گھڑیال بیٹھا ہے ــــ" ریحان نے بشاشت سے آواز دی۔ سامنے ندی کی سطح پر ایک سیاہ لکیر نظر آ رہی تھی۔ ایک گھڑیال تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دیپالی چیخ مار کر واپس پلٹی۔

ریحان کھلکھلا کر ہنستا ہوا سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ دیپالی اس سے کچھ فاصلے پر دوسری سیڑھی پر آ بیٹھی۔ ندی کا پانی سیاہ ہو چکا تھا۔ اور دوسرے کنارے پر سندری کے جھنڈ سرسرا رہے تھے۔ ریحان نے سر اٹھا کر دیپالی کو دیکھا۔ پھر وہ یک لخت بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ اور اس نے آہستہ سے کہا۔ "شاید مجھے کوئی حق حاصل نہیں تھا کہ میں تم کو اس طرح۔ اس طرح زحمت دوں۔"

وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ ریحان نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"دیپالی۔ میں تین برس سے مسلسل، متواتر تین برس سے جرائم پیشہ لوگوں اور ڈاکوؤں کی طرح چھپتا پھر رہا ہوں۔ مدتوں سے مجھے چین کی نیند اور ذرا سی ذاتی مسرت نصیب نہیں ہوئی۔ تمھیں معلوم ہے چارلس بارلو نے قسم کھائی ہے کہ زندہ یا مردہ مجھے گرفتار کر کے رہے گا ــــ؟ تم ــــ تم مجھے کیا سمجھتی ہو ــــ میں انسان ہوں آخر ــــ فولاد کی مشین گن تو ہوں نہیں۔ یا ہوں۔ بتاؤ۔؟" اس نے دوبارہ شگفتگی کی کوشش کی۔ پھر اس نے کہا۔ "نہیں ــــ دیپالی میں تم سے ملنا چاہتا تھا ــــ شاید مجھے اس طرح غلط بہانہ کرنے تم کو اتنی دور نہ بلانا چاہئے تھا۔ مگر میں بے حد خود غرض انسان ہوں۔ اور بہر حال اب تو تم آ ہی گئیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے!" اس نے پھر ہنسنے کی سعی کی۔

دیپالی آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگی۔ مختصر سے گھاٹ کی شکستہ سیڑھی پر بیٹھا وہ ایک چھوٹے سے لڑکے کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ اسکول کا چھوٹا سا لڑکا، جو استانی کے سامنے اپنی شرارت کی معافی چاہ رہا ہو۔ مگر ساتھ ہی کسی دوسری شرارت پر بھی تلا بیٹھا ہو۔ دیپالی کو یک لخت ہنسی آ گئی۔

اسکول گرل گگلز ــــ اس کے کان میں گونجا۔ اور اس گونج کو شکست دیتے ہوئے ایک اینٹ اٹھا کر بھرپور مسرت کے ساتھ دور ندی میں پھینک دی۔

"کھا جائے گا آ کر گھڑیال۔" ریحان نے کہا۔

وہ زور سے ہنسی ــــ "اوما دیدی۔ میری اس ہنسی کو اسکول گرل گگلز کہتی ہیں۔" اس نے کہا اور دوسرے لمحے اس نے سوچا میں یہ نام لے کر قسمت کو TEMPT کر رہی ہوں اور میں وہمی بھی بنتی جا رہی ہوں۔ اور میرے اس ذہنی زوال کا ذمے دار یہ شخص ہے۔ ہاہاہا۔ اس نے زور سے پانی اُچھالا۔

"اُوما دیدی ــــ" ریحان نے سگرٹ جلاتے ہوئے بے پرواہی سے کہا۔ "بڑی اچھی آدمی ہیں۔ ان کی سنگت میں رہو گی تو تمھارے اندر بھی عقل آ جائے گی۔"

"ابھی بے عقل ہوں؟"

"بے حد۔ ایک اجنبی آدمی کے بلانے پر تن تنہا اس کے پاس بنوں میں آگئیں۔"

"مجھے اس اجنبی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔؟"

"قطعی نہیں!"

"اور ایسے ناقابل اعتبار آدمی کے ہاتھوں میں صوبے کی تحریک کی باگ ڈور ہے۔ جب ہی تو یہ گت بن رہی ہے تحریک کی۔ ہاہاہا۔"

ہاہاہا۔ وہ بھی خوب ہنسا۔

اب چاند دلدلی جنگلوں کے سیاہ اُفق پر آہستہ آہستہ اوپر آرہا تھا۔

"چلو تم کو اپنے میزبانوں سے ملوادیں۔"

وہ اس بوڑھے جوڑے کے مسکین اور باصبر چہرے کو یاد کر کے فوراً دکھی ہوگئی۔

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"مولوی ابوالہاشم ـــــ ماہی گیر ہیں اور اس گاؤں کی مسجد کے پیش امام۔ ان کے لڑکے بھی مچھیرے ہیں اور ہمارے ورکر بھی ہیں۔ میں ان کے یہاں دو مہینے سے مقیم ہوں۔ کھلنا میں کافی کام ہو رہا ہے۔ گو رفتار سست ہے۔"

"آپ نے ان دونوں میاں بیوی کو میرے متعلق کیا بتایا ہے؟"

"تمہارے متعلق ـــــ؟ کچھ نہیں۔ ان سے کہہ دیا تھا کہ اس ہندو لڑکی کو مسلمان کر کے شادی کرنے والا ہوں۔" ریحان نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"شرم تو نہیں آتی آپ کو"۔ دیپالی نے غصے سے سُرخ ہو کر کہا۔

"بالکل نہیں ـــــ چلو ـــــ اٹھو ـــــ" ریحان نے بڑے تکلف اور شائستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور لالٹین اٹھالی۔ وہ بانس کی سیڑھیاں چڑھ کر جھونپڑے میں داخل ہوئے۔

زینب بی نے ماچھی بھات ان کے سامنے رکھا۔ دیوار پر پھیلے مچھلی پکڑنے کے جال کے نیچے وہ دونوں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ان دونوں کا سایہ دیوار پر بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اتنے میں مولوی کا داڑھی والا جھکا جھکا سایہ بھی پرچھائیوں میں آشامل ہوا۔

"بابا ـــــ خالہ ـــــ" ریحان نے دونوں بوڑھی پرچھائیوں سے کہا۔ "یہ ہماری کولثم ہے۔ کولثم دیپالی"۔

مولوی نے سر اٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ اور سر ہلایا۔

ریحان کہتا رہا۔ "یہ ہمارے لئے کولثم بھی ہے اور دیپالی بھی۔ کسی دن میں تم کو سمجھاؤں گا

کہ اس دیس میں کولثم اور دیپالی ایک کیسے ہو سکتی ہیں"۔

بس شروع ہو گئی تبلیغ۔ ایک منٹ کو بھی پارٹی لائن چلانا نہیں بھولتے۔ دیپالی نے ذرا الجھن سے سوچا اور یک لخت اسے ایسا لگا کہ سامنے پرچھائیوں میں بنوئے چندر سرکار کا سایہ بھی آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ یہ میں کیا کر رہی ہوں۔ وہ سر جھکا کر تندہی سے کھانا کھانے میں منہمک ہو گئی۔

کھانے کے بعد ریحان نے کہا۔ "رات بہت آ گئی ہے۔ تم اتنا طویل سفر کر کے آئی ہو دیپالی۔ اب آرام کرنا چاہو گی"۔

"جی ہاں"۔

"گڈ نائٹ"۔ ریحان نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"گڈ نائٹ"۔

ریحان اور مولوی ابوالہاشم کمرے سے باہر چلے گئے۔

اُس رات، سُندر بن کے عمیق سناٹے میں، زینب بی بی کے برابر والی کھاٹ پر لیٹ کر دیپالی نے سوچا۔ زندگی کی کوئی تک بھی ہے۔ بہت جلد اسے نیند آ گئی۔

دوسرے روز صبح سویرے وہ جھونپڑے سے نکلتی ہوئی ایک قریبی کنج میں چلی گئی۔ جہاں دور سے رنگین گلدار ہرنوں کی ایک ڈار چوکڑیاں بھرتی گذر رہی تھی۔ وہ ایک درخت کی شاخ پر ہاتھ رکھ کر ان خوبصورت ہرنوں کا نظارہ کرنے میں محو تھی۔ جب کسی نے پیچھے سے کھنکارا۔

"نہ ہوئی غریب شکنتلا، اس وقت اس پوز کو دیکھ کر فوراً بے ہوش ہو جاتی اور کالی داس کو سین دوبارہ لکھنا پڑتا ــــ!"

دیپالی نے پلٹ کر دیکھا۔

"ریحان۔ آپ اس قدر نون سیریس ہو گئے ہیں کہ مجھے آپ کی طرف سے فکر ہو چلی ہے۔ آئیے۔ میں آپ کو آپ کے رسالے دے دوں"۔

"اجی پڑھ لیں گے رسالے"۔ وہ آرام سے ایک درخت کے کٹے ہوئے تنے پر بیٹھ گیا۔

"مجھے آپ سے جنگ کی تازہ ترین صورت حال ڈسکس کرنا ہے"۔

"وہ بھی کر لی جائے گی"۔

"اچھا تو چل کر ناشتہ تو کر لیجئے"۔

"ناشتہ۔ اوہ۔ آج کا مینو کیا ہے ہمارے بریکفاسٹ کا؟" ریحان نے شان سے پوچھا۔

"مُرغ مسلّم اور پلاؤ۔ یا جو کچھ بھی آپ مسلمان لوگ کھاتے ہیں صبح کو"۔

"اری بیوقوف۔ مسلمان ناشتے میں مرغ مسلّم نہیں کھاتے۔"

"واہ۔ جہاں آرا کے ہاں، میں نے ایک مرتبہ مرغ مسلّم اور پراٹھے کھائے تو اس نے کہا کہ صبح پکے تھے۔"

"جہاں آرا کون۔؟" وہ دونوں ٹہلتے ہوئے اب جھونپڑے کی طرف لوٹ رہے تھے۔

"میری دوست ہے۔ نواب قمرالزماں چودھری کی لڑکی۔ سخت فیوڈل۔ لیکن بے حد سوئیٹ۔"

"اوہ۔"

وہ جھونپڑے میں داخل ہو گئے۔ زینب بی بی نے رات کا پکایا ہوا پنتھا بھات سامنے رکھا۔

"میں آج ہاٹ جا کر آپ کے لئے کھانے پینے کی سامان خرید لاؤں گی۔" دیپالی نے ریحان سے انگریزی میں کہا۔

"دیپالی تم چند روز یہاں رہ کر میرے لئے بہتر کھانا پکا دو گی۔ مگر ان دونوں کو تو ساری زندگی اس کے علاوہ کچھ میسر نہیں ہوا۔"

"اوہ ـــــ" دیپالی نادم ہو کر المونیم کی رکابی پر جھک گئی۔ زینب بی بی چولھے پر چائے اونٹنے میں مصروف تھیں۔ چار پینے کے بعد وہ دونوں دوسرے کمرے میں گئے۔ جس میں ریحان کی چارپائی بچھی تھی۔ فرش پر کاغذات کا ڈھیر لگا تھا۔ ایک کونے میں اس کے ٹرنک کے اوپر بیٹری کا ریڈیو رکھا تھا۔ ریحان نے صبح کی خبروں کے لئے ریڈیو آن کیا۔ اے۔ آئی۔ آر۔ دہلی سے میلوِن ڈی میلو کی آواز گونجی۔

خبریں سننے کے بعد ریحان نے کہا۔ چلو باہر چلیں۔ وہ دونوں باہر نکلے۔ جھونپڑے کے نیچے گھاٹ پر مولوی کی ناؤ بندھی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب دن بھر کے لئے کسی کام سے گاؤں جا چکے تھے اور پانی کی سطح پر بحری عقاب مچھلیوں پر جھپٹا مار رہے تھے۔

"میں وہ چتکبرے ہرن دیکھنا چاہتی ہوں، جو صبح اتنی تیزی سے بھاگ گئے۔ آگے جا کر جنگل زیادہ خوب صورت ہو جاتا ہے؟"

"زیادہ خوب صورت اور زیادہ خطرناک۔"

"مگر میں وہ ہرن ضرور دیکھوں گی۔ اتنے حسین ہرن میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے۔"

"ٹھیک ہے ـــــ مگر سیتا کے انجام سے واقف ہو؟"

وہ ہنستی ہوئی اُتر کر کشتی میں بیٹھ گئی ـــــ ریحان نے کشتی کھول کر دھارے پر چھوڑ دی۔

وہ اس ندی اور اس منظر اور اس ماحول کا ایک لازمی اور فطری جزو معلوم ہو رہا تھا۔ دیپالی کو یک بیک خیال آیا کہ وہ اس کی زندگی کے پس منظر سے بالکل واقف نہیں۔

ناؤ پانی کی سطح پر روانی سے بہہ رہی تھی۔ ریحان نے آہستہ آہستہ ایک ساری گان گنگنانا

شروع کر دیا۔ پھر چپ ہو گیا۔

کنارے پر جھکے سندری درختوں پر رنگ برنگے پرندے چکر کاٹ تھے۔

" تم کو احساس ہے شوکتی کہ ان دریاؤں اور اس دھرتی نے کیسے کیسے دکھ دیکھے ہیں ؟ میں ان دکھوں کا ایک حصّہ ہوں"۔

" آپ بھی گاؤں کے رہنے والے ہیں ؟"

" تم نے مولوی ابوالہاشم کو دیکھا ـــــ میرے بابا مولوی ابوالہاشم کا نمونہ ہیں۔ ایسے ہی صابر، نیک اور بھولے"۔

" اوہ "۔ وہ چپ ہو گئی۔ وہ یہ کرید نہ کرنا چاہتی تھی کہ ایک غریب کسان کا لڑکا لندن اسکول آف اکنامکس کیسے پہنچ گیا۔ یقیناً وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہ جانتی تھی۔

چند لمحوں بعد اس نے آہستہ سے کہا۔" آپ لندن کیسے گئے تھے ؟"

" لندن ـــــ ؟" ریحان نے چونک کر دہرایا۔" لندن کا یہاں کیا ذکر ہے ؟ یہ اپنا ملک دیکھو اور دیکھو کہ لندن نے اس کے ساتھ کیا کیا ؟" وہ خاموش ہو گیا۔" میں ۱۹۳۵ء میں لندن گیا تھا ـــــ تم میرے حالاتِ زندگی جاننا چاہتی ہو ؟ میں نے علی گڈھ سے ہائی اسکول اور ایف اے کیا تھا ـــــ"

" علی گڈھ"۔

" ہاں یہ تمھارے لئے تقریباً اجنبی نام ہے، مگر یہ ملک اور قوم کی ایک بے حد اہم داستان کا ایک حصّہ ہے اور اس داستان سے تم کو واقف ہونا چاہئے ـــــ پھر میں نے ڈھاکے لوٹ کر بی اے اور کلکتہ سے ایم۔ اے کیا۔ اسی زمانے میں میں تمھارے چچا کی کتاب "بنگال کی اقتصادی تاریخ" پڑھی تھی۔ وہ رک کر کسی سوچ میں کھو گیا۔ اور پھر چپو چلانے شروع کئے اور کہنے لگا۔" اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ ان کی بھتیجی ـــــ کوئی سڑیلی سی لونڈیا کسی اسکول میں پڑھ رہی ہے اور ایک دن میری زندگی میں سائیکلون کی طرح داخل ہو گی ـــــ دیکھو کھلنا کی مناسبت سے کیسی برمحل تشبیہ دی ہے"۔ وہ اداسی سے ہنسا۔

" بہت خوب ! آگے چلئے !!"

" اس کے بعد ـــــ ایک ـــــ ایک وظیفے پر لندن چلا گیا۔ وہاں میں اور اُدما اور اکشے اور بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ہمارا بڑا ہی تاریخی قسم کا گروہ تھا وہ !"

" اور واپس آتے ہی کود پڑے انقلاب کے شعلوں میں !" دیپالی نے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ پھر اس نے کہا۔" کلکتہ میں چند سال ہوئے پروگریسو رائٹرز کی دوسری کانفرنس ہوئی تھی۔ اس میں تمھیں آنا چاہئے تھا۔ بڑا ولولہ خیز تجربہ تھا"۔

"آپ بھی لکھتے ہیں ؟"

ریحان نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ "ارے تم کتنی جاہل ہو۔ یہ رائلٹی مجھے ابھی کس لئے ملی ہے اور وہ جو میں نورالرحمٰن بنا رسالہ ایڈٹ کر رہا تھا تو کیا گھاس کھود رہا تھا ؟ دیپالی کیا تم نے واقعی میری کتاب نہیں پڑھی ؟ اُو آنے تم کو نہیں دی پڑھنے کو ؟"

"کیا افسانے لکھتے ہیں ؟"

ریحان نے چپو چھوڑ کر آسمان کی طرف احتجاجاً ہاتھ پھیلائے۔ "اوہ لڑکیاں۔ لڑکیاں ـــ" اس نے فریاد کی۔

"نہیں سچ بتائیے"۔

"میں افسانے نہیں لکھتا ہوں نہ شاعری کرتا ہوں۔ ٹھوس کام کرتا ہوں"۔

"تھوڑا سا انکسار آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائے گا"۔ دیپالی نے ہنس کر کہا۔ "آپ کی کتاب کا کیا نام ہے ؟"

"انیسویں صدی میں بنگال کی زرعی حالت"۔ ریحان نے منہ لٹکا کر کہا۔ "ارے دیپالی تم بڑی جاہل نکلیں ـــ"

"اور یہ پروگریسو رائٹرز کیا ہوتے ہیں ؟"

ریحان نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور کراہا۔

"نہیں پلیز۔ بتائیے نا"۔

"ابھی جب کالج واپس جاؤ گی تو گرودیو نے جو پیغام کانفرنس کے نام بھیجا تھا وہ پڑھ لینا، سمجھ میں آجائے گا"۔

"گرودیو نے کیا کہا تھا ـــ ؟"

"انھوں نے کہا تھا کہ میری طرح گوشہ نشیں بن کر کام نہیں چل سکتا۔ اُوما دیبی کو چاہئے تھا کہ تمھیں یہ سب باتیں بتاتیں"۔

اُوما دیبی۔ اُوما دیبی۔

"آپ نے بہت سے لوگوں کو آئیڈیلائز کر رکھا ہے"۔

"ہاں"۔

"کون کون"۔

"بہت سارے ہیں۔ ان میں سے ایک تم بھی ہو۔ دیپالی تم کلچرل فرنٹ پر کام کرو گی ؟"

"آپ جو کہیں گے کروں گی"۔

کشتی اب درختوں کی سُرنگ میں سے گذر رہی تھی۔

"مغرب میں بھی یہی سب ہو رہا ہے؟ جدوجہد؟" دیپالی نے پوچھا۔

"مغرب میں ـــــ اسپین میں ایک خونریز جنگ لڑی جا چکی ہے دیپالی"۔

"مجھے اور بتائیے ـــــ لندن کے متعلق۔ جب آپ وہاں طالب علم تھے"۔

"جب ہم وہاں طالب علم تھے"۔ ریحان چپو ایک طرف رکھ کر نیم دراز ہو گیا ـــــ وہ واقعی "ری لیکس" کر رہا تھا۔ "اس زمانے میں وہاں بڑے معقول لوگ جمع تھے۔ ملک راج آنند اور سجاد ظہیر اور جیوتی گھوش نے مل کر پی ڈبلیو اے قایم کی تھی"۔

"آپ انگلینڈ ہی میں تحریک میں شامل ہو گئے تھے"۔ دیپالی نے بات کاٹی۔

"ہاں۔ اور واپس آکر دیکھا کہ ہمارے ساتھی ـــــ علی گڑھ اور لکھنؤ۔ اور جامعہ ملیہ اور کلکتہ اور سب جگہوں کے نوجوان ہمارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔ پرانے دہشت پسند بھی اب ہماری طرف آچکے تھے۔ شوکتی۔ ہم لوگ خوش قسمت ہیں جو اس زمانے میں پیدا ہوئے اور ملک کے لئے کچھ کر سکنے کے اہل ہیں"۔

سُرنگ کے اختتام پر پہنچ کر ریحان نے کشتی موڑ لی۔ "آگے گھڑیالوں کی راجدھانی ہے۔ اب واپس چلتے ہیں"۔ اس نے کہا۔

واپسی میں ریحان خاموشی سے پتوار چلانے میں مصروف رہا۔ بادل گھر آئے تھے اور سورج کبھی کبھی بادلوں میں سے نمودار ہو کر چمکنے لگتا تھا۔ لقلق اور رام چڑیاں سارے میں اڑتی پھر رہی تھیں۔

گھر پہنچ کر انھوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ تیسرے پہر کو ریحان نے دیپالی کے دروازے پر آن کر آواز دی۔ "شوکتی۔ یہاں آنا تو ـــــ" دیپالی کھاٹ پر ساری بچھا کر اور اپنے تھیلے کا تکیہ بنائے بے خبر سو رہی تھی۔ زینب بی بی گھڑا لے کر شام کے پکانے، رینڈھنے کے لئے پانی لینے ندی پر گئی ہوئی تھیں۔ ریحان ذرا جھجکتا ہوا اندر آگیا اور کواڑ سے لگ کر خوابیدہ دیپالی کو دیکھنے لگا۔ "شوکتی"! اس نے چند منٹ بعد پھر آہستہ سے آواز دی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

"وہ رسالے کہاں ہیں؟" ریحان نے یونہی بے مقصد سوال کیا۔

"ابھی لاتی ہوں"۔

ریحان ذرا احمقوں کی طرح کھڑا سر کھجاتا رہا۔ پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دیپالی اخبار اور رسالے اُس کے پاس لے گئی۔

"آؤ باہر روشنی میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں"۔ ریحان نے کہا۔ وہ یہ رسالے حاصل کر کے واقعی بے حد خوش نظر آرہا تھا۔ جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا ہو۔

برآمدے میں چٹائی بچھا کر وہ سورج ڈوبنے تک رسالوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ ریحان دیپالی کو مختلف مضامین کے نکات سمجھاتا گیا۔

سامنے گھاٹ پر ناؤ آکر رکی۔ مولوی صاحب اُترے۔

زینب بی بی نے اندر سے آواز دی۔ "کھانا تیار ہے"۔

کھانے کے بعد دیپالی پھر برآمدے میں جا کھڑی ہوئی۔ اور اُفق پر تیرتے ہوئے چاند کو دیکھنے لگی۔ ریحان نزدیک کے کھمبے سے ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ رات کا اندھیرا سیلاب کی طرح بڑھتا آرہا تھا۔

زندگی کا ـــــ ایک اور دن ختم ہو گیا۔ ایک انمول دن گذر گیا۔ ایک شعر پڑھا جا چکا۔ ریحان نے کہا۔ پھر اس نے مڑ کر دیپالی کو آواز دی۔

"گڈ نائٹ ـــــ دیپالی"۔ وہ اپنے کمرے میں گھس گیا۔

دوسرے دن وہ پگڈنڈیوں پر سے گزر کر گاؤں میں گئے۔ کسانوں اور مچھیروں سے باتیں کرتے رہے۔ اور رات گئے واپس آئے۔ راستے میں دیپالی کی ساری ایک جھاڑی میں الجھ گئی۔ ریحان اس کی مدد کرنے کے لئے زمین پر دو زانو بیٹھ گیا۔ کانٹے نکالتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر دفعتاً پوچھا۔ "ساری پر یاد آیا۔ تمھاری چوری کا پتہ چل گیا۔؟"

"جی ہاں"۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ اور چاند کی روشنی میں ساری کے چاک میں گرہ لگانے کی کوشش کرنے لگی۔

"مجھے ان ساریوں کے بکنے کا بڑا رنج ہوا تھا۔" ریحان نے کہا۔ "میں نے سوچا تھا، جو لڑکی اتنی بڑی قربانی دے سکتی ہے"۔

"میں نے کیا قربانی دی ہے"۔ دیپالی نے جھنجھلا کر بات کاٹی۔

"کیوں۔ کیا میں جانتا نہیں کہ لڑکیوں کو اپنی ساریوں اور گہنوں سے کتنی وابستگی ہوتی ہے"۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "امی کے پاس بھی دو بالوچر ساریاں تھیں۔ جب وہ بیاہ کر آئی تھیں تو میری دادی اماں نے ان کو دی تھیں ـــــ وہ ساریاں میں تم کو دوں گا دیپالی"۔

دیپالی سکتے میں رہ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ گھبرا کر پتھر پر سے اٹھی۔

"کیوں۔ کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" ریحان نے پریشانی سے دریافت کیا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔ گھر چلئے"۔

وہ اونچے نیچے ٹیلوں، اور جھاڑیوں کو پھلانگتے جھونپڑے کی طرف روانہ ہو گئے۔ دیپالی نے اب پھر ایک دم چپ سادھ لی تھی۔

تیسرے روز وہ دونوں ٹہلتے ہوئے ندی کے ساحل پر کافی دور نکل گئے۔ جب، اچانک دور سے ایک لانچ نظر آئی۔ دیپالی سہم کر ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گئی۔ یہ سرکاری لانچ تھی۔ غالباً معمول کے دورے پر اس طرف سے گذر رہی تھی یا شاید کچھ سرکاری افسر شکار کے ارادے سے ادھر آئے تھے۔ لانچ شور مچاتی پانی پر سے گزر کر درختوں کی سرنگ میں غائب ہو گئی۔ دیپالی کا رنگ فق ہو چکا تھا۔

"ارے شوکتی۔ ایک ذرا سی سویلین لانچ سے ڈر گئیں"۔

دور سے گولیاں چلنے کی آواز آئی۔

"اوماں"۔ دیپالی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

ریحان ہنسنے لگا۔ "گھبراتی کیوں ہو بھائی۔ افسر لوگ شکار کھیلنے آیا ہے۔ ہم لوگ یہاں بالکل محفوظ ہیں۔ یہ دریا اور جنگل ڈیڑھ سو سال سے اپنے بچوں کی حفاظت کر رہے ہیں"۔ ریحان چند لمحوں تک جنگل کے سرسبز اور گنجان سناٹے کی آواز سنتا رہا اور پھر کہنے لگا۔ "کل ہم جن کسانوں سے ملے تھے۔ اُن کے پرکھے سو سال پہلے فرائضی تحریک میں لڑے تھے"۔

"ریحان۔ آپ کو اپنے راستے کے بارے میں مطلق کوئی شبہ، کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے؟" دیپالی نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

"نہیں۔ جب اپنے اصل دشمن اور اس کے ایجنٹوں کو ہم پہچان چکے ہیں تو پھر الجھن کیا ہو سکتی ہے؟" وہ آگے جھک کر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا۔ "سنو دیپالی۔ یہ یاد رکھو کہ برطانوی سرمایہ داری ہندوستان کے قحط، غلامی، قرضے، ذات بندی اور فرقہ وارانہ کش مکش کی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے۔ تمھیں معلوم ہے یہی کھلنا اور نواکھالی، جو اب ڈاکوؤں اور مفلس ماہی گیروں کا دیس ہے۔ مغلوں اور نوابوں کے عہد میں کتنے دولت مند تجارتی علاقے تھے؟ یورپ میں جو ۲۰۰ برس تک سب سے زیادہ خونریز لڑائیاں لڑی گئیں وہ ہندوستان کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں"۔

وہ اب درختوں کے نیچے سے نکل کر ساحل پر آ گئے۔ چاروں طرف پھولوں کی روشنی نے بڑی سہانی اور عجیب سی خوشبو پھیلا رکھی تھی۔

"تم جانتی ہو نا کہ سترہویں صدی میں ہندوستان کے فولاد کا پروڈکشن سارے یورپ کے فولاد کے پروڈکشن سے برتر تھا۔؟"

دفعتاً دیپالی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کیا ہوا ــــ؟"

"کچھ نہیں! کوئی اس وقت یہاں آن کر دیکھے کہ اس شدید رومانی ماحول میں ریحان الدین احمد مجھے سترہویں صدی کے فولاد کے پروڈکشن کے متعلق سمجھا رہا ہے۔ اگر میں یہ بات واپس جا کر لوگوں کو

بتاؤں کسی کو یقین آئے گا۔؟"

"ہماری جدوجہد کا تدارک کرنے کے لئے۔" ریحان کہتا رہا۔ "پچھلی صدی میں برطانیہ نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ امپریلزم کے سائے میں اس نے ہندوستان کو کتنا ترقی یافتہ بنایا ہے۔ انگریزی تعلیم اور ہسپتال اور ریل گاڑیاں۔ اور مشن کالج۔"

"ریورنڈ بنرجی۔" دیپالی نے زیرلب کہا۔

"کیا ــــ؟"

"کچھ نہیں۔"

"وہ خودکفیل ہندوستانی سوسائٹی جو مہابھارت کے زمانے سے لے کر مغل عہد تک قایم رہی تھی اُسے انگریزی سرمایہ داری نے تباہ کردیا۔ کیا سوچ رہی ہو ــــ؟" ریحان نے ٹھٹھک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں اور بتائیے۔"

"ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا۔" ریحان نے سر کھجا کر بات دوبارہ شروع کی۔ "مگر یورپ میں سرمایہ داری کے ساتھ نئی سماجی طاقتیں بھی پیدا ہوگئی تھیں۔ جو ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوئیں۔"

"لیکن کل تو آپ کہہ رہے تھے ہندوستانی گاؤں کی اکونومی کی برطانیہ کے ہاتھوں تباہی کو کارل مارکس نے ایک سماجی انقلاب بتایا ہے۔ کیونکہ ذات بندی کی بنا پر ہمارے گاؤں رجعت پسند تھے۔ اور ان میں مزید ترقی کی گنجائش نہ تھی۔"

"گڈ کویسچن ــــ" ریحان نے کہا اور جھونپڑے کی طرف لوٹتے ہوئے دیپالی کو ان دقیق مسائل کے رموز و نکات سمجھانے میں مصروف رہا۔

چوتھا دن۔ ریحان نے دیپالی کو برطانوی سرمائے کے تین ادوار ــــ کمپنی کے مرچنٹ سرمائے، انیسویں صدی کے انڈسٹریل سرمائے اور جدید فنانس کے سرمائے اور نئے ہندوستانی سرمایہ داروں کے متعلق سمجھانے میں صرف کیا۔

پانچویں دن جب وہ کشتی رانی کے لئے نکلے تو اچانک بے حد ملول ہو کر اُس نے دیپالی سے پوچھا ــــ "شوکتی۔ تم کتنے دن یہاں رہ سکتی ہو۔"

"لوک گیت جمع کرنے میں جتنے دن بھی لگ جائیں۔" اس نے ہنس کر جواب دیا۔

چھٹے دن وہ ناؤ کھیتے کھیتے بہت دور نکل گئے۔

پھولوں کے ایک کنج میں سے ناؤ گزرنے لگی تو اس نے اوپر جھکی ہوئی ڈالیوں میں سے چند پھول توڑ کر اس کے بالوں پر برسا دیئے۔ ناؤ ایک گھاٹ کے قریب پہنچی۔

بنگال کے ہندو عوام کا عقیدہ ہے کہ جب رام اور سیتا نے بن باس لیا تو انھوں نے کافی عرصہ

سُندر بن میں بھی گذارا تھا۔ کاٹھیا واڑ، وسطی اور جنوبی ہند سے لے کر چاٹ گام تک ان علاقوں کے باسیوں کا اپنے اپنے جنگلوں کے متعلق یہی عقیدہ ہے۔ ان جنگلوں میں رام اور سیتا انھیں اب بھی چلتے نظر آتے ہیں۔

سُندر بن کے اسی تقدس کی وجہ سے نواکھالی اور کھُلنا کے جنگلوں اور دریاؤں اور سندیپ کے جزیروں میں پرانے مندروں، مٹھوں اور سنیاسیوں کے جھونپڑوں کی بہتات ہے۔

ریحان نے ناؤ جس جگہ کنارے سے باندھی اس کے قریب ہی جنگل میں ایک پرانا مندر نظر آرہا تھا۔ کچھ فاصلے پر گاؤں کا بازار تھا۔

"بھوک لگ رہی ہے۔ آؤ کچھ کھالیں"۔ ریحان نے کہا۔ کنارے پر اتر کر وہ جنگل میں داخل ہوئے۔ دفعتاً مندر اُن کے سامنے آگیا۔

دیپالی نے غیر ارادی طور پر آنچل سے سر ڈھک لیا۔

"دسویں صدی کا مندر ہے"۔ ریحان نے کائی آلود معبد پر نظر ڈال کر ماہرانہ انداز میں کہا۔

"اوفوہ۔ مارے قابلیت کے حالت خراب"۔ دیپالی نے مسکرا کر کہا۔

"آؤ۔ اندر چل کر دیکھتے ہیں۔ یہ تو بہت ہی تاریخی عمارت معلوم ہوتی ہے۔ یہ اسکلپچر دیکھو۔ ضریحاً سین پیریڈ"۔

ایک بوڑھا اندھا دُھندا پجاری اندر سے پرچھائیں کی طرح برآمد ہوا۔ ریحان چپلوں سمیت دیوار پر چڑھ کر مورتیوں کی فریز کا مطالعہ کر رہا تھا۔ پجاری کو اپنی طرف تاکتے دیکھ کر اس نے دیپالی سے انگریزی میں کہا۔ "اگر کوئی اعتراض کرے تو کہہ دینا میں تمھارا پتی دیو ہوں۔ رو ہل سرکار"۔

"شٹ اپ"۔

پجاری نے نذرانے کی امید میں مسکرا کر دیپالی کو اندر بلا لیا۔ اور ریحان کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

دوسرے لمحے وہ دونوں دُرگا بھوانی کی مورتی کے سامنے کھڑے تھے۔ ریحان نے چہرے پر مصنوعی عقیدت طاری کر لی۔

پجاری نے دونوں کی پیشانیوں پر تلک لگا کر انھیں پرشاد دیا اور دیوی کے چرنوں میں پڑے گیندے کے دو ہار اُن کے گلے میں ڈال دیئے اور جھکا جھکا ٹٹول ٹٹول کر لوبان سلگانے میں مصروف ہو گیا۔

"لو بھئی مبارک ہو"۔ ریحان نے چلّا کر انگریزی میں کہا۔

دیپالی شرم سے لال بھبوکا ہو رہی تھی۔

ریحان نے جیب سے نکال کر پجاری کو کچھ روپے دیئے اور دیپالی کا بازو تھام کر اُسے باہر لے آیا ـــــ "ارے بھائی ـــــ" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہر انڈین فلم میں دیکھا ہے کہ ہیرو اور ہیروئن مندر میں جا پہنچتے ہیں اور پجاری عین اسی طریقے سے ہار پہنا کر ان کا بیاہ کر دیتا ہے۔ بھئی کمال ہو گیا۔"

"ریحان۔ دِل یُو پلیز شٹ اپ"۔ دیپالی نے کہا اور چند قدم چلنے کے بعد ایک شکستہ ستون پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ریحان حیرت سے اُسے دیکھنے لگا اور جب اس ہندو لڑکی کی جذباتی کیفیت اور موقع کی نزاکت کا اسے اندازہ ہوا تو وہ گھبرا کر اس کے قریب دوزانو جھک گیا۔ اور لجاجت سے کہنے لگا۔ "ارے بیوقوف۔ نہیں ہوا بیاہ۔ کون گدھا کہتا ہے کہ بیاہ ہو گیا۔ عجیب بیوقوف لڑکی ہو۔ ارے تم ابھی تک مذہبی توہمات کی قائل ہو۔ مندر اور پجاری ـــــ اور ـــــ کمال ہے"۔ وہ سر کھجانے لگا ـــــ "ارے احمق لڑکی۔ شادی صرف کورٹ میں ہوتی ہے۔ تم اور میں مندر اور مولوی کے قائل ہی کہاں ہیں۔ اور ـــــ اور کوئی ـــــ تُک بھی ہے بھلا ـــــ چلو اٹھو ـــــ عجیب بیوقوف لڑکی ہو بھئی۔"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر پگڈنڈی پر لے آیا۔ گاؤں پہنچ کر وہ ایک چائے خانے میں گئے اور لکڑی کی بنچ پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور چائے پی۔ دیپالی بالکل چُپ رہی۔ ریحان اُسے بار بار پریشانی سے دیکھتا تھا۔ پھر وہ چائے خانے میں جمع لوگوں سے باتیں کرنے لگا۔ یک لخت اسے خیال آیا کہ وہ بے حد غیر محتاط ہو گیا ہے۔ یہ گاؤں کھلنا شہر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور پولیس کے سپاہی بھی زیادہ دُور نہیں ہوں گے۔ چائے ختم کر کے وہ دونوں گھاٹ پر آئے اور کشتی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہو گئے۔

"دیپالی"۔ کشتی ندے کے دھارے پر آئی تو ریحان نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔ میں نے مذاق کیا تھا۔ اگر تم کو بُرا لگا ہے تو مجھے معاف کر دو"۔

وہ ایک دم پھر رونے لگی۔

"او مائی گاڈ ـــــ" ریحان نے بازو پھیلا کر آسمان کو دیکھا۔ "حد ہے"۔

وہ ہنس پڑی۔ اب وہ رو رہی تھی اور ہنس رہی تھی۔ ریحان خاموش رہا۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ اُس کی اور اس لڑکی کی زندگی اس نوکا کی مانند طوفانوں سے بے پرواہ، دریا کے پُرشور دھارے پر کسی نامعلوم ساحل کی طرف بہہ رہی ہے۔ اب وہ ایک دوسرے کے رحم و کرم پر زندہ رہیں گے۔

اب چاند بہت دیر میں طلوع ہوتا تھا۔ سُندر بن پر گھُپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس رات جب جھونپڑے میں سب لوگ سو گئے تو دیپالی چپکے سے اٹھی۔ طاق میں رکھے خالی دیوں میں سے ایک دیا نکال کر اُس میں تیل ڈالا۔ اور بتّی لگائی۔ پھر دیا اور کاغذ کا ایک ٹکڑا لے کر باہر چلی گئی۔ اور ندی

کے کنارے بیٹھ کر اس نے کاغذ کی چھوٹی سی ناؤ بنائی۔ دیا جلا کر اس ناؤ میں رکھا اور اُسے پانی میں بہا دیا۔ اور گھاٹ پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بے حد دھیان اور فکر مندی سے اُسے دیکھنے لگی۔ دیا دریا کے دھارے پر دُور تک بہتا چلا گیا اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اچانک دیپالی کو احساس ہوا کہ ریحان اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں کھڑا اسے ندی میں چراغ بہاتے دیکھ رہا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھی اور سیڑھی چڑھ کر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دوسری صبح وہ چولھے کے پاس بالکل نارمل اور بشاش نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ ریحان کے قریب آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "گڈ مارننگ"۔

"گڈ مارننگ"۔

زینب بی بی اور مولوی صاحب اس سے باتیں کرنے لگے۔ مولوی صاحب اس سے لڑائی کی خبریں پوچھ رہے تھے۔ ریحان نے چائے ختم کرنے کے بعد اپنے کمرے میں جا کر ریڈیو لگایا۔ دیپالی زینب بی بی کے ساتھ کھانا پکانے میں مشغول ہو گئی۔

اچانک ریحان کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ "دیپالی"۔

"کیا ہوا؟" وہ ڈوئی لئے برآمدے میں گئی۔

"ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا"۔

لوک گیت جمع کرنے کی مدت ختم ہوئی۔ دیپالی اور ریحان گھاٹ پر کھڑے تھے۔ قرب و جوار کے گاؤں میں بُنی ہوئی دلکش حصیر چٹائیاں فروخت کے لئے منڈی لے جانے والے چھتریاں لگائے کاریگروں کا ہجوم ساحل پر جمع تھا۔ ماہی گیر اپنی اپنی کشتیاں لے کر نکل رہے تھے۔ مولوی ابوالہاشم حسب عادت خاموشی سے سر جھکائے اپنی کشتی کے بادبان درست کرنے میں منہمک تھے۔ وہ دیپالی کو باگھیر گھاٹ تک پہنچانے والے تھے۔ بہت لمبا سفر تھا۔

رات وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں چپ چاپ کھڑا اندھیری ندی پر سے گذرتی کشتیوں کو دیکھ رہا تھا۔ دیپالی اس کے ٹرنک پر ریڈیو کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے ریحان سے کہا تھا۔ "آپ کو اب ہیڈ کوارٹرز سے رابطہ قایم کرنا چاہئے۔ اس نئی جنگ کی وجہ سے پوزیشن بدلنے والی ہو گی نا؟"

وہ چونک اٹھا۔ "جنگ۔؟ کیسی جنگ۔؟" اس نے جھنجھلا کر پوچھا۔

دیپالی نے تعجب اور اداسی سے اس پر نظر ڈالی۔ "آپ حقیقت سے اتنی آسانی سے کٹ جاتے ہیں"۔

"ایسا ــــ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا شوکتی۔!" اس نے آہستہ سے جواب دیا اور اسی طرح کھڑا ندی کو دیکھتا رہا۔

"اب میں واپس جانا چاہتی ہوں۔" دیپالی نے کہا۔

"کیوں۔؟" اس نے غصے سے پوچھا۔

"ارے۔ ریحان۔ میں یہاں ہمیشہ تو نہیں رہ سکتی۔"

"وہ اس کی طرف مڑا۔ "ہاں تم ٹھیک کہتی ہو، تم یا میں ہمیشہ تو یہاں نہیں رہ سکتے۔ شاید کہیں بھی نہیں رہ سکتے۔" پھر چند لمحوں بعد اس نے برآمدے میں جاکر مولوی ابوالہاشم سے دیپالی کی واپسی کے انتظامات کے متعلق بات چیت شروع کر دی تھی۔

یہ تین دن پہلے کی بات تھی۔ آج وہ سندر بن سے واپس جا رہی ہے باگیر ہاٹ پہنچ کر وہ اسٹیمر کے ذریعے باریسال اور فرید پور کے دریاؤں پر سے گذرتی نارائن گنج چلی جائے گی۔

ریحان اب پریشانی کے ساتھ کلکتے کے خفیہ ہیڈ کوارٹرز سے کسی اطلاع کا منتظر تھا۔ پارٹی کے سارے بڑے لیڈر دور تپتے ہوئے راجستھان کی دیولی جیل میں بند تھے۔ ان کے پاس سے اسمگل ہو کر کسی نئے ڈائریکٹو کا کلکتہ ہوتے ہوئے سندر بن پہنچنا ہفتوں کا نسخہ تھا ــــ سندر بن پر بارشیں شروع ہو چکی تھیں۔ میں یہاں جانے کب تک رہوں گا ــــ "ایسا لگتا ہے کہ جیسے کلکتے کے ساتھی مجھے بھول ہی گئے ہیں۔" اس نے صبح بڑی ملول آواز میں دیپالی سے کہا تھا۔

اور اب دیپالی چھتری کے نیچے چھپی گھاٹ پر کھڑی تھی اور کچھ فاصلے پر چھتریوں کا میلہ سا لگا تھا۔ سب بار بار آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ جھڑی لگتی ہے تو سندر بن کے جنگل اور کھال اور دریا اور ساحل اور سمندر سب پانی میں دوب جاتے ہیں۔ جیسے کسی نے ایک بڑے سے واٹر کلر لینڈ اسکیپ کو داش کے بعد پانی کی چلمچی ہی میں چھوڑ دیا ہو۔ اور سارے رنگ پانی میں پھیل کر آپس میں گڈمڈ ہو جائیں۔

ریحان چھتری لگائے دیپالی کے قریب کھڑا تھا۔ اچانک اس نے بڑے غصے سے کہا۔ "تم بھی جا رہی ہو۔"

"چلو بیٹی کلثوم ــــ" مولوی ابوالہاشم نے اسے آواز دی۔ وہ اور زینب بی بی اُسے باضابطہ کلثوم ہی پکارتے تھے۔ انھیں یقین کامل تھا کہ بہت جلد یہ لڑکی ریحان کے ہاتھوں پر مشرف بہ اسلام ہو کر اس سے نکاح کر لے گی۔ جانے ریحان نے ان دونوں بھولے میاں بیوی کو کیا پٹی پڑھا رکھی تھی۔ زینب بی بی نے تو ایک رات ریحان سے بڑی رازداری سے کہا تھا کہ کلثوم کو مولوی صاحب کلمہ پڑھا دیں اور شربت کے پیالے پر نکاح ہو جائے۔ یوں بھی یہ برسات کا زمانہ اور شادیوں کا موسم تھا۔ ان بیچاری نے برسوں سے سینت کر رکھی ہوئی ایک نئی سوتی ساری بھی نکال کر ریحان کو پیش کر دی تھی۔ یہ ساری

انھوں نے اپنی بہو کے لئے رکھی تھی۔ اور جب ریحان نے ان کو سمجھایا کہ پہلے اسے گاؤں جا کر اپنے باپ سے بھی اجازت لینی ہے۔ تب بھی وہ یہ ساری اپنی طرف سے تحفتہً دینے پہ مُصر رہی تھیں۔ ریحان کے انکار پر انھوں نے کہا تھا۔ ہمیں غریب سمجھ کر ہم سے یہ تحفہ نہیں لینا چاہتے ہو بیٹا اور رونے لگیں تھیں۔ لیکن ریحان بے حد سٹپٹایا تھا۔ اس مندر والے واقعے کے بعد اب دیپالی سے یہ کس طرح کہے کہ یہ سُرخ ساری بھی لے لو، جسے پہنا کر زینب بی بی تمھیں دلہن بنانا چاہتی ہیں۔ عجب گھپلا ہو رہا ہے یہ خدا کی قسم۔ اس نے بے حد الجھ کر سوچا تھا۔ مگر زینب بی بی کا دل رکھنے کے لئے وہ ساری ان سے لے کر ٹرنک پر رکھے ہوئے اخباروں کے نیچے چھپا دی تھی۔ زینب بی بی کے جانے کے بعد دیپالی ریڈیو سننے کے لئے اس کے کمرے میں آئی اور ٹرنک پر بیٹھنے کے لئے اس پر سے اخبار اٹھائے تو نیچے سُرخ ساری پر اس کی نظر پڑی اور ریحان خود شرم سے سُرخ ہو کر فوراً کمرے سے باہر بھاگ گیا تھا۔

دیپالی چھتری ذرا اونچی کر کے اس کی طرف مڑی۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں دونوں کیا دیکھتے ہیں کہ زینب بی بی اپنی شکستہ چھتری لگائے بغل میں ایک بنڈل دابے افتاں وخیزاں پگڈنڈی پر سے بھاگتی چلی آ رہی ہیں۔ نزدیک آ کر انھوں نے اخبار میں لپیٹی ہوئی سُرخ ساری دیپالی کے ہاتھوں میں ٹھونسی اور کچھ کہے سنے بغیر اسی سرعت سے گھاٹ کی بھیڑ میں غائب ہو گئیں۔

چند قطرے ٹپ ٹپ بنڈل کے کاغذ پر گرے۔ دیپالی نے اوپر دیکھا۔ بارش آ گئی۔ وہ دونوں چپ چاپ کھڑے دریا کے منظر کو دیکھتے رہے۔ کشتیوں نے لنگر اٹھا دیئے تھے۔ بادبان کھول دیئے گئے تھے۔ قسم قسم کی کشتیاں سطح آب پر بکھر چکی تھیں۔ مولوی ابوالہاشم نے اپنی کشتی جیٹی سے لگا دی اور دوبارہ پکارا۔ "کولثم بیٹی۔ اللہ کا نام لے کر آ جاؤ ــــ اللہ تم لوگوں کا نگہبان ــــ"

"اللہ"۔ دیپالی نے چپکے سے دل میں دہرایا سُرخ ساری کا بنڈل مضبوطی سے بازوؤں میں جکڑ کر آگے بڑھی اور کود کر کشتی میں بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب کا چھوٹا لڑکا جواب تک چٹائی کی چھت کے اندر دیپالی کا سامان رکھنے میں مشغول تھا باہر نکلا اور دونوں باپ بیٹوں نے چپّو سنبھالے۔ ریحان نے گھاٹ کی سیڑھیوں پر آ کر الوداع کے لئے ایک ہاتھ اٹھایا اور پھر گرا دیا۔

عین اسی وقت ایک نو کا کشتیوں کی بھیڑ میں سے تیزی سے نکلتی سامنے آ کر مولوی صاحب کی کشتی سے لگ گئی۔ مولوی صاحب کا ہم شکل ایک داڑھی والا نوجوان کود کر گھاٹ پر اُترا ــــ اس نے اپنے باپ کو اور دیپالی کو آداب کیا اور ریحان کے پاس جا پہنچا۔

"ریحان بھائی ...."

ریحان جواب تک سر جھکائے کھڑا تھا چونک پڑا۔

"تم اس وقت کیسے؟"

ابوالقاسم نے اپنی تہمد پر بندھی پیٹی کے نیچے سے ایک کاغذ نکالا اور آہستہ سے کہا۔ "اُدمادیبی نے آپ کو کلکتے فوراً بلایا ہے۔ کل رات میرے پاس ستیندر ــــ"

دیپالی نے صرف اتنا ہی سنا۔ اُدمادیبی نے آپ کو کلکتے بلایا ہے۔ اُدمادیبی نے آپ کو فوراً ــــ اُدمادیبی نے آپ کو ــــ اُدمادیبی نے آپ کو فوراً ــــ اُدمادیبی نے ــــ

کشتی گھاٹ سے الگ ہو کر پانی میں پہنچ چکی تھی۔

اُدمادیبی نے آپ کو فوراً بلایا ہے ــــ اُدمادیبی نے۔

"شوکتی ــــ" گھاٹ پر سے ریحان کی آواز آئی۔ "ٹھہرو۔ میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔"

"میں سیدھی ڈھاکے جاؤں گی۔" اس نے یک لخت ذرا خشکی سے جواب دیا۔

"ہاں۔ ہاں۔ لیکن کچھ دور تک ــــ"

ریحان تازہ انگریزی اخباروں کا پلندہ ابوالقاسم کے ہاتھ سے لے کر اس کے ساتھ آہستہ آہستہ گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ اب وہ دیپالی کے وجود سے بالکل بے خبر ہو چکا تھا۔

وہ چند منٹ تک اسی طرح کشتی میں بیٹھی رہی۔ پھر مولوی ابوالہاشم نے آنکھوں آنکھوں میں اسے اشارہ کیا کہ وہ گھاٹ پر اُتر آئے۔

بوڑھے مولوی صاحب دنیا دیکھ چکے تھے۔

## (۱۶)

# ارجمند منزل

نواب قمرالزماں چودھری کا کتب خانہ ارجمند منزل کے بیرونی، طویل برآمدے کے ایک سرے پر تھا۔ اس کمرے سیاہ و سفید ٹائلوں کے فرش پر بیش قیمت کشمیری قالین بچھا تھا۔ جس میں بنا ہوا "شجرِ حیات" کا ایرانی نمونہ اب کافی گھس چکا تھا۔ دیواروں کے برابر لحیم شحیم الماریاں ایستادہ تھیں۔ بڑے دریچے کے نیچے، جو پہلو کے باغ میں کھلتا تھا، نواب صاحب کی آرام کرسی بچھی تھی۔

بڑے دریچے کے نیچے، جو پہلو کے باغ میں کھلتا تھا۔ نواب صاحب کی آرام کرسی بچھی تھی۔ اور چاندی کی نقشین پتر چڑھی نیچی چوکی پر پیچوان دھرا تھا۔ دیواروں پر سرسید، حالی، سر سلیم اللہ اور شیر بنگال اے۔ کے۔ فضل الحق کی تصاویر آویزاں تھیں۔ ڈھاکے کے مغل قلعے لال باغ کا بڑا دلآویز واٹر کلر، آتشدان کے اوپر اور بوڑھی گنگا کے کنارے شائستہ خاں کے دور میں بنی ست گنبد مسجد کا واٹر کلر مقابل کی دیوار پر سجا تھا۔ بی بی پری کے مقبرے اور حسینی دالان کی مختصر تصاویر ایک الماری کے اوپر رکھی تھیں۔ جناح صاحب کا دستخط شدہ پورٹریٹ میز کی عقبی دیوار پر آویزاں تھا۔ مسلم بنگال کے پرانے اور نئے بنگلہ اخبار شدھاکر، نوبونور، بنگو مسلمانیر شاہتیہ پتریکا، اسلام پرچارک، المسلم اور مہر کے مجلد فائل اور الہلال، پیسہ اخبار، ہمدم، زمیندار اور ڈھاکے سے شایع ہونے والے پرانے اردو رسالوں جادو اور المشرق کے فائل ایک الماری میں مقفل تھے۔ دوسری الماریوں میں بنگلہ، فارسی اور اردو کی کتابوں اور قدیم نسخوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود تھا۔ انگریزی کتابوں کی تعداد مقابلتاً کم تھی۔

جولائی ۱۹۴۱ء کے ایک اتوار کی صبح نواب قمرالزماں چودھری اپنی آرام کرسی پر نیم دراز پیچوان کی نے منہ سے لگائے صوبائی مسلم لیگ کے ماہانہ جلسے کے لئے جو تیسرے پہر کو ارجمند منزل کے بڑے ہال میں منعقد ہونے والا تھا، اپنی تقریر لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ تازہ اخبارات کا انبار اُن کے نزدیک اخروٹ کی کشمیری میز پر موجود تھا۔ نواب صاحب آنکھیں بند کئے اپنی بلند پیشانی پر انگلی پھیرتے ہوئے تقریر کا افتتاحی پیراگراف سوچ رہے تھے۔ چند منٹ بعد انھوں نے فاؤنٹن پن اٹھا کر بنگلہ میں تقریر لکھنی شروع کر دی۔

نواب قمرالزماں چودھری بڑی بڑی آنکھوں والے ایک وجیہہ و ملیح پچاس سالہ ثقہ، وضعدار ارسٹوکریٹ تھے۔ اُن کے والد نواب نورالزماں مرحوم ضلع فریدپور کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ انھوں نے ہی ارجمند منزل تعمیر کروا کے ایبسنٹی لینڈ لارڈ کی حیثیت سے ڈھاکے میں اقامت اختیار کی تھی۔ نواب صاحب مرحوم نے خود کو نواب ڈھاکہ کے توڑ کا رئیس سمجھنے کے شوق میں راگ رنگ تھیٹر اور دوسرے رئیسانہ مشاغل پر بے تحاشا روپیہ اٹھایا تھا۔ اس وجہ سے اب بھی ان کے جانشین نواب قمرالزماں کا شہر کے چوٹی کے مسلمان رؤسا میں شمار ہوتا تھا۔ نواب نورالزماں مرحوم کو سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں ڈھاکے میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے اولین اراکین اور سرپرستوں میں شامل تھے۔ ڈھاکے کے اکثر مسلمان رئیسوں کی مانند نواب صاحب مرحوم کے یہاں بھی اردو کا چرچا تھا۔ اور بچوں کو گھر پر بنگلہ کے ساتھ ساتھ اردو پڑھائی جاتی تھی۔ نواب قمرالزماں کی والدہ نورالنسا بیگم دہلی اور لاہور کے زنانہ رسالوں عصمت اور تہذیب نسواں کی خریدار تھیں اور "مرسلہ بیگم نورالزماں چودھری، ڈھاکہ بنگال" کی طرف سے کبھی کبھی اصلاح معاشرت پر ان کے مضامین ان جریدوں میں شایع ہوا کرتے

تھے۔ ان کی بہو یعنی بیگم قمر الزماں کُشتیا ضلع کے ایک خالص "بنگالی اسپیکنگ" زمیندار کی بیٹی تھیں انھیں اردو بالکل نہیں آتی تھی۔ مگر جہاں آرا اور اس کے بھائی اور بہنوں کو گھر پر اردو پڑھائی گئی تھی۔

اس وقت جبکہ نواب قمر الزماں اپنی خاموش اسٹڈی میں سکون سے بیٹھے تقریر لکھ رہے تھے۔ باہر کافی شور مچ رہا تھا۔ کوٹھی کے وسطی ہال میں لیگ کے جلسے کے لئے ایک قطار میں کرسیاں بچھائی جارہی تھیں پوربی مالی رام سرن اسٹیج کی میز پر رکھے گلدان میں پھول سجا رہا تھا۔ باقی دوسرے ملازمین کمرے کی صفائی میں لگے تھے۔

لیکن اندر زنانخانے میں جس قدر چہل پہل اور رونق تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ تین دن بعد نواب قمر الزماں چودھری کے فرزند اور جانشین نواب زادہ نیّر الزماں کی بارات چڑھنے والی تھی۔ شادی کے جوڑے سل رہے تھے۔ جوہری پھیرے لگا رہے تھے۔ گیت گائے جا رہے تھے۔ فرید پور سے رشتہ دار آنے شروع ہو گئے تھے۔ بارات دیناج پور جائے گی۔

تقریر لکھتے لکھتے نواب صاحب نے اٹھ کر رسالوں کی الماری میں سے المشرق کا فائل نکالا۔ یہ ماہانہ رسالہ تقسیم بنگالہ کے بعد جب لارڈ کرزن نے آسام اور مشرقی بنگال کو ملا کر مسلم اکثریت کا ایک صوبہ بنا دیا تھا، مسلم بنگال کی ایک مشہور ہستی، حکیم حبیب الرحمٰن نے ۱۹۰۶ء میں نکالا تھا، تاکہ اردو کے ذریعہ بقیہ مسلمانانِ ہند سے ذہنی اور سیاسی رابطہ قایم کیا جا سکے۔ یہ پاکستان کی اوّلین داغ بیل تھی۔ نواب قمر الزماں نے اپنی تقریر میں اس رسالے کے پہلے شمارے کے ایڈیٹوریل سے ایک اقتباس نقل کیا۔ "۱۶ اگست ۱۹۰۶ء اگر غور سے دیکھئے تو کیسی سعید تاریخ ہے کہ اس دن ہم کو زندگی اور موت اور مرض اور صحت کا پورا پورا احساس ہوا اور ہم خواب اور نیم خوابی سے گھبرا کر چونک پڑے۔ مسلمانوں کے لئے اب کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ بحیثیت برٹش انڈیا کے ایک مستقل آرگنائزیشن قایم کریں ـــــ بنگالی اخباروں کے طرزِ تحریر اور درشت لہجے سے اب ہمارا کلیجہ منہ کو آگیا ہے۔ اور ہم کچھ نہیں جانتے کہ آخر ہماری حالت کیا ہوگی؟ ہم اپنے لیڈروں کے متعلق کون سی پھبتی ہے جو روزانہ نہیں سنتے۔ ہمارے لیڈر کیوں بُرے ہیں۔ اس لئے کہ وہ بہت سا ذاتی نقصان برداشت کر کے صرف اس لئے پارٹیشن کے موئید ہوئے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے لئے مفید ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے باوجود ملکی ہمدرد ہونے کے نام نہاد سودیشی تحریک میں جو پارٹیشن کے استرداد کے لئے ایک آلہ ہے، شرکت گوارا نہ کی کہ اس سے اپنی قوم گھاٹے میں رہتی"۔

اقتباس کا بنگالی ترجمہ کرنے کے بعد انھوں نے فائل بند کیا اور ۱۹۰۶ء سے لے کر اب تک کی سیاسی جدوجہد کا مختصر تذکرہ قلم بند کرنے کے بعد میز پر بکھرے ہوئے اخباروں میں مسلم لیگ کے ہفتہ وار اخبار ڈان کا تازہ شمارہ تلاش کرنے لگے۔ اس شمارے میں مجوزہ پاکستان کا تفصیلی نقشہ شایع ہوا تھا۔ اور نواب صاحب اس نقشے کے حوالے سے بنگال و آسام کے متعلق چند اہم نکات اپنی تقریر میں شامل

کرنا چاہتے تھے۔ جب وہ پرچہ نہیں ملا، جو کل شام کی ڈاک میں دہلی سے آیا تھا۔ تو انھوں نے ذرا بے دماغ ہو کر گھنٹی بجائی۔

ایک ملازم کتب خانے کے دروازے کا اودا مخملیں پردہ سرکا کر اندر داخل ہوا۔

"تازہ ڈان اخبار ـــــ" نواب صاحب نے کہا۔ "نیّر میاں سے پوچھو۔ وہ تو نہیں اٹھالے گئے۔ ان سے کہنا ہمیں پاکستان کا نقشہ چاہئے۔"

"حضور ـــــ پاکستان کا نقشہ تو نیّر میاں نے اس میں کاٹ کر باہر برآمدے میں دیوار پر لگا دیا ہے۔ فرمائیے تو اکھیڑ لاؤں۔ مگر دیوار خراب ہو جائے گی۔"

"اوہ ـــــ اچھا۔ ٹھیک ہے۔ رہنے دو۔ جاؤ۔"

ملازم باہر چلا گیا۔ نواب صاحب پھر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

اور اُس وقت عبدالقادر کوچوان کی کھڑکھڑاتی ہوئی گھوڑا گاڑی ارجمند منزل کی برساتی میں داخل ہوئی۔

دیپالی سرکار گاڑی کے دروازے کی چٹخنی کھول کر نیچے اتری۔ عبدالقادر کو کرایہ ادا کیا۔ عبدالقادر حسب معمول سر جھکائے گھوڑے کو ہنکاتا آگے بڑھ گیا۔ سر جھکائے دیپالی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھی لیکن اندر جاتے ہوئے اس کی نظر صدر دروازے کے برابر والی دیوار پر پڑ گئی جہاں پام کے گملے کے اوپر نیّر الزماں نے مجوزہ پاکستان کا نقشہ ڈرائنگ پنوں کے ذریعہ لگا دیا تھا۔

دیپالی ٹھٹھک گئی اور آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگی۔ پنجاب، آسام، بنگال، کشمیر، سرحد و سندھ، بلوچستان ـــــ وہ تیوری پر بل ڈال کر بڑے غور سے اس نقشے کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت تک ملازم ہال میں کرسیاں لگا کر جا چکے تھے۔ اور طویل برآمدہ خاموش پڑا تھا۔

اتنے میں ایک گمبھیر، نرم آواز نے اسے چونکا دیا۔

"دیپالی بیٹی ـــــ دھیان سے کیا دیکھ رہی ہو ـــــ؟"

اُس نے مڑ کر دیکھا۔ نواب قمر الزماں اپنے کتب خانے کے دروازے میں کھڑے شفقت سے مسکرا رہے تھے۔

اُسے جہاں آرا کے بابا بہت اچھے لگتے تھے۔ اس قدر مہذب اور نفیس اور خوش اخلاق گو ان سے باتیں کرنے کا بہت کم اتفاق ہوتا تھا۔ لیکن وہ خود اپنے باپ کی اتنی منہ چڑھی اور لاڈلی تھی۔ اس لئے نواب صاحب سے بھی بے تکلفی سے بات کر لیتی تھی اور ان سے ذرا خائف نہ تھی۔ اب اس نے آنکھیں پھیلا کر انھیں دیکھا اور پوچھا۔ "یہ کیا ہے۔ کاکا ـــــ؟"

"بیٹی، تم کو تو جاننا چاہیئے۔ ایک روز بہت جلد۔ انشاء اللہ جب پاکستان بن جائے گا تو تم پاکستانی ہوگی۔"

"میں ــــ کاکا ــــ؟" اُس نے اسٹڈی کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے دریافت کیا۔

نواب صاحب نرمی سے ہنسے ــــ اپنی ساری اولاد میں جہاں آرا ان کو سب سے زیادہ پیاری تھی۔ اس وجہ سے جہاں آرا کی سہیلیوں کا وہ بڑا خیال کرتے تھے۔ علاوہ ازیں دیپالی ان کے پرانے دوست کی لڑکی تھی۔

"اتنی دیر میں کیوں آئیں۔ تمھارا صبح سے انتظار کیا جا رہا ہے۔" انھوں نے کہا۔ "اب جاؤ جلدی اندر۔ جہاں آرا تمھارے لئے بہت سا کام لئے بیٹھی ہے۔"

"ابھی جاتی ہوں کاکا۔ مگر پہلے آپ سے کچھ پوچھنا چاہوں گی۔" دیپالی نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں۔ ہاں پوچھو بیٹی۔ آؤ۔" نواب صاحب نے پردہ ہاتھ سے ایک طرف کو اٹھا دیا۔ دیپالی اسٹڈی میں داخل ہوئی۔ نواب صاحب جا کر اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ دیپالی قریب ایک صوفے پر ٹِک گئی۔

"تمھارے باپ کیسے ہیں۔"

"اچھی طرح ہیں۔"

"اچھا ذرا میں یہ کاغذ پتر سمیٹ لوں، پھر تم سے بات کرتا ہوں۔" نواب صاحب نے عینک کیس میں رکھ کر کاغذات ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر سرکار اسکول میں نواب قمر الزماں کے ہم جماعت تھے۔ ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ وہ ارجمند منزل کے فیملی ڈاکٹر رہے۔ مارے دوستی کے فیس نہیں لیتے تھے۔ اس لئے نواب صاحب نے فیس کے بجائے تحفے تحائف اُن کے گھر بھجوانے شروع کئے۔ ڈاکٹر سرکار نے ارجمند منزل ہی آنا چھوڑ دیا۔ نواب صاحب کو اُن کی مالی حالت کا خوب اندازہ تھا۔ دُرگا پوجا اور عید کے مواقع پر جہاں آرا نے دیپالی کو ساریاں تحفے میں دیں تو ان کو دیکھ کر ڈاکٹر سرکار کا منھ اتر گیا۔ انھوں نے دیپالی سے کہا۔ "جب تم اس کو کچھ دے نہیں سکتیں تو اس سے لیتی کیوں ہو۔" لہٰذا یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

"بھئی ہم کیا کریں ــــ" نواب قمر الزماں نے اخباروں کا پلندہ ایک تپائی پر سرکاتے ہوئے کہا۔ "ہمارے یہاں تم جانتی ہو۔ بیماری کا سلسلہ کتنا رہتا ہے۔ جہاں آرا کی ماں اختلاجِ قلب کی مریضہ ہیں۔ آئے دن ڈاکٹر کی حاجت۔ مگر تمھارے باپ ایسی الٹی کھوپڑی کے آدمی ہیں۔ مجبوراً ہم نے ڈاکٹر گھوش کو لگا لیا۔ بتاؤ بھلا اگر ڈاکٹر اور وکیل دوستوں سے فیس لینا چھوڑ دے، تو کیا کرے ــــ"

"آپ ان کو سمجھائیے ــــ" دیپالی نے کہا۔

"خبطی ہیں۔ اُن کو کون سمجھا سکتا ہے۔ تم بتاؤ بیٹی۔ ایسی پریشان سی کیوں نظر آ رہی ہو۔ اور تمھارا شانتی نکیتن کیسا چل رہا ہے؟"

"ٹھیک ہے کاکا۔"

"بنوئے بابو ایک روز ملے تھے، بتلا رہے تھے کہ تم چھٹیوں میں گھر آنے کے بجائے لوک گیت جمع کرنے سنتھال پرگنہ چلی گئیں۔"

"جی ہاں۔ کاکا۔" دیپالی نے بڑی بے چینی سے مجرموں کی طرح صوفے پر پہلو بدلا۔

"بے چارے بہت سخت پریشان تھے کہ برسات کا زمانہ ہے جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہوگی۔ کہیں بیمار نہ پڑ جائے۔"

دیپالی اپنے آپ سے نظریں چرا کر دریچے سے باہر دیکھنے لگی جہاں کاسنی پھول کھلے تھے۔ کیسا پرسکون سہانا اتوار کا دن تھا۔ مگر نہ جانے کیوں دل کو پنکھے سے لگ گئے اور پاکستان کا نقشہ ــــ اس نے بابا کو اتنا بڑا دھوکا دینے کے احساس کو نظر انداز کرنے کی سعی کرتے ہوئے دوبارہ نواب صاحب کو مخاطب کیا۔ "پاکستان واقعی بن جائے گا کاکا ــــ؟"

"انشاء اللہ ــــ" اب وہ کاغذات ایک طرف رکھنے کے بعد آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر کسی سوچ میں کھو چکے تھے۔ دیپالی نے اُن کے خیالات میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔ اور دیوار پر لگے واٹر کلرز کو دیکھنے لگی ــــ ڈھاکے کے آثار الصنادید ــــ قلعہ لال باغ۔ ست گنبد مسجد۔ بی بی پری کا مقبرہ۔ حسینی دالان۔

نواب قمر الزماں بنگال کے اس اسلامی ماضی کے وارث ہیں۔ دیپالی نے سوچا۔ اور اسے یاد آیا۔ اُس کی جنم بھوم میمن سنگھ کے وسیع و عریض، سرسبز علاقے میں، ہندو اور بودھ بنگال کے پرفسوں اور لرزہ خیز، کھنڈر بھی موجود ہیں تو میں صرف اس ہندو ماضی کی وارث ہوں؟ اس ماضی اور اس اسلامی ماضی کی وراثت کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ــــ؟

لیکن ریحان نے سُندر بن میں ایک روز اُس سے کہا تھا۔ تاریخ آپ سے آپ ہمیں سمجھا دیتی ہے اس لئے کہ ہم خود تاریخ ہیں۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیاں تاریخ کی مجموعیت کی سب سے بڑی تفسیر ہیں۔

نواب صاحب آنکھیں بند کئے، پیچوان کے آہستہ آہستہ کش لگا رہے تھے۔ اور غالباً دیپالی کی موجودگی سے بے خبر ہو چکے تھے۔ دیپالی نے انھیں دیکھا۔ مہذب، نیک نفس، شریف انسان، مسلم لیگ کے لیڈر۔ لیکن اپنی نیک نفسی اور خلوص نیت کے باوجود اُن کو عبدالقادر کوچوان کے مسائل کا صحیح احساس ہے؟ عبدالقادر کوچوان پاکستان کے قیام سے مستفید ہوگا ــــ؟ مجھے یہ سب کون سمجھائے؟

ریحان نے کہا تھا ــــ دیپالی ــــ ہندوستان کے نوّے فی صدی انسان مفلس ہیں اور

اہلِ ثروت مفلسی کی تلخی، کم مائیگی، کمتری اور بے عزتی کے احساسات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ زندہ رہنے کی جدوجہد کلچر اور اخلاق اور مذہب اور فلسفے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ انسان کو جھوٹا اور گھٹیا اور کمینہ اور کردار سے عاری بنا دیتی ہے۔ ہم ہندوستانی اسی لئے جھوٹے اور کمینے اور کردار سے عاری اور بے ایمان ہیں ـــــ ماضی سنہرا تھا۔ کیوں کہ آبادی کم اور گیہوں اور چاول وافر تھا۔ لیکن کولونیل نظام اور بڑھتی ہوئی آبادی نے ملک کا کچومر نکال دیا۔ ہندوستان والوں کو جھوٹا اور بے ایمان بنا دیا۔ ہر کولونیل ملک کے باشندے لامحالا گھٹیا اور کردار سے عاری ہو جاتے ہیں۔ غلامانہ ذہنیت بے معنی اصطلاح نہیں ہے۔

سورج اب نصف النہار پر پہنچنے والا تھا۔ کتب خانے کے وسیع دریچوں میں سے آتی ہوئی اس کی کرنوں نے شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے بیٹے، صوبے دار بنگال، شہزادہ محمد اعظم کے بنوائے قلعہ لال باغ کی بڑی پینٹنگ کو جھلملا دیا۔ دیپالی مسحور ہو کر اس پینٹنگ کو دیکھا کی۔ ریحان نے کہا تھا۔ (وہ اب اس طرح سوچ رہی تھی۔ جس طرح پادری بنرجی بات بات پر اس سے کہا کرتے تھے ـــــ یسوعؑ نے کہا تھا ـــــ") ریحان نے کہا تھا، ـــــ ہمارے بنگال کی، ڈھاکے کی مسجدیں۔ قلعے، پرانے محلات، ہماری مصنوعات، ہماری سنگیت اور سنگتراشی، یہ سب اس سنہرے، رومانی ماضی کی یادگار ہیں لیکن اسی ڈھاکے شہر کا موجودہ فرقہ وارانہ کھنچاؤ اور افلاس برطانوی کولونیلزم کا ثبوت ہیں: جس دھرتی پر کھانے کو کم ملے گا وہاں فرقہ وارانہ کشمکش ناگزیر ہے کہ سب ایک دوسرے کے منہ سے روٹی چھین کر اپنے پیٹ کی آگ بجھانا چاہتے ہیں۔ یہ جنگل کا قانون ہے۔ برطانوی نظام ایک ایسی دوکان ہے جس کے سامنے کھڑے ہوئے قطار اندر قطار مختلف ہندوستانی فرقے اپنے اپنے کشکول سنبھالے، جھولیاں پھیلائے ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھنا چاہ رہے ہیں۔ اور سر پھٹول میں مصروف ہیں۔ اور یہ بھوکے، فرسٹریٹڈ، اب نارمل عوام آپس میں فساد کر کے ملک کی قسمت کا آج کل فیصلہ کروا رہے ہیں ـــــ

"ہاں بھائی دیپالی۔ کیا پوچھنا چاہتی تھیں"۔ نواب صاحب نے ایک دم زور سے پیچوان گڑگڑا کر آنکھیں کھولتے ہوئے دریافت کیا۔

دیپالی چونک پڑی۔ پھر اس نے کہا۔ "کاکا۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ ملک تقسیم ہو جائے؟"

نواب صاحب چند سیکنڈ تک پیچوان گڑگڑاتے رہے اور پھر رسان سے کہا۔ "بیٹی تم کو یہ معلوم ہے کہ سارے ہندوستان کے مسلمان تباہ حال ہیں؟ ایک وقت تھا کہ اسی بنگال کا مسلمان خوش حال اور آسودہ تھا۔ صرف اس صوبے میں ایک لاکھ اسلامی مدارس تھے بیٹی ـــــ ایک لاکھ مدرسے۔ اب یہاں مسلمانوں کی غربت اور جہالت کی کیا حالت ہے؟ خود تمہارے گرودیو ٹیگور بنگالی مسلمانوں کی اقتصادی پسماندگی اور ان کے ساتھ سماجی بے انصافی کا اعتراف کر چکے ہیں"۔

"مگر کاکا ـــ آزاد متحدہ ہندوستان میں بھی تو مسلمان خوشحال ہو سکتے ہیں"۔

"متحدہ ہندوستان میں ـــ؟ ہرگز نہیں"۔ انھوں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "اور ہندوستان متحد کب تھا۔ اسے انگریزوں نے متحد کیا ـــ دیپالی۔ تم میری بچی ہو۔ میں تم سے کیا بحث کروں۔ میں تو اب تمھارے بابا سے بھی بحث نہیں کرتا۔ جوانی کے زمانے میں ہم دونوں خوب خوب جھگڑتے تھے۔ جب وہ احمق الدین اپنے باپ دادا کی بچی کھچی زمینیں بیچ کر کانگریس میں گھس گئے تھے۔ جیل چلے گئے تھے ـــ" انھوں نے پھر پیچوان کی نے منہ سے لگائی۔

"کاکا۔ میں بچی نہیں ہوں"۔ دیپالی نے الجھ کر کہا۔ "میں آپ سے یہ باتیں ڈسکس کرنا چاہتی ہوں"۔

نواب صاحب نے ذرا اُداسی سے مسکرا کر اسے غور سے دیکھا اور کہنے لگے ـــ "میں بھول گیا تھا تم اس سر پھرے بیچارے دینیش بابو کی بھتیجی ہو۔ تم بھی سر پھری ہو گی۔ مگر آج ایک نصیحت کرتا ہوں۔ قومی جدوجہد کے چکر میں تم کسی آفت میں نہ پھنس جانا۔ تمھارے باپ پہلے ہی ایک بہت بڑی قربانی دے چکے ہیں"۔

"قربانی ـــ" دیپالی نے ہنس کر کہا ـــ "تیاگ اور قربانی تو اس دیس کی پرانی روایت ہے کاکا۔ گوتم بدھ سے لے کر مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو تک سب قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ تیاگ اور قربانی ـــ تیاگ اور قربانی ـــ"

"ہوں ـــ" نواب صاحب ذرا مسکرا کر چپ ہو رہے۔

"نہیں کاکا"۔ دیپالی نے بڑے دکھ سے کہا۔ "ملک کو تقسیم نہ ہونے دیجئے"۔

"بیٹی ـــ" نواب صاحب نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "میرا اور تمھارا نقطۂ نظر اب بالکل جداگانہ ہے۔ میں تم سے کیا کہوں ـــ" پھر انھوں نے کرسی پر پہلو بدلا اور قریب کی میز پر سے اپنی نامکمل تقریر اٹھا کر بے دھیانی سے اس کے اوراق پلٹتے ہوئے دہرایا۔ "بالکل جداگانہ ہے۔ ہم ۱۹۰۶ء کی تقسیم بنگال سے خوش تھے۔ کیونکہ اس میں ہمارا اقتصادی فائدہ تھا۔ تم لوگوں نے اسے اپنی سیاسی عزائم پر ضرب کاری سمجھا۔ اور اس کو ختم کرنے کے لئے تشدد کی تحریک شروع کر دی اور بم پھینکنے لگے۔ یہ بم پھینکنے والے تمھارے ہیرو قرار پائے۔ بیٹی معاف کرنا۔ تم نے ہی یہ ذکر چھیڑا ہے اور تم کہتی ہو کہ تم اب بڑی ہو گئی ہو اور سمجھ دار ہو۔ اس لئے میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ اسی ڈھاکے میں تقسیم کے خلاف احتجاج کرنے لئے انگریزوں پر بم پھینکنے والوں کے پانچ سو خفیہ گروہ تھے"۔

"پانچ سو ـــ کاکا ـــ؟" دیپالی نے آنکھیں پھیلا کر دہرایا۔ اور سوچا۔ میں اُس بم پھینکنے والے خفیہ گروہ کی روایت کی پیرو ہوں۔ اور نواب قمر الزماں چودھری مخالف کیمپ میں ہیں۔ ایسا کیوں

"میں دوسرے صوبوں کے متعلق تو نہیں جانتی کاکا۔ مگر ہمارے بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا کلچر تو بالکل ایک ہے"۔

"مانتا ہوں بھائی ـــــ یہاں کا کلچر ایک ہے۔ یہاں کی لوک سنگیت، لوک ساہتیہ ہر چیز میں مسلمانوں کا کتنا بڑا حصہ ہے۔ مگر ہندوؤں نے کبھی اس کا اعتراف کیا؟ بنگالی کلچر سے ان کی مراد محض ہندو بنگالی کلچر ہوتی ہے۔ پچھلی صدی میں تو زور شور سے یہ بحث چھیڑی گئی تھی کہ بنگلہ مسلمانوں کی زبان ہی نہیں۔ بنگلہ ادب اور تہذیب صرف ہندوؤں کا ورثہ ہے ـــــ کیا ہم اتحاد نہیں چاہتے تھے؟ خدا کی قسم ہم اتحاد چاہتے تھے اور پچھلے آٹھ سو سال کی تخلیق شدہ بنگالی لوک سنگیت اور ادب اس کا مکمل ثبوت ہے ـــــ مگر اب مسلمانوں سے اتنی نفرت۔ ان کے لیے حقارت کا ایسا رویہ ـــــ تم نے آنند مٹھ پڑھا ہے؟"

دیپالی نے نفی میں سر ہلایا۔

"لیکن بنگال کے مسلمان پسماندہ اور مفلس کسان اور ماہی گیر اور ملاح اور کاریگر ہیں۔ اپنی مدافعت میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تمھارا ہندو بنگالی پریس نواب سر سلیم اللہ کو انگریز کا پٹھو کہتا ہے اور یہ جو اتنے بنگالی ہندو نائٹ ہیں۔ یہ انگریز کے پٹھو نہیں ـــــ؟"

دیپالی خاموش رہی۔ نواب صاحب نے ذرا جوش سے بات جاری رکھی۔ "تم بنگالی کلچر کے اتحاد کی بات کرتی ہو۔ بالکل صحیح ہے۔ سوڈیڑھ سو سال قبل تک یہ کلچر واقعی ایک تھی۔ راجہ رام موہن رائے عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ نوابین مرشد آباد کے دور تک ہندو شرفا فارسی پڑھتے تھے۔ تمھارے گرودیو، جن کا خاندانی نام انگریزوں نے ٹھاکر کے بجائے ٹیگور کر دیا۔ ٹھاکر کا یہ خطاب ـــــ اس خاندان کو بنگال کے مسلمان نوابوں ہی نے دیا تھا۔ تم۔ یہ بات جانتی ہو۔؟"

دیپالی نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

"ایک زمانے میں یہ ٹھاکر خاندان پیر علی برہمنوں کا گھرانا کہلاتا تھا۔ کیونکہ انھوں نے قنوج جی برہمنوں کی ذات پات کی قیود توڑ کر مسلمان نوابوں کے یہاں ملازمت کر لی تھی ـــــ خود اپنا نام دیکھو۔ سرکار، مجموعہ دار یا مزمدار، تعلقہ دار اور قانون گو۔ یہ سب بنگالی کائستھوں کے مغل عہدے تھے، جو اب تمھاری ذات بن چکے ہیں"۔ نواب صاحب نے پیچوان کی نے ایک طرف رکھ کر لمبی سانس لی۔

"مگر کاکا ـــــ دیپالی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہندو تجدیدیت کے ساتھ مسلم تجدیدیت بھی تو شروع ہوئی بنگال میں ـــــ" سندر بن میں ریحان نے اسے ایک شام وہابی تحریک کے متعلق بتایا تھا۔ جس کی زیر قیادت مسلمان مولوی انیسویں صدی میں بنگالی مسلمان کسانوں سے کہتے پھرتے تھے کہ وہ اپنے ہندوانہ رسم و رواج ترک کر دیں"۔ اور پھر لڑوا دیا انگریزوں نے آپس میں"۔ اس نے

آواز بلند کہا۔

" ہر بات کا الزام انگریز کے سر تھوپنا بالکل غلط چیز ہے۔ تم لوگ چند مفروضوں کی بنا پر
نی ساری دلیلیں پیش کرتے ہو"۔ انھوں نے گھڑی دیکھی اور چونک کر کہا۔" تمھارے ساتھ اس بیکار
ی مغز سوزی میں اتنا وقت نکل گیا۔ مجھے ابھی تقریر بھی تو لکھنی ہے"۔ انھوں نے تپائی پر سے کاغذ اٹھایا۔

" کاکا ــــ مجھے سنائیے اپنی تقریر ــــ"

" بھاگ جاؤ"۔

" نہیں کاکا ــــ" اس نے اُن کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا اور نامکمل صفحہ پڑھنے لگی۔" اس
ی گذری حالت میں بھی مسلمانانِ بنگال نے عیسائی مبلغین کے خلاف اور ہندو احیار کی مدافعت میں
بار اور رسالے نکالے اور ہمارے لیڈر قوم کی بے چارگی پر خون کے آنسو روتے رہے۔ بھائیو۔ واقعہ یہ ہے
۱۸۵۷ء کے بعد سے آج تک لاہور سے لے کر چاٹگام اور دہلی سے لے کر مدراس تک کے مسلمان محض
ن کے آنسو روتے رہے ہیں۔ مگر اب عمل کا وقت آگیا ہے"۔

دیپالی نے پڑھ کر کاغذ میز پر رکھ دیا۔

نواب صاحب المشرق کا فائل الماری میں واپس رکھنے کے لئے آرام کرسی سے اٹھے ــــ دیپالی
ھی اٹھ کھڑی ہوئی۔" تم نے مسلم احیار کے متعلق کسی کانگریسی کی کتاب پڑھی ہوگی"۔

" جی نہیں کاکا"۔ ریحان کا نام اس کی زبان پر آتے آتے رہ گیا۔" ایسے ہی بس اِدھر اُدھر سے
نا ہے"۔

نواب صاحب الماری کھول کر کتابوں کا جائزہ لینے لگے۔ دیپالی نے دریچے سے باہر جھانکا ریحان
کہا تھا۔ (یسوع مسیحؑ نے کہا تھا) آج سے دو سو برس قبل تک بہت سے بنگالی صوفی گورکھ وجے جیسے
وں کی کتابیں لکھتے تھے۔ اور وشنو پد گاتے تھے۔ بہت سے صوفیوں کے سلسلے تنترک یوگ تک کے ہم شکل
تھے۔ بنگالی خانقاہوں میں ایک اچھا خاصا "مسلم یوگ ساہتیہ" تخلیق ہو چکا تھا۔ مدار شاہ کے فقیر اور
ندو یوگی تقریباً ایک جیسے تھے۔ اور یہ مداری فقیر اور ہندو سنیاسی ۱۷۷۰ء کے بھیانک قحط کے
د کمپنی کی افواج سے لڑتے بھڑتے پھرے تھے۔ اور ریحان نے بتایا تھا کہ ایک مرتضیٰ شاہی فقیروں
سلسلہ تھا۔ جن کے گرو سید مرتضیٰ آنند نے یوگ قلندر اور وشنو بھجنوں کی ایک کتاب لکھی تھی ایک
ادی شدہ برہمن زادی ان پر عاشق ہو کر اُن کی چیلی بن گئی تھی۔ اس کا نام آنند مایا دیبی تھا۔ اسی
ے وہ مرتضیٰ آنند کہلاتے تھے۔ مثال کے طور پر ــــ ریحان نے کھنکار کر اضافہ کیا تھا۔ جس طرح اس
اکسار کو باؤل فقیر سید ریحان دیپالی کہا جائے گا۔ دریچے میں کھڑے کھڑے دیپالی کو یہ بات یاد کر کے
نسی آگئی۔ "YOU AND I — WE TWO ARE THE STUFF ALL HUMAN LOVE IS MADE OF"

ریحان نے کہا تھا۔ "اب سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے سارے باؤل منی عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی اور انسانیت کے عشق کے متعلق کیا گاتے پھرتے تھے؟ شیخ مدن باؤل، شتولن شاہ، حسن رضا، لالن شاہ ـــــ یہ سنگیت کار درویش جن کی شاعری اور موسیقی نے اتنی شدت سے گرودیو کی شاعری اور موسیقی کو متاثر کیا ـــــ کیا یہ مشترکہ ورثہ نہیں؟" ـــــ اور دیپالی نے خود اپنے گاؤں میمن سنگھ میں دیکھا تھا۔ کہ برہما دتیہ فقیر جو مسلمان تھے۔ منتر پڑھ کر اور گھنٹیاں بجا بجا کر مسلمان کسانوں کی مرادیں پوری کرنے کا تپ کرتے تھے اور مسلمان کسانوں کے ہاں شادی کے موقع پر منگل چنڈی دجے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ خود ریحان رونو میاں تھے۔ رونو ہندوؤں کا نام بھی تھا۔ کیا یہ سب تہذیبی مماثلت یا اتحاد کے بے حد سطحی مظاہر ہیں، یا ان کے پیچھے کوئی ایسی گمبھیر، تاریخی، نسلی اور نفسیاتی معنویت بھی پنہاں ہے۔ جو سیاسی تبدیلیوں سے بلند تر اور ماورا رہے گی؟ دیپالی بہت زیادہ اُلجھ کر دریچے سے مڑی۔ نواب صاحب الماری بند کر کے لکھنے کی میز کی طرف جا رہے تھے۔

"یہ سب طبقاتی سیاست ہے"۔ دیپالی نے ریحان کے الفاظ دہرائے اور اونچی آواز میں کہا۔ "اب میں جاتی ہوں کاکا"۔

نواب صاحب نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اور شاہانہ وقار سے چلتے ہوئے اس کے نزدیک آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تم بیٹی۔ مجھے آج تک معلوم نہ تھا کہ اتنا زیادہ پڑھ لکھ گئی ہو مجھے تمہاری طرف سے بہت تشویش ہو گئی۔ لڑکیوں کے لئے اتنا پڑھ لکھ جانا بہت مضر ہے۔ اسی لئے میں نے جہاں آرا کو کالج سے اٹھا لیا۔ تمہارا اصل فرض وہ ہے، جس کے لئے اندر تمہارا انتظار کیا جا رہا ہے۔ جاؤ جا کے اپنے بھائی نیّر کی بری کے جوڑے ٹانکو۔ جاؤ۔ بھاگو ـــــ"

"جی کاکا ـــــ" دیپالی نے ہنس کر کہا۔ اور تقریباً دوڑتی ہوئی کتب خانے سے باہر نکل گئی۔ نواب صاحب کیس میں سے عینک نکال کر بڑی میز پر جا بیٹھے۔

ارجمند منزل کے پائیں باغ کے وسط میں سنگِ سُرخ کا بڑا خوبصورت تالاب تھا۔ جس کے چاروں طرف اونچی، کنگورے دار منڈیروں کے ساتھ ساتھ سنگی بنچیں نصب تھیں۔ اور بیرونی سیڑھیوں کے دونوں جانب حُسنہ حنا کی جھاڑیاں تھیں۔ تالاب کے کنارے سیمل کے نیچے کئی لڑکیاں ایک تخت پر جمع سلائی میں مصروف تھیں۔ قریب ہی گھاس پر سیتل پاٹیاں بچھی تھیں اور بڑی سرگرمی سے جوڑے سل رہے تھے۔ تالاب کی دوسری جانب گلابِ خاص کے گھنے سائے میں ایک شکستہ سا "شاہی تخت" بچھا تھا جس پر انجم آرا، اطلسی دلائی پھیلائے اس پر گوٹے کا چوکھا جال بنانے میں مصروف تھی۔

یہ "شاہی تخت" اس زمانے کی یادگار تھا جب نواب نورالزماں مرحوم کے ہاں ارجمند منزل

کے باغ میں جاترا والوں کی منڈلیاں آکر ڈیرے ڈالتی تھیں۔ لوک ناٹک کھیلے جاتے تھے۔ بنگالی تھیٹر کمپنیاں تاریخی، سوشل اور سیاسی ڈرامے اسٹیج کرتی تھیں۔ اور شہر کے ہندو اور مسلم امرا جمع ہو کر "شاہ جہاں"، "ٹیپو سلطان"، "سراج الدولہ"، "میر قاسم"، "کرانی جیون" اور "خودی رام باسو" سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ (خودی رام باسو، جو ایک دہشت پسند نوجوان تھا۔ اور جسے مظفر پور کے انگریز جج کنگز فرڈ پر قاتلانہ حملہ کرنے کے جرم میں ۱۹۰۸ء میں پھانسی ہوئی تھی۔ ہزاروں ہندو گھروں میں اس کی راکھ تبرک کی طرح تقسیم کی گئی۔ اور لوگ اس کے تعویز بنا بنا کر پہننے لگے۔ اس کے متعلق مقبول ڈرامہ بھی ارجمند منزل میں کھیلا جا چکا تھا) یہاں گریش چندر اور ٹیگور کا چرچا رہتا تھا۔ اور بنگلہ سنگیت ناٹکوں کی موسیقی گونجی تھی۔

ڈھاکے میں اردو تھیٹر ۵۷ء سے پہلے سے قایم تھا۔ اور اواخر انیسویں صدی تک یعنی جب نواب نورالزماں فریدپور سے آکر وہاں سکونت پذیر ہوئے۔ شہر میں متعدد تھیٹر کمپنیاں موجود تھیں جن کے منشی اور ایکٹریسیں لکھنؤ سے منگوائے جاتے تھے۔ اور ایکٹرسیں مردانہ پارٹ کرتی تھیں۔ ۱۸۷۶ء تک جب نواب قمرالزماں کے دادا پہلی بار فریدپور سے ڈھاکے آن کر رہے تھے۔ شہر میں چونتیس تھیٹر کمپنیاں قائم تھیں۔ اور اس زمانہ سے لے کر آج تک ارجمند منزل میں ناٹک کا سلسلہ جاری تھا۔ بنگالی زمینداروں کو تھیٹر کا از حد شوق تھا۔ اپنے گھروں میں اسٹیج کئے جانے والے ڈراموں میں اکثر وہ خود بھی ایکٹنگ کرتے تھے۔ "جلسہ گھر" زمینداروں کے مکان کا لازمی حصہ تھا۔ ارجمند منزل کے جلسہ گھر میں اب سیاسی میٹنگیں بھی ہوتی تھیں۔ مگر اس کی اسٹیج اور دیگر ساز و سامان جوں کا توں موجود تھا۔ نواب نورالزماں کے چھوٹے بھائی نواب زادہ فخرالزماں مرحوم نے خود ایک تھیٹر کمپنی کھولی تھی۔ خواص و عوام سبھی اسٹیج کے رسیا تھے۔ کلکتہ میں مدتوں سے ریوالونگ اسٹیج موجود تھی۔ اور "ترکی حور" ناٹک میں پہلی بار بیک گراؤنڈ میں فلم کے مناظر سے کام لیا گیا تھا۔ کلکتہ، ڈھاکہ اور دوسرے شہروں کے ہر محلے کی اپنی ناٹک منڈلی تھی۔ دیہات میں جاترا والے گاؤں گاؤں گھومتے تھے۔

اسی دور کے "سین سنیریوں" کے پردوں، اونچی اونچے چینی کے گملوں، فرنیچر، "شاہی" ملبوسات نقلی تاج، داڑھی مونچھوں، کاٹھ کی تلواروں اور دیگر لوازمات کا انبار ارجمند منزل کے شاگرد پیشے کے ایک گودام میں مقفل تھا۔ اور جب کبھی کالج میں ڈرامہ ہوتا تو دیپالی اور روزی فوراً ارجمند منزل کا رُخ کرتیں۔ نواب زادہ نیرالزماں گودام کھلواتے اور وہ اپنے مطلب کی چیزیں نکال کر لے جاتیں۔

نواب زادہ فخرالزماں مرحوم نے "راجہ بھوج" کے عنوان سے خود ایک سنگیت ناٹک بنگلہ میں تصنیف کیا تھا۔ اس کے لئے ننھے منے آئینوں اور رنگ برنگے نقش و نگار سے مزین وکرم آدتیہ کا روایتی سنگھاسن بنوایا گیا تھا۔ جس میں ساری میں لپٹی چار مورتیاں چاروں پایوں کی جگہ تخت سر پر اٹھائے

کھڑی تھیں۔ بقیہ اٹھائیس مورتیاں سنگھاسن کے سہ طرفہ جنگلے میں نصب تھیں۔ یہ "شاہی تخت" اسٹیج کے دوسرے فرنیچر کے انبار کے نیچے مدتوں سے دبا پڑا تھا۔ اور آج صبح ملازموں نے باہر نکال کر جھاڑ پونچھ کے گلابِ خاص کے نیچے بچھا دیا تھا۔ تاکہ صاحبزادیاں آرام سے بیٹھ کر سی پرو سکیں۔

سنگھاسن کے مقابل میں سیمل کے نیچے اختر آرار مشین پر کچھ سی رہی تھی۔ تین چار خادمائیں تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھی پان چبا رہی تھیں۔ ایک سیتل پاٹی پر ہارمونیم رکھا تھا اور ایک لڑکی بیاہ کے گیت الاپنے میں مصروف تھی۔

نواب قمر الزماں چودھری کو کتب خانے میں لیگ کے ماہانہ جلسے کے لئے تقریر لکھنا چھوڑ کر دیپالی سرکار طویل گیلری میں سے گذرتی کشادہ چوبی زینے پر پہنچی۔ اور دوسری منزل پر جا کر جہاں آرار کے کمرے میں داخل ہوئی۔ مگر کمرہ خالی پڑا تھا۔ تخت اور مسہری بنارسی ساریوں کے خالی ڈبہ بکھرے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں مٹھائی کے گلابی کاغذوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ساری کوٹھی کی طرح اس کمرے میں بھی شادی کا ماحول نظر آرہا تھا۔

نیچے سے ہارمونیم کی آواز بلند ہوئی۔ دیپالی دریچے میں گئی جو پچھلے باغ پر کھلتا تھا۔ اس نے جھانک کر نجمہ اور اختر آرار کو دیکھا۔ مونگیا ساری پہنے ایک اور لڑکی، جس کی پشت کوٹھی کی طرف تھی۔ بڑی تندہی سے مشین کا ہینڈل گھمانے میں مصروف تھی۔ بادل گھر آئے تھے۔ بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ ایک ملازمہ تالاب کے دوسرے سرے کی اندرونی سیڑھی پر بیٹھی چاندی کے برتن صاف کر رہی تھی۔ کتب خانے کے پریشان کن، کربناک ملکی سیاست کے تذکرے کے بعد یہ منظر کس قدر پر سکون اور نظر فریب تھا۔

باورچی خانے کی سمت سے جہاں آرار خراماں خراماں چلتی تالاب کی طرف آئی۔ دیپالی نے دریچے میں سے اُسے آواز دی۔ جہاں آرار نے اسے سر اٹھا کر دیکھا — "دیپالی — اتنی دیر لگا دی جلدی آؤ —"

"آتی ہوں بھائی —" اُس نے جواب دیا۔ اور تیزی سے نیچے چلی گئی۔

"آہا — دیدی آگئیں"۔ "راج سنگھاسن" پر بیٹھی انجم آرار نے نعرہ لگایا۔ دیپالی تقریباً دوڑتی ہوئی سیمل کے نیچے پہنچی۔ مونگیا ساری والی لڑکی نے پلٹ کر اور بالوں کی ایک لمبی چوٹی زور سے پشت پر پھینک کے دیپالی کو دیکھا اسے آداب کیا۔ اور پھر ہینڈل گھمانے جُٹ گئی۔ دیپالی تخت کے کنارے بیٹھ گئی۔

"آج صبح سے بارش نہیں ہوئی۔ ہم لوگوں نے کارخانہ باہر ہی جما رکھا ہے"۔ جہاں آرار نے

بیش قیمت چینی ریشم کی پستئی ساری کا ڈھیر اس کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔ "لو اس پر یہ بیل ٹانک دو"۔ دیپالی نے سورت کی جگمگاتی بیل اور ساری کے ہم رنگ دھاگے کی ریل نیچے سیتل پاٹی پر سے اٹھاتے ہوئے سوچا۔ پاکستان، کمیونسٹ تحریک، ہندو مسلم آویزش، عالمی جنگ۔ ان سب جھگڑوں سے بے پرواہ جہاں آرا اپنے بھائی کی بری تیاری کر رہی ہے۔ کیسی خوش قسمت ہے۔ میں خواہ مخواہ دنیا کی فکر میں کیوں ہلکان ہوتی ہوں۔ یہ سوچ کر اُس نے فوراً بشاشت اور زندہ دلی اپنے اوپر طاری کر لی۔ اور جہاں آرا اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ بے فکری سے ہنسنے بولنے میں مصروف ہو گئی۔

"روزی آپا بھی ابھی تک نہیں پہنچیں"۔ ایک لڑکی نے کہا۔

"آج اتوار جو ہے۔ گرجا میں دیر لگے گی۔ پھر سنڈے اسکول پڑھائیں گی"۔ اختر آرا نے جواب دیا ــــ "اب آتی ہی ہوں گی بے چاری"۔ "تم بھی سویرے سے آجاتیں تو یہ بیل اب تک ٹنک گئی ہوتی"۔ جہاں آرا نے دیپالی سے کہا۔

"میں باہر کاکا سے بحث میں لگ گئی تھی"۔

"کیسی بحث؟" اختر آرا نے پوچھا، جو دیپالی کی ہم عمر تھی۔

"کچھ نہیں۔ پاکستان کے متعلق"۔

"کیا کہا تم نے؟"

"میں انھیں سمجھا رہی تھی کہ پاکستان انگریزوں کا منصوبہ ہے"۔

"تم ابا سے جھگڑ رہی تھیں؟" جہاں آرا نے حیرت سے پوچھا۔

"اب اگر ہمارے بزرگ غلطی پر ہوں تو انھیں سمجھانا تو چاہئے ہی"۔ مونگیا ساری والی لڑکی نے مشین چلاتے چلاتے منہ لٹکا کر کہا۔ دیپالی نے چونک کر اسے دیکھا۔

جہاں آرا ہنس پڑی"۔ ارے دیپالی۔ یہ یاسمین ہے باؤلی۔ میں نے تمھیں اس کے متعلق خط میں لکھا تھا نا"۔ اس نے بڑے پیار سے کہا۔ جہاں آرا کے دل میں ساری دنیا کے لئے محبت تھی۔

سولہ سترہ سالہ ذرا وحشی آنکھوں والی یاسمین مجید نے دیپالی کو دوبارہ آداب کیا۔

"یہ تمھاری روزی آپا کی اور ہماری ہمجولی ہیں"۔ جہاں آرا نے اس سے کہا۔

"آں ہاں۔ دیدی۔ میرے پاس تو آپ کے تینوں ریکارڈ موجود ہیں۔ اور ایک گیت پر تو میں ناچتی بھی ہوں ــــ"

"ہاں بھائی۔ ہمیں یاد ہی نہیں رہتا کہ تم اتنی مشہور مغنیہ ہو۔ اور لوگ تم کو پہلے سے غائبانہ ہی جانتے ہیں! بھئی ہم کیا کریں۔ ہمارے لئے تو تم وہی ہمیشہ کی دیپالی ہو۔ بقول ہماری امی بنوئے بابو کی خبطی لونڈیا ــــ" جہاں آرا نے ہنس کر کہا۔

"آپ تو مجھے بھی خبطی سمجھتی ہیں آپا۔" یاسمین شگفتگی سے بولی۔

"یہ جہاں آرا، جو ہیں نا۔ ان کے خیال میں سب دیوانے ہیں۔ بس یہی سب سے زیادہ ہوشمند ہیں۔ بڑی بی۔" دیپالی نے کہا۔

"روزی آپا آگئیں ——" انجم آرا چلائی۔

روزی سائیکل پر فراٹے بھرتی سیدھی تالاب کے کنارے پہنچی اور سائیکل تالاب کی منڈیر سے لگا کر تخت پر آن بیٹھی اور فوراً سلائی میں مصروف ہو گئی۔

دوسری منزل کے ایک دریچے میں سے نیّر الزماں نے سر نکال کر جھانکا۔ "بھئی واہ۔ دیکھو ہماری روزی اور دیپالی کتنی سگھڑ ہیں۔ کون کہتا ہے کہ آج کل کی لڑکیاں سینا پرونا نہیں جانتیں۔" اُس نے آواز دی۔

جہاں آرا نے سر اٹھا کر بھائی کا منہ چڑایا۔ روزی اور دیپالی نے اسے نمسکار کیا۔

"کتنا نیگ دو گے نیّر بھائی۔" یاسمین چلائی۔

"جتنا چاہو لو ——" بیگم قمر الزماں نے دریچے میں بیٹے کے پیچھے سے آکر کہا۔

"اے ہے۔ اللہ رکھے۔ ماشاء اللہ کیسا اچھا لگ رہا ہے۔" سگن بگیچے والی شمسہ خالہ نے دریچے میں آکر کہا۔ "اے کچھ گاؤ بھی تو۔ لڑکیو اے فریدہ۔ تو کیوں چپ ہو گئی۔ ہ دیپالی تم کچھ گاؤ بیٹی ——"

نیّر الزماں دریچے سے ہٹ کر اندر چلے گئے۔

"بہت اچھا خالہ ——" دیپالی نے جواب دیا۔

بیگم قمر الزماں اور شمسہ خالہ بھی باتوں میں مصروف دریچے میں سے غائب ہو گئیں۔

نیچے سیمل کی ڈالیوں میں مینائیں شور مچا رہی تھیں۔ تالاب کے کنارے سلطانہ چمپا کا درخت مہک رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ساگوان کے جھرمٹ میں سفید پھول کھلے تھے۔

"دیدی نذرل کا کوئی گیت سنائیے۔" یاسمین نے کہا۔

"نذرل کا —— اچھا ——" دیپالی سر جھکا کر سلائی کرتی رہی پھر گنگنانے لگی۔

"نورگش باگ میں۔ نورگش باگ میں۔

بہار کی آگ میں۔"

یاسمین تخت پر سے اٹھ کر اس گیت کے ساتھ منی پوری طرز کا ہلکا پھلکا رقص کرنے لگی۔ واقعی وہ بہت اچھی رقاصہ تھی۔

"بہار کی آگ میں —— بھرے دل داگ میں۔"

جہاں آرا سر جھکائے سلائی کرتی رہی۔

"بہار کی آگ میں ـــــ کہاں میرے پیارے ـــــ" دیپالی نے گایا۔ یاسمین نے گردن ہلا ہلا کر ناچ جاری رکھا۔

"درد دل زور ـــــ" دیپالی نے گایا۔

جہاں آرا ریک لخت اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

"ہرا دھاگا ختم ہوگیا ـــــ" روزی نے اختر آرا سے کہا۔

"دیدی"۔ اختر آرا نے دیپالی سے کہا۔ "ذرا پلیز اوپر جاکر آپا کی الماری میں سے ہری اور نیلی ریلیں نکال لائیے"۔ اُس نے تخت پر بکھرے کپڑوں کے نیچے جہاں آرا کا سوتیوں کا بٹوہ تلاش کیا۔ اور اس میں سے کنجیوں کا گچھا نکال کر دیپالی کو تھما دیا۔ "یہ بیچ والی کنجی ہے۔ چاکلیٹ کے بڑے ڈبے میں ریلیں ہوں گی اور آپا کا سوئینگ باکس اگر مقفل نہ ہو تو اس میں سے ڈی۔ ایم۔ سی کا کاسنی لچھا بھی نکالتی لائیے گا"۔

"اچھا ـــــ" دیپالی نے جواب دیا اور کنجی لے کر پہلو کی زینے کی طرف روانہ ہوگئی۔

جہاں آرا کے کمرے میں پہنچ کر اس نے لمبی چوڑی وکٹورین الماری جس کے ایک پٹ پر قدِ آدم آئینہ لگا تھا کھولی۔ چاکلیٹ کا ٹین اور سوئینگ باکس چوڑیوں کے ڈھیر کے پاس ایک درمیانی تختے پر سامنے ہی رکھے تھے۔ دیپالی نے چاکلیٹ کے ڈبے میں سے مطلوبہ ریلیں نکالیں۔ بید کا سوئینگ باکس بھی کھلا ہوا تھا۔ اس کا ڈھکنا اٹھا کر اس نے کاسنی لچھا تلاش کرنا شروع کیا۔

ریشم کے لچھوں، ریلوں اور کشیدہ کاری کے دوسرے لوازمات کے نیچے اسے ڈی۔ ایم۔ سی کے کاسنی لچھے کی جھلک نظر آئی۔ اسے نکالنے کے لئے دیپالی نے باقی چیزیں ایک طرف سرکائیں تو بکس کی تہ میں رکھی ایک تصویر دکھلائی پڑی۔

دیپالی سُن سی رہ گئی۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے تصویر باہر نکالی۔

یہ آج سے چند برس پہلے کے ریحان الدین احمد کی تصویر تھی۔

تصویر کی پشت پر بنگالی میں لکھا تھا۔

شہزادی جہاں آرا بیگم کے حضور میں

اُن کے ادنیٰ غلام بے دام کی طرف سے

کلکتہ۔ ۱۶ر اپریل ۱۹۳۵ء

اِس تحریر کے نیچے ایک اردو شعر لکھا تھا۔

دیپالی کی آنکھوں کے سامنے گھُپ اندھیرا چھا گیا۔ چند لمحوں تک وہ تصویر ہاتھ میں لئے مفلوج سی کھڑی رہی۔ اتنے میں برابر کے کمرے میں کسی نے زور سے دروازہ بند کیا۔ اور وہ ہوش میں آکر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ کمرہ وہی تھا۔ ساگوان کی مسہری۔ بنارسی ساریوں کے ڈبے ان گنت "طاقچوں"

اور دروازوں والی وکٹورین سنگھار میز۔ مسند، قالین، کتابوں کی الماری۔ کشمیری کڑھت کے پردے، کوئی چیز بھی نہیں بدلی تھی۔ دریچے کے باہر جولائی کی مدھم دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور نیچے تالاب کے کنارے سے لڑکیوں کے قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔

دیپالی نے جلدی سے تصویر سوئینگ باکس کی تہہ میں واپس رکھ کر الماری بند کی اور قدِ آدم آئینے میں اسے اپنی دہشت زدہ، بھونچکی شکل نظر آئی۔ اس کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔ اور اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

دھاگوں کی ریلیں اور لچھا سمیٹ میں بھینچ کر وہ کمرے سے باہر نکلی۔ اور زینہ اتر کر سیمل کے نیچے پہنچی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ ازل سے ابد تک کا فاصلہ طے کر کے لوٹی ہے۔

نورگس باگ میں ـــــ بہار کی آگ میں۔

درد دل زور

اب شمسہ خاکہ کی لڑکی فریدہ ہارمونیم پر زور زور سے گا رہی تھی اور یاسمین پھرکی کی طرح ناچنے میں مشغول تھی۔ اختر آرا اور روزی سیمل کے نیچے سلائی کر رہی تھیں۔ انجم آرا گلاب خاص کے نیچے "راج سنگھاسن" پر سے دُلائی سمیٹ کر اٹھ رہی تھی۔ یاسمین ناچتے ناچتے جا کر اس تخت پر بیٹھ گئی۔ دیپالی کو دیکھ کر انجم آرا نے آواز دی۔ "دیدی۔ ادھر آؤ۔"

دیپالی اختر آرا کو دھاگے دینے کے بعد جا کر "شاہی تخت" کے کنارے پر ٹک گئی۔

"دیدی ذرا سنبھل کر بیٹھنا۔ اس کا ایک پایہ ٹوٹا ہوا ہے"۔ یاسمین نے کہا۔

"اچھا ـــــ" اس نے احمقوں کی طرح ہنس کر جواب دیا۔

"آستینوں کی تُرپائی"۔ انجم آرا نے اسے بروکیڈ کا ایک ادھ سلا بلاؤز تھما دیا۔ اور خود دُلائی تہہ کر کے کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئی۔

نزدیک ایک سٹیل پاٹی پر فریدپور سے آئی ہوئی ایک رشتہ دار لڑکی نے گلابی کریب ڈی شین کا ایک ٹکڑا بچھا کر بلاوز تراشنے کے لئے اسے ناپنا شروع کیا۔ مالا ملازمہ اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گئی۔

باغ چاروں طرف ڈول رہا تھا۔ دیپالی نے بروکیڈ کے بلاؤز کی ایک آستین کا کنارہ موڑ کر سوئی کھوپنی جہاں آرا باورچی خانہ سے لوٹ کر کب آئی۔ اور اس کے نزدیک بیٹھ کر کب سلائی کرنے لگی۔ اسے پتہ بھی نہ چلا۔ باغ بڑے سے جہاز کی طرح ڈول رہا تھا۔

سیمل کے نیچے سے روزی اٹھ کر گلاب خاص کے نیچے "سنگھاسن" پر آن بیٹھی۔ یاسمین اب بندریا کی طرح تخت کی پشت کے برابر اکڑوں بیٹھ کر جنگلے میں بنی مورتیوں پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

سیتل پاٹی پر بیٹھی لڑکی نے دلہن کا بلاؤز تراشنا شروع کیا۔

"اللہ کرے اب جلدی سے جہاں آرا بی بی کے جوڑے بھی سلیں۔" قریب بیٹھی ملازمہ مالا نے ایک انگلی سے کپڑے کا کونا دباتے ہوئے کہا۔ جہاں آرا نے سر اٹھا کر غصے اور کرب سے اس پر نظر ڈالی اور اپنی سلائی پر جھک گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ جنھیں اس نے چپکے سے اپنی ساری کے سُرخ کنارے سے پونچھ لیا۔

دیپالی نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"اپنی شادی کے ذکر پر نہ جانے کیوں اس کا یہی ری ایکشن ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ میرے سامنے بھی رونے لگی تھی۔ جانے کیا بات ہے۔ کبھی کچھ بتاتی بھی نہیں"۔ روزی نے چپکے سے اس کے کان میں کہا۔ دیپالی اپنے ہاتھوں کا رعشہ چھپانے کے لئے ذرا دوسری طرف مڑ گئی۔ مگر اس طرف گلابی کریب ڈی شین کے بکھرے ٹکڑوں میں سے کھلنا میں بنی سیتل پاٹی پر چھپا ہوا گلدار ہرن اُسے جھانکنے لگا۔

فریدہ ہارمونیم بند کر چکی تھی۔ باغ پر ایک دم بڑا سناٹا سا چھا گیا۔ ساری لڑکیاں سر جھکائے اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں۔

چند منٹ بعد باتونی اور بے چین یاسمین نے اس خاموشی کو توڑا۔ "کیسا FUNNY تخت ہے"۔ اس نے جنگلے پر طبلہ بجاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

"سنگھاسن بتیسی ـــــ!" گھاس پر بیٹھی ملازمہ مالا نے کھیسیں نکال کر کہا۔

"کون چیز ـــــ؟" یاسمین نے پوچھا۔

"راجہ بکرم جیت کا سنگھاسن"۔ فریدہ نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

"اوہ ـــــ" یاسمین نے مورتیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

سیتل پاٹی پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں نے بھی دفعتاً باتیں شروع کر دیں۔

"امی ایک جوڑا فرشی پائجامے کا بھی رکھ رہی ہیں"۔ اختر آرا فریدہ سے کہہ رہی تھی۔

"اُدھر ہندوستان میں تو صرف غرارہ ہی پہنا جاتا ہے۔ ابا بتا رہے تھے"۔ انجم آرا نے جو کوٹھی سے واپس آ چکی تھی۔ گھاس پر دو زانو بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپا کے پاس تو کئی فرشی پائجامے ہیں ـــــ ہیں نا آپا ـــــ؟ مگر آپا پہنتی ہی نہیں"۔ اختر آرا نے کہا۔

"اب بڑھاپے میں کیا خاک پہنوں گی"۔ جہاں آرا نے تلخی سے کہا۔

"اے لو ـــــ اور سنو ـــــ" فریدہ نے ذرا کھوکھلی آواز میں بُرا مانا۔

"یاد ہے ایک دفعہ آپا نے عید پر غرارہ پہنا تھا ـــــ؟ جب ہم لوگ سب خالو جان کے ہاں نرائن گنج گئے تھے"۔ اختر آرا نے انجم آرا سے کہا۔

(اُس عید پر اس نے کلکتہ سے حسب معمول شرارتاً ایک بے حد واہیات سا عید کارڈ بھیجا تھا۔ جس پر ہلال، کھجور کے درخت اور اونٹ کے منظر کے نیچے دو ہاتھ (ایک نسوانی ایک مردانہ) مصافحہ کر رہے تھے اور برابر میں دو موٹے مسخرے نفیریاں بجا رہے تھے۔ کارڈ کی پشت پر اس نے اردو میں ایک سخت بازاری شعر لکھا تھا ــــ "عید کا دن ہے، پتہ نہیں کیا ــــ مجھے مصرعہ یاد نہیں ہے۔ گلے مل لو صاحب۔ رسم دنیا بھی ہے۔ موقع بھی ہے دستور بھی ہے"۔ اس کی اردو ہینڈ رائٹنگ کتنی کچی اور بچکانہ تھی۔ جہاں آرا ایک گھٹنے پر سر رکھ کر سلائی میں مصروف رہی۔)

"چلو لڑکیو۔ دسترخوان لگ گیا ــــ" برآمدے میں سے ایک بوڑھی ملازمہ نے پکارا۔

روزی "سنگھاسن" سے اتر کر چیزیں سمیٹنے کے لئے سیمل کے نیچے چلی گئی۔

یاسمین ابھی تک سنگھاسن بتیسی کے تصور میں محو تھی۔ اس نے اچانک سر اٹھا کر جہاں آرا اور دیپالی کو مخاطب کیا۔

"آہا ــــ آپا ــــ دیدی۔ تم دونوں اور میں اس تخت پر بیٹھے ہیں نا۔ تو یہ PRETEND کرو کہ ہم تینوں پایوں والی مورتیاں ہیں جو راجہ بھوج اس لائق نہ ہوگا ہم اُسے اس تخت پر قدم بھی نہ رکھنے دیں گے"۔

"کیا دیوانی لڑکی ہے!" جہاں آرا نے ہنس کر کہا۔

دیپالی بلاؤز ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب جہاں آرا نے پہلی بار اس کی وحشت زدہ شکل دیکھی۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "ارے دیپالی تمھیں کیا ہو گیا۔؟"

کچھ نہیں بھائی۔ میرے سر میں بڑا سخت درد ہو رہا ہے"۔ اس نے شدید اکتاہٹ اور تکان کے ساتھ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔

"ارے تو اوپر جا کر ذرا لیٹ رہو ــــ کھانا پھر کھا لینا"۔

"نہیں۔ میں اب گھر جاؤں گی"۔

"ابھی سے؟ تمھیں ہو کیا رہا ہے بیٹھے بٹھائے؟"

"جہاں آرا"۔ دیپالی کی آواز میں التجا تھی۔ "مجھے اب گھر جانے دو۔ اتوار کو بولپور واپس جانا ہے۔ اس کے لئے پیکنگ بھی ــــ" وہ بات پوری کئے بغیر تھک کر چپ ہو گئی۔

"ایک تو اتنے دنوں بعد آئیں۔ ساری چھٹیاں جانے کہاں کہاں سیر سپاٹے کرتی پھریں۔ اب بھاگی جا رہی ہو۔ یہ کیا دھاندلی ہے۔ اطمینان سے بیٹھ کر آج گپ بھی نہیں ہو سکی"۔ جہاں آرا نے دیپالی پر دوبارہ نظر ڈالی ــــ "تم واقعی بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ چلو جلدی سے چل کر کھانا کھا لو۔ پھر چلی جانا۔ مالا"۔ اس نے ملازمہ کو آواز دی ــــ "ڈرائیور سے کہو۔ موٹر ادھر لا کر لگا دے۔ دیپالی

بی بی کو جلدی گھر جانا ہے۔ آؤ ــــ" اس نے دیپالی سے کہا۔

باقی لڑکیاں کام سمیٹ کر کوٹھی کے پچھلے دالان تک پہنچ چکی تھیں بوندا باندی شروع ہو گئی بارش کے پہلے قطرے تالاب کی سطح پر ننھے منے بھنور بنا رہے تھے۔

روزی بھاگی ہوئی دیپالی کے پاس آئی ــــ "کیا ہوا ــــ؟ کیا ہوا جہاں آرا؟"

"کچھ بھی تو نہیں ــــ" دیپالی نے ذرا درشتی سے کہا۔ یہ میں کیا اپنا تماشہ بنا رہی ہوں۔ اس نے دل میں کہا۔ اور "راج سنگھاسن" سے اتری ــــ چلو دیپالی اٹھو ــــ اس نے حسب عادت خود کو مخاطب کیا ــــ پھر بولپور پہنچنا ہے۔ چلو دیپالی سرکار دوسرا قدم آگے بڑھاؤ۔

وہ جہاں آرا اور روزی کے ساتھ کوٹھی کی سمت روانہ ہو گئی۔

## ۱۷

# گوڑ ملہار

جل تھل۔ نبھ۔ تال۔ بن۔ اُپ بن۔ ندی۔ نالے۔ گری۔ گوہا۔ سب ہی کچھ۔ سارا بنگال دیس برکھا رت میں ایک بیکراں دریا بن چکا ہے۔ شہر کی گلیوں میں نوکائیں چل رہی ہیں۔ کالے بادلوں کے نیچے طوفانی ندیاں بہتی ہیں۔ کائنات پھیل کر وسیع تر ہو گئی۔ فصلیں بونے اور بالیدگی اور تجدید اور شادابی کا موسم۔ پٹ سن کٹنے والا ہے۔ تنکے کی نوکیلی چھجے دار ٹوپیاں اوڑھے کسان کھیتوں میں دھان بو رہے ہیں۔ محلوں دو محلوں، مکانوں اور جھونپڑوں میں ڈھولک بج رہی ہے۔ آبی راستوں کے چوکھے بلوریں جال پر باراتیں رواں ہیں۔ بانسریاں بجتی ہیں۔ امرا کی دلہنوں کی پالکیاں کشتیوں اور اسٹیمروں پر چڑھائی جا رہی ہیں۔ غریب باراتی شکستہ چھتریاں لگائے گاتے بجاتے شمپانوں میں لدے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جا رہے۔ برکھا رُت، شادیوں کی رُت ہے۔ ہر برسات کی مانند اس برس بھی کتنے بندھن بندھیں گے۔ ان سب دلہنوں کی قسمتوں میں کیا لکھا ہے۔؟

گھر کی لکشمی، ہزار برس کی نیو بہوؤں نے سندھیا کال اپنے اپنے آنگنوں میں لکشمی کی اوتار تلسی کے گملوں کے سامنے چراغ جلا دیئے۔

پچھلی صدیوں کی وہ سدا سہاگنیں جو زبردستی ستی ہونے چلیں اور اپنے گھروں کے دروازوں پر ریت کے مطابق لاکھ کے رنگ میں ڈبو کر اپنے داہنے ہاتھ کا نشان لگاتی گئیں، اندھیرے جنگلوں میں،

دور افتادہ گاؤں میں پرانے بوسیدہ مکانوں کے دروازوں کی چوکھٹوں پر ان کے چھوٹے سے پنجے کے سُرخ نشان ٹمٹمارہے ہیں۔ تاریک بنوں میں ان بے چاری ستی ساوتریوں کی سمادھیوں کے گول، نیچے لرزہ خیز گنبد، بارش میں بھیگتے ہیں۔

شعراء کی موضوعِ سخن، افسانہ نگاروں کی ہیروئن۔ جذباتی چتر کاروں کی تصویر ——— بنگال کی عورت۔ سدا دکھ سہنے والی۔ صابر و شاکر بے چاری۔

سیندور اور مہندی کی سُرخی۔ لاکھ کے رنگ کی سُرخی۔

بُوندوں کی لڑیاں۔ زندگی۔ موت ——— زندگی کی پھول مالا گوندھتی جارہی ہیں۔

جب بارش تھمتی ہے تو بادلوں کے اودے شامیانے کے نیچے مور ناچنا شروع کر دیتے ہیں۔ کنجوں میں جو تھیکا کھلی ہے۔ بنوں میں سال کے پھول مہک اٹھے۔ بھیگی، گھپ اندھیری رات میں جگنو چمک رہے ہیں۔ جن کی روشنی میں کبیوں نے کہا۔ "ابھیسار یکا۔ اپنے محبوب سے ملنے جاتی ہے۔ ندی کنارے بید کے پھول کھلے ہیں۔ ہرے اور سیاہ پروں والی مرغابیاں چلّا رہی ہیں ——— ہرن درختوں کے نیچے چپ چاپ کھڑے ہیں۔ چھپّر ٹپکنے لگے۔

پودے بڑھ رہے ہیں۔ کھیت لہلہا اٹھے۔ بانس کے سرسراتے جھنڈ میں ہاتھی بارش سے بچنے کے لئے کھڑے کان پھٹپھٹا رہے ہیں۔ بگلے مچھلیوں کے تعاقب میں ہیں جن سے تال اور ندیاں لبریز ہوگئیں۔

پروائی میں کیتکی مہک رہی ہے۔ بانس کے جھرمٹ میں سانپ سوتا ہے"۔

ندی پر سے بارات آرہی ہے۔ بارات آنگن کے دوار پر اُتر گئی۔ تلسی کے سامنے چراغ جل رہا ہے۔

یہ کس کا گھر ہے اور دولہا کون ہے؟ اور کہاں ہے؟ کس کی دلہن ہے جو اٹاری پر یوں بال بکھرائے پریشان سوتی ہے؟

## ۱۸

# میگھ رنجنی راگنی

آدھی رات کے بعد بارش تھمی۔ سیمل کے خُنک پتوں میں سے ٹپ ٹپ کرتی بوندیں باغ کی

نم، سوندھی مٹی پر گرتی رہیں۔ مینڈکوں کا شور ایک دم تیز ہوگیا۔ محل میں روشنیاں جل اٹھیں گہما گہمی، ہنسی مذاق، شور، قدموں کی چاپ۔

دوسری منزل کی طویل گیلری میں سے گزرتی انجم آرا رک رک کر ٹیگور کا گیت الاپ رہی ہے۔

استھوے جوے نبھ استھوے بنے اُپ بنے ندی ناوے۔ گری گوہا پارا بارے۔

آشاڑھے نوبو آنند واتشبو نوبو۔

اتی گمبھیر اتی گمبھیر نیل ادمبرے ڈمرو باجے۔

وہ بے چینی سے مسہری پر کروٹ بدلتی ہے۔ شنکری[1] ناچے۔ شنکری ناچے۔ بین ملار گیت گاہی چھے آندھار راتے ___ آواز دور چلی جاتی ہے۔

لیکن سپنے میں گیت جاری ہے۔

کورے گرجن نیر جھرنی سگھنے۔ اٹھے روپ بھیرب تانے بتانے

سپنے میں وہ گا رہا ہے۔

جبکہ وہ بال بکھرائے برمی نقش و نگار کے چھپر کھٹ پر بے چینی سے سوتی ہے۔ وہ سیمل کے نیچے بکرم جیت کے شکستہ سنگھاسن کے کنارے کھڑا گائے جا رہا ہے۔ وکرمادتیہ کے زرد عقیق کے تخت میں سے سرخ و سبز شعاعیں چھوٹ رہی ہیں۔ انصاف کا تخت ایک دم جگمگانے لگا۔ وہ گا رہا ہے۔

دیکے دیکے کتو بانی نوبو کتو بھاشا۔ جھورو جھورو روشو دھارا۔

جھورو ___ جھورو ___ امی کہتی ہیں۔ مالا کہتی ہے۔ سیمل کے سفید اور زرد پھولوں میں معجزے اور سحر کی طاقتیں پوشیدہ ہیں۔ جادو ٹونے۔ معجزے۔

"بی بی ___ بی بی ___ اٹھیے ___ وہ آگئے۔"

وہ ایک دم چونک کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے۔

مالا مسہری پر جھکی اسے جگا رہی ہے۔ چھت کا برقی پنکھا تیزی سے گھوم رہا ہے۔ کھلے ہوئے دریچوں اور دروازوں میں سے تازہ، سہانی ہوا اندر آ رہی ہے۔

چنبیلی کے پھولوں کی اور برسات کی رات کی مہک۔

"کون آگئے ___؟ کون ___؟" اُس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا ہے۔ رنگ سفید پڑ گیا۔ ہاتھ پاؤں میں سنسنی۔

"بی بی ___" مالا سرہانے ریشمی جھالر دار لیمپ کا سوئچ دبا کر اطمینان سے کھیسیں نکالتے

---

[1] کالی

ہوئے جواب دیتی ہے۔ "اجی وہی سب۔ سگن بگیچے والے۔ دُدی ٹھو موٹر بھر کر۔ دیناج پور چلے خاطر۔ اٹھئے سب جنے تیار ہیں۔ جہاج ٹھیک سات بجے چھوٹے گا۔ آپ ابھی تلک سو رہی ہیں۔ یہ اندھیر دیکھو۔"

"اوہ ——" وہ بال سمیٹ کر آنکھیں موند لیتی ہے۔ میرے خوابوں سے تمھارے خوابوں تلک اب قیامت تک کا فاصلہ ہے —— اچھا بھائی —— جو تمھاری مرضی۔

"جلدی کریئے بی بی"۔

"اچھا۔ اچھا"۔

مالا بڑی مصروفیت سے دروازے کا پردہ اٹھا کر باہر نکل جاتی ہے۔

وہ مسہری سے اتر کر ننگے پاؤں بڑے دریچے میں جاتی ہے۔ نیچے باغ پر گھرے بادل جھکے کھڑے ہیں۔ یہ برسات بھی گذرنے والی ہے۔ گذر جائے گی۔

بجلی چمکتی ہے۔

ان مادنی سودامنی رونگ بھرے نرتیہ کورے —— ادمبر تلے —— انجم آرا کی سُریلی آواز اب نچلی منزل سے آرہی ہے۔ فریدہ اور دوسری لڑکیوں کے قہقہے۔

وہ آگئے —— وہ چند لمحوں قبل کی اپنی حماقت پر تلخی سے مسکراتی ہے۔ اتنے برس۔ اتنے اشاڑھ اتنے شرابن، اتنے بھادرو، اتنے موسم نکل گئے۔ وہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔ اب کیا آئیں گے۔

دریچے سے ہٹ کر وہ غسل خانے میں جاتی ہے۔ منھ پر ٹھنڈے پانی کے چھپکے مار کر واپس آتی ہے۔ الماری کی طرف بڑھتی ہے۔ الماری کے قدِ آدم آئینے میں اپنے بھیگے ہوئے چہرے کا عکس دیکھتی ہے۔ یہ میں ہوں۔

وہ الماری کا پٹ کھولتی ہے۔ مرشد آبادی ریشم کی ایک بیش قیمت گلابی ساڑھی نکال کر باندھتی ہے۔ پھر وہ سوئینگ باکس کھولتی ہے۔ (یہ سوئینگ باکس اسے دن میں کتنی بار کھولنا بند کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو فولاد کی طرح مضبوط بنا لیا ہے) اس میں سے وہ برما کے گلابی موتیوں کا ہار اٹھا لیتی ہے —— جو شام اس نے امّی کے سیف میں سے نکلوایا تھا۔ تصویر کو اس نے مختلف چیزوں کے نیچے اچھی طرح چھپا کر رکھا ہے۔ برسوں سے وہ تصویر اسی طرح بید کی اس صندوقچی کی تہہ میں رکھی ہے۔ اتنی مدتوں بعد بھی اسے یقین ہے کہ اگر اس پر اُس کی نظر پڑ گئی تو اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔

وہ بال گوندھ کر گہنے پہن کر کمرے سے مسکراتی ہوئی نکلتی ہے اور نیچے قہقہوں اور شادمانیوں کی دنیا میں شامل ہونے کے لئے اپنے مہندی لگے ہاتھ کو جنگلے پر ٹکاتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگتی ہے۔

آشاڑھے نوبو آنندو آتشو نوبو۔

میری ہر لحظہ، ہر آن جلتی ہوئی چتا کس نے دیکھی ہے؟
نواب قمر الزماں چودھری کی بڑی صاحبزادی جہاں آرا بیگم۔

نیچے برساتی میں سترہ سالہ یاسمین مجید خوش اور بشاش، جارجٹ کی ہری اور لال چُنری ساری پہنے، دو چوٹیاں گوندھے، زیور پہنے، موٹر سے اتری ہے اور برآمدے میں کھڑی فریدہ اور اختر آرا کے ساتھ قہقہے لگا لگا کر نیر الزماں کو تنگ کر رہی ہے۔ خوش اور بشاش۔
اُس کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟

اور وہ اجنبی، بھولی لڑکی، جوان پُر شور، دریاؤں، طوفانی راستوں کے اس پار، دیناج پور کے ایک دور افتادہ گاؤں میں اجنبیوں کے اس قافلے کی، ایک اجنبی انسان کی آمد کی منتظر ہے۔ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟
دھان کے پودوں کی آواز سنو۔ جو ہرے سناٹے میں آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔

## ۱۹

# بھیرَبی کا خواب

کس کی دلہن ہے یہ، بیکراں، بھیانک رات نے پوچھا۔ جو بھیرَبی کی طرح بال بکھرائے، پریشان سوتی ہے؟
بوندوں کی لڑیاں سری سدن کے باغ پر ٹپ ٹپ گرتی سُرخ مٹی میں جذب ہو گئیں۔ عمارت کے ایک کمرے میں، کھڑکی کے نیچے، پلنگ پر وہ بے چینی سے کروٹ بدلتی ہے۔ سارا باغ جگنوؤں سے جگمگا رہا ہے۔ وہ بھوج پتروں کے ڈھیر پر چڑھی بیٹھی ہے۔ 'میں جگنوؤں کی روشنی میں زعفران سے تمہیں خط لکھوں گی اور پون دوت کے ذریعے بھجواؤں گی'۔ جس طرح ہم اپنے الفاظ ہوا کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اگر نہ بولیں تو کیا ہو۔؟ جگنو اور بھوج پتر اچانک غائب ہو گئے۔ گورکھ املی کا ٹیڑھی میڑھی شاخوں والا خوفناک درخت اس کے سر پر جھومے جا رہا ہے۔ بھوانی کا بوڑھا مندر جڑ سے اکھڑ گیا۔ اس سال بڑا بھاری سائیکلون آیا تھا بھائی۔ کتب خانے میں دروازے نہیں ہیں۔ صرف دیواریں۔ صرف دیواریں

کوئی راستہ نکلنے کا نہیں۔ کھڑ کھڑ کھڑ ـــــ بھوج پتروں کے نیچے سے وہ نمودار ہوتا ہے۔ بڑی چالاکی سے چوہے کی طرح چلتا وہ سامنے آگیا۔ بھکشو۔ سر منڈا۔ عینک لگائے۔ کھڑاؤں پہنے۔ کھٹ کھٹ کھٹ کھیسیں نکال کر وہ ایک بھوج پتر اس کے حوالے کر دیتا ہے۔

(یہ بھکشو چائنا بھون میں پڑھاتا ہے) وہ غور سے پڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بڑی عجیب زبان ہے۔ سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ فائنل امتحان اسی زبان میں ہوگا۔ بجلی کڑکی۔

بھکشو بھی غائب۔ وہ چائنا بھون کے برآمدے میں کان لگا کر سن رہی ہے۔ "میری آواز تمھاری کڑک۔ میرے آنسو تمھاری مسلسل جھڑی۔ میرے من کی آگ تمھاری بجلی۔ میرے دل میں اس کا چہرہ ہے اور تمھاری آغوش میں چاند۔ میں اور تم یکساں ہیں۔ بھائی بادل۔ پھر مجھے کیوں تنگ کرتے ہو"۔

بڑا مدھم، سہانا اجالا سارے میں پھیل گیا۔ پھول بن میں چمپک کے شگوفوں کا چراغاں سا ہو رہا ہے۔ ندی کے کنارے کنارے چلتا وہ خراماں خراماں اس کی سمت آرہا ہے۔

وہ چکوروں کا محبوب۔ لمبے بالوں، کالی آنکھوں والا، ہاتھ میں کنول سنبھالے، انگلیوں سے امرت گراتا۔ اولوکیتیشور۔ پدم پانی۔

وہ کلا بھون کے باغ میں موجود ہے۔ مسرور، محفوظ، نندلال بوس برآمدے میں ترکی ٹوپی اوڑھے نقرائی پیچوان گڑگڑا رہے ہیں۔ ہر طرف تصویریں ہی تصویریں۔ جوان گھاس پر چلتا اشوک کے پھولوں کا تاج پہنے وہ اس کی جانب آرہا ہے۔ لوک ناتھ۔ لوکیشور۔

وہ خوشی سے کھلکھلا کر ہنستی ہے۔ وہ پین کی طرح منہ اٹھا کر بانسری بجاتا ہے۔ وہ چاندی سے بنا۔ سیاہ بادلوں سے نکلتا سورج۔ امیتابھ۔

بیکراں نور۔ بیکراں رحم۔ بیکراں محبت۔

بالکل قریب آکر اس نے عینک اتار لی اور گھور کر اُسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر آنکھیں ہی نہیں تھیں۔ آنکھ، ناک، منہ۔ کچھ بھی نہیں۔ خالی چہرہ۔ بالکل خالی چہرہ ـــــ انڈے جیسا ـــــ اس چہرے کو جیسا چاہو بنا لو۔ بھکشو نے غرا کر کہا۔ وہ دہل کر چیخی۔

یہ لو۔ بھکشو نے کہا۔ اور خالی ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

یہ کیا ہے؟

دودھ کا گلاس۔ جاؤ جا کر پرستش کرو۔ کیسی کمیونسٹ ہمدرد ہو۔ پوجا پاٹ نہیں کرتیں کہیں بیٹی تم کمیونسٹ تو نہیں ہو گئیں؟

کس کی پرستش؟

اپنی ـــــ ہم سب اپنی اپنی پرستش کرتے ہیں۔

مگر آج تو ناگ پنچمی ہے۔

ہاں۔

کون سی؟ کس صدی کی ناگ پنچمی ــــ؟

ازل سے ابد تک۔ محض ایک لمحہ ــــ وہ انگلی اٹھا کر مسخروں کی طرح ناچنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ خالی ہاتھ اس طرح اُٹھائے گویا انجلی تھامے ہو۔ وزنی قدموں سے پھر گورکھ اٹلی کی سمت چلی۔ جنگل کا جنگل جگمگا رہا ہے۔

او جگمگانے والو ــــ جاگو ــــ تھرڈ ایر کی لڑکیوں نے قطار میں کھڑے ہو پڑھنا شروع کیا۔ وہ حسب معمول ڈائرکٹ کر رہی ہے۔

او جگمگانے والو ــــ چبوترے پر کھڑی دبلی پتلی اور نوعمر اور حسین سروجنی دیبی کی آواز۔

جاگو ــــ کہ ہم گپھاؤں اور ٹیلوں اور مقدس برگد کی جڑوں میں چھپے تمھارے سندر ڈھونڈھتے آئے ہیں۔ ابدی خرد کے مراقبے سے اپنے پھن اٹھاؤ۔ جاگو۔ بانسری کی دُھن پر وجد کرو۔ ہم تمھارے لئے دودھ اور باجرہ اور جنگلی انجیر اور سنہرے شہد کی انجلی لائے ہیں۔ ہم نے عود و لوبان سے فضا کو متبرک کیا ہے۔ ہماری لاچار زندگیوں اور باصبر مشقت اور ہماری نیندوں اور ہماری مضطرب تمناؤں کی حفاظت کرو۔ ندی کی طرح تیز اور شبنم کی طرح خاموش، بجلی کی طرح سُبک۔ اور آفتاب کی طرف درخشاں ــــ عارفو ــــ تم کہ اس قدیم خاموشی کی علامت ہو۔ جس میں موت و حیات، رنج و غم ایک ہو ــــ اسٹیج دھڑام سے گر پڑی۔ گورکھ اٹلی کی شاخیں زور زور سے سرسرانے لگیں ــــ سینکڑوں برس پرانا، بوڑھا جوگی درخت اُس کے سر پر کھڑکھڑا رہا ہے ــــ پرتیوں کا بسیرا ــــ "پچھلے آٹھ سو برس کی ہماری تہذیبی تخلیق ــــ" اداس روحوں کا مسکن ــــ بوڑھے مندر کے کنارے مندر کا اندھا پروہت (یہی ہے، اس نے میرا بیاہ کرایا تھا) منڈیر پر کھڑا دہاڑ رہا ہے۔ شری رام اور سیتا مہارانی۔ بندھیاچل کے بنوں میں کھو گئے۔ ہری ہر ــــ ہری ہر ــــ ہری ہر ــــ دُہائی ہے۔ دُہائی ــــ گورکھ اٹلی نے زور کا ہنکارا بھرا۔ اس کی ڈراونی چھاؤں میں کپالی بیٹھے ہیں۔ کپالیوں کی آل انڈیا کانفرنس۔ ڈائس پر تنترک عملیات کا عود سُلگ رہا ہے۔ اَن گنت کپالی۔ ایک کپالی کھڑکی میں سے اندر کود آیا۔ لو دم لگاؤ۔ نو۔ تھینک یو۔ میں نے آج تک سگریٹ بھی نہیں چکھا۔ سگریٹ پیا جاتا ہے۔ چکھا نہیں جاتا۔ بیوقوف۔ لو ایک سُوٹا۔ لگے دم۔ مٹے غم۔ معاف کیجئے گا آپ مداری ہیں یا دیشنو؟ الکھ نرنجن۔ آمار پرانیر آرام مونیر آنند۔ آتمار ہتیا۔ اکسکیوزمی۔ آپ کی داڑھی تو بالکل پٹ سن کی معلوم ہوتی ہے۔ ہاہاہا۔ نقلی سادھو۔ نقلی راجہ۔ نقلی سنگھاسن۔ آآآ۔ سب جگ نقلی۔ سب جگ دھوکا۔ ساری دنیا گورکھ دھندا۔ الجھن میں لے کام سمجھ سے۔ کھُل جائے گا پھندا۔ ہارمونیم خوب زور سے بج رہا ہے۔

مائی نیم مس ہری متی۔ سارے کپالی کھوپڑیوں کی مالائیں پہنے، ترنگے، ہرے اور لال پھریرے اڑاتے گھنٹیاں بجاتے، انڈر گراؤنڈ مٹھ میں اتر گئے۔ تم نے آنند مٹھ پڑھا ہے؟ ترکی ٹوپی والا جوکر۔

چلتی چلتی وہ دریا پر آگئی۔ سامنے سُرخ لہروں پر ہری ناؤ بنا پتوار بہے جاتی ہے۔ ناؤ پر انگریزی میں لکھا ہے۔ "ایس۔ ایس۔ علادل"۔ بھئی واہ۔ ناؤ بہے جا رہی ہے۔ بے آواز۔ منظر میں سے ساؤنڈ غائب۔ بھیانک۔ وہ خود کشتی میں بیٹھی ہے۔ اچانک دھماکہ۔ اب دِنگ میں سے لالن شاہ گاتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ لالن شاہ جادوگر۔ سینکڑوں برس ہوئے مر گیا۔ پھر بھی گا رہا ہے۔ دھندلی شکل ہیولا۔ کتنا ہی غور سے دیکھو۔ صاف نظر نہیں آئے گا۔ میں عشق ہوں۔ ناقابلِ فہم۔ غیر مرئی۔ گرفت سے باہر۔ لالن شاہ ڈائیلاگ بول رہا ہے۔ اس کے دھواں ایسے ہاتھ میں کدم کا پتہ ہے۔ دل کی شکل والا کدم کا پتہ۔ کیا گاتا ہے۔ لالن شاہ کہ میرے پاس شیشے کا ایک گھر ہے۔ اس میں میرا پڑوسی رہتا ہے۔ اسے میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میرے اور اس کے درمیان گہرا دریا حائل ہے۔ اس دریا کو کیسے پار کروں ـــــ کاش وہ خود ہی میرے پاس آجائے۔

او بھائی رے۔

اب وہ دوسری طرف کروٹ بدلتی ہے۔ سامنے گھڑیال ہی گھڑیال۔ گھڑیالوں کی فوج۔ ہر گھڑیال کی پشت پر ایک ایک سیلولائیڈ کا کام دیو سوار[1] ہے۔ جاپانی کام دیو۔ بوگس۔

تاریک طویل رنگ برنگی سُرنگ۔ اندھکار۔ سمدر۔ میں اس دریا میں ڈوب جاؤں تو مجھے جل سمادھی دینا۔ ہے بن مالی[2]۔

پتوار بغیر ناؤ کے بہہ گئی۔ ناؤ بغیر ندی کے رواں ہے۔ چراغ بنا لو کے روشن ہے۔ لو بنا چراغ کے جل رہی ہے۔

جنگل کا جنگل چل رہا ہے۔ ندی کے مانند بہتا ہے۔ اور ندی ساکت ہے اور انسان درختوں کی طرح جمے کھڑے ہیں۔

ہاتھی۔ سیاہ ہاتھیوں کی قطار۔ مٹی کا کالا ہاتھی، سُرخ تالاب کے کنارے کھڑا احمقوں کی طرح کان ہلا رہا ہے۔ دھماکہ۔ دِنگ میں چھپا لالن شاہ پھُس پھُسی آواز میں (گاتے گاتے اس کا گلا بیٹھ گیا) کہتا ہے۔ جہاں آرا رات کو اسی تالاب میں ڈوب کر مر گئی۔ اب لالن شاہ انگریزی میں اناؤنس کر رہا ہے۔ نواب زادی جہاں آرا بیگم کو قتل کر دیا گیا۔ مرڈر اِن کولڈ بلڈ ـــــ زندہ ہے مگر جیتے جی مر گئی۔ ایک اور دھماکہ ـــــ رعد کی کڑک۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ باہر زور سے بجلی چمکی۔ بادل گرج رہے تھے۔ اُس کا دل بُری طرح دھڑک

[1] گھڑیال کام دیو کی سواری ہے۔ [2] کرشن جی

رہا تھا۔ اس نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ دہشت سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ اس کی روم میٹ آبانی دوسری کھڑکی کے نیچے اپنے پلنگ پر بے خبر سو رہی تھی۔ وہ چند منٹ تک ساکت و صامت بیٹھی رہی۔ باہر تاریک آسمان پر بادل پھٹے اور چاند کی جھلک دکھائی دی۔ پھر چاند کھڑکی میں سے اس طرح جھانکنے لگا۔ جیسے بادلوں میں سے پھسل کر کمرے میں آن گرے گا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید چاند مجھے کوئی جواب دے۔ رات کوئی فیصلہ سنائے۔ اس نے رات کی گرج دار سمفنی پر کان لگا دیئے۔ نہیں۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔ نہیں۔ میں اپنے جسم، اپنے دماغ، اپنے پریشان خوابوں میں مقید ہوں۔

روانگی کے وقت اس نے باگیرہاٹ پر کہا تھا۔ شوکتی۔ تم اکیلے میں زندگی سے ڈرنا ہرگز نہیں۔ شوکتی یاد رکھو۔ مرد موت کا مقابلہ موت سے۔ مگر عورت موت کا مقابلہ زندگی سے کرتی ہے۔

ہاہاہا ــــ وہ دل میں شدید تلخی سے ہنسی۔ اور پلنگ پر سر جھکائے بیٹھی اپنے داہنے پاؤں کے انگوٹھے کو غور سے دیکھا کی۔ زندگی! اس نے سوچا۔ زندگی! تو نے میرے ساتھ یہ کیا کیا۔؟

وہ صبح ڈھاکے سے شانتی نکیتن واپس پہنچی ہے سوچتے سوچتے اس کا دماغ ماؤف ہو چکا ہے۔ رات کو اسے بھیانک سپنے دکھلائی دیتے ہیں۔ دن میں وہ گم سم رہتی ہے۔ ایسا میرے ساتھ کیوں ہوا؟

چار سو بیس۔ دھوکے باز۔ ٹھگ۔

میری بڑی خوفناک غلطی یہ تھی۔ اس نے بال سمیٹتے ہوئے خود سے کہا کہ قومی اور بین الاقوامی جدوجہد کو نظر انداز کر کے میں ایک ذاتی جذباتی جھمیلے میں پڑ گئی۔

شرمناک۔ افسوس ناک۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں پونچھیں اور دبے پاؤں اٹھی کھڑکی میں رکھی صراحی میں سے پانی انڈیل کر پیا۔ گلاس صراحی پر واپس رکھ کر باہر جھانکا۔ چاند بادلوں میں کہیں بہہ چکا تھا۔

ساری عمر بات نہیں کروں گی۔ پہچان کے نہیں دوں گی۔ دھوکے باز۔

دھوکے باز ــــ باغ بہت سنسان ہے۔ رات چیتے کی آنکھ کی طرح مجھے گھور رہی ہے۔ عمر بھر بات نہیں کروں گی۔ ارے آپ کی اصلیت تو مجھے اب معلوم ہوئی۔ بچہ جی۔ کردک۔

برآمدے میں مدھم بلب روشن تھا۔ مرے ہوئے برساتی پتنگوں کا مختصر سا ڈھیر بلب کے عین نیچے فرش پر پڑا تھا۔ برآمدے کے باہر کرشن چوڑا کی ڈالیاں ٹھنڈی ہوا میں سرسرا رہی تھیں مینڈک خاموش ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی جھینگر چلا اٹھتا۔

اسے ایک دم سردی سی لگی۔ وہ کھڑکی میں سے ہٹ آئی۔ نیم تاریکی میں ہاتھ بڑھا کر سرہانے کی میز پر رکھا ہوا اٹیچی کیس کھولا۔ اور ٹٹول ٹٹول کر ایک مٹی کا ہاتھی نکالا۔ ہاتھی تکیے پر رکھ کر اسے بڑی بہادری اور دھیان سے دیکھنے لگی۔ چھوٹا سا بے چارا سنجرا سرخ اور زرد نقش و نگار والا مٹی کا ہاتھی۔

ابوالقاسم کی آمد کے بعد وہ مولوی ابوالہاشم کے کہے پر کیا جھٹ پٹ کشتی سے اتر آئی تھی ایک ایک بات بڑی تفصیل سے یاد ہے۔ ایک ایک بات۔ اس رات وہ اور ریحان ٹہلتے ہوئے ایک بستی کی طرف گئے تھے تو وہاں ـــــ وہاں کمہار کی دوکان پر مٹی کے کھلونوں کی قطار میں سجا یہ ہاتھی کتنا کیوٹ لگا تھا۔ وہ ٹھٹھک کر اسے دیکھنے لگی۔ تو ریحان نے خرید کر اسے دیتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ جب تم بہت دکھی ہو اسے الہ دین کے چراغ کی طرح گھسنا۔ میں فوراً آجاؤں گا۔ سنبھال کر رکھنا اسے تبرک کی طرح۔

اور ریحان نے کہا تھا۔ عاشق۔ بچے۔ وحشی۔ یہ سب فطرت سے بے حد قریب ہوتے ہیں اور تصنع اور مہذب ریاکاری کے پردوں میں اپنے اصل جذبات نہیں چھپا سکتے۔ اور ان سب کو ٹوٹم، منتروں اور تعویذوں کی ضرورت بھی رہتی ہے۔ بچے اپنا پسندیدہ کھلونا سرہانے رکھ کر سوتے ہیں۔ وحشی تعویذ پہنتے ہیں۔ عاشق بھی اسی قسم کی احمقانہ حرکت کرتے ہیں۔ پرانے خطوط، پرانی تصویریں، نشانیاں، یادگاریں۔ محبت کرنے والوں کے ٹوٹم اور تعویز ہیں۔

لہٰذا شوکتی! مولوی صاحب کے جھونپڑے کی طرف آتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ تم ایک چھوٹی سی بچی ہو۔ تمھیں حفاظت کی ضرورت ہے۔ میں تمھارا تعویذ ہوں، جو تمھیں ہر خطرے پر دکھ سے بچائے گا۔ میں کہ ایک کپالی بیراگی ہوں۔ قوم کو مایا جال سے نکالنے کے لئے تپ کرنے والا مٹھ دھاری گوسائیں۔ تم میری شوکتی ہو۔

ہر علامت۔ ہر تصور بے حد بامعنی ہے۔ پیاری بچی ـــــ پھر اس نے بڑی گمبھیر آواز میں کہا تھا۔ تمھارا یہاں آنا بے حد خطرناک بات تھی۔ مگر میں نے مجرمانہ بے احتیاطی سے کام لے کر تم کو یہاں بلایا۔ کیونکہ مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں نے اگر تم کو جلد از جلد نہ دیکھا تو واقعی مر جاؤں گا۔ تم میرے اس جرم کا باعث ہو۔ لیکن چونکہ تم میرا طلسم ہو۔ اس لئے مجھے معلوم ہے کہ کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔

شاید میں بے حد کمزور انسان ہوں۔

بے احتیاطی ـــــ؟ اس نے دفعتاً بے انتہا سراسیمہ ہو کر پوچھا تھا۔

ہاں کچھ عرصہ سے بڑی فاش غلطیوں کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر جب پہلے روز تم اُدما سے وود ڈلینڈز میں ملیں تو ان کو تمھیں ہرگز یہ نہ بتانا چاہئے تھا کہ نورالرحمٰن میاں دراصل میں ہی تھا۔ اگر تم کو پکڑ کر ایذا پہنچائی جاتی اور ـــــ

اوہ نو ـــــ اس نے دہل کر کہا۔

تم صرف سریندر اور اونکل سے واقف ہو اور وہ بھی کچھ نہیں جانتے۔ اُدما رائے بھی کچھ نہیں جانتیں۔

دفعتاً وہ اسے بے حد خوفناک نظر آیا۔ راکھشس۔ پاتال میں رہنے والا ناگ دیوتا ـــــ راسپوٹین کا ایسا جادوگر۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ اندھیرے سندر بن میں مہذب دنیا سے سینکڑوں میل دور اس پُراسرار اجنبی کے ساتھ موجود تھی۔ نوعمری میں انسان ایسا DARE DEVIL کیوں ہو جاتا ہے۔ اب کیا ہوگا؟ پولس اور تھرڈ ڈگری۔

اچانک وہ ہنسا۔ اور کہنے لگا۔ چنانچہ شوکتی ـــــ میں تم کو ہیرے جواہرات تو تحفے میں اور نشانی کے طور پر دے نہیں سکتا۔ تم مٹی کے اس حقیر کھلونے کو ہی احتیاط سے رکھنا۔ یہ تم کو ہر آفت سے بچائے گا۔

دیپالی ہاتھی کو تکتی رہی۔ پرانے خط۔ تصویریں۔ نشانیاں۔ محبت کرنے والوں کے ٹوٹم ہیں۔ اس نے غم و غصے سے ریحان کے الفاظ دل میں دہرائے۔ بید کی ایک صندوقچی میں رکھی ہوئی ایک پرانی تصویر بھی تو ٹوٹم ہے۔ تم اسے بھول گئے۔

دوسری رات وہ تاریک دریا پر برستی بارش میں باگھیر ہاٹ کی سمت روانہ ہو گئے تھے۔ اس، پہلے روز کے بعد سے ریحان نے شیو نہیں کیا تھا۔ بال بڑھا لئے تھے۔ کھلنا کے داڑھی دار مچھیرے کا بھیس بدل کر وہ گھپ اندھیری رات کے سمندر میں ایک بار پھر غائب ہو گیا۔ اسی طرح اندھیری راتوں میں سفر کرتا وہ کلکتے پہنچا ہوگا یا جہاں کہیں بھی پہنچا ہو۔ اب اسے معلوم ہو چکا تھا۔ اب تک جو کچھ بھی وہ جانتی تھی انڈر گراؤنڈ کے اصل معاملات اس سے بالکل مختلف تھے۔ ایسی پُرخطر زندگی۔ کون کس پر بھروسہ کرے گا۔؟

کیا تمہاری آئیڈیالوجی بھی کہیں ایک اور ٹوٹم تو نہیں؟

اس نے ہاتھی تکئے کے نیچے سرکا دیا۔ اور لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد اسے نیند آ گئی۔

عجیب عجیب شکلوں والے آدمی گھاٹ پر پھر آن کھڑے ہوئے۔ ایسے انسان، جن کے چہرے ہی نہیں ہیں۔ دریا پر براتیوں سے لدے اسٹیمر بھونپو بجا رہے تھے۔

پالکی چوَلے ـــــ پالکی چوَلے ہو ـــــ ہو ـــــ قدموں کی تال کے ساتھ گاتے اگیا بیتال کہاروں نے پالکی لا کر گھاس پر پٹخ دی۔

پالکی خالی ہے۔

جہاں آرا سامنے کھڑی ہے۔

اسٹیمر بھونپو بجا رہا ہے۔ اسٹیمر چھٹنے والا ہے۔ اسٹیمر کا نام "عمر رواں" اندھیرے میں فاسفورس کی طرح چمکتا ہے۔ "عمر رواں" کیسا بھیانک نام ہے۔ "عمرِ رواں" نام ایک دم چمک کر غائب ہو گیا۔ اسٹیمر نے چلنا شروع کیا۔ جہاں آرا غائب ہو گئی۔ پالکی خالی رکھی ہے۔

رونا مسلسل رونا۔ رونے کی آواز ـــــ دور جاتے اسٹیمر کی سیٹی سے اونچی ہوگئی۔ تارا منڈل میں گونجنے لگی۔ دولہا ہاتھی پر بیٹھا ہے۔

صبح ہوگئی ـــــ سہانی، ابر آلود۔ آشاڑھ کی صبح دور تک پھیل گئی۔

باہر باغ میں سے اُڑیہ مالی کی چھوٹی بچّی کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ جہاں آرا تُو تو یقیناً یہاں تک میرا تعاقب نہیں کرسکتی۔

جہاں آرا۔ میری سکھی۔ میری بہن۔ میں نے تجھ سے تیرا آدمی چھینا ـــــ مجھے معلوم نہیں تھا آپا ـــــ اب نہیں چھینوں گی ـــــ واپس کردوں گی۔ مجھے معاف کردینا۔ اس انجانی غلطی کو معاف کردینا آپا۔

"ارے دیپالی ـــــ" ابانی نے غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ "صبح صبح رو کیوں رہی ہو۔ کیا ہوا؟ گھر پہ تو سب خیریت ہے؟ تم تو بالکل کسی بھیرَبی کی ایسی ہونق معلوم ہورہی ہو۔"

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا چہرہ اور تکیہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔

"سب خیریت ہے ابانی ـــــ" اس نے جلدی جلدی آنسو پونچھ کر ناک سنکتے اور بال سمیٹتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ اور ذرا آگے جُھک کر سنگھار میز کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ بھیرَبی ـــــ! بال بکھرائے شیو کی جوگن۔ !! "ہر علامت ہرا بیجری بے حد بامعنی ہے۔ پیاری بچّی۔" وشنو بیراگی کا بچّہ ـــــ ڈیم ـــــ ڈیم ـــــ ڈیم

اُس نے پلنگ سے پاؤں اتار کر چپّلیں اپنی طرف سرکائیں۔

زندگی کی ہر نئی صبح آفاقی رات کے اتھاہ سمندر کے کنارے ایک نیا اجنبی ساحل ہے جس پر ہم اپنے خوشگوار یا اذیت دہ خوابوں کی کشتی سے مسرور یا مغموم، بشاش یا خوفزدہ، اُترتے ہیں۔

نیند کی نوکا رات کے دریا پر ساری زندگی بہتی رہتی ہے۔ ہم اپنی عمر عزیز کے کئی برس بغیر پتوار کی اس نوکا میں گزار دیتے ہیں۔ عمرِ رواں کی ہر نئی صبح جب ہم جاگتے ہیں۔ ہمارے خوابوں کی نوکا ایک دم غائب ہوجاتی ہے اور دوسری رات تک کے لئے ہماری منتظر جاکر پھر اپنے ساحل سے لگ جاتی ہے۔

نیند کی پُرسکون یا طوفانی پدما پر خوابیدہ انسانوں کے سپنوں کی اَن گنت نوکائیں رواں ہیں۔ ایک دوسرے کے پاس سے گذر جاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ڈوب جاتی ہیں یا کبھی کبھی دو نوکائیں اکٹھی گھاٹ کی سمت بڑھتی ہیں جہاں مقدّر کی زینب بی بی اپنے کالے سوکھے مضبوط ہاتھوں میں سُرخ

ساری کا بنڈل سنبھالے دلہن کی منتظر ہے۔

چپلیں پیروں میں ڈال کر اُس نے اپنی رسٹ واچ اٹھانے کے لئے تکیہ سرکایا اور تب اس کی نظر مٹی کے ہاتھی پر پڑی۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ ہاتھی کو اٹھا کر کھڑکی میں گئی۔ چند لمحوں تک ٹھٹھکی رہی۔ پھر ایک دم بڑے زور سے اسے باہر پھینک دیا۔ پل کے پل میں وہ بے چارا کھڑکی کے نیچے اُگی ہوئی برساتی گھاس میں غائب ہوگیا۔ ہاتھی ڈباؤ گھاس۔ اس نے مسکرا کر دل میں کہا۔ اور باہیں پھیلائیں۔ اب میں آزاد ہوں۔ میں ہر جادو ٹونے۔ ٹوٹم، ٹوٹکے، تعویز اور طلسم کے اثر سے مطلق آزاد ہوں۔ ہُرّے۔

خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے کی سعی کرتی ہوئی وہ برآمدے میں چلی گئی۔

## ۲۰

# ہرے بنگال کا "آنند کانن"

پاٹ کے پیلے پھول مرجھانے لگے۔ کھیتوں میں درانتیاں چل رہی ہیں۔ گٹھے پانی میں ڈبو دیئے گئے۔ کمر کمر پانی میں کھڑے کسان ریشہ علیحدہ کرنے میں جُٹے ہیں۔ یہ ریشہ دھویا اور سکھایا جائے گا۔ جھونپڑوں میں چرخے اور کرگھے چلیں گے۔

بنگال کے کسان نے اس ریشے کی خاطر سال بھر اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ بارش میں بھیگ کر دھوپ میں جل کر یہ شاندار فصل تیار کی ہے۔ کیچڑ اور بدبو کے سمندر میں ڈوب کر سونا نکالا ہے۔

اب یہ "طلائی ریشہ" کارگو کے مہیب فولادی جہازوں پر لد کر طویل دریاؤں پر سے گذرتا جُوٹ اسٹیشنوں پر پہنچے گا۔ چاند پور اور مداری پور اور نرائن گنج میں اتارا جائے گا۔ کلکتے کے تاریک کارخانے اور اسکاٹ لینڈ کے جگمگاتے بینک بنگال کے اس سنہرے دھن کی منزل ہیں۔

پاٹ کے سڑتے سڑتے برکھا رت بھی بیت چلی۔ گھاٹ اور گلیاں دو تارے کی جھنکار سے گونج رہی ہیں۔ سارے میں دھان کے سرسبز پودے لہلہاتے ہیں۔ چوپال میں مُرشدی گان کی محفلیں جمیں۔ شیخ مدن باؤل اور دُرگائی فقیر اور پگلا کنائی — گاؤں کے نٹ مندر سے کھول اور کرتال کی آواز بلند ہوئی۔ رادھا، کرشنا۔ رادھا کرشنا۔ رادھا کرشنا۔ رادھا کرشنا۔

چنڈی داس کی رادھا۔ رام پرشاد کی کالی۔ درگائی فقیر کا اللہ۔ اللہ رے۔ اللہ رے۔ اللہ رے۔

"بادل بوڑھے ہو گئے۔ رات نے چاند نیک شگون کے گھڑے کی طرح آسمان کے آنگن میں رکھ دیا۔ بگلوں کی پرواز جھیلوں میں اسی طرح منعکس ہے جیسے اَن گنت سفید کنول کھل جائیں۔ امیروں کے ہاں بے تماشہ کھانے والے برہمنوں کو اب گرمی محسوس ہو رہی ہے"۔ گاؤں کے کبی نے کہا۔

پھر اشین کی تیز دھوپ پانیوں پر پھیلی۔ سیندور ایسے سُرخ سورج کی گرمی نے نازک بدن بگلوں کو دکھی کیا۔ نرسلوں میں چہکنے والے پرند اور پن ککڑیاں اداس ہوئیں۔ ایکھ پک گئی۔ اب ہیبت ناک دریا اپنی پرانی رفتار پر واپس آ رہے ہیں۔ سیلاب اتر گیا۔ درخت سطح آب سے نمودار ہوئے ٹیلوں پر بنے جھونپڑے ننھے منے زمردیں جزیروں کی طرح پانی میں کھڑے ہیں۔ ہر طرف ڈونگیاں چل رہی ہیں۔ ریت کی لہروں پر راج ہنس کے پنجوں کے نشان پڑے ہیں۔ زرخیز بھیگی دھرتی پر نئی فصلیں بوئی جاتی ہیں۔ جھونپڑوں کی مرمت کی جا رہی ہے۔ دُرگا پوجا کے لئے منڈپ اور بازار سج گئے۔ سارا دیس سنگیت سے گونج رہا ہے کہ درگا میکے آنے والی ہے۔ بیاہی بیٹی کے سواگت کے لئے گھر گھر تیاری کی گئی ہے۔ ہر ہندو گرہستن دُرگا کی ماں اور ہر گرہست گری راج ہے۔ گیتوں میں دُرگا کی ماں نے کہا۔ اُوما کو میکے کب بلاؤ گے گری راج؟ جاڑے نکلے، برسات بیتی ـــــ خزاں آ گئی۔ مگر گوری اب تک نہیں آئی۔ اُسے تم نے کیسے خبطی سنیاسی کے پلے باندھ دیا۔ اس کا تو رنگ بھی کالا پڑ گیا ہو گا۔ جب کہتی ہوں گوری کو کیلاش سے لے آؤ تم ٹال جاتے ہو گری راج ـــــ میں اسے لینے کیسے جاؤں ـــــ میں تو لوک لاج سے مری جا رہی ہوں۔ ایسا بے ٹکا بھکاری داماد۔

شنکر نے بڑی مشکل سے چار دن کے لئے گوری کو میکے بھیجا ہے۔ ہر سُو تہوار کی دھوم مچی ہے۔ وجے گاتے ہوئے دیبی کو گھروں سے وداع کیا گیا۔ دیبی سجے ہوئے بجروں میں دریاؤں پر پہنچی پانی میں ڈبو دی گئی۔

کارتک میں رات کو آسمان کی شفاف جھیل پر چاند کا خزاں آلود کنول تیرا تیرا پھرتا ہے۔ کچی سڑک پر گنّے کے چھلکے بکھرے پڑے ہیں۔ ہوا میں زعفرانی گرد اڑتی ہے۔ جو کی بالیوں پر طوطے بیٹھے ہیں۔ تیز چاندنی میں مچھیروں نے اپنے جال دریاؤں پر پھیلا دیئے۔ ان کی بانسریوں کے سُروں نے پردیس جانے والے مسافروں کو مضطرب کیا۔ فضا میں آسمان کا دریا بہہ رہا ہے۔ اڑتے بگلے اور سفید بادل اس کے ریتیلے ساحل ہیں۔ اور ستارے اس کے نیلوفر۔ ندی کنارے۔ ٹھنڈی کیچڑ میں چرواہا سوتا ہے۔ گاؤں کے کبی نے کہا۔

اوگھران مہینے میں دھان تیار ہو گیا۔ منڈیوں میں قیامت کی چہل پہل ہے۔ گانے کے مقابلے کئے جا رہے ہیں۔ گھر گھر نئے چاول کی کھیر پک رہی ہے۔

چاول۔ چاول۔ چاول۔

"سنہرا بنگال" سال میں تین بار چاول اگاتا ہے اور بھوکا رہتا ہے۔

گلابی جاڑوں میں سپاری کے سڈول درخت گلابی سپاریوں سے لد گئے۔ پوش کی چاندنی راتوں میں مچھیروں کے جال روپہلی مچھلیوں سے بھرے۔ کٹی ہوئی فصلوں کی رکھوالی کے لئے مچان بنائے گئے۔ الاؤ کے گرد غازی گان کی مجلس جمی۔ جھونپڑوں میں پرال بچھائی جانے لگی۔ رات کو گیدڑ جنگلوں سے باہر نکل آئے۔ سرسوں پھولی۔ دریاؤں پر کشتی رانی کے مقابلے شروع ہوئے۔ ساری گان کے جوشیلے سُر آبی راستوں پر پھیل گئے۔

ماگھ کی طویل راتوں میں بندر سردی سے کانپ رہے ہیں۔ کتا چولھے کے پاس بیٹھا ہے۔ لڑکیاں چراغ کی روشنی میں سوزنیاں گاڑھنے میں مصروف ہیں۔ پردیسی مسافر گاؤں والوں سے پرال اور بھوسہ مانگ رہے ہیں۔ غریب بڑھیا آگ تاپتی اپنی کٹی سے باہر نہیں نکلتی۔ دھان کے گٹھوں کے پاس اُپلے جل رہے ہیں۔ آپس میں جھگڑتے مسافر چوپال کے الاؤ کے پاس اکڑوں بیٹھے ہیں۔ اماوس کے سرد اور تاریک اندھیرے میں چڑیلوں اور جادوگرنیوں نے اپنے اپنے چولھے جلا لئے۔

صبح کا دھندلکا سارے گاؤں پر چھا جاتا ہے۔ دور اُفق پر سُرخ پھول پہنے۔ گھونگھٹ کاڑھے اُوشا سسرال جاتی نظر آتی ہے۔ پھر پان کی سُرخی کی طرح لال۔ جنیو پہنے۔ تلک لگائے۔ کندھے پر لال انگوچھا ڈالے سُوریہ ٹھاکر برگد کے پیچھے سے جھانکتے ہیں۔ لو بھائی۔ وہ مالی اور سنار اور تیلی کے چھپروں تک پہنچ گئے۔ مالی کی لڑکیاں باغ میں پشپ انجلی کے پھول چنتی ہیں۔ تیلی کی لڑکی تالاب پر برتن مانجھتی ہے۔ صبح تڑکے سُوریہ ٹھاکر کی کرنیں بیل کی پیٹھ پر برستی ہیں۔ جو سرسبز چوراہے پر سرسوں کے پھولوں سے لدا آرام سے لیٹا ہے اور کہرا اس کی پلکوں پر جم گیا ہے۔ گڈریاں اور پیوند بھری رضائیاں اوڑھے یاتری گلیوں میں بیٹھے رادھا کرشن کے نغمے گا گا کر بستی والوں کو جگا رہے ہیں۔ کولھو چلنے لگے۔ گڑ کی بھیلیاں بنیوں کی دوکانوں پر آگئیں ـــــ گاؤں کے کبی نے کہا۔

اور اب جنگلوں میں پلاش کے پتے جھڑ رہے ہیں۔ بنوں میں شیر دھاڑتے ہیں۔ شیشم کے خنک چاند کے نیچے پہاڑی راستوں پر اور کِڈ کھلے ہیں۔ سرسوتی پوجا کے لئے مورتیاں گھڑ کر دھوپ میں سکھائی جا چکیں۔ سرسوں پک گئی۔

پھاگن میں بانس کے ہرے بھرے جھنڈوں میں سے گذرتی، شہد کی مکھیوں کو جلو میں لئے بہار آن پہنچی۔ دکھن کی سہانی ہوائیں چلیں۔ لڑکیوں نے بالوں میں کلیاں سجائیں۔ رنگین کشتیاں لے کر مانجھی دریاؤں پر نکلے۔ پشپ بنوں میں بھونرے گونجنے لگے۔

پھول بن میں آدھی رات کو آنا رے بھونرے۔ میں چاند کی بتی جلاؤں گی اور شبنم سے باتیں

کردوں گی۔ اور سپنوں کی پگڈنڈی پر چلتی تمھاری اور آؤں گی۔ بہت دھیرے سے آنا رے بھونرے۔ کہیں تمھارا گیت ختم نہ ہو جائے۔ میری نیند نہ ٹوٹ جائے۔ پھول اور ڈالیاں نہ جاگ اُٹھیں رے بھونرے۔ گاؤں کے کبی نے کہا۔

ہرجائی ہوا جنگل جنگل منڈلاتی پھر رہی ہے۔ چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھر چکے ہیں۔ رنگین ناؤ کا مانجھی اودی موجوں پر اپنی سبک کشتی کھیتا ہے۔ بل کھاتے دریا کی موڑ پر اسے سُرخ رنگ کا جھونپڑا نظر آیا۔ ندی کے کنارے ہری گھاس پر نیلی ساری سوکھتی ہے۔ شام کی پرچھائیوں میں چھپی کالی باڑی کی سمت سے پایل کی آواز آرہی ہے۔ جھمر جھمر کرتی وہ گھاٹ پر آکر اپنا رنگین گھڑا پانی میں ڈبو دیتی ہے۔ اس کی شکل کی ایک جھلک نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ سورج لہروں میں ڈوبتا جا رہا ہے اور میں اپنی ناؤ کھے رہا ہوں۔ بھٹیالی کے مغنی نے کہا۔

چیتروں کے شہد ایسے مہینے میں پلاش پھولوں سے لد گئے۔ گل مہر کی پتیاں جھڑنے لگیں جنگلوں میں زرد اور سرخ پتوں کے فرش بچھ گئے۔ آم کے کنجوں میں کوئل کوکی۔ طوطے کی چونچ ایسے سُرخ سورج ماما کا غصہ پل پل بڑھتا جا رہا ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کا ہنگامہ شباب پر آیا۔ کشتیوں کی مرمت کی گئی۔ میلے لگے۔ خلقِ خدا جاترا کے تماشوں سے محظوظ ہوئی۔ ندیوں اور جھیلوں پر بنسیاں اور جال سنبھالے دیہاتیوں کی بھیڑ جمع ہے۔ جگمگاتی مچھلیوں کے انبار ہر سو لگ گئے۔

بوئی شاک میں شیفالی مہکی اور مادھبی اور بکل۔ اشوک اور مہوے اور املتاس اور شیشم اور لاکھ کی شاخوں پر پھول کھلے۔ پاٹ کی نئی فصل بوئی جا رہی ہے۔ خوشگوار ہوائیں آندھیوں میں تبدیل ہونے لگیں۔

جوئی شٹو کی دھوپ میں تال اور پوکھر سوکھنے لگے۔ نرسلوں کے پرند اور بگلے اور دریائی باز پر پھیلا کر اڑتے جا رہے ہیں۔ خوفناک طوفان۔ تیز و تند جھکڑ۔ چھپر اڑ گئے۔ جھونپڑیاں گر گئیں۔ بادبان بکھر گئے۔ ہواؤں کی غارت گری۔ جھکڑ نے دھرتی پر پھلوں کی بارش کر دی۔ بازار اور ہاٹ آم سے پٹ گئے۔ اب جارل کھل چکے ہیں۔ اور چمپا اور رجنی گندھوں نے راتیں معطر کر دی ہیں۔ تباہ حال کسان پھر جھونپڑوں اور جالوں کی مرمت میں جٹ چکے ہیں۔ برسات کے انتظار میں نئے جال بنے جا رہے ہیں۔ شدید دھوپ وحشت۔ خشک سالی۔ اللہ میگھ دے۔ میگھ دے رے۔ اللہ میگھ دے۔ اللہ رے اللہ۔

تب بنگال کی کھاڑی سے آشاڑھ کے ورشا کالین بادلوں کے لشکر آگے بڑھنا شروع ہوئے۔ "کیتکی کے زرگل کا بھبوت مل کر، کھوپڑیوں کے بجائے بگلوں کی قطار کی مالا پہنے سیاہ بادلوں کا جوڑا باندھ کر، دھنک کی چھڑی اور بجلی کی جھنڈیوں والا عصا سنبھالے برہنوں کو ڈرانے کے لئے موسم نے

پھر جادوگر کا روپ دھارا۔ آسمان بارش کا تاریک درخت بن گیا۔ جس کی داڑھی زمین تلک آ رہی ہے۔ سانپوں کے بھوکے مور بنوں میں چلانے لگے۔ گلابی کیلوں سے لدا درخت اپنے پتوں کا چلو بنا کر بارش کا پانی پی رہا ہے۔ بید کے پھولوں سے مہکتی ندی جامن کے درختوں کے نیچے رواں ہے۔ مچھلی کے تعاقب میں بگلا رزاں پتوں کو پُر امید نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ مفلس کسان کی بیوی سر پر چٹائی اوڑھے، ہر طرف ٹپکتے جھونپڑے کا بچاؤ کرتی پھر رہی ہے۔ جنگلوں کے آدی واسی کانن دُرگا پوجا کے لئے درختوں کی جڑوں میں خون چھڑک کر بلوا کے پیالوں میں تاڑی پی رہے ہیں ـــــ گاؤں کے کبی نے کہا۔

دریا چڑھے۔ میگھنا اور برہم پُتر۔ پدما اور مدھومتی، بھیرب اور بھاگیرتی۔ شب بنشری، اور کرنا فلی۔ سُرما اور دھالیشوری ـــــ سرابن کے پانچویں دن ناگ پنچمی منائی گئی۔ جنگلوں میں ہاتھی چنگھاڑ رہے ہیں۔ ندیوں کے ساحل کیچڑ اور کائی اور کینچوؤں اور دلدل کی راجدھانی بن گئے۔ سانپ بلوں سے نکل آئے۔ اوجھوں کا کاروبار چمکا۔ چھتریاں لگائے لوگ جلدی جلدی گھاٹ پر اترتے ہیں۔ بانس کے پلوں پر سے گذر رہے ہیں۔ تیتریوں کی ایسی نازک کشتیوں کو طوفانی دریا نگل گئے۔ دریا گاؤں اپنے ساتھ بہا لے گئے۔ درخت جڑ سے اکھڑے۔ مویشی اور انسان غرقاب ہو گئے۔

"میری قسمت ہی خراب ہے۔ سیلاب میں سب کچھ بہہ گیا۔ اللہ تو نے دنیا بنائی۔ اور پھر مجھ سے میرا پاٹ، میرا دھان سب کچھ چھین لیا۔ میری قسمت میں کتنے دکھ ہیں رے اللہ۔ میں پاٹ بیچ کر تیرے لئے سونے کی نتھ لاؤں گا۔ میں نے اُس سے کہا تھا۔ پاٹ تو سیلاب میں بہہ گیا۔"

او۔ مانجھی رے کتنے نش۔ کتنے ڈھور ڈنگر طوفان کی بھینٹ چڑھے۔ اللہ رے۔ اللہ رے۔ اللہ رے۔

گاؤں کے کبی نے کہا

## (۲۱)

# اگست اندولن اور پیپلز وار

آشاڑھ۔ بھادرو۔ ۱۳۴۸ء[1]

کال کے گھٹا ٹوپ اندھیارے میں مناظر غیر مرئی تصاویر کی طرح روشن رہیں گے۔ کیونکہ ہر منظر

---

[1] بنگالی سن مطابق ۱۹۴۲ء

جو معدوم ہوا۔ باقی ہے۔ ان سارے گھروں، روشن کمروں کا تصور کرو جو لمحہ گذرنے کے باوجود، وقت میں شامل، موجود ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے لوگ، ٹیبلو گروپ۔ ان کی آوازیں۔

چندر کنج اندھیرا پڑا تھا، جب وہ تین اس کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔ وہ برآمدے میں آکر بیٹھک خانے کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ برآمدے کے سرے پر چادر میں سر منھ لپیٹے ایک داڑھی والا بوڑھا بے خبر پڑا سوتا ہے۔ اب نووارد برآمدے سے اتر کر گھاس میں سے گذرتے پچھواڑے ڈیوڑھی کی کنڈی بجا رہے ہیں۔

رسوئی گھر کی کھڑکی کھلتی ہے۔ گھاس پر روشنی کا راستہ سا بن گیا۔ کھڑکی میں سے کسی نے جھانکا۔

"دیپالی"۔

"ارے تم لوگ ——" دیپالی ذرا خشکی سے کہتی ہے مگر فوراً باہر آکر ڈیوڑھی کا دروازہ کھولتی ہے۔ وہ تینوں اس کے ساتھ پچھلے برآمدے میں آجاتے ہیں۔ دیپالی بیٹھک خانے کا دروازہ کھولتی ہے۔ جس میں شدید حبس طاری ہے۔

وہ تینوں برآمدے میں پڑے ہوئے تخت پر ٹک جاتے ہیں۔ محمود الحق تالی بجا کر ایک مچھر مارتا ہے۔ جیوتر موئے دتا نے سگریٹ سلگانے کے بعد ماچس کی خالی ڈبیا نشانہ باندھ کر سامنے حوض میں پھینک دی۔ روزی بنرجی تیوری پر بل ڈالے آنگن کے درختوں کو دیکھ رہی ہے۔ تینوں خاموش ہیں۔ دیپالی بھی خاموش ہے۔

"ادھر آؤ —— دیپالی"۔ روزی اچانک ذرا درشتی سے کہتی ہے۔ اور دیپالی کے آگے چلتی اس کے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

کمرے میں مچھر بھنبھنا رہے ہیں۔ دیپالی نے روشنی جلائی۔

"تمھارے بابا سو رہے ہیں۔؟" روزی کا سوال۔

"بابا اور پشی ماں فرید پور گئے ہیں۔ پشی ماں کے دیور کی لڑکی کی شادی ہے۔ اس میں بابا کی شرکت ضروری تھی۔ رات کو عبدالقادر برآمدے میں سوتے ہیں۔ کل یا پرسوں میں بھی چلی جاؤں گی۔ شادی اتوار کو ہے۔ کفو کفو بیمار پڑ گیا تھا اس لئے میں بابا کے ساتھ نہ جا سکی"۔ وہ پلنگ پر ٹک جاتی ہے روزی دروازہ بھیڑ دیتی ہے۔

باہر محمود الحق اور جیوتر موئے دتا چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ اچانک اندر سے روزی کی گرج دار آواز آتی ہے۔

"غدار ——"

محمود الحق تاسف سے سر ہلاتا ہے۔

اندر کمرے میں روزی بنرجی عین اسی جگہ کھڑی ہے جہاں آج سے ڈھائی سال قبل دیپالی نے اس سے حلف اٹھوایا تھا۔

"ٹوڈی"۔ روزی کی دوسری گرج۔

"پارٹی ڈائریکٹو"۔ دیپالی کا جوشیلا، برافروختہ، توضیحی لہجہ۔

"برٹش ایجنٹ ——" روزی کی پھنکار۔

"فاشسٹ ——" دیپالی کا ترکی بہ ترکی جواب۔

جیوتر موئے دتا اٹھ کر دروازے پر دستک دیتا ہے۔ آگ بگولہ روزی اور دیپالی باہر نکلتی ہیں۔ اچانک بارش شروع ہو جاتی ہے۔ ایک زوردار بوچھار نے سارا برآمدہ شرابور کر دیا۔ وہ چاروں بیٹھک خانے میں چلے جاتے ہیں۔ دیپالی بتی جلا کر کھڑکیاں کھولتی ہے۔ کرسیوں پر ٹک کر وہ چاروں زور شور کی بحث میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ غل سن کر کھوکھوا اپنے کمرے سے آنکھیں ملتا چھینکتا سلیپر گھسیٹتا بیٹھک خانے میں آتا ہے۔ وہ اب بڑا ہو چکا ہے۔ اور کالج میں پڑھتا ہے۔ وہ بھی تندہی سے تکرار میں شامل ہو گیا۔ اب یہ لوگ دہشت پسند شہدار کا ذکر کر رہے ہیں۔

دیپالی جلدی سے اٹھ کر باہر چلی جاتی ہے۔ آسمان پر زور سے بجلی چمکی۔ وہ چند لحظوں تک چپ چاپ کھڑی اندر جھانک کر اپنے چچا کی تصویر کو دیکھتی رہتی ہے۔ کالی گھٹا ہرے بھرے آنگن پر اتنی نیچے جھک آئی ہے۔ لگتا ہے اگر ہاتھ بڑھاؤ تو گرفت میں آجائے گی۔

"کنک لتا بروا —— کل شہید ہو گئی ——" اندر محمود الحق کہہ رہا ہے۔

"دلی کے امپیریل ہوٹل میں ریحان دا اور اُدمادی ڈنر اڑا رہے ہیں ——" جیوتر موئے دتا کہہ رہا ہے۔ دیپالی چونکی ہو گئی۔

"اُدمادی جو کلچرل فرنٹ پر کام کر رہی ہیں —— فاشزم کے خلاف —— ہاہاہا ——" روزی کا زہر خند۔

"سر پری توش رائے کی صاحبزادی؟" محمود الحق کا تجاہل عارفانہ۔

"ڈیڈی کو نائٹ ہڈ مل گئی —— ؟ ہُرّے"۔ جیوتر موئے دتا کا نعرہ۔

اب ساری آوازیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔

"ڈنر اڑاؤ ——"

"چرخہ چلاؤ ——"

"پیپلز وار میں مضمون لکھو ——"

"ہُرّے ــــ ہُرّے ــــ"

"ہم جاتے ہیں دیپالی ــــ" روزی کی آواز۔ "تمھیں یاد رکھیں گے۔ بائی بائی۔ گڈ نائٹ"۔

"گڈ نائٹ دیپالی"۔ محمود الحق اور جیوتر موئے دتّا کی آوازیں۔

وہ تینوں پھٹ سے کواڑ کھول کر سامنے کے برآمدے میں نکل جاتے ہیں۔ دیپالی پچھلے برآمدے میں دیوار سے لگی کھڑی ہے۔ اس کے پاؤں فرش پر جم سے گئے ہیں۔ وہ دینیش چندر سرکار کی تصویر پر نظر ڈال کر جلدی سے پلکیں جھکا لیتی ہے۔

رات کا اندھیرا اور بارش باہر ان تینوں کو نگل لیتی ہے۔

کھوکھو باہر کا دروازہ بند کر کے چھینکتا ہوا بیٹھک خانے میں واپس جاتا ہے۔ کیا یہ بھی، یہ تو اندولن میں شامل نہیں ہو گیا ــــ؟ وہ اسے کچھ بھی نہیں بتاتا۔ عجیب گھنّا، تلخ سا لڑکا بنتا جا رہا ہے۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔

باہر بارش کی پھوار سے عبدالقادر کا آدھا بستر بھیگ چکا ہے۔ وہ اس کے باوجود گہری نیند سو رہا ہے۔ جب بارش کا چھینٹا اس کے چہرے پر پڑتا ہے تو نیند میں بڑبڑاتے ہوئے وہ کروٹ بدل لیتا ہے۔

دور سے بم پھٹنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ یہ منظر بھی وقت میں تحلیل نہیں ہو گا۔

## ۲۲

# بدروہی

بھادرو کی موسلا دھار جھڑی کی وجہ سے روزی بنرجی نے اپنی سائیکل لِلی کاٹج کے ایک کونے میں مقفّل کر کے کھڑی کر دی ہے۔ وہ گھوڑا گاڑی میں گھر واپس پہنچتی ہے۔ گاڑی اسے مشن کمپاؤنڈ کے اتار کر برگد تلے جا کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے دونوں مرگلے گھوڑے ہنہنا ہنہنا کر کیچڑ میں اپنے سُم پٹخ رہے ہیں۔

روزی بنرجی بی۔ اے میں فرسٹ ڈویژن لانے کے بعد یونی ورسٹی میں ایم۔ اے کے لیے داخل ہو چکی ہے۔ ریورنڈ بنرجی اس سے بے حد خوش ہیں، تعلیم میں اس قدر منہمک دیکھ کر ان کو یقین ہے کہ وہ اپنی سیاسی حماقتیں ترک کر چکی ہے۔ وہ اس پر سخت نازاں ہیں۔ میری قابل، ہونہار، بے مثال بچّی، وہ اس کی پچھلی سال کی حماقت اور بدتمیزی بھی معاف کر چکے ہیں۔ اور سوچتے ہیں ایک اعلیٰ خاندان

عیسائی نوجوان کی تلاش از سرِ نو شروع کر دی جائے۔ اس مرتبہ وہ قطعی روزی کی پسند یا ناپسند کا خیال رکھیں گے۔ گو وہ اس سلسلے میں وہ اس سے ابھی کچھ نہیں کہتے، یوں بھی وہ اس قدر مصروف ہے۔ پوسٹ گریجویٹ پڑھائی کی وجہ سے دیر تک اسے یونی ورسٹی لائبریری میں رہنا پڑتا ہے۔ شام کو وہ سگن بگیچے جا کر اپنا ٹیوشن کرتی ہے (اس کی شاگرد یاسمین ہائی اسکول پاس کر کے اب ایف اے کے لئے اس سے انگریزی پڑھ رہی ہے) اس طرح روزی عموماً صبح کی گئی گئی رات پڑے بلی کاٹج واپس آتی ہے۔ یوں بھی اگر وہ دیر سے گھر لوٹے تو پادری بنرجی باز پرس نہیں کرتے۔ وہ اب بڑی ہو چکی ہے اور انھیں اس پر مکمل اعتماد ہے۔ زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ جنگ نے پرانے معاشرے کی بہت سی فصیلیں ڈھا دیں جنگ دقیانوسی اور پابند وضع ڈھاکے تک پر اثر انداز ہو چکی ہے۔ پادری بنرجی اپنے اتوار کے وعظوں میں کئی بار اس اخلاقی کجروی کی طرف بڑے دکھ سے اشارہ کر چکے ہیں، جو کلکتے جیسے گناہ گار شہر کی مانند شاید یہاں بھی عام ہو جائے۔

ٹھیکیداروں اور تاجروں کا نو دولتا طبقہ تیزی سے ابھر رہا ہے۔ لڑائی اس وقت بنگال کے عین پڑوس میں لڑی جا رہی ہے۔ کلکتے پر ہلکی سی بمباری ہو چکی ہے۔ جاپان نے مشرق میں برٹش ایمپائر کی بنیادیں ہلا دیں۔

۵ فروری کو سقوطِ سنگاپور کے بعد ریورنڈ بنرجی نے گرجا میں رحم کی دعا کے لئے اسپیشل سروس منعقد کی، کوائیر نے ROCK OF AGES ایسے جذبے سے گایا کہ بڑے بڑے شقی القلب قوم پرستوں کی (پادری بنرجی کے گلے میں اینٹی برٹش بھیڑوں کی اب کمی نہیں) آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور ——

O GOD OUR HELP IN AGES PAST

OUR HOPE IN YEARS TO COME

OUR SHELTER IN THE STORMY BLAST

AND OUR ETERNAL HOME.

روزی بچپن سے کوائیر میں گاتی آئی ہے۔ مگر اس روز غائب تھی۔ خیر

A THOUSAND YEARS IN THY SIGHT

ARE LIKE AN EVENING GONE

SHORT AS THE WATCH OF NIGHT

BEFORE THE MORNING SUN.

لیکن مارچ میں جاپانی بونے سارے برما پر قابض ہو گئے۔ رنگون سے بھاگ کر پیدل بنگال تک پہنچنے والے پناہ گزینوں کے حالات سن سن کر پادری بنرجی کا دل لرز گیا۔ ڈھاکے آنے والے اینگلو برمن،

ہندوستانی اور برمی عیسائی قافلوں کے لئے مشن کمپاؤنڈ میں خیمے لگائے گئے۔ پادری بنرجی دن رات مریضوں اور زخمیوں کی تیمارداری اور دل جوئی میں جُٹے رہے۔

اب بنگال کی چھاؤنیوں میں برطانوی اور امریکن فوجیوں کی ریل پیل ہے۔ جو برما کے جنگلوں میں پہنچتے ہی موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں۔ موت اور تباہ کاری کا بازار ساری دنیا میں گرم ہے۔

ریورنڈ بنرجی کو سوا چند امریکن مشنریوں کے، امریکنوں سے اب تک سابقہ نہیں پڑا تھا۔ مگر پچھلے دنوں انھوں نے اس اجنبی، بے تکی، انوکھی، ایمیچیور قوم کے عام افراد کو پہلی بار قریب سے دیکھا جب امریکن افسروں کی ٹولیاں جیپ گاڑیوں میں لد کر مشن کمپاؤنڈ آنے لگیں۔ انھوں نے بیش قیمت تحائف عیسائی غربا میں بانٹے، اور پادری بنرجی سے بڑی بے تکلفی اور بھائی چارے سے باتیں کیں۔ اس بھائی چارے کے ساتھ انگریزان کے ساتھ کبھی پیش نہیں آئے۔

ملایا میں برطانوی شکست کے بعد بنگال کے فوجی ہسپتال زخمیوں سے بھر چکے ہیں۔ ایک دن پادری بنرجی نے اسٹیٹسمین میں پڑھا کہ بہت سے ہندوستانی فوجیوں کو ملایا میں جاپانیوں نے جنگی قیدی بنالیا۔ سبھاش بابو کے متعلق بھی آئے دن خبریں چھپا کرتی ہیں۔

لیکن پادری بنرجی نے کسی اخبار میں یہ نہیں پڑھا کہ بنگال کے انقلابی، پرانے پاپی، اندھیری راتوں میں نئی سازشیں کر رہے ہیں۔

روزی پچھلے چند روز سے رات کو کافی دیر میں گھر آتی ہے۔ کیونکہ لائبریری مشن کمپاؤنڈ سے بہت فاصلے پر ہے۔

گھوڑا گاڑی سے اتر کر روزی سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے لیکن ریورنڈ اور مسز بنرجی حسبِ معمول کھانے کی میز پر صبر کے ساتھ اس کے منتظر تھے۔ آج اس نے بہت ہی زیادہ دیر لگادی۔

اپنے کمرے میں جاکر پانی سے بھیگی ساری تبدیل کرنے کے بعد وہ جلدی سے آکر میز پر بیٹھ گئی۔ مسز بنرجی فوراً کچن سے گرما گرم لوچیاں لے کر آئیں۔

ریورنڈ نے ماتھے پر انگلی رکھ کر گریس کی دعا کے لئے سر جھکایا۔ ان کی بیوی نے بھی سر جھکا دیا۔ روزی نے بھی۔ مگر کن انکھیوں سے اپنی رسٹ واچ دیکھتی رہی۔

"اے ہمارے آسمانی باپ۔ تو جس نے اپنے فضل و کرم سے یہ نعمتیں ہمارے سامنے رکھیں۔ تیری رحمت ہمیشہ اسی طرح اس میز پر اور اس گھر پر برستی رہے۔ آمین"۔ پادری بنرجی نے گریس پڑھ کر سر اٹھایا۔ ایستھر بنرجی نے لوچیاں پیش کیں۔ ریورنڈ نے لقمہ بناتے ہوئے روزی کو دیکھا جو کھانا شروع کرنے

کے بجائے ذرا بے چینی کے ساتھ چمچے سے کھیل رہی تھی۔

"کھانا کھاؤ بیٹی۔"

"جی ہاں پاپا۔"

اس نے جلدی جلدی کھانا شروع کیا۔ اور پانچ چھ نوالے نگلنے کے بعد کرسی سے اٹھنے لگی تو پادری بنرجی نے اسے ٹوکا۔

"کیا بات ہے؟"

"بھوک بالکل ہے ہی نہیں پاپا۔ یونی ورسٹی کینٹین میں بہت سے سموسے کھا لئے تھے۔"

"سارے ملک میں ان بدمعاشوں نے آگ لگا رکھی ہے۔ ایسے پُر آشوب زمانے میں تم اتنی رات گئے گھر لوٹی ہو۔ جوزف ہی کو ساتھ لے جایا کرو۔"

"نہیں پاپا۔ گرودیو کا انتقال ہو گیا ہے نا بے چارے کا۔ تو یونی ورسٹی میں ہم لوگ ان کی یاد میں ایک بڑا زبردست پروگرام کرنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں میٹنگ تھی۔ میٹنگ کے بعد آپ جانئے۔ حسب معمول اڈہ شروع ہو گیا۔"

"آج کل اڈے کا زمانہ نہیں ہے۔ ہر طرف گولیاں برس رہی ہیں، احتیاط رکھو۔"

"بہت اچھا پاپا۔" وہ کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

اچانک ریورنڈ بنرجی کو ایک خیال آیا۔ یونی ورسٹی تو اس بدبخت بغاوت کی وجہ سے بند ہو چکی ہے۔ یہ پھر مجھے دقیانوسی احمق بڈھا سمجھ کر بیوقوف تو نہیں بنا رہی؟

"روزی ادھر آؤ۔" انھوں نے کڑک کر کہا۔

وہ ٹھٹھک گئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" انھوں نے حکم دیا۔

وہ اطمینان سے واپس آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تم پھر ان ـــــ ان غداروں سے جا ملی ہو؟"

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"روزی۔" ریورنڈ بنرجی نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر ٹوٹی ہوئی آواز میں ایک بار پھر کہنا شروع کیا ـــــ "جس سرکار نے ہمیں جنگلی سے انسان بنایا۔ بت پرستی کے جہنمی راستے سے نکال کر۔"

"اوہ نو پاپا ـــــ نوٹ اگین ـــــ" روزی نے یک لخت جھنجھلا کر میز پر مکّہ مارا۔ پانی کا گلاس چھلک گیا۔ ایشور بنرجی نے جھاڑن اٹھا کر پھرتی سے میز صاف کرتے ہوئے اُسے ڈانٹا "روزی۔"

"سوری ماما۔" پھر وہ اپنے پاپا کی طرف مڑی۔

"پاپا۔ سنئے۔ سی۔ ایف اینڈریوز تو نہ صرف پکے عیسائی تھے بلکہ اصل نسل انگریز بھی تھے۔ اور آپ سے کہیں زیادہ بڑے پادری۔ آپ نے جا کر کبھی ان کو یہ سب کیوں نہ سمجھایا۔؟" اس نے نہایت ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئٹ انڈیا۔ کوئٹ انڈیا ——" پادری بنرجی طیش کے عالم میں کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ "احمقو۔ گدھو۔ انگریز چلا گیا تو ہم پھر اسی بربریت، بے ایمانی اور بے انصافی کے دور کی طرف لوٹ جائیں گے۔ جس سے انھوں نے ہمیں نجات دی"۔

روزی نے دوبارہ ذرا پریشانی سے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پادری بنرجی اب ایک کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھ کر نہایت برافروختہ آواز میں اس سے مخاطب تھے۔ "کوئٹ انڈیا کی بچی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی جھوٹی ڈینگیں پڑھ پڑھ کر پاگل ہو گئی۔ ہندوستان کی سنہری قدیم تہذیب! سنہری قدیم تہذیب یہ تھی کہ منتیں پوری کرنے کے لئے ہندو اپنے بچوں کو گھڑیالوں کے سامنے پھینک دیتے تھے۔ ہندو لڑکیوں کو مار ڈالا جاتا تھا۔ مسلمان ٹھگ مسافروں کا گلا گھونٹتے تھے۔ انڈین کلچر! انڈین کلچر! کتنے انگریز مشنریوں نے زندہ عورتوں کو چتا سے نکالا۔ اور جب وہ ان بدنصیبوں کو بچانے کی کوشش کرتے، عین وہیں شمشان گھاٹ پر فساد ہو جاتا تھا —— خود میری پردادی کو —— جانتی ہے احمق؟ میری اپنی پردادی کو ستی ہونا پڑا۔ ہندو کلچر۔ ہندو کلچر ——"

روزی کو باپ کا اس قدر شدید غصہ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "مگر پاپا۔ آپ کے مہذب مسیحی یورپ میں بھی تو ہزاروں بے گناہ عورتوں کو جادوگری کے الزام میں صدیوں تک زندہ جلایا جاتا رہا۔ اور جس زمانے میں ہندوستان میں ہندو مسلمان مزے سے اکٹھے رہ رہے تھے اس وقت آپ کے چہیتے یورپ میں INQUISITION ہو رہا تھا۔ ہاہاہا ——!"

"روزی —— چپ ——" ایستھر بنرجی نے سہم کر باپ بیٹی کی تکرار ختم کرانی چاہی۔

"اور سنئے پاپا ——" روزی مزے سے کہتی گئی۔ یسوع کے پجاریوں نے سارے یہودیوں کو اٹھا کر GHETTOS میں ڈال دیا۔ (میری اور بے چارے پاپا کی ڈبیٹنگ سوسائٹی! اس نے دل میں سوچا) اور یہ جو پاپا آپ اچھوتوں کی بات کرتے ہیں تو کیا آپ کے انگلینڈ میں ایک چمنی سویپ یا اُسے کیا کہتے ہیں —— چارڈومن —— یہ کسی لارڈ کی میز پر اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں؟ —— ہاہاہا"۔

"کج بحثی مت کرو روزی"۔ پادری بنرجی نے ڈانٹا۔

روزی کو ایک اور نکتہ یاد آیا (گو اس بحثا بحثی میں آدھ گھنٹہ برباد جائے گا) "یہ جو آپ ہمیشہ ہندوستان کے پرانے مطلق العنان حکمرانوں کو بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں —— خصوصاً سراج الدولہ کو، جو میرا ہیرو ہے —— تو کیا آپ کے ایلزبتھن انگلستان میں بات بے بات لوگوں کے سر قلم نہیں کر دیئے جاتے تھے؟

جسے دیکھو ٹاور آف لندن میں پڑا جھینک رہا ہے اور دوسرے روز کھٹ سے سر غائب۔ وہاں عام آدمی کے لئے کوئی انصاف تھا؟ صرف سو برس پہلے تک آپ کے انگلستان میں ایک بھیڑ کی چوری کی سزا موت تھی۔ اب یہ "لا اینڈ آرڈر" کا کس منہ سے ہم پر رعب ڈالتے ہیں۔ یہ انگریز کے بچے کمینے ـــــ ہماری دولت لوٹ کر تو خود کو مہذب بنایا ان بنیوں نے۔"

پادری بنرجی عینک اتار کر اسے صاف کرتے ہوئے پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ بدتمیز، گستاخ، زباں دراز، ذہین بچی۔

"اور بتاؤں آپ کو پاپا ـــــ" روزی اب صریحاً بے رحمی پر اتر آئی تھی۔ "آپ کے وہ جو ایک کٹر رومن کیتھولک دوست ہیں۔ ڈاکٹر فرانسس باسو۔ جب ان کی بڑی لڑکی نے ایک مسلمان سے شادی کی جو بے چارہ ایک اعلیٰ خاندان بنگالی ہے تو انھوں نے فوراً بیٹی کو عاق کر دیا ـــــ اور آپ بھی کس قدر خفا ہوئے تھے۔ افوہ۔ اور ابھی پچھلے دنوں ان کی چھوٹی لڑکی نے ایک معمولی امریکن فوجی سپاہی سے بیاہ رچایا تو انکل باسو فخر سے پھولے نہیں سمائے حالانکہ ـــــ حالانکہ وہ رومن کیتھولک تو کیا عیسائی ہی نہیں سرے سے یہودی ہے۔ اور جناب آپ نے بھی فوراً فلومینا کو مبارک باد کا تار بھیجا۔ تو پاپا یہ تو غلامانہ ذہنیت اور گوری چمڑی کا رعب۔"

"بس کر روزی۔" ایستھر بنرجی نے سراسیمگی سے کہا اور چپکے سے اشارہ کیا کہ کمرے سے چلی جائے۔ وہ گہرا سانس لے کر کرسی سے اٹھی۔

"اچھا۔ اچھا۔ بیٹی۔" پادری بنرجی نے ملول آواز میں جواب دیا۔ "نکال دو انگریزوں کو ہندوستان سے پھر دیکھنا کیا حشر ہوتا ہے۔ تم سب الٹرا نیشنلسٹوں کا۔ جوں ہی یہ ہٹے تمھارے لاڈلے ہندو مسلمانوں میں وہ جوتا چلے گا، وہ بھیانک خانہ جنگی ہوگی کہ دیکھ لینا۔ تب تمھیں اس جاہل بوڑھے پادری کی باتیں یاد آئیں گی۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

روزی نے بڑی نرمی سے کہا۔ "پاپا۔ میں تو یونہی آپ سے تفریحاً بحث کر رہی تھی۔ آخر مجھے کالج کی ڈبیٹوں میں یونہی ٹرافیاں ملتی رہی ہیں، مفت! میں قوم پرست تو یقیناً ہوں پاپا مگر آج کل جو تباہ کاری مچ رہی ہے میں خود اس کے خلاف ہوں۔"

"تم جانتی ہو بیٹی کہ ایسے نازک موقع پر جبکہ برطانیہ ہر محاذ پر ہار رہا ہے ـــــ"

"ہمیں اس کی مدد کرنی چاہئے ـــــ بالکل ـــــ بالکل۔" روزی نے جوش سے ان کی بات پوری کر دی۔

"اچھا بس ہو گئی تم لوگوں کی ڈبیٹ۔ اب پاپا کو جا کر سونے دو روزی۔" ایستھر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"یس ماما۔" روزی نے دروازے میں جاکر باہر جھانکا۔ مینھ تھم چکا تھا۔ "اُفوہ کتنی گھُپ اندھیاری رات ہے ماما۔ دیکھنا سبزی باڑی پر جگنو کیسے چمک رہے ہیں پاپا۔" اس نے مُڑ کر پادری بنرجی سے دوبارہ کہا۔ "کیا آپ واقعی خفا ہو گئے؟ میں تو آپ کو TEASE کر رہی تھی۔ سچ مچ پاپا ——" کرسی کے پیچھے آکر اس نے بڑے لاڈ سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ پادری بنرجی خوش ہو گئے۔ عینک اتار کر اسے رومال سے صاف کیا۔

"سچ مچ پاپا۔ یونی ورسٹی تو بند ہو چکی ہے، مگر ہماری لٹریری سوسائٹی ٹیگور کا تعزیتی پروگرام کر رہی ہے۔ کل جلسہ ہوگا بڑا۔"

"دیپالی اس جلسے میں شامل ہے؟ وہ بھی آئی تھی؟"

"جی نہیں —— جی ہاں —— پاپا۔ رابندر سنگیت کا پروگرام اس کے بغیر کیسے مکمل ہو سکتا ہے۔"

"ہُوں۔" انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"گڈ نائٹ پاپا۔" اس نے جھک کر ریورنڈ بنرجی کا سر چوما۔

"گڈ نائٹ ماما۔"

"گڈ نائٹ۔ گوڈ بلیس یُو مائی چائلڈ۔" والدین نے تقریباً یک زبان ہو کر کہا۔

روزی ایک لحظے کے لئے ٹھٹھکی۔ ان دونوں پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی

ریورنڈ بنرجی کرسی سے اٹھے۔ اور دوبارہ ٹہلنے لگے۔ سائیڈ بورڈ پر رکھے گلدان کو چھوا۔ "گوڈ بلیس آور ہوم"۔ کے طغرے پر نظر ڈالی جس کے مقابل میں یسوعؑ کے "آخری طعام" کا بڑا سا رنگین پرنٹ دوسری دیوار پر آویزاں تھا۔ وہ چند سکنڈ تک اس تصویر کو دیکھا کئے۔ پھر حسبِ عادت کمرے کے پیچھے ہاتھ باندھے، سر جھکائے، مطمئن اور خداوند تعالیٰ کے مشکور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

کوئی پون گھنٹے بعد مسز بنرجی نے گھر کے سارے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد حسبِ معمول اوولٹین کی دو پیالیاں تیار کیں، ایک پیالی طشتری سے ڈھانپ کر سائیڈ بورڈ پر رکھی۔ اور دوسری لے کر روزی کے کمرے میں گئیں۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔ انھوں نے پیالی میز پر رکھ دی اور غسل خانے کی طرف مڑ کر آواز دی۔ "روزی بیٹیا۔ صبح کو دھوبی آئے گا، اپنے کپڑے نکال ——" وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکیں کیونکہ نہ جانے کیوں آپ سے آپ ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ نہ جانے کیوں ان کو خیال آیا کہ روزی بھاگ گئی وہ اپنی جگہ پر منجمد رہ گئیں۔ پھر انھوں نے نوٹس کیا کہ غسل خانہ اندھیرا پڑا ہے۔ اور تیز ہوا اندر آ رہی

ہے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ غسل خانے کا باہر کی رُخ کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔

شاید وہ جگنو پکڑنے سبزی باڑی میں اتر گئی ہو۔ مسز بنرجی نے دروازے میں جاکر آواز دی۔ "روزی ـــــ روزی بیٹے ـــــ" پھر وہ چھتری لگا کر اندھیرے اور کیچڑ میں باہر نکلیں۔ ڈیزی شام سے جاکر اپنے کوارٹر میں سو رہی تھی۔ اسے کیا معلوم ہوگا۔ انھوں نے پورے کمپاؤنڈ کا چکر لگایا۔ سارے کوارٹروں میں سوتا پڑا تھا۔ گرجا کی برساتی میں روشن بلب پر پتنگے چکر کاٹ رہے تھے۔ سارے میں ہُو کا عالم طاری تھا۔ بچی ایسی بھیانک رات میں تو کہاں چلی گئی ـــــ یہ کیا ہوا۔؟

وہ میں گھر میں واپس آئیں۔ کیچڑ میں لت پت چپلیں پائیدان پر اتار کر آہستہ آہستہ چلتی سارے کمروں میں گئیں دروازے بند کئے۔ بتیاں بجھائیں۔ اور پھر اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئیں جہاں ان کے شوہر شب خوابی کا لباس پہنے اولٹین کے منتظر غنودگی کے عالم میں بید کی کرسی پر بیٹھے تھے۔ نیند میں ان کا سر سامنے جھک آیا تھا۔ بیوی کی آہٹ پر وہ چونکے۔ اور ان کی طرف دیکھے بغیر عادت کے مطابق پیالی کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

ایستھر بنرجی نے ان کے قریب جاکر آہستہ سے کہا ـــــ "پال ـــــ ہماری لڑکی گھر سے بھاگ گئی۔"

پادری بنرجی نے سر جھٹکا۔ پلکیں ملیں اور بیوی کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ ان کے صرف ہونٹ ہلے۔ منھ سے آواز نہیں نکلی۔

ایستھر گری بالا نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ ان کے قریب فرش پر دوزانو بیٹھ گئیں۔

باہر بجلی زور سے چمکی اور شکست خوردہ میاں بیوی کے ٹیبلوں کو روشن کر گئی۔ (مناظر وقت میں معدوم نہیں ہوں گے)

پادری بنرجی چند منٹ تک بالکل چپ، ساکت، منجمد بیٹھے رہے۔ پھر انھوں نے لرزاں ہاتھوں سے عینک ٹٹولی۔ ایستھر نے میز پر رکھے سیاہ کیس میں سے عینک نکال کر ان کو دی۔ پادری بنرجی نے اپنے پلنگ کے سرہانے سے انجیل مقدس اٹھائی۔ ایستھر ان کے نزدیک دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں اور آنچل سے سر ڈھانپ لیا۔

"LET US PRAY" پادری بنرجی نے آہستہ سے کہا۔

اس ساری رات پادری بنرجی حضرت ایوبؑ کی گریہ وزاری کا باب پڑھتے رہے۔

اور دیکھو۔ کہ دنیا کے سارے مقدس صحیفوں کے یہ سارے ابواب کتنے ہزارہا برسوں سے کتنے

ان گنت انسانوں کی مصیبت کے وقت میں پڑھے گئے ہیں۔ اور وہ چند الفاظ اسی طرح موجود ہیں۔
وقت اور الفاظ انسان کے شکاری ہیں۔

## ۲۳

# گنگا اور برہمپتر

ڈیک چیر پر ذرا آگے کو جھکا ہوا نوجوان مضطرب سرگوشی میں کہہ رہا تھا ـــــ "ہم نے روپوشی سے باہر آنے کے بعد تم کو اتنے خط لکھے۔ ہر تیسرے روز، ہر ہفتے، ہر پتے پر، اتنے تار دیئے، اتنے سندیسے بھجوائے۔ تم نے ایک کا ـــــ حد ہے، ایک خط کا جواب نہ دیا۔ ہماری شدید پریشانی کا بھی تمھیں خیال نہ آیا۔ ہمیں طرح طرح کے اندیشوں نے بدحواس کر دیا تھا۔ شاید تم پکڑی گئی ہو۔ شاید بنوئے بابو نے تمھیں گاؤں بھیج دیا ہو۔ شاید زبردستی تمھاری شادی کر دی گئی ہو، پھر اونیل کے ذریعے معلوم ہوا کہ تم خیریت سے ہو۔ اس کے بعد تمھارے چپ سادھ لینے کی وجہ بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔

"ہماری عقل حیران ہے کہ تم نے یہ رویہ کیوں اختیار کیا۔ ناراض ہو تو صرف دو سطروں میں ناراضگی کی وجہ ہی بتلا دیتیں۔ ہم نے بار بار تمھیں لکھا۔ کسی وجہ سے خفا ہو گئی ہو تو بتلا دو۔ اور معاف کر دو۔ آخر یہ تم کو ہوا کیا؟"

نیم تاریک اور سنسان ڈیک کے سرے پر صرف سگریٹ کی روشنی چمکتی رہی۔ ڈیک کا فرش بھیگا ہوا تھا۔ کچھ دور پر ایک خلاصی ایک بنچ پر محوِ خواب تھا

"ہم شروع شروع میں تفصیل سے تمھیں کچھ نہیں لکھ سکتے تھے"۔ سگریٹ ایک جھٹکے سے پدما میں جا گرا۔

"پچھلی جولائی سے ـــــ کھلنا کی اس اندھیری رات سے لے کر نومبر دسمبر تک ہم اِدھر اُدھر روپوش رہے۔ سندر بن میں تم سے ملاقات کے اس خطرناک ایڈونچر کے بعد ہم بہت محتاط ہو گئے تھے۔ اس لئے تمھیں کوئی دو حرفی پیغام بھی نہ بھجوا سکے۔ اور اتنے مصروف رہے کہ غمِ جاناں کے متعلق سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ دیولی والوں کو دسمبر میں رہائی حاصل ہوئی اور ہم ـــــ کدھر دیکھ رہی ہو، کیا ہماری آواز بھی ناگوار ہے؟"

دیا سلائی کا مختصر سا شعلہ لپکا۔ دوسرا سگریٹ، زیادہ مضطرب، آزردہ لہجہ۔ "کیا تم اس لئے

خفا تھیں کہ ہم دسمبر کے بعد تم سے ملنے بنگال نہ آسکے؟ ہمیں معلوم نہ تھا واللہ کہ تم اس قدر دیوانی لڑکی ہو ــــ"

دوسرا سگریٹ بھی تین چار کش کے بعد اندھیرے مہیب دریا میں جا گرا۔

"اگر ہمیں ایک ضروری کام سے اچانک یہاں نہ بھیجا گیا ہوتا تو شاید اب بھی نہ آسکتے۔ کیا تم تم دوسرے گروپ سے جا ملی ہو؟"

جہاز نرم روی سے آگے بڑھتا رہا۔

"کیا مجھے تم سے خفا نہیں ہونا چاہئے؟ میرے ساتھ یہ رویہ اختیار کرنے کی آخر ــــ اوہ ڈیم یو ــــ"

تیسرے سگریٹ کے لئے ماچس جلانے کی کوشش، مگر ماچس سیلی ہوئی تھی۔

"کیا تم کو ــــ کسی اور سے ــــ کسی اور ــــ کوئی اور ــــ" ذرا کانپتے ہوئے ہاتھ۔ ماچس کی ڈبیا بھی دریا برد ہوئی۔

"شٹ اپ۔" دوسری ڈیک چیر پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے یک لخت تلملا کر جواب دیا۔

وہ اور آگے جھکا۔ لڑکی کی شکل دھیان سے دیکھی اور آہستہ سے مسکرایا۔ "شکر ہے۔"

"کیا شکر ہے؟" وہ بلی کی طرح غرائی۔

دریا پر تیز ہوا چل رہی تھی۔ لڑکی نے سردی کی وجہ سے کندھے سکیڑ کر ساری کا آنچل جسم سے اچھی طرح لپیٹا۔ نوجوان نے کھادی ریشم کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس نے چادر اتار کر لڑکی کے کندھوں پر ڈالی۔ لحظے بھر کے توقف کے بعد بڑی نرمی اور احتیاط سے لپیٹ دی۔ لڑکی ذرا سا کپکپائی۔

بے چاری بے وقوف، نالائق بچی۔

"آپ کو ــــ آپ کو سردی لگ جائے گی۔" لڑکی نے دھیرے سے کہا۔

"تم سے مطلب؟ مر گئے تو شہیدِ محبت کہلائیں گے، قسم خدا کی تین ساڑھے تین سال سے کیا تھیٹریکل عشق چل رہا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔"

کروک، چار سو بیس، دھوکے باز۔

"بی۔ اے پاس کر لیا؟" نوجوان نے پھر بات کی۔

"کر لیا۔"

"فرسٹ ڈویژن؟"

"جی۔"

"ارے واہ شاباش۔ مبارک ہو۔ تو اب گویا تمھاری شادی کا اشتہار اخباروں میں دیا جا سکتا

ہے۔" اس نے کھنکار کر کہا۔ "بی، اے پاس، امور خانہ داری میں ماہر، رابندر سنگیت کی استاد، کائستھ کنیا ـــــ لڑکا برسرِ روزگار ہونا ضروری ہے۔ کم از کم پی سی ایس کو ترجیح دی جائے گی ـــ"

کمینہ، بے ہودہ، لوفر۔

وہ اٹھنے لگی، نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھر کرسی پر بٹھا دیا۔ "آپ اب کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتیں

"آپ کا دماغ خراب ہے۔" لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ اور پھر اٹھنے لگی۔

"یہ تم بھاگی کہاں جا رہی ہو؟"

"عبدالقادر جالی کے ادھر چوکنے بیٹھے ہیں، اگر آپ کی اس ـــ کیا کہنا چاہئے ـــ بے تکلفی پر ان کی نظر پڑ گئی ـــ"

"پچھلے سال لگ بھگ اسی موسم میں آپ کہاں تشریف رکھتی تھیں، غالباً یاد ہو۔"

"ایک مرتبہ حماقت کی تھی، اب دوبارہ نہیں ہوگی۔ گڈ گریشس ـــ خیال آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ـــ"

"تم واقعی بدل گئی ہو۔"

"جی ہاں۔"

اب وہ خاموش ہو گیا۔

شاید قصہ واقعی ختم ہو چکا ہے۔ ایک سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ یا شاید محبت ختم ہونے کی کوئی منطقی وجہ نہیں ہوتی۔ میں بیکار اس لڑکی کا تعاقب کر رہا ہوں، یہ وہ لڑکی ہی نہیں ہے۔

کئی منٹ گزر گئے۔ اچانک وہ بولی۔ "آپ ـــ آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ ـــ آپ نے آخر اس جہاز پر مجھے کیسے پکڑ لیا ـــ"

وہ خوش ہو گیا۔ نہیں۔ یہ وہی لڑکی ہے۔ ابھی کچھ نہیں بدلا۔

"کس طرح پکڑ لیا ـــ؟" اس نے بشاش لہجے میں جواب دیا۔ "اس طرح کہ میں ڈھاکے میں سیدھا آپ کے گھر پہنچا۔ جو سنسان پڑا تھا۔ چکر کاٹ کر شاگرد پیشے کی طرف گیا۔ وہاں آپ کی ریاست کے منیجر مولوی عبدالقادر کی اہلیہ نے ضروری معلومات فراہم کیں کہ بچے کوئی مترا بابو ہیں ان کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔ آپ کسی خاندانی شادی کے لئے عبدالقادر کے ہمراہ فرید پور تشریف لے گئی ہیں اور فلاں تاریخ کو عبدالقادر کے ساتھ ہی واپس آجائیں گی۔ کھوکھو کی بیماری کی وجہ سے۔ چنانچہ میں نے فی الفور فرید پور کا ٹکٹ کٹایا۔ میں فرید پور ـــ فرید پور کے لوگوں سے واقف ہوں۔ آپ کی پشی ماں کے گھر والوں کو بھی جانتا ہوں۔ یہاں چپکے سے پتہ لگانا بہت آسان تھا۔ کہ آپ کس روز، کس وقت نرائن گنج کے لئے

روانہ ہو رہی ہیں۔ چنانچہ اسی جہاز کا ٹکٹ اس ناچیز نے بھی خرید لیا۔ باقی حالات آپ نے پردۂ سیمیں پر خود ملاحظہ فرمائے۔"

"آپ ڈھاکے میں میرا انتظار کر سکتے تھے۔"

"نہیں کر سکتے تھے۔ آپ کے سلسلے میں ہم منطقی نہیں ہیں۔"

دونوں دھندلے سائے ساکت بیٹھے رہے۔ چاروں طرف بادل اور دریا ایک ہو گئے تھے۔ ڈیک چیئرز سے کچھ دور لمبی سفید داڑھی والا مسلمان بوڑھا کپتان اپنے کھلے کیبن کے سامنے جنگلے پر جھکا کھڑا تھا، اس کے نزدیک لگی ہوئی بے حد طاقتور سرچ لائٹ نے دریا کو حدِ نظر تک روشن کر رکھا تھا۔

"روزی کیسی ہے؟" کچھ دیر بعد نوجوان نے دریافت کیا۔

"روزی ـــ محمود دا ـــ یہ سب لوگ ـــ آپ کو نہیں معلوم ـــ؟"

"ہاں۔ سریندر نے ڈھاکے میں مجھے بتایا ـــ ان لوگوں کو کچھ سمجھایا نہیں جا سکتا ـــ"

اس نے گہری سانس لی۔ "اچھا کہیں سے ماچس لے کر آؤ۔"

کس مزے سے حکم چلاتے ہیں، میں کنیز ہوں ان کی۔ زر خرید۔ چرنوں کی داسی کتنے ہی کامریڈ بن جائیں اصلیت میں رہیں گے وہی نہ خالص ہندوستانی لارڈ اینڈ ماسٹر ـــ میں نہیں لاتی ماچس واچس۔

"ارے بھائی ذرا بھاگ کر ایک ماچس لے آؤ نا کہیں سے ـــ عبدالقادر میاں سے مانگ لو۔ وہ ضرور بیڑی پیتے ہوں گے۔"

"میں ان سے جا کر کہوں کہ ذرا دیا سلائی دینا جو میرے ایک عزیز دوست کو چاہیے جو مجھے بھگا لے جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔"

"جب تم (عنقریب انشاء اللہ) بھاگو گی تو بنوئے بابو لامحالہ یہی شبہ کریں گے کہ ان کے ذریعہ ہی تم ایک میاں بھائی کے ساتھ اڑنچھو ہوئیں۔"

"اس خیال میں بھی نہ رہیے گا۔ عبدالقادر میاں میں انتہائی فیوڈل وفاداری ہے۔ وہ آپ کے مولوی ابوالہاشم نہیں ہیں ـــ" دفعتاً وہ چپ ہو گئی۔

"وہ ـــ وہ ہم نے ایک سہانا ـــ ناقابلِ یقین خواب دیکھا تھا نا ـــ"

"ہاں ـــ" لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

کچھ دور پر فوجیوں سے لدا نیم تاریک اسٹیمر گزر رہا تھا۔

"عجیب بات ہے۔" لڑکی نے پھر جلدی سے موضوع تبدیل کیا۔ "جب کامریڈ رندھیوے کا بیان چھپا پہلی بار کہ یہ جنگ اب عوامی جنگ ہے ـــ تو یہ قوم پرست اتنی شدت سے پارٹی

کے خلاف کیوں ہو گئے۔ خصوصاً روزی ـــــ وہ تو بہت ہی ایمیچور نکلی۔ میں نے اسے کئی بار ـــ کئی بار سمجھایا ـــ کہ ـــ آپ نے ایک بار لکھا تھا نا خط میں کہ کمیونسٹ انٹرنیشنل اس بے جگری سے ناتسیت اور فاشزم کا مقابلہ ـــ"

"بہت خوب، آپ کا جواب نہیں۔ ہمارے عریضوں کے ذریعے آپ اپنے دوستوں کو ایجوکیٹ کرتی ہیں۔ مگر ہمیں دو سطریں لکھنے کی آپ نے زحمت گوارا نہ کی۔ اب بھائی ہمیں یقین ہو گیا کہ تمھارے دماغ کی ایک چول ضرور ڈھیلی ہے۔"

"کمال ہے ـــ" لڑکی نے مزید گڑبڑا کر بے حد سنجیدگی سے سیاسی گفتگو جاری رکھی۔ "۸ تاریخ کو کانگریس بھی سی، پی، آئی سے علیحدہ ہو گئی۔ حالانکہ ـــ حالانکہ ـــ پنڈت نہرو ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے فاشزم کے خطرے کو پہچانا تھا ـــ" لڑکی نے اس انداز میں بات ختم کی گویا اخبار کا ایڈیٹوریل پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے چہرہ پھیر کر بے نیازی سے دریا کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

"جی ہاں۔ آپ بالکل صحیح فرماتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی سیاسی سوجھ بوجھ اور بالغ نظری ترقی پر ہے۔"

دریا کی متلاطم لہریں اسٹیمر سے ٹکرایا کیں۔ کبھی کبھی پانی کی چھینٹیں اڑ کر اوپر آجاتی تھیں۔ لڑکی کے بال بھیگ گئے۔ رات تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ نوجوان نے گھبرا کر گھڑی پر نظر ڈالی۔

دفعتاً لڑکی نے سوال کیا۔ "آپ یہاں کس کام سے آئے ہیں؟ یا ـــ راز کی بات ہے؟"

"نہیں۔ کوئی راز کی بات نہیں ہے۔ ہمیں پروونشل مسلم لیگ کے لیڈروں سے بات چیت کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔"

مسلم لیگ ـــ نواب قمرالزماں چودھری ـــ ارجم ـــ جہاں آ ـــ

جہاز دریا کی گدلی موجوں پر ڈولنے لگا۔ اس کے انجن کی آواز ایک دم اونچی ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

"جیوتی دا، روزی، محمود دا، یہ سب بھی مجھ سے بے حد خفا تھے، روزی نے تو مجھے غدار اور توڑی کہا ـــ حد ہے ـــ"

"تم نے ان کا ساتھ کیوں نہ دیا ـــ؟ تم تو دینیش بابو کی بھتیجی ہو ـــ"

"آپ نے جو اتنی سختی سے منع کر دیا تھا۔"

"کب۔؟"

"اپنے پچھلے خط میں۔"

"مائی گڈنس۔"

لڑکی نے اور زیادہ ہڑبڑا کر سر جھکا لیا۔ "حالانکہ مجھے اتنی شرمندگی سی تھی کہ میں کاکا کو LET DOWN کر رہی ہوں۔"

"مائی گڈنس ——" نوجوان نے دہرایا۔ پھر اس نے آگے جھک کر پوچھا۔ "کیوں خفا تھیں۔ ہمارے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیتی تھیں؟"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوجوان بھی اٹھا۔ اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ "اس پُرسکون جہاز کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت سارے دیس میں آگ لگ رہی ہے۔" اس نے ملول آواز میں کہا۔

لڑکی جا کر سرچ لائٹ کے نزدیک کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی اس کے برابر آ گیا۔

"شاید میں بزدل ہو گئی ہوں۔" لڑکی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

وہ خاموش رہا۔ سرچ لائٹ دریا پر روشنی کا ایک اور دریا بہا رہی تھی۔

"آپ کتنے دن رہیں گے؟"

"پتہ نہیں۔ جتنے دن بھی لگ جائیں۔ معاملات کافی گنجلک ہیں۔ مسلم لیگ عوامی تحریک بن چکی ہے، اس کی نئی طاقت کو نظر انداز کرنا حماقت ہو گی۔"

بوڑھے ناخدا نے کان کھڑے کئے۔ اور ذرا نزدیک ہو کر دلچسپی سے بات سننے لگا۔ اور ایک دفعہ مڑ کر نوجوان کو دیکھا۔ نوجوان نے مسکرا کر اسے "سلام علیکم" کہا اور بات جاری رکھی۔ "بنگال مسلم اکثریت کا صوبہ ہے۔ یہاں کی مسلم جنتا پروگریسو لیڈر شپ کی منتظر ہے ——"

"نواب لوگ تو پروگریسو لیڈر شپ نہیں ہیں۔"

"پروگریسو لیڈر شپ ہماری ہو گی۔ ہمیں لیگ کے قریب آنا ہو گا۔ یہ پیشین گوئی میں آج اگست ۴۲ء کی اس رات کر رہا ہوں۔ گرہ میں باندھ لو!"

نواب قمر الزماں —— یہ ارجمند منزل جائے گا۔ ارجمند منزل جائے گا —— اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ ریلنگ پر جھک کر نیچے لہروں کو تاکنے لگی۔ پچھلے سال جولائی کی اس رات، سری سدن میں جو وعدہ میں نے آپ سے کیا تھا اس پر قایم نہ رہی۔ اسے چکر سا آ گیا۔ اس نے جنگلہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ جنگلے کا لوہا بالکل یخ تھا۔ میں نے ساری رات اس سے باتیں کرنے میں گذار دی۔ اب نہیں۔ اب کچھ نہیں۔ اب آئندہ بالکل پہچان کر نہ دوں گی۔ آخر سال بھر تک کس مضبوطی اور بے جگری سے اپنے وعدے پر قایم رہی ہوں کہ نہیں۔ ایک سال گذر گیا۔ اس طرح باقی عمر بھی گذر جائے گی۔ اب نہیں۔ یہ آخری ملاقات ہے۔ دیکھ لینا۔

بوڑھا پہیئے پر جھک چکا تھا۔ اسٹیمر تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

"ڈھاکے میں آپ کہاں ٹھہرے ہیں۔" لڑکی نے بالکل نارمل آواز میں دریافت کیا۔

"اُدما کے ہاں۔" وہ ہنسا۔ "ایک زمانہ تھا کہ وُوڈ لینڈ میں ہمارے فرشتے تک نہ بھٹک سکتے تھے ـــــ نہیں خیر۔ ہمارا ایک فرشتہ تو پھٹکا تھا۔" اس نے پیار سے لڑکی کے بالوں کو چھوا۔ وہ جھنجھلا کر پرے سرک گئی۔ وہ کہتا رہا۔

"اب ہم مزے سے عین سر پری توش رائے کے گیسٹ روم میں ڈٹے ہوئے ہیں۔! اُدما سے تم کب سے نہیں ملیں؟"

"مدتیں ہو گئیں۔"

"آنا ان سے ملنے۔ وہ دلّی سے میرے ساتھ ہی آئی ہیں۔ آج کل ان کے والدین کلکتے گئے ہوئے ہیں۔ اس لئے سارے دوستوں کا اڈہ بے فکری سے وہیں ہوتا ہے۔"

"دلّی میں آپ امپیریل ہوٹل میں ٹھہرے تھے؟"

"ہم ـــــ؟ نہیں تو۔ اُدما وہاں مقیم تھیں۔ ہم ایک دوست کے یہاں تھے۔ کیوں؟ تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

"آکاش بانی آئی تھی ـــــ" لڑکی نے خشکی سے جواب دیا۔ نوجوان نے اسے غور سے دیکھا۔

"تم واقعی بدل گئی ہو ـــــ ایک سال میں بدل گئی ہو۔ تم میں تلخی آگئی ہے۔ تم اتنی سیدھی، اتنی بھولی تھیں، تمھیں کیا ہو گیا۔ کون تمھاری اس تبدیلی کا ذمے دار ہے؟ اس نے لجاجت سے کہا۔

ماں۔ مجھے مضبوط بنا۔ مجھے فولاد کی طرح مضبوط بنا۔ لڑکی آنکھیں میچ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ لیکن ہر سمت دریا کا دھندلکا طاری تھا۔

"تم دن بھر گھر پر رہتی ہو؟"

"جی ہاں۔"

"میں کسی وقت تمھارے ہاں آسکتا ہوں؟"

"کسی وقت نہیں۔"

"کیوں؟"

"ایسے ہی۔ میری مرضی۔"

"اچھا۔"

اسٹیمر اب دریا کے موڑ سے گذر چکا تھا۔ ملاح نے پہیہ گھمانا ختم کر دیا۔ سامنے روشنی کا راستہ بے حد وسیع ہو گیا۔ وہ دونوں جنگلے پر جھکے دریا کی منور لہروں کو تکتے رہے۔ گہرا متلاطم دریا۔ منور پانی، حدِ نظر تک روشن۔ چاروں کھونٹ پانی۔ ابتدا میں خلا تھا۔ اور تاریکی، اور خدا کی روح پانیوں پر ڈولتی

تھی۔ یہ تخلیق کائنات کی رات تھی۔ اور خدا نے کہا روشنی اور روشنی ہو گئی۔ اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے۔ اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا۔

اور آدم و حوّا کو بنایا۔ اور ایک دوسرے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ آدم و حوّا، اسٹیمر کے جنگلے پر جھکے کھڑے ہیں، استعارے کو اور آگے لے جاؤں تو یہ بزرگ کپتان حضرت نوح ہیں۔ جو ہم دونوں کو نہ جانے کون سے ارارات کی سمت لئے جا رہے ہیں۔ نوجوان زیر لب مسکرایا۔

روشنی اور تاریکی، موت و حیات، دکھ اور سکھ، فراق اور وصال، جنوں اور خرد ـــــ سنگم تو گوالندو گھاٹ سے پرے، بہت دور رہ گیا۔ گنگا اور برہم پتر کی لہروں سے بنا یہ دریا ـــــ اس کے پانیوں میں گنگا کون سی ہے اور برہم پتر کون ہے؟

لڑکی کو زور کی چھینک آئی۔ وہ اس کی طرف مڑا۔ وہ سُوں سُوں کر رہی تھی۔

"تمھیں سردی لگ جائے گی۔ چلو اندر چلیں"۔ نوجوان نے متفکر ہو کر کہا۔

"نہیں۔ میں تو یہیں کھڑی رہوں گی"۔ لڑکی نے ضد سے جواب دیا۔ پھر وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ پھر فوراً سنجیدہ ہو گئی۔ وہ اسے ہنستا دیکھ کر مسرور ہوا۔ اور خود بھی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے ریلنگ پر رکھے ہوئے لڑکی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

لڑکی نے اپنا ہاتھ نہیں ہٹایا۔

ساحلی بتیاں دھندلکے میں ٹمٹما کر گذر چکی تھیں۔ نرائن گنج کی روشنیاں قریب آتی گئیں۔ اسٹیمر مصروف بندرگاہ کے اجالے میں داخل ہوا۔ نرائن گنج سامنے جگمگا رہا تھا۔ نرائن گنج ـــــ اس کی گلیوں کی نہروں پر چلتی کشتیاں، جوٹ اسٹیشن، گہما گہمی، باہر اندھیرے میں چھپی کچی سڑکیں، نیم شکستہ مغل پُل، کھیت، طویل اندھیری شاہراہ جس کے سرے پر ڈھاکہ ہمیشہ کی طرح منتظر ملے گا۔ شفیق، محفوظ، مامون شہر۔

دنیا متزلزل ہو چکی تھی۔ مگر شاید موجود تھی۔ مسرت کا وجود بھی تھا۔ ملنا ممکن تھا۔ آخر دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں گے۔ جنھیں چین اور خوشی میسر ہے؟ اور مسرت کے حصول میں خود غرضی گناہ ہے؟

لڑکی نے ہوا سے بچنے کے لئے کھادی سلک کی دوہری چادر مضبوطی سے اپنے شانوں کے گرد لپیٹ لی۔

## (۲۴)

# چارلس بارلو "بنگال سویلین"

"نغماتِ ہند[1]۔ از الف چیم
پیارے بیٹے جِم کے لئے۔ انیسویں سال گرہ پر۔
تمہارا ڈیڈ
میمن سنگھ، ۱۸۸۸ء

چارلس بارلو نے بیئر کا مگ تپائی پر رکھ کر سنہری جلد کتاب کا احتیاط سے ورق الٹا، یہ بڑی نادر کتاب تھی۔ جو خود مصنف نے جو "الف چیم" کے قلمی نام سے ہندوستان کی برطانوی سوسائٹی اور نیٹو لائف کے متعلق بے حد پُر لطف اور طنزیہ نظمیں لکھتا تھا، گرینڈ ڈیڈ کو دی تھی۔ یہ اپنے زمانہ کا مقبول "الف چیم" دراصل ۱۸ء حصار کا کیپٹن یلڈھیم تھا۔ گرینڈ ڈیڈ کا جگری دوست، گرینڈ ڈیڈ ان دنوں بنگال میں ڈویژنل کمشنر تھے۔ انھوں نے ڈیڈ کو یہ کتاب ان کی سالگرہ پر دی تھی۔ ڈیڈ آکسفرڈ سے چھٹیوں پر اپنے والدین سے ملنے بنگال آئے ہوئے تھے۔ اور بہت جلد خود بھی اپنے والد کی مانند بنگال سویلین بننے والے تھے۔

ماضی کی وہ افسانوی ہستی ـــــ بنگال سویلین۔

چارلس بارلو نے اداس، زیر لب تبسم کے ساتھ پہلی نظم پر نظر ڈالی، اس مجموعے میں وہ سارے کردار موجود تھے جو ماضی کے بنگال سویلین کی زندگی کا لازمی جزو رہ چکے تھے۔

پہلی نظم ـــــ "ریورنڈ مک فرسن کا خیال تھا کہ "انڈین ناچ" شیطانی گورکھ دھندا ہے۔ ایک روز راجہ نے ساری چھاؤنی کو ناچ کے لئے مدعو کیا۔ باغ قمقموں سے سجایا گیا۔ میم صاحبوں کے لئے خیمے لگے۔ بڑھیا شرابیں، پلاؤ، عطر گلاب، سارا اسٹیشن مدعو تھا۔ "تماشا شاندہ بوٹ اچھا" تھا۔ راجہ جھک جھک کر صاحب لوگ کو سلام کرتا۔ عجیب عجیب زیور ناک میں پہنے ناچ گرلز آئیں۔ اور ٹوم ٹوم کی جنگلی تال پر تھرکیں۔ سازندوں کے وحشیانہ ساز چیخے۔ ان کے چوبدار عودان اور مشعلیں سنبھالے پیچھے کھڑے تھے۔ چیف رقاصہ راما راما کہہ کر ناچنے لگی۔ ریورنڈ مک فرسن کو یہ معلوم نہ تھا کہ راما ایک دیوتا

---

[1] LAYS OF IND BY ALIPH CHEEM

ہے۔ ورنہ انھیں تعجب نہ ہوتا کہ شیطان کی چیلی ایک دیوتا کو پکارتی ہے۔ ان معاملات سے جو ان کے چرچ سے متعلق نہ تھے، ریورنڈ مک فرسن لاعلم تھے۔ ــــ"

آج بھدرا لوگ کی لڑکیاں کلکتہ اور شانتی نکیتن کے اسٹیج پر ناچ رہی ہیں۔ بے چارے الف چیم! تم مجھے اپنے بلیرڈ روم، چرٹ، بسمارک اور فرانکو جرمن دار کی باتیں کرنے والے فوجی افسروں، اپ کنٹری، مفصل، بینڈ اسٹینڈ، گزٹ، پائینر، ٹفن اور چھوٹا حاضری کی حکایات سنائے جاؤ۔ کہ اس گم شدہ دنیا کے تذکرے سے ہی مجھے تقویت حاصل ہوتی ہے۔

دوسری نظم ــــ "چاندنی رات، جب دور سے نیٹوز کے ٹوم ٹوم کی بھیانک آواز سنائی دیتی ہے، بازار کی مکھیوں ایسی بھنبھناہٹ۔ چوکرا سگار لاؤ۔ میں برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوں باہر سرو کے درختوں کے پیچھے سے چاند نکل رہا ہے۔ چوکرا شراب انڈیلتا ہے۔ اوہ انڈیا! سہانی شاموں کی سرزمین۔ پتوں پر لرزاں تیری چاندنی، تیری واحد دیوانگی نہیں!"

چارلس بارلو نے پل کی پل کو آنکھیں بند کرلیں۔ پھر بیئر کا مگ اٹھا کر ایک صفحہ اور پلٹا۔

"میرا چالاک منشی محمد دین، روزانہ مجھے اوردو پڑھاتے آتا۔ گپّی۔ وہ انگریزی بولتا۔ نیٹو بات۔" بہت کم ہوتی۔ سرکنڈے کے قلم خرید کر لاتا۔ اور روز چار آنے چرا لیتا۔ مجھے کتنی نفرت تھی اس درس و تدریس سے، منشی گپّیں ہانکتا اور میں چپ چاپ بیٹھا چرٹ پیا کرتا۔ مگر جب میں نے امتحان پاس کیا تو ایسی اُردو بولی کے کوئی سالار جنگ بھی کیا بولے گا۔"

ایک اور نظم ــــ "راجہ کرشما ہاؤڈی ڈو ــــ ہند کے اس خطے میں جہاں تیلگو بولی جاتی ہے۔ راجہ کرشما ہاؤڈی ڈو رہتا تھا۔ جو اس سال افسوس کہ پرلوک سدھارا، راجہ ان نیٹوز میں سے تھا، اگر جن کا رنگ صاف ہوتا تو وہ سیدھے سیدھے انگریز بن جاتے۔ اس کی عادتیں صاف ستھری تھیں۔ نہ بھنگ پیتا تھا، نہ مرچیں کھاتا تھا نہ پان۔ تیلگو لہجے میں انگریزی خاصی بول لیتا تھا۔ "کالے پانی" پار ولایت ہو آیا تھا۔ بلیرڈ کھیلتا تھا۔ اور اپنے ساتھ ولایت سے تصویریں اور (نقلی) بالوں کے بنڈل لایا تھا، جو اُن احمق عورتوں نے اسے دیئے تھے جو ایک دولت مند اور نیٹیل کو دیکھ کر خواہ مخواہ جذباتی ہو جاتی ہیں۔ راجہ پولکا ناچتا تھا۔ چپّل کے بجائے بوٹ اور ٹویڈ کا سوٹ، اس کا راج بھی مثالی تھا۔ اپنی ریاست کو متمدن کر چکا تھا۔ ہیلتھ کمیشن، ویکسی نیشن، ایڈمنسٹریشن۔ ریلوے زنانہ تعلیم، یہ اور وہ، اس کی ریاست اتنی عمدہ ہو گئی تھی کہ ہم نے اس سے کہا تھا کہ ہم کبھی اس کا الحاق نہ کریں گے۔ لارڈ وائسرائے نے اس سے کہا کہ وہ ہمارا بہترین فرزند دلبند ہے اور ایک سو ستر توپوں کی سلامی کا اسے حق دار بنایا۔

"راجہ گو اتنا مغربی ہو چکا تھا۔ مگر دل سے اصلیت میں ایک دم بلیک نیٹو تھا۔ دھوم

دھڑکے کا رسیا، ہزاروں خوشامدی، حوالی موالی، ناچ گرلز، سازشی مصاحب، بھکاری، پروہت، گھوڑے ہاتھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ گو فلیوٹ بجانا سیکھ چکا تھا۔ مگر اپنے ملک کے وحشیانہ ڈھول اور بانسری کو ترجیح دیتا تھا۔ پلم پڈنگ کا مداح تھا۔ مگر کری اینڈ رائس پر مرتا تھا۔ ان خصائل سے اس کے کردار کی مضبوطی ظاہر ہوتی ہے کہ راجہ کرشنما ہاؤڈی ڈو دراصل مرتے دم تک اپنے وطن اور اپنے دستور کا وفادار رہا ——"

اتوار کی صبح تھی، چارلس بارلو نے گھڑی پر نظر ڈالی اور آرام کرسی پر دراز اطمینان سے اگلا صفحہ پلٹا۔ کتاب اسے بے حد دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔

ایک اور نظم —— "اولڈ ٹائمز لکھتا ہے: فرانس کو معلوم ہونا چاہئے کہ مشرق اولڈ انگلینڈ کی ذمہ داری ہے۔ کہ فرانس کے لئے چندر نگر اور پانڈیچری ہی کافی ہیں۔ ناقابل یقین! کہ فرانس اور زیادہ کی لالچ کرے۔"

پانچ چھ صفحات کے بعد ایک نظم نے چارلس بارلو کو متوجہ کیا —— "صبح کی شہ سواری، جب گاؤں کے مرغے بانگ دیتے اور گائیں ڈکراتیں۔ کاہل چرواہے سو رہے ہوتے۔ تب میں اور اسمتھ مونسون کی ہوا کی طرح جنگل میں سے گھوڑا دوڑاتے نکل جاتے، مندر، ناقوس پھونکتے برہمن، وحشانہ جنگ وجدل کی یادگار قلعوں کے کھنڈر، گاڑی بانوں کے ہجوم، بیلوں کی گھنٹیاں، پنگھٹ، کسی نیٹو رئیس کی گاڑی، لکڑہارے، برابر سے گذر جاتے، گھنٹی بجاتا ڈاک کا ہرکارہ چمڑے کے تھیلے میں ڈاک لئے پاس سے گذرتا تو معلوم ہو جاتا کہ اسٹیشن قریب آرہا ہے، صبح کی بندوق دغتی، منڈی، نیٹو، ہجوم، رنگین پردوں والی بہلی میں سے جھانکتی ناچ گرلز صاحب لوگوں کو دیکھ کر بیباک قہقہے لگاتیں۔ پھر ایک صاحب اور اس کی لیڈی گھوڑوں پر گذرتے، دور سے آبادی نظر آتی۔ ندی، مسجد کے مینار، گنجان نیٹو شہر، دھندلکا حسین مناظر، اور اسمتھ جو اور نیٹیل معاملات میں جذباتی نہ تھا کہتا —— یہ غلیظ نیٹو شہر تم کو حسین نظارہ معلوم ہوتا ہوگا، مجھے تو ——"

"صاحب ——" عبدالغفور نے اندر آکر کہا۔ چارلس بارلو نے کتاب پر سے سر اٹھایا۔ عبدالغفور نے تازہ اخباروں کا پلندہ قریب کی میز پر رکھا، اور واپس چلے گئے۔ چارلس بارلو نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

"پولس والا زکا ڈنر —— کلکٹر مک کال، جونز اس کا مغرور کمپی ٹیشن والا سب، ٹوم کنز سول اور سشن جج، نرم دل ڈاکٹر شارپ سول سرجن جس نے کالرا کے دنوں میں جب جیل کالرا والوں سے بھر گیا تھا دن رات کام کیا۔ اب ڈنر کے بعد ذرا اونگھ رہا ہے۔ ریورنڈ مائیکل دائن اداس بیٹھے ہیں۔ یہ سب بڑے معقول لوگ ہیں۔ مگر مجھ پولس والے کو سال میں دو دفعہ ان کی دعوت کرنا بڑا مشکل کام ہے۔

باتیں شروع ہوتی ہیں۔ مونسون آنے والی ہے جانے کب آئے گی۔ دھان کی فصل شاید اس بار بھی فیل ہو جائے، مک کال کہتا ہے۔ بارش آئے تو چھے کا شکار شروع ہو۔ پھر شکار کے قصے۔ لیکن کمپی ٹیشن والا شکار کے بجائے ذرا انٹلیکچول باتیں کرنا چاہتا ہے۔ شیری اور جنجر کے بعد خاموشی، بڑے بڑے چرٹ سلگائے گئے۔ تاش ہوا۔ ڈاکٹر اب خراٹے لے رہا تھا۔ برانڈی پانی کا دور چلا۔ پھر ہم سب ڈسٹرکٹ گپ سے بور ہو کر اپنے اپنے گھر چلے گئے ——"

"اجاڑ بنگلہ —— سرنگا پٹم میں، کاویری کے کنارے ایک بنگلہ، جس سال ٹیپو گرا تب سے ویران پڑا ہے۔ باغ میں درخت آہیں بھرتے ہیں۔ لنگور شور مچاتے ہیں۔ الو بولتے ہیں۔ دریا کے کنارے قلعہ کی فصیل ہے جو اولڈ انگلینڈ کی طاقت سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گئی۔ آنے والی نسلوں کے لئے ایک سبق! وہ زمانہ جب ہمارے جری نوجوان شیر کی کچھار تک پہنچ گئے تھے، اور اس بنگلہ کے نزدیک وہ معرکہ ہوا تھا۔ محاصرے کے بعد اس بنگلے میں ایک کرنل اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا میں اب بھی تصور میں اس وقت کا نظارہ کر رہا ہوں، خوبصورت بنگلہ، بچیوں کے قہقہے، صبح کی شہواری، جب کرنل اس جگہ سے گذرتے ہوئے اس پھاٹک کو تکتا ہوگا۔ جہاں ٹیپو گرا تھا۔ شہواری کے بعد درختوں کے نیچے بریکفاسٹ، خس کی ٹٹیوں کے پیچھے دن گذارنے کے بعد ٹفن اور گرینڈ پیانو کی آواز۔ اور پھر ایک شام کالا نے دروازہ کھٹ کھٹایا اور ماں اور بیٹیاں اس کے ساتھ چلی گئیں۔ دل گرفتہ کرنل نے اس بنگلہ کو خیرباد کہا۔ اب ان کمروں میں کائی جمی ہے۔ اسی برس سے وہ کمرے سنسان ہیں۔ پیانو اور قالین اور مسہریوں کے پردے گل چکے۔ کاویری کے کنارے —— ! جہاں ٹیپو گرا تھا ——"

اور آگے —— "آج کا اہم سوال ——"

"—— کیا روس کا اولڈ پیٹر ہم کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے؟ کمزور خیوا فتح کر کے اتنا اکڑ گیا! اولڈ پیٹر؟ کیا وہ سمجھتا ہے کہ ہمارا سکھ فوجی خیبر پر ہم سے نمک حرامی کرے گا؟ کیا اس نے غدر کے حقائق سے کوئی سبق نہیں لیا؟ کیا اولڈ پیٹر سمجھتا ہے ہمارے راجگان اس سے جا ملیں گے؟ آنے دو —— ذرا افغانستان سے گذر کر آنے دو۔ ہمارے سکھ کی تلوار خیوا کی تلوار سے زیادہ مضبوط ہے۔ ہم جو روس سے پہلے لڑ چکے ہیں، پھر اسے شکست دیں گے۔ جس قوم پر حکومت کرنا خدا نے ہمیں سونپا ہم اس خدائی امانت کے ساتھ بددیانتی کرتے تو ہمیں ڈر تھا۔ اگر ہم اس ملک پر روس کی مانند کوڑے سے حکومت کرتے، اگر اس ملک کو ہم نے روندا ہوتا، اس کی آبادی سے محبت نہ کی ہوتی۔ سیاہ و سفید میں عدل نہ قایم کیا ہوتا، قحط کے زمانوں میں اپنی محبت نہ بوئی ہوتی۔ تب ہم دشمن سے ڈرتے، چالاک روس! اس سے قبل کہ تم ہمارے تاکستان کو تاکو خود اپنے ایشیائی قبائل کی حالت سدھارو۔ ان کو محسوس کرنے دو کہ ان پر حکومت کی جا رہی ہے۔ ظلم نہیں۔ اپنے اہل خیوا اور اہلِ بخارا پر ثابت کرو کہ تم طاقتور ہونے

کے ساتھ ساتھ انصاف پسند بھی ہو۔ وسط ایشیا کے ایسے نئے آقا بنو جو ماضی کے وحشی قبائلی ایشیائی سرداروں سے مختلف ہو۔ جو ان کو تہذیب سکھائے۔ اگر ہماری اور تمھاری فتوحات کا مقصد یہی ہو تو ہم مشرق میں تمھارے دوست ہیں ـــــ دونوں ترقی کے نقیب، دونوں خوابیدہ اقوام کو جگانے والے، لیکن اگر تمھارا مقصد کچھ اور ہے تو یاد رکھو، ہمارے ہاتھ میں شمشیر ہے۔ ہمیں خداوند تعالیٰ پر بھروسہ ہے۔ جو بہادروں اور منصفوں کے ساتھ ہے۔ اور جو تمھارے مغرور عقاب کو مٹی میں ملا سکتا ہے ـــــ"

ایک اور نظم ـــــ "انگلینڈ ہو ـــ! بمبئی کی بندرگاہ پر سورج چمک رہا ہے۔ گیلنٹ رُڈ پر گھڑیال پر میری رجمنٹ واپس جاری ہے۔ گیارہ برس پہلے ہم چھ سو آئے تھے، تین سو واپس جا رہے ہیں۔ باقی وباؤں نے کھا لئے۔ مشرق پر حکومت کی قیمت ہم بیماری اور موت کے ذریعے ادا کرتے ہیں ـــــ ہندوستان نیلاہٹ میں ڈوب رہا ہے، جہاں میرے تین سو دوستوں کی قبریں ہیں۔ میں اپنا ٹوپ ہلاتا ہوں۔ ہُرّے ہم گھر جا رہے ہیں، ہم ہند کو بھول جائیں گے، خدا حافظ دوستو، وباؤں نے تمھیں کھا لیا۔ انگلستان کی خاطر تم نے اپنی جانیں دیں۔ الوداع۔ سورج کے دیس، ہماری جلاوطنی ختم ہوئی۔"

اگلی نظم ـــــ "اوٹی میں ٹہلتے ہوئے کونسل کا ممبر پیٹر اسٹریٹ جان مک ڈو سے کہتا ہے ـــــ پیٹر ہم کو خدا نے یہ ملک اس لئے دیا تھا کہ ہم اسے متمدن بنائیں، اور جب ہمارا یہ ارفع مشن ختم ہو جائے تو واپس چلے جائیں۔ لیکن ہم کر کیا رہے ہیں۔؟ ہم نیٹوز کو کالج جانے کے لئے کہتے ہیں۔ اور پھر ان کو ایسی نوکریاں دیتے ہیں، جن کے لئے تعلیم کی ضرورت نہیں۔ ہم انھیں شراب نوشی کو منع کرتے ہیں، مگر افیون کی کاشت کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں تم نگر لوگ اپنی عورتوں کو آزادی دو۔ اور وہ پوچھتے ہیں کیوں؟ اور طنز سے ہماری خواتین کی آزادی کی طرف اشارہ کرتے ہیں ـــــ پیٹر اسٹریٹ جب ہم اپنی لڑکیوں کو ایماندار نیٹو جنٹل مین سے شادی کرنے کی اجازت دیں، جب با اثر بابوؤں کو معقول عہدے دیں، کونسل والوں کی تنخواہیں کم کریں، تب ہی اس ذمہ داری کو نبھا سکیں گے، جو خدا نے ہمارے کندھوں پر ڈالی ہے۔

"تب پیٹر اسٹریٹ نے کہا:۔ تمھارا یہ پروگرام ممکن ہے بہت خوشگوار ہو، مگر مجھے تو یہ سب بکواس معلوم ہوتی ہے جو آپ نے فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں ہم کچھ عرصے کے لئے اس ملک کے امین ہیں۔ مگر جناب عالی حقیقت یہ ہے کہ جب تک ممکن ہوگا ہم اس کو اپنے قبضے میں رکھیں گے ـــــ"

"ہمیشہ آگے جاؤ ـــــ

"ہمپٹی ڈمپٹی فرمٹی چندر عاقل برہمن زمانے کی ترقی سے نالاں اور متحیر تھا۔ کیا ویدوں اور شاستروں میں پہلے سے سارا علم موجود نہیں؟ مصلحین ماضی سے متنفر ہیں۔ اور ذات پات کے بندھن توڑنا چاہتے ہیں۔ فرنگی استادوں اور ان کی ایجوکیشن گرانٹس پر لعنت! انھیں کیا معلوم ہندو کی ضروریات

کیا ہیں ؟ ان برہمو سماجیوں پر لعنت جو کہتے ہیں خدا کا میدان بہت وسیع ہے کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔ یہی سب لوگ کالج میں پڑھتے ہیں ـــــ یہی بات کیشپ چندر سین کہتا ہے ـــــ!

"بابو اسمپل بمبل بندر بھی ایک برہمن تھا۔ مگر ترقی کا جوشیلا حامی۔ وہ اور چندر شام کو دروازہ میں بیٹھ کر حقہ پیتے اور باتیں کرتے۔ بازار کا بھاؤ، چاول کی قیمت اور کبھی کبھی زیادہ سنجیدہ موضوع، ذات پات دھرم وغیرہ اور اپنے متضاد خیالات پر بحث کرتے کرتے جھگڑنے لگتے۔ ایک روز بندر نے کہا ـــــ "میں ایک ودھوا سے بیاہ کرنے والا ہوں"۔

"گھاس تو نہیں کھا گئے ہو ؟ حقہ پانی بند کر دیا جائے گا"۔ چندر نے کہا۔

"زمانہ بدل چکا ہے، اب تہذیب ہمیں نئے راستے دکھا رہی ہے۔ تمھیں معلوم نہیں اب ہندوستان کا نعرہ ہے ـــــ ہمیشہ آگے جاؤ"۔ بندر بولا۔

"بکواس"۔ چندر نے چادر سنبھال کر کہا۔ "برہمن ہو تم ؟ غدار ؟ ودھوا سے بیاہ ؟ لعنت ہو"۔ اتنا کہہ کر اس نے بندر کی چپل پر ٹھوکر لگائی تو وہ نیچے بہتی گندی نالی میں جا گری۔ بندر نے چندر کی ناک دبوچ لی۔ دونوں چیختے چلاتے ایک دوسرے کو زدوکوب کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ایک انگریز فوجی نے آن کر ان کو چھڑایا اور چوکی لے گیا۔ اور ان کے احتجاج پر محض اتنا کہا۔ "آگے جاؤ"۔

چارلس بارلو بے ساختہ ہنس پڑا۔ یہ بنگالی کی سچی تصویر تھی، لیکن "سر علی بابا" نے بابو کے متعلق جو پیشین گوئی کی تھی وہ بھی آج لفظ بہ لفظ صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ بابو مغربی علوم اور مغربی خیالات سے پیٹ بھر کے اب دولتی جھاڑ رہا تھا۔ چارلس بارلو نے کاہلی سے سر اٹھا کر الماریوں پر نظر ڈالی۔ لیکن اسے یاد آیا کہ "سر علی بابا کا سفر نامہ" مدتیں گذریں ڈیڈ نے نواب انوار الزماں کو تحفتاً دے دیا تھا۔

گرینڈ ڈیڈ۔ ڈیڈ۔ ماما دونوں چچا سڈنی اور کرسٹفر۔ پھر گریٹ آنٹ ہیبل۔ آنٹ ماڈ آنٹ جیرلڈین۔ آنٹ۔ مٹیلڈا۔ خالص وکٹورین نام۔ بھولی برخود غلط وکٹورین ہستیاں ـــــ پورا بارلو خاندان اسٹڈی کے آتش دان اور دیواروں پر اپنی اپنی تصویروں کے بیش قیمت چوکھٹوں کے اندر محفوظ و مامون موجود تھا۔

جبکہ باہر دور دور بم پھٹ رہے تھے۔

گرینڈ ڈیڈ اور ڈیڈ سلطنت کی اس تباہی پر اپنی اپنی قبروں میں کروٹیں بدل رہے ہوں گے۔ کلکتے اور کھلنا کے انگریزی قبرستان، بارش میں بھیگتے قبروں کے کتبے، سارا ہندوستان انگریزوں کا وسیع و عریض قبرستان ہے۔ اپنی جانیں دے کر ہم نے اس ملک کو سنوارا۔

گرینڈ ڈیڈ ہیلی بری سے ٹریننگ لے کر اڑیسہ آئے تھے۔ انھوں نے ایڈمنسٹریشن میں ان بڈھوں سے ٹریننگ لی تھی، جن کی اپنی جوانی میں محمد رضا خاں اور شتاب رائے زندہ تھے۔ کلائیو، ہیسٹنگز

کارنوالس، ولیم بینٹنگ، میکالے ــــ

کس جانفشانی اور محنت اور محبت سے گرینڈ ڈیڈ اور ان سے پہلے اور بعد کی پیڑھیوں کے سویلینز نے اس ملک کی حکومت کو دنیا کی بہترین حکومت بنایا۔ جلتی دھوپ، لُو، بارشوں، سیلابوں، وباؤں کی پروا کئے بغیر سینکڑوں میل کے فاصلے، گھوڑے پالکیوں اور کشتیوں کے ذریعہ طے کر کے یہ عظیم لوگ، آراضی کا بندوبست کرتے، مقدمے فیصل کرتے، درختوں کے نیچے بیٹھ کر کسانوں کی فریادیں سنتے کسان ان کو مائی باپ کہتے، کمپنی کے اولین دور میں بے شک کرپشن تھا۔ مگر اس کے فوراً بعد ــــ؟ اور کرپشن کیا اس ملک کی پرانی روایت نہیں تھی؟ نذرانہ اور رشوت؟ اب پہلی بار اہل ہند کو احساس ہوا ہے کہ مرکزی اور صوبجاتی حکومت قتل و غارت، لوٹ مار اور زبردستی کا نام نہیں، بلکہ یہ رعایا کی بھلائی اور حفاظت کے لئے قایم ہے، مغلوں کا ایڈمنسٹریشن ــــ؟ اوکسفرڈ میں وہ مسعود علی سے بحث کیا کرتا تھا۔ اشوک، شیر شاہ، اکبر ــــ ٹھیک ہے۔ مگر ان کے بعد؟ اور یہ لوگ کبھی قانون کے تصور سے ناآشنا تھے۔ سارا مشرق قانون کے تصور سے ناآشنا ہے۔

سلطنت روم کی وارث مسیحی یوروپین تہذیب کے بہترین نمائندے برطانیہ نے پہلی بار اہلِ ہند کو قانون عطا کیا۔

اولڈ کارنوالس نے تھانوں اور پولس چوکیوں کا جال بچھا دیا۔ کلیو لینڈ نے آدی باسیوں کو انسان بنایا۔ اٹھارویں صدی میں جیسور کا ایک کلکٹر نیکل اس قدر شفیق تھا کہ عوام نے اس کی مورتی بنا کر اس کی پوجا کی۔ نکلسن کو پنجاب کے کسان پیار سے نکل سائیں کہتے تھے۔ جوناتھن ڈنکن نے بنارس میں دُختر کشی کے خلاف مہم شروع کی۔ جیمز گرانٹ نے دن رات کی انتھک محنت کے بعد ایک دیانت دار اور انصاف پسند ایڈمنسٹریشن قایم کیا۔ یہ دو سو سال کی قربانیاں، عرق ریزیاں، جانفشانیاں سب رائیگاں جائیں گی ــــ؟ اس عظیم کارنامے "برطانوی ہند" کو ہم لاقانونیت اور جذباتیت کے حوالے کریں گے؟ کوئٹ انڈیا اِن ڈیڈ ــــ!

انڈیا ہے کہاں؟ نہرو کے شاعرانہ تخیل میں۔ انڈیا کو ایک بار اشوک نے متحد کیا۔ ایک بار اکبر نے (کوشش کی مگر فیل ہوگیا) اور اب واقعی اسے ہم نے متحد کیا ہے۔ پنجاب میں مقیم لیڈی ولسن نے آج سے نصف صدی قبل بالکل صحیح لکھا تھا کہ یہ ملک لکڑیوں کا ایک گٹھا ہے۔ ہر لکڑی چاہتی ہے کہ دوسری کو توڑ دے۔ ان سب کا بیرونی اتحاد محض برطانوی پرچم کے ذریعے قایم ہے۔

گرینڈ ڈیڈ اپنی اس تصویر میں جو شملہ کے ایک مشہور فوٹو گرافر نے ۱۸۸۱ء میں کھینچی تھی۔ قلم ہاتھ میں لئے کچھ لکھ رہے ہیں۔ یہ تصویر آتشدان پر رکھی ہے۔ گرینڈ ڈیڈ ــــ ایڈورڈ بارلو، برطانوی سویلینز کی اس شاندار روایت کی ایک مثال تھے۔ جنھوں نے اپنی شدید مصروف زندگی کے باوجود اس

ملک کے بارے میں ہزارہا محققانہ اور عالمانہ کتابیں لکھیں۔ یہ ہندوستانی جو آج کل "انڈین کلچر" کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ ان کی یہ "انڈین کلچر" ان کی بے چارے وکٹورین بڈھوں نے دریافت کر کے دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔ آج ہم ان وکٹورین بڈھوں کو بد دماغ، برخود غلط، سمجھتے ہیں۔ اور غالباً وہ ایسے تھے بھی۔ کیا قدیم رومن باقی دنیا کو وحشی نہیں سمجھتے تھے؟ انیسویں صدی کے برطانیہ کا ایک فرد ہونا مذاق تھوڑا ہی رہا ہوگا۔ برٹش امپائر ـــــ! پوری انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ عظیم الشان، باجبروت سلطنت پہلے کہیں قایم نہ ہوئی تھی! چنانچہ یہ بڈھے۔ گرینڈ ڈیڈ اور ڈیڈ اور ان کے ساتھی خود دماغ اور ذرا خبطی سے تھے۔ مگر کیا دولت اور طاقت کے بل بوتے پر امریکہ بد دماغ اور برخود غلط نہیں ہوگیا؟ اور مزید ہوتا جائے گا ـــــ جب کہ اس کے پاس تہذیب بھی نہیں ہے؟

امریکہ ـــــ وائلٹ ـــــ وائلٹ اس وقت کیا کر رہی ہوگی۔ تمھاری صحت ڈارلنگ ـــــ

چارلس بارلو نے مگ اٹھا کر چند گھونٹ بھرے۔ پھر ایڈورڈ بارلو کی تصویر کو دیکھا۔

گرینڈ ڈیڈ، پر کا قلم ہاتھ میں لئے، سیاہ ریشمی ڈورے والی عینک لگائے شدت کی سنجیدگی سے کیا لکھ رہے ہو ـــــ؟

گرینڈ ڈیڈ نے بنگال کے کتنے اضلاع کے امپیریل گزیٹرز پر کام کیا تھا۔ شام کو تھکے ہارے عدالت سے لوٹ کر پھونس کے چھپر والے کسی بنگلے کے برآمدے میں بیٹھ کر، لیمپ کی روشنی میں تم یہ سب لکھا کرتے ہوگے۔ چوکرا۔ سگار لاؤ۔ چاند نکلتا ہوگا۔ مچھر بھنبھناتے ہوں گے۔ تم تنہا بنگلے میں بیٹھے امپیریل گزیٹر کی جلدوں میں ایک جلد ایک باب کا اضافہ کرنے میں جٹے رہتے ہوگے۔ اور "آسام کے ناگا قبائل" گرینڈ ڈیڈ کی مشہور کتاب تھی۔

برابر کی تصویر میں گرینڈ ما بیٹھی ہیں۔ اونچا سا جوڑا باندھے۔ درشت چہرہ۔ سیاہ گاؤن۔ ہندوستان میں برطانوی سوسائٹی کی ایک فراموش شدہ ستون۔ ان کے برابر میں گریٹ آنٹ میبل کی تصویر رکھی ہے۔ (بوڑھا وفادار عبدالغفور جو ولیم کینٹ ویل سے ترکے میں ملا ہے۔ کس احتیاط اور خیال سے روزانہ ان ساری تصویروں کی جھاڑ پونچھ کرتا ہے) گریٹ آنٹ میبل جو گرینڈ ڈیڈ کی بہن تھیں۔ انھوں نے ساری زندگی چرچ آف انگلینڈ کی "زنانہ مشنری سوسائٹی" کا کام کرنے میں صرف کر دی۔ جو ڈیڈ بتاتے تھے۔ ایک روز گوالندو گھاٹ سے تن تنہا اسٹیمر پر بیٹھیں اور دور دراز شمالی مغربی صوبجات[1] کے ایک دور افتادہ ضلع میں مشن قایم کرنے کے لئے یسوع کا نام لے کر چل پڑیں۔ گوالندو سے مونگھیر۔ پٹنہ۔ بکسر، غازی پور، بنارس ـــــ (ہر نام کا اپنا ـــــ رومان تھا) بنارس کے خوفناک

---

[1] موجودہ یو۔ پی

صنم کدے سے وہ اودھ کے شہر سیتاپور پہنچیں۔ وہاں مشن کمپاونڈ میں اسکول اور ہسپتال قایم کیا۔ اور بیچاری جوانی کے عالم ہی میں وہاں ہیضے کا شکار ہوگئیں۔ آج کی یہ تعلیم یافتہ قوم پرست ہندوستانی لڑکیاں آنٹ میبل جیسی بہادر عورتوں کی شکرگزار ہیں۔ جنھوں نے تعلیم کی روشنی ان تک پہنچائی؟

کوئٹ انڈیا! بلڈی فولز ــــــ

اب چارلس بارلو کا سر بھاری سا ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تنہائی میں مجھ پر ماضی کی یاد کے دورے زیادہ پڑنے لگے ہیں۔ اور یہ اچھی بات نہیں۔

ڈیڈ کا آئل پورٹریٹ۔ جو لندن کے کسی دوسرے درجے کے مصور نے ۱۹۰۱ء میں بنایا تھا۔ ڈیڈ تھوڑے سے ڈینڈی تھے۔ ایلن ٹیری اور اوسکر وائلڈ اور آبری بیرڈزلے کے دور کے فیشن ایبل نوجوان۔ جو فرلو پر لندن جاتے تو اپنا سارا وقت تھیٹر اور اوپیرا اور بیلے میں گذارتے GAY NINETIES کے ہنگاموں کے رسیا۔ واپس آتے اور بنگال اور اڑیسہ کے غیر دلچسپ پس ماندہ اضلاع میں اپنے فرائض منصبی میں جُٹ جاتے مگر اپنے لندن کے انٹلکچوئل دوستوں سے خط و کتابت جاری رکھتے۔ کتنے برطانوی منصفوں، صحافیوں اور شاعروں سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ ڈیڈ کو علم نباتات کا شوق تھا۔ انھوں نے بھی گرینڈ ڈیڈ کی مانند ہندوستان کے متعلق لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا۔ آسام کے اور کِڈز کی ان گنت اقسام کی فہرستیں بنائیں اور بنگال اڑیسہ اور آسام کے پودوں اور پھولوں اور درختوں پر ایک مستند اور ضخیم کتاب لکھ ڈالی۔

ڈیڈ کتابیں لکھتے تھے اور مما جنھوں نے اپنی شادی سے قبل کچھ عرصہ تک پیرس میں مصوری سیکھی تھی، ان پھولوں اور پتوں کے سبک اور نفیس اسکیچ بناتیں۔

مما کی تصویر۔ صوفے پر بیٹھی ہیں۔ ڈیڈ پیچھے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ اس تصویر میں ڈیڈ کی کرزن فیشن کی مونچھیں ہیں، مما پیرس کے تازہ ترین فیشن کے گاؤن میں ملبوس ہیں۔

یہ لوگ سب مر گئے۔

گرینڈ ڈیڈ نے اپنے ہندو بنگالی منشی سے فارسی پڑھی تھی۔ اور بنگلہ جانتے تھے۔ ڈیڈ بھی بنگلہ سے واقف تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد ان کا ارادہ تھا کہ وہ اپنا زیادہ وقت لندن میں انڈیا آفس لائبریری میں صرف کریں گے۔ مگر لندن جانے سے پہلے ہی وہ سندربن میں شیر کا نوالہ بن گئے۔

ان سے گاؤں والوں نے درخواست کی تھی کہ اس آدم خور شیر سے بچائیں جو بہت سارے لکڑہاروں کا شکار کر چکا تھا۔ ڈیڈ بے خوفی سے بندوق سنبھال کر اسے مارنے کے لئے اندھیرے جنگل میں گھسے اور زندہ واپس نہ آئے۔

انھوں نے اپنی قیمتی جان دی تاکہ یہ نیم وحشی لکڑہارے زندہ رہیں

گرینڈ ڈیڈ کا انتقال ۱۹۰۷ء میں ہوا۔ جب بنگال میں قتل و غارت شروع ہو چکا تھا۔ انھوں نے بہت لمبی عمر پائی۔ نوجوان وکٹوریہ کی تخت نشینی، کمپنی کی ملازمت، غدر، وکٹوریہ کی موت اور آخر میں خودی رام باسو، سب ہی کچھ دیکھ لیا۔ ان کو پنشن لیتے کافی عرصہ گذر چکا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد وہ وطن واپس نہیں لوٹے۔ انھوں نے دارجلنگ اور کلکتے میں بے حد خوبصورت کوٹھیاں بنوائی تھیں اور اپنا وقت علمی مصروفیات میں صرف کرتے تھے۔ کلکتہ یونی ورسٹی کی سینیٹ۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ یہ اور وہ۔ چند برہمو مصلحین بھی ان کے دوست تھے۔ گویا واقعہ ہے کہ وہ نیٹوز سے برابری کی سطح پر کبھی نہ ملے، اور حاکم و محکوم کی شعوری دیوار قایم رکھی کہ ایمپائر کی سلامتی اسی میں مضمر تھی۔

گرینڈ ڈیڈ کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ وکٹورین دستور کے مطابق بہت بڑا کنبہ تھا۔ مگر صرف یہ سات بچے ہندوستان کے ملیریا اور دوسری بیماریوں سے زندہ بچے تھے اور دستور کے مطابق (تاکہ ہندوستانیوں کی بُری خصلتیں نہ سیکھ لیں) چھ چھ سال کی عمر میں انھیں تعلیم و تربیت کے لئے انگلستان بھیج دیا گیا۔ بڑے ہو کر ڈیڈ کے سب سے بڑے بھائی فوجی افسر بن کر ہندوستان لوٹے لیکن کابل کے مارچ میں کھیت رہے۔ منجھلے بھائی نے لنکا میں چائے کی کاشت شروع کی اور وہاں کے متمول پلانٹر بنے۔ ڈیڈ جو ان دونوں سے زیادہ ذہین تھے، انڈین سول سروس کے مقابلے میں آگئے اور اس کے فوراً بعد ہی ماما کو بیاہ کر ہندوستان لوٹے۔

آنٹ ماڈ کی تصویر۔ روکھی پھیکی شخصیت، سفید گاؤن۔ ہاتھ میں بائیبل۔

آنٹ جیرلڈین کی تصویر۔ خوش شکل متبسم، شریر آنکھیں، فیشن ایبل گاؤن، گلے میں موتیوں کا ہار، گود میں کتا، ہاتھ میں پنکھا ——

آنٹ ٹیلڈا کی تصویر —— متبسم بھولی صورت، یہ تینوں تصویریں ایک ایک بک شلف پر رکھی ہیں۔ یہ تینوں وکٹورین خواتین ڈیڈ کی بہنیں تھیں۔ تینوں اڑیسہ کے مختلف اضلاع میں پیدا ہوئیں۔ آنٹ ماڈ سب سے بڑی۔ شادی نہیں کی۔ یہ ابھی پھوپھی میبل بارلو کے مانند اہل مشرق کی روحیں بچانے میں جُٹی رہیں۔ گریٹ آنٹ میبل نے اس سلسلے میں صرف گوالندو گھاٹ سے ستیاپور تک کا سفر کیا تھا۔ آنٹ ماڈ نے چینیوں کی روحانی نجات کی خاطر گن بوٹ سیاست اور مشرقی ایشیا کی کولونیل جنگوں کے پُرخطر زمانے میں تنہا کینٹن تک کا سفر کیا۔ برسوں وہاں رہیں اور باکسر بغاوت کے زمانے میں جب باغیوں نے ان کے مشن کمپاؤنڈ پر حملہ کیا۔ وہ چند برطانوی بلجین اور امریکن مشنری خواتین سمیت جیزس کی خاطر شہید ہوئیں۔ سرزمین چین میں ان کی قبر بنی۔

آنٹ جیرلڈین —— خوبصورت اور فلرٹ۔ لندن میں ایک بیرسٹر سے شادی کر لی۔ آنٹ ٹیلڈا بھی بہت خوبصورت اور پیاری سی تھیں۔ ڈیڈ کی پسندیدہ بہن۔ دارجلنگ میں ایک فوجی

افسر (بنگال لانسرز) اُن پر عاشق ہوا۔ مگر منگنی کے بعد ان کو دغا دے کر بھاگ گیا۔ دل شکستہ آنٹ ٹیلڈا ابھی مذہب کی طرف راغب ہوئیں۔ گارو ہلز میں نیا مشن کھولا۔ گرینڈ ڈیڈ کو ناگا قبائل سے بہت محبت تھی۔ انھوں نے آنٹ ٹیلڈا کی ہمت افزائی کی۔ آنٹ ٹیلڈا اب بوڑھی ہو چکی ہیں اور لندن میں آبائی مکان میں رہتی ہیں۔

ڈیڈ اور مما کے ہاں تین بچے زندہ رہے۔ ایلس، چارلس اور رچرڈ۔ وہ تینوں بھی بچپن میں انگلستان بھیج دیئے گئے۔

ایلس بارلو۔ عجیب بات ہے۔ وکٹورین انگلستان مذہبی نہیں تھا۔ انگریز زیادہ مذہب پرست کبھی نہیں رہا۔ مگر مشرق میں آکر سب پر مذہب کا جوش سوار ہو جاتا تھا۔ غالباً یہاں کے عجیب و غریب لیکن دلچسپ مذاہب سے غیر شعوری مدافعت۔ ایلس کو مشنری بننے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ ایلس جدید زمانے کی لڑکی تھی۔ کوئی اور پیشہ اختیار کر سکتی تھی۔ اسے گریٹ آنٹ میبل اور آنٹ ماڈ اور آنٹ ٹیلڈا کی روایات سے متاثر ہونے کی ضرورت کیا تھی؟ یہ میری سمجھ میں کبھی نہ آیا۔ غریب ایلس شادی کر سکتی تھی۔ بہت ہی معمولی شکل تھی پھر بھی یقیناً اس کی شادی ہو سکتی تھی۔ وہ پچھلے بیس برس سے گارو کی پہاڑیوں میں، آنٹ ٹیلڈا کا قایم کیا ہوا مشن چلا رہی ہے۔ ناگا قبائل ہی اس کی ساری کائنات ہیں۔

مشنری عورتوں کو اس ایثار اور قربانی کا صلہ کیا ملتا ہے؟ افریقہ کے جنگل، ایشیا کے جنگل، مصائب، پریشانیاں اور آخر میں تنہائی اور بڑھاپا۔ یا کسی وحشی کے ہاتھوں موت ـــــ کیوں؟ ایسا یہ لوگ کیوں کرتی ہیں؟ کیا ان کو واقعی یقین ہے کہ آسمانی بادشاہت ملے گی؟

بارلو خواتین کا تو بہر حال سینٹ پیٹر استقبال کرتے کرتے بولا جائیں گے۔ میبل۔ ماڈ۔ ٹیلڈ۔ ایلس

چارلس بارلو کمرے کا چکر لگا کر پھر اپنی آرام کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ اتنی دیر سے اپنے خاندانی تصاویر کا مطالعہ کر رہا تھا، مگر ایک گروپ فوٹو جو اس کے ساگوان ڈیسک پر رکھا تھا۔ اس کی طرف سے اس نے نظریں چرالیں۔ وہ تینوں اسے زور زور سے پکار رہے تھے۔ اس کی بیوی وائلٹ، اس کے بچے ٹام اور کیرل۔ وہ تینوں اس وقت ڈھاکے سے ہزاروں میل دور جنگ کے مہیب شعلوں میں گھرے انگلستان میں موجود تھے۔

بوڑھی اور بہادر آنٹ ٹیلڈا بھی جو ۱۹۴۰ء کی بلٹز کے زمانے میں اطمینان سے اپنے پلنگ پر سویا کرتی تھیں (وائلٹ نے لکھا تھا)

آبائی مکان کی تصویر۔ ۱۴ اینڈریوز کریسنٹ ـــــ یہ تصویر بہت چھوٹی سی ہے اور ٹام نے اپنے بے بی براؤنی سے کھینچ کر اسے بھیجی تھی۔ آنٹ ٹیلڈا پورچ کی سیڑھیوں پر بلی گود میں لئے

کھڑی ہیں۔ کیرل قریب ہی کتے سے کھیل رہی ہے۔ (دائلٹ تصویر میں نہیں ہے) یہ تصویر لکھنے کی میز پر بلاٹنگ پیڈ کے کونے میں اڑسی ہوئی دو سال سے اسی طرح رکھی ہے۔ اس دو سال میں لندن پر کیا قیامت گذر گئی

آبائی مکان۔ ریجنسی طرز کا یہ مکان گرینڈ ڈیڈ کے والد نے جو سٹی میں سولسٹر تھے۔ ۱۸۱۲ء میں خریدا تھا ——

مکانوں کی زندگی۔ انسانوں کی زندگی۔

اب میں پھر ماضی کی طرف واپس لوٹتا ہوں۔ چارلس بارلو نے لمبا سانس بھر کر "نغماتِ ہند" دوبارہ اٹھالی۔ کتاب کے پیلے ورقوں میں سے جو پرانی مہک آرہی تھی وہ اسے بہت اطمینان بخش معلوم ہوئی۔ ماضی محفوظ ہے۔

یوروپین اور امریکن ہمیشہ متعجب رہتے ہیں کہ انگریز اتنا غیر جذباتی ہوتے ہوئے بھی اتنا ماضی پرست کیوں ہے۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ ہم لوگ کتنے جذباتی ہیں۔ اور دوسری بات یہ —— اس نے بوتل سے مگ میں بیئر انڈیلی —— کہ ہمارا ایسا ماضی اور کسی قوم کا ہے ہی نہیں۔ لاجواب، بے مثال، درخشاں۔

ایسا درخشاں بھی نہیں۔ ذرا ہندوستانیوں سے پوچھو۔

وہاٹ دی ہل۔

اب مما بے طرح یاد آرہی ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے واٹر کلر ڈرائینگ روم میں سجے ہیں بنگال کے دو مناظر —— سنہری پاٹ سے لدی ہوئی کشتی، دور دھندلکے میں مسجد کا مینار اور برگد تلے کھڑا کالا بھجنگ کسان۔ سامنے الماری میں مما کے واٹر کلرز کا البم رکھا ہے اور اسکیچ بک —— دارجلنگ کے چیتھڑوں میں ملبوس پہاڑی بچے۔ اور کڈ کا ایک گچھا۔ فرن کے پتے۔ کرشن چوڑا کی شاخ۔ اپنے وفادار نیٹو ملازموں کے اسکیچ۔ اپنے تینوں بچوں کی تصویریں۔ ایلس عمر پندرہ سال، چارلی عمر گیارہ سال، ڈِک عمر دو سال۔

ڈِک —— ونگ کمانڈر رچرڈ بارلو —— ڈیشنگ۔ بشاش۔ خوبصورت، سنہری آر۔ اے ایف مونچھیں۔ یونیفارم پر تمغوں کی قطار، یہ ایک اور تصویر ہے جو سامنے میز پر رکھی ہے۔ جسے میں نہیں دیکھنا چاہتا ——

ونگ کمانڈر رچرڈ بارلو —— "پرانے بنگال سویلین ایڈورڈ بارلو مرحوم کا پوتا۔ جیمز بارلو مرحوم کا چھوٹا بیٹا۔ مسٹر چارلس بارلو، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مرشد آباد کا چھوٹا بھائی۔ عمر اٹھائیس سال۔ جرمنی پر بمبار طیاروں کی قیادت کے لئے گیا اور زندہ واپس نہ آیا۔" پچھلے سال اسٹیٹسمین میں شایع ہوا تھا۔

ماضی کی طرف لوٹو چارلی۔ ماضی محفوظ ہے۔ پُرامن۔ پُرسکون۔ چارلس بارلو سر ہلا کر تلخی سے ہنس پڑا۔ سامنے کے بُک شیلف میں پچھلی جنگوں کے متعلق سنہری مجلد کتابیں ایک قطار میں رکھی تھیں۔ فرسٹ اینگلو فرنچ وار ۱۷۴۸-۴۴ء، کرناٹک وارز، پلاسی، فتح مسولی پٹم، بکسر، فرسٹ میسور وار، روہیلہ وار، فرسٹ اینگلو مرہٹہ وار، سیکنڈ میسور وار، تھرڈ میسور وار، فورتھ میسور وار، سیکنڈ مرہٹہ وار، اینگلو گورکھا وار، پنڈاری وار، تھرڈ اینگلو مرہٹہ وار، فرسٹ برمیز وار، فرسٹ اینگلو سکھ وار، سیکنڈ اینگلو سکھ وار، سیکنڈ اینگلو برمیز وار، سنتھال بغاوت، سپاہی میوٹنی، معرکہ انبالہ، بھوٹان وار، سیکنڈ اینگلو افغان وار، تھرڈ اینگلو برمیز وار، منی پور بغاوت، سرحدی بغاوت ——

یہ تو صرف پچھلے دو سو سال میں برطانیہ کی مشرقی فتوحات تھیں۔ ہزاروں لاکھوں کرسٹفر اور رچرڈ بارلو ان معرکوں میں کھیت رہے۔ یورپ کی جنگوں میں کتنے رچرڈ ——

"عبدالغفور"۔ چارلس نے دفعتہً گرج کر آواز دی۔

عبدالغفور چند سکنڈ میں نمودار ہوئے۔

"گوسل کا پانی لگاؤ"۔

"جی صاحب"۔ عبدالغفور غائب ہو گئے۔

بہت خون بہایا میرے آبا نے۔ چارلس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ پرانے رومنوں کی مانند، مگر پرانے رومنوں کی مانند انھوں نے علم و فن کو بھی مالا مال کر دیا۔

مارس اور منروا کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

اس نے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ پرانی کتابیں اور پرانی تصویریں، یادوں کا قبرستان۔

اڑتیس سال میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ کیوں کہ میری عمر اڑتیس نہیں ہے۔ میرے عقیدے کی عمر انیس سو بیالیس سال ہے۔ ذہنی اعتبار سے ڈھائی ہزار سال، تاریخی اعتبار سے ڈیڑھ ہزار سال اور نسلی یادداشت کی عمر کتنے ہزار سال —— ؟ ہر سوچنے والے یوروپین انسان کی یہ سب عمریں ہیں۔ ہر ہندوستانی کی عمر کتنی ہے؟ غالباً لامحدود۔

پھر ہم اپنے نام رکھتے ہیں۔ ایڈورڈ، جیمز، چارلس، ٹامس، خاندانی نام بارلو، جو ہمیں ایک پرانے دھندلکے سے جا ملاتا ہے اور جس کی وجہ سے ہمیں مستقبل میں بھی اپنے پاؤں جمائے رہنے کی خوشگوار امید ہے۔ یہودیوں اور عربوں کا دستور ہے —— فلاں ابن فلاں ابن فلاں۔ کیا خود پسندی ہے۔

سچے گیانی میں اتنی خودی بھی نہیں کہ وہ اپنا نام تک لکھے۔ کس اپنشد میں ہے؟

ڈیڈ بتاتے تھے کہ مونیر ولیمز نے کسی گاؤں کے برہمنوں سے دستخط کرنے کے لئے کہا، انھوں نے جواب میں صرف نمو بھگوتے اور ادم لکھ دیا ——

"صاحب پانی تیار ہے"۔ عبدالغفور نے اطلاع دی اور غائب ہو گئے۔

چارلس سر جھکائے بیٹھا رہا۔

آخر میں سب مر جاتے ہیں۔

ڈیڈ کو ہندوستان کے متعلق انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے پہلے ایڈیشن جمع کرنے کا شوق تھا۔ ان الماریوں میں وہ ساری کتابیں موجود ہیں۔ گرینڈ ڈیڈ اور ڈیڈ کا کتب خانہ۔ ان کتابوں کے مصنف ـــــ جان کمپنی کے افسر، انڈین سول سروس کے افسر، فوجی، مشنری، ماہرین تعلیم، پلانٹر، ان کے بھوت پھونس کی چھتوں والے بنگلوں میں اب بھی منڈلا رہے ہوں گے ـــــ

یہ کتابیں ـــــ زراعت اور جنگلات۔ آرکیالوجی، رسل و رسائل اور سول انجینئرنگ، تعلیم، ایتھنولوجی اور سوسیولوجی ("آسام کے ناگا قبائل از ایڈورڈ بارلو آئی، سی۔ ایس"۔ چارلس نے فخر سے سوچا۔ نام مستقبل کے گرد آلود کونوں کھدروں میں بہر حال محفوظ رہے گا۔ کتاب کی جلد پر لکھا ہوا نام، اور قبر کا کتبہ۔ نام) قانون، ایڈمنسٹریشن، طب، فلسفہ، نیچرل ہسٹری، سفرنامے، جغرافیہ ـــــ کلکتے کا جیمز پرنسپ جس نے خروشٹی میں یونانی نام دریافت کئے اور اشوک کے کتبوں کی عبارت پڑھی۔ کننگھم۔ جان مارشل، جیمز فرگسن، ہیول، گرانٹ ڈف، کرنل ٹاڈ، ونسنٹ اسمتھ، مور لینڈ، جیمز مل، وارن ہیسٹنگز، ولیم جونز، گرہم بیلی، چارلس ایلیٹ، ولسن گرفتھ، جارج سیل ـــــ آرٹ ہسٹری، لسانیات، مذاہب

اور دلچسپ ناول۔ جو اب مضحکہ خیز لگتے ہیں۔ اور جدید ہندوستانیوں کے ہاتھ میں پڑ جائیں تو وہ ان کو نذر آتش کر دیں ـــــ جن کے ہندوستانی کردار "نیٹو اور نگر" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ ہنٹی (گڈ اولڈ، ہنٹی) میرین کرافرڈ، ماڈ ڈائیور، کرنل میڈوز ٹائیلر کے ناول ـــــ "ایک ٹھگ کے اعترافات"۔ "سیتا"، "تارا"، "ٹیپو سلطان"۔ ! فلورا اینی اسٹیل۔ ایف۔ ڈبلیو بین ـــــ ہر اسٹیشن کے کلب کی لائبریری میں یہ ناول موجود ہوتے تھے ـــــ

اور بچوں کے لئے کتابیں جو ہم سب نے بچپن میں پڑھیں۔ لٹل آرتھر اور اس کا بیرہ"۔ لٹل آرتھر کی ہسٹری"۔ "لٹل آرتھر ـــــ"

غدر کے متعلق کتابوں کے انبار، اور پھر کپلنگ ـــــ!

لاہور اور پشاور کی پُراسرار گلیاں، چنڈو خانے، گنگا داس اور سدھو، اور ولی داد اور لالن طوائف لاہور کی لالن طوائف غالباً کپلنگ کا علامتی کردار تھی ـــــ مغرب کے لئے علامتی کردار ـــــ ایک خطرناک، پُرکشش بے ایمان عورت ـــــ ہندوستان۔ جو انگریز اس جادوگرنی کے ہلاکت خیز سحر کا شکار ہوا وہ بہت جلد اپنا کردار کھو بیٹھا۔ پھٹیچر ہو گیا۔ اس لئے ہمیشہ الگ تھلگ

بنے رہو۔ اس تاریک اور بھیانک جنگل میں ایمپائر کے اسٹینڈرڈ کو قایم رکھو۔ (اسی وجہ سے گرینڈ ڈیڈ اور گرینڈ ماڈیڈ اور مما اڑیسہ اور آسام کے ویران ڈاک بنگلوں میں شام کو باقاعدہ اس طرح کپڑے بدلتے تھے گویا لندن کے سوآئے میں ڈنر کھانے جا رہے ہوں)

چارلس بارلو اٹھ کر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ یہ ڈی۔ ایمز ہاؤس، اس کے ملازم، اس کا باغ، یہ سب چیزیں اسی مستحکم نظام اور روایات کا ایک جزو ہیں۔ یہ سحر انگیز اینگلو انڈین دنیا جو دو سو سال سے اس ملک میں آباد ہے ـــــ اس کے جانے بوجھے کردار اور جزویات، کلکتہ، شملہ، ہل اسٹیشن، مفصل اضلاع، صوبے، ہر صوبے کا سویلین خود کو اس صوبے سے مماثل کرتا تھا۔ پنجاب سویلین، سندھ سویلین، بنگال سویلین، سندھ کلب، بنگال کلب۔

یہ مضبوط اور مستحکم اینگلو انڈین[1] معاشرہ۔ یہ کسی لفٹ ونگ ہندوستانی انٹلکچوئیل نے سچ کہا ہے کہ انگریز ہندوستان کو کنٹری اسکوائر یا زمیندار کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہندوستانی صوبے گویا ان انگریز حاکموں کی ذاتی زمینداریاں تھیں۔ جس میں ہم پلہ لوگ یا انسان دوسرے یوروپین تھے۔ اہل برطانیہ ہندوستان میں ملازمت کرنے والے اپنے ہم وطنوں کو "انڈین"۔ "انڈین سویلین"، یا "انڈین باکس والا"، یا "انڈین آفیسر" کہتے تھے۔ ہندوستانی محض "نیٹو" تھا۔ اور اس قابل نہ تھا کہ اس کا تذکرہ کسی مہذب سیاق و سباق میں کیا جائے۔

"پنجاب کا اولڈ جارج کل مجھے جم خانہ میں ملا تھا ـــــ" بالکل جس طرح ڈیوک اپنی ریاستوں سے مماثل کئے جاتے ہیں اور جس طرح انگلستان کا کنٹری اسکوائر اپنی رعیت کا خیال رکھتا تھا۔ اسی شفقت اور خیال سے ہم لوگ اپنی رعیت سے یہاں پیش آئے۔ زیادہ دل سوزی اور محبت سے، کیونکہ یہ رعایا بچوں کی طرح احمق اور جانوروں کی طرح جنگلی تھی۔ نسلاً بعد نسلاً ان سب سویلینز کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے ایک بڑی عظیم اخلاقی اور روحانی ذمہ داری ان کو سونپی ہے ـــــ برطانوی ہند کی حکومت! (غدر کے متعلق ہربرٹ ایڈورڈ نے کہا تھا کہ یہ خدا نے ہم کو اس غفلت کی سزا دی ہے کہ ہم نے عوام کو عیسائیت کے اصولوں سے آشنا نہیں کیا۔) اور خدا کی قسم ہم نے اس ذمے داری کو بہت خوب نبھایا۔ ہم تاریخ سے شرمندہ نہیں ہیں۔

کوئٹ انڈیا ـــــ!

اسی اخلاقی برتری اور دیانت داری کے بل بوتے پر ہم مٹھی بھر انگریز چالیس کروڑ ہندوستانیوں پر اطمینان سے حکومت کر رہے ہیں۔

---

[1] انیسویں صدی میں ہندوستان میں رہنے والے یا یہاں ملازمتیں کرنے والے انگریزوں کو اینگلو ایڈین کہا جاتا تھا، مخلوط نسل والا طبقہ "ہاف کاسٹ" یا یوریشین کہلاتا تھا۔

گو کبھی کبھی ہماری ماؤں کو رات کے وقت ہمیں برآمدوں میں مچھر دانیوں کے اندر سلاتے ہوئے یک لخت یہ دہشت آدبوچتی تھی کہ اندھیرے میں سے نمودار ہو کر ٹوم ٹوم بجاتے نیٹو حملہ نہ کر دیں۔ ۵۷ء کی طرح۔ یہ واقعہ ہے کہ غدر کی یاد ہمیں ہمیشہ HAUNT کرتی رہتی ہے۔

اور گو یہ حقیقت تھی کہ اہل ہند برٹش راج کی برکتوں کے معترف تھے۔ اور ایک عام ہندوستانی عدالت میں ایک ہندوستانی جج کے فیصلے کے مقابلے میں انگریز جج کے فیصلے کو ترجیح دیتا تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ تھا کہ غدر کے بعد ہنری لارنس نے کہا تھا کہ ہندوستانی اپنے دیوانے بادشاہوں کے زیر حکومت خوش تھے، اصول پرست کمشنروں کے زیر نگین خوش نہیں۔

کوئٹ انڈیا ——

یقیناً ہم نے بھی غلطیاں کی ہیں، شاید۔ امپیریلزم بذات خود سب سے بڑا جرم ہے، مگر ہماری جیسی بابرکت امپیریلزم ——؟ فرانس، ہالینڈ اور بلجیم کی کولونیوں کی کیا ناگفتہ بہ حالت ہے؟ ناقابل یقین۔

بہر حال "الف چیم" والا زمانہ تو مدتیں ہوئیں، پچھلی جنگ عظیم سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

غدر سے پہلے اضلاع میں سوشل زندگی کے مرکز یوروپین چرچ اور اسمبلی رومز تھے، یوریشین طبقہ اپنی اچھوت حیثیت پہچانتا تھا اور الگ رہتا تھا۔ پھر یہ اسمبلی رومز "کلب" میں تبدیل ہوئے۔ ڈانس، بلیرڈ، شوقیہ ڈرامے، گرینڈ ڈیڈ کا ہندوستان، ڈاک گاڑیاں، کتے گاڑیاں، بگھیاں، پالکیاں، (پالکی بردار PALANQUIN BEARER بیرہ بن گیا) کلکتہ کا ایڈن گارڈن جہاں شام کو بینڈ بجتا تھا۔ پارسیوں کی دوکانیں۔

اسٹیشن کے چند افسر ایک دوسرے سے ہی ملتے رہتے۔ میمیں دن بھر ایک دوسرے کو چٹیں بھیجا کرتیں۔ پھر ٹینس، پولو، شکار، انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان اتنا دلچسپ ہو چکا تھا کہ ہوم سے اکثر لوگ چھٹیاں گذارنے یہاں آتے۔ گو ہندوستان سے ان کی مراد یہاں کی برطانوی سوسائٹی تھی۔

جاڑوں میں گرینڈ ڈیڈ دورے پر جاتے۔ جب گرینڈ ڈیڈ اور دوسرے صوبوں میں ان کے ساتھی افسر دورے پر نکلتے تو عہد رفتہ کے مغل صوبے داروں کے لاؤ لشکر کا گمان ہو سکتا تھا (یہ واقعہ ہے کہ ہم نے مغلوں سے حکومت چھین کر تزک و احتشام میں ان کی نقل کرنے کی پوری کوشش کی۔ وائسرائے کی شان و شوکت ——!) بنگال میں کشتیوں اور اسٹیمروں پر اور دوسرے صوبوں میں بیل گاڑیوں اور اونٹوں پر لد کر سارا ساز و سامان کیمپ میں ساتھ جاتا۔ بھاری فرنیچر، تصویریں، چاندی کے ظروف، ہر چیز۔ تاکہ سلطنت کے نمائندے کا دبدبہ اور رعب جنگل اور دیہات میں بھی قایم رہے۔ لشکر میں کتے، گائیں، بکریاں، مرغیاں، سواری کے گھوڑے کیا کچھ شامل نہ ہوتا۔ بڑے صاحب کے

خیمے، قالین تصویروں اور گلدانوں سے سجائے جاتے۔ خورونوش کی اشیا ٹین کے ڈبوں میں بمبئی کے آرمی اینڈ نیوی اسٹورز سے آتیں۔ کچھ فاصلے پر نیٹو افسروں کے خیمے لگتے اور گاؤں والے آکر وہاں اپنا بازار لگاتے۔

سالِ نو پر ڈپٹی کمشنر کا دربار لگتا۔ دربار میں زمیندار نذریں پیش کرتے، جن کو صاحب ہاتھ لگا کر واپس کر دیتا ـــــ بڑے صاحب کے دربار میں کرسی ملنا نیٹو جنٹل مین کے لئے بے حد عزت کی بات تھی۔

کلکتے اور شملے میں قیصر کی جرمن ایمپائر کے سفیر رہتے۔ جرمنی اور برطانیہ کی تجارتی جنگ شروع ہو چکی تھی، جرمن مصنوعات کی ہندوستانی بازاروں میں ریل پیل تھی لیکن نو آبادیوں سے فائدہ اٹھانے کی اس ریس کا نتیجہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کی صورت میں رونما ہونے میں ابھی بہت عرصہ باقی تھا۔

نیٹو سوسائٹی سے علیحدگی کی ایک فصیل اینگلو انڈیا نے اپنے گرد کھڑی کر رکھی تھی، مگر خود اس فصیل کے اندر برطانیہ جیسی شدید کلاس سسٹم نہیں تھی۔ انڈیا ایک آؤٹ پوسٹ تھا اور یہاں سب کو ایک دوسرے کے ساتھ مرنا جینا تھا۔ زندگی زیادہ بے تکلف تھی۔ برطانیہ اپنے بہترین نوجوان یہاں حکومت کرنے کے لئے بھیجتا۔ مگر وہاں کے بدترین نمونوں کو یہاں قسمت آزمانے کے لئے بھیج دیا جاتا۔ عموماً اونچے خاندانوں کے یہ ناخلف لڑکے، زیادہ ایڈونچرس ہوتے۔ ملک میں امن وامان، ترقی و خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ اور ایک عام جاہل ہندو "ملکہ وکٹوریہ" کو دیوی ماتا سمجھنے لگا تھا۔ (مرنے سے پہلے وکٹوریہ نے لارڈ کرزن سے کہا تھا:- BE KIND TO MY POOR INDIANS

اس ملک کی قدیم روایت تھی کہ بادشاہ پرجا کو درشن دیتا تھا۔ اور پرجا اس سے فریادی ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے اکثر ہندوستانی امرا اپنا سارا اثاثہ فروخت کر کے، صعوبتیں اٹھا کر، اپنے مقدموں کی اپیل کے لئے لندن جاتے تاکہ ملکہ سے خود فریادی ہوں۔ زیادہ تر نامراد لوٹتے یا غریب الوطنی کے عالم میں مر جاتے، حاکم کے حکم کی اطاعت اور صاحبان اقتدار کا خوف اس ملک کے عوام کی سرشت میں داخل ہے۔ لہذا کیا تعجب ہے کہ اہل ہند ہماری اطاعت گذار رعایا بن گئے اور ملکہ کو اپنی ماں سمجھنے لگے؟

غدر کے بعد انڈین سول سروس قایم ہوئی اور "کمپی ٹیشن والا" اینگلو انڈین منظر پر نمودار ہوا۔ مغرور، خود پسند، ایلی بری کے بجائے ادکس برج کا تعلیم یافتہ، جو "باکس والا" یعنی اپنے ہم قوم تاجر کو بھی ذرا حقیر سمجھتا تھا۔ یہ نیا سویلین خالص امپریلسٹ تھا۔ غدر سے پہلے کی زیادہ روادار برطانوی روایات اور ہندوستان کی اس دلکش نیٹو تہذیب سے بالکل ناواقف جو غدر کے بعد ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ ڈیڈیہ نئے سویلین تھے۔ اور ہندوستان کی برطانوی سوسائٹی کی نئی اور شدید کٹر کاسٹ سسٹم کے ایک

فرد۔ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے نمائندے اور دنیا کی ارفع ترین ملازمت کے رکن، مغرور، خود ماغ لیکن جو حقیر لکڑہاروں کی جانیں بچانے کے لئے اطمینان سے لقمۂ اجل بن گئے انسانی فطرت کے۔ برطانوی کردار کے یہ تضاد ــــ!

چارلس بارلو دریچے سے ہٹ آیا۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔

شملہ برطانوی دیوتاؤں کا مسکن تھا۔ اضلاع کے کلکٹر اور کمشنر عموماً اپنے اپنے صوبوں کے پہاڑوں پر جاتے تھے۔ دارجلنگ میں ہماری دلفریب کوٹھی، پہاڑ ہمیں اپنے وطن کے مناظر اپنے وطن کی خوشگوار سردی کی یاد دلاتے تھے۔ ہمارے حسین ہل اسٹیشن، ہمارا پیارا ہندوستان۔

یہ واقعہ ہے کہ ہم سب، ہماری ساری قوم اس ملک کے سحر سے نہیں بچ سکی۔ اس کی گرمی، غلاظت اور کمینگی کے باوجود۔

ہماری یہ مخصوص دنیا۔ وطن واپس جاکر بھی جس کی یاد ہمیں ستاتی رہتی ہے۔ یہ مخصوص زبان جو ہم نیٹوز کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، بندوبست، شاباش، سب برابر، کوب مالوم ہائے۔ کپڑ داریو سُور۔ شاندہ بوٹ اچا۔ بڑا کھانا، بڑا تماشا۔ ایڈورڈ لیئر کی نظمیں ــــ

بیک وقت نفرت و محبت کا یہ عجیب و غریب رشتہ۔ لارڈ مورلے نے صحیح کہا تھا۔ میں مغربی ہوں، مشرقی نہیں۔ میں بہت زیادہ مشرقیت کبھی اختیار نہیں کر سکتا۔

یہ بھی واقعہ تھا کہ عموماً انگریز، میل جول میں مسلمانوں کو ترجیح دیتے تھے۔ کیونکہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ مہذب تھا۔ ہندوؤں کو ہمارا یہ ترجیحی سلوک قدرتی بات ہے کہ بہت بُرا معلوم ہوا۔

اوکسفرڈ میں مسعود علی اور رامانا تھن سے ہندو مسلم سوال پر کتنی لمبی لمبی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔

صبح سے تازہ اخبار آئے رکھے ہیں۔ میں نے ابھی تک کچھ نہیں پڑھا۔ سرخیاں دیکھتے ہوئے آج ڈر سا لگ رہا ہے۔ برطانوی ہمت اور بہادری۔

وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ پائپ جلایا، اب غسل کے لئے جانا چاہئے۔

مسعود آج کل پنجاب میں کلکٹر ہے۔ رامانا تھن مراٹھا کنٹری میں کہیں تعینات ہے۔ دونوں اپنی بحثوں میں ظاہر کرتے تھے کہ برطانوی حکومت سے متنفر ہیں۔ اور دونوں کی شدید تمنا تھی کہ آئی۔ سی۔ ایس میں لے لئے جائیں۔ دونوں اس وقت اس برطانوی حکومت کے ارفع ترین ملازمت کے اراکین ہیں! اپنے ہم وطنوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور زمین پر قدم نہیں دھرتے۔

آہ ــــ ہندوستانی کردار ــــ! ہندوستانی کردار!

مگر وہ انقلابی جو اس حکومت کی بیخ کنی کے درپے رہے ہیں، مجھے وہ بھی مضحکہ خیز لگتے ہیں۔

اصلیت غالباً یہ ہے کہ مجھے صرف اپنے نوکر، بھشتی اور خدمت گار، رینگتے سلام کرتے، "مائی، باپ، غریب پرور" کہتے، کسان اور جاہل اور قابل رحم ہندوستانی اچھے لگتے ہیں۔ پچھلے دو تین سو سال سے مراقش سے چین تک اہل مشرق کی پسماندگی اور جہالت کا بھرپور تجربہ کر چکنے کے بعد ہم انھیں اپنے جیسا انسان سمجھنے کے لئے غالباً ابھی تیار نہیں۔

جب چارلس بارلو سول سروس میں شامل ہوا اس وقت دہشت پسند تحریک ایک بار پھر زور پکڑ چکی تھی۔ پچھلی صدی کے لبرل مصلحین کے مقابلے میں سامنے آنے والے جوشیلے قوم پرستوں کی "عوامی جدوجہد" کی اپیل نچلے متوسط طبقے، اور بے کار نوجوانوں میں پہنچ چکی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ہم نے یہ یونیورسٹیاں کیوں قایم کیں؟ چارلس نے پائپ سلگایا اور پھر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ دہشت پسند قوم پرست اور امن پسند قوم پرست اور یہ اور وہ۔ اس جوالا مکھی پر قابو پا کر اسی سکون کے ساتھ اس برصغیر کا ایڈمنسٹریشن چلائے جانا سول سروس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

اوکسفرڈ سے تازہ تازہ آیا ہوا نوجوان چارلس بارلو انقلابیوں کے پرانے گڑھ باریسال میں جوائنٹ مجسٹریٹ تھا۔ یہ ان لوگوں کا بنگال ہے۔ یہ میرا بنگال بھی تو ہے۔ گرینڈ ڈیڈ اور گرینڈ ما، ڈیڈ اور ما، آنٹ میبل اور آنٹ ماڈ کا بنگال، مجھے اس سے کتنی محبت ہے۔ میں اسے تباہ ہونے دوں گا؟ وہ باریسال کلب کے برآمدے میں وہسکی پیتے ہوئے BROOD کرتا۔ اس نے دہشت پسند تحریک کا مطالعہ کیا۔ انقلابیوں کے حالات سے تفصیلی واقفیت حاصل کی۔ ان کی لکھی ہوئی ورناکیولر کتابوں کے اہم اقتباسات ترجمہ کروا کے پڑھے۔ (مثلاً رام پرشاد بسمل شاہجہانپوری کی سوانح حیات جو انھوں نے پھانسی پانے سے تین روز قبل لکھ کر ختم کی تھی) اس نے دنیش چندر سرکار کی کتاب کا بغور مطالعہ کیا، کہ اوکسفرڈ میں اقتصادیات ہی اس کا مضمون تھا۔ مگر اس قدر مفسدانہ، بالشویک خیالات ان انقلابیوں کے خصوصاً دنیش چندر سرکار کے تھے، اس نے ہندوستانی نفسیات پر عموماً اور بنگالی نفسیات پر خصوصیت کے ساتھ غور کیا۔ کہ بنگالیوں کی شکتی پوجا کا ان کی تخریب پسندی سے کتنا گہرا نفسیاتی تعلق ہے۔ دراوڑوں، منگولوں اور آریوں سے قبل کے قدیم ترین وحشی قبائل کا خون ان کی رگوں میں جوش مارتا ہے، تو کس آسانی سے مار دھاڑ پر اتر آتے ہیں۔ آدی واسی قبائل کی دیوی ماں کا عقیدہ اب تک ان کے دلوں میں راسخ ہے۔ اسے ان کے بنکم بابو نے کس چالاکی سے "مدر انڈیا" سے مماثل کر دیا۔ بندے ماترم۔ ہاہاہا۔ ماتا خون کی قربانی چاہتی ہے۔ مسلمان کا خون، انگریز کا خون ــــ ارے ان چالاک بابوؤں کی سائیکولوجی سے تو ہم واقف ہیں۔ ان کے فلسفی اپنی "روحانیت" اور "اساطیری علامات" کے متعلق ہمیں کیا سمجھائیں گے۔

مگر ہماری قوم میں بھی احمقوں کی کمی نہیں۔ وہ ایلس جیسی خبطی ایک مارگریٹ نوبل آئی تھیں۔

وہ کالی کی پرستار بن گئیں۔ ان کو سسٹر نودتا بنا کر ان ہندوستانیوں نے جھنڈے پر چڑھا دیا ـــــ عورتوں کی دراصل صحیح عمر میں شادی ہو جانی چاہئے۔

ودیکانند، سنا ہے بے حد وجیہہ تھا۔ سب یوروپین اور امریکن عورتیں اس کی مقناطیسی آنکھوں پر عاشق ہوتی تھیں۔

اہل ہند سسٹر نودتا اور اینی بسنٹ کے کیا کیا گن نہیں گاتے۔ کہ دیکھو تمہارے جیسے سفید فام بھی ہماری روحانی عظمت کے قائل ہو گئے ـــــ ہا ـــــ بے چاروں کا احساسِ کمتری۔

اس احساس کمتری میں ہم ہی نے انھیں مبتلا کیا۔ بڑھیا سے بڑھیا ہندوستانی انگریز سے دو باتیں کر لینا فخر سمجھتا تھا۔ ہائے کس قدر قابلِ رحم قوم ہے۔ کس فخر سے کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ چھری کانٹے سے کھاتے ہیں۔ انگریزی بولتے ہیں۔ دنیا کا عظیم ترین، مثالی، کولونیل سماج!

اور پھر پچھلی صدی کے برہمو سخرے۔ ان کے ہارمونیم اور پیانو۔ ان کی خواتین کی گاؤن نما ساریاں۔ اونچی ایڑی کے جوتے اور موزے۔ ان کے انگلستان کے سفر، ان عورتوں نے پردہ ترک کر کے زنانہ اور پالکی اور حرم کے رومان کا بھی خاتمہ کر دیا۔

بے چارہ الف چیم۔

ٹیگور بھی ہماری نقال تہذیب کی پیداوار ہے۔ ہم نہ آئے ہوتے تو نہ رام موہن پیدا ہوتے نہ رابندر ناتھ، اسی طرح آپس کے کشت و خون میں اور کئی صدیاں نکل جاتیں۔ آخر دیکھو افغانستان وغیرہ کی کیا حالت ہے۔ ٹیگور نے شیلی اور کیٹس نہ پڑھا ہوتا تو ایسی شاعری نہ کرتا۔

بے چارہ اوپری طبقہ کا ہندو۔ پہلے مسلمان حکمرانوں کی نقالی میں لگا رہا۔ اب ہماری تقلید میں جُٹا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ سارے ہندوستانی ریاکار ہیں۔ شانتی شانتی رٹتے ہیں۔ مگر تشدد اور بے رحمی ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ مذہبی جنون اور ملکی سیاست کا اس ملک میں ہمیشہ سے گہرا تعلق ہے۔ مسلمانوں سے پہلے شیوؤں، شاکتوں، برہمنوں، بودھوں، جینیوں، میں جنگیں ہوا کیں، جس عہد کا جو راج دھرم ہوا اس کے حکمرانوں نے دوسرے فرقوں پر ظلم توڑے۔ اب مسلم پیریڈ پر آئیے۔

"عبدالغفور ـــــ"

ایک منٹ میں عبدالغفور دروازے پر نمودار ہوئے۔

"صاحب"۔

"کچھ نہیں جاؤ"۔

عبدالغفور واپس چلے گئے۔

مسلم دور ـــــ ساری مسلم پیریڈ کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ سارے مسلمان بادشاہ خود کو فخریہ غازی کہتے تھے اور بت شکن، کافروں کو مارو۔ کتنے مندر گرا کر مسجدیں بنا دیں۔

برطانوی دور کو لیجئے ـــــ سنیاسیوں اور مولویوں کی بغاوتیں، جہاد کے فتوے۔ اور حال میں رام کرشن مٹھ کے سوامی وویکانند کے ساتھی اور چیلے چانٹے جو بنگال کے اوّلین دہشت پسندوں میں شامل تھے۔ انقلابیوں کو اپنے مٹھوں میں پناہ دیتے، خود انڈر گراؤنڈ میں کام کرتے۔ اٹھارویں صدی کے سنیاسیوں کی معنوی اولاد ـــــ تاریخ کس طرح اس ہلاکت خیز ملک میں متواتر اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔

اور جو ہندوستانی بم نہیں پھینکتے انھیں تقریریں کرنے کا مرض ہے۔ ساری قوم اس عارضے میں مبتلا ہے۔ کپلنگ کو ۱۸۸۸ء میں پانیر نے الہ آباد سے غلاظت اور تعفن اور بھیانک راتوں کے شہر کلکتے بھیجا۔ وہاں بابو لوگ جنھیں ہم نے لوکل سلف گورنمنٹ سونپ دی تھی۔ اپنے شہر کی صفائی کے بجائے تقریریں کر رہے تھے۔ میونسپل بورڈ اور بنگال لیجسلیٹو کونسل کے نیٹو ممبر بس دھواں دھار تقریریں کر رہے تھے۔ نظریات کے بجائے ان حضرات کو کدال اور پھاوڑے سنبھالنے چاہئیں۔ کپلنگ نے انتہائی نفرت سے کہا تھا۔ یہ بات آج تک صحیح ہے۔

تقریریں کرتے ہیں اور بے حد ذہین ہیں۔ اس لئے دماغ قانونی موشگافیوں میں بھی خوب چلتا ہے۔ کاکوری ڈکیتی۔ صرف دس نوجوانوں نے چلتی ٹرین روک کر سرکاری خزانہ لوٹ لیا۔ کمال ہے۔ اس کے ملزمین کے دفاع میں موتی لال نہرو کی جرح میں نے خود سنی تھی۔ پٹنہ اور الہ آباد کے یہ سارے طباع قانون داں جو لندن سے قانون پڑھ کر آتے تھے اور اوکس برج کے تعلیم یافتہ لیڈروں کے مقدمے لڑ رہے تھے۔ یہ ہماری بابرکت امپیریلزم کا نتیجہ ہوا۔

انقلابیوں کے گیت ـــــ "بسے گا ہند پیچھے کو بسے گا انڈمان آگے"۔ نذرالاسلام کے طوفانی گانے، ڈرامے، عوامی ناٹک، گرینڈ ڈیڈ اور ایڈورڈ بارلو کا بنگال ان آتشیں آوازوں سے گونج رہا ہے۔

یہ انقلابی واقعی بڑے جری لوگ تھے۔ اپنی تحریک کے قانون کے مطابق صرف تین چھٹانک چاول اور دو چھٹانک چنا ان کو روزانہ پیٹ بھرنے کے لئے ملتا تھا۔ اور حیرت انگیز صعوبتیں اٹھا کر یہ ہم سے لڑ رہے تھے۔

اشلوک رٹتے اور نمازیں پڑھتے ہوئے دار پر چڑھتے تھے۔

سوال یہ ہے۔ چارلس بارلو نے پائپ کا گھراکش لگا کر سر پیچھے ٹکایا کہ آئرش باغیوں نے بھی تو ہمارا ناک میں دم کر دیا تھا۔ ان کو ہم اتنا مجرم نہیں سمجھتے، محض اس لئے کہ وہ گورے تھے؟

ستمبر ۱۹۳۹ء میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ نافذ کیا گیا کہ یورپ میں ہم ہٹلر کے مقابلے میں

بالکل تنہا تھے اور ہندوستان میں ہمیں باغیوں اور مفسدوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ گرینڈ ڈیڈ اور ڈیڈ ضرور خوش ہوں گے کہ میں نے اپنی بساط بھر اس قومی کرائسس کے موقع پر اپنے فرائض ادا کئے۔ اپنی حد تک میں نے اپنے اضلاع میں کمیونسٹوں کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی۔ بے چارہ بل کینٹ ویل ان کے ایک لیڈر ریحان احمد کو نہ پکڑ سکا اور اس کی سزا میں اسے دور دراز رنگا مائی تبدیل کر دیا گیا۔

کامریڈ ریحان کو میں بھی کبھی نہ پکڑ سکا۔ میں خوش ہوں کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ مجھے ان لوگوں کو مجرموں کی طرح پکڑنا اچھا نہیں لگتا۔ مگر فرض فرض ہے۔

خدا کرے ایلس خیریت سے ہو۔ گارو ہلز میں ہمیشہ سے مشنریوں کا اثر ہے۔ مگر کمیونسٹ وہاں بھی زور پکڑ چکے ہیں۔ اور وہاں کے جنگلی کمیونسٹ اور سوشلسٹ کے باریک فرق کو نہ سمجھ سکیں گے۔

بلیا میں باغیوں نے آزاد سرکار قایم کر لی۔ یو۔ پی کی سڑکوں پر لڑکے "ہمارا بادشاہ کون۔؟ ابوالکلام آزاد"! کے نعرے لگاتے پھر رہے ہیں۔ آسام میں گولیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ سبھاش چندر بوس نے رنگون میں بہادر شاہ ظفر کے مزار پر جا کر قسم کھائی ہے کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرا کر دم لیں گے۔

جیزس کرائسٹ!

چارلس بارلو نے زور سے انگڑائی لی۔ بہت جلد کیا میں بھی کرنل بلمپ کی طرح، ایک کردار ایک ٹائپ میں تبدیل ہو جاؤں گا؟

اوکسفرڈ میں ایسے ہی ایک اتوار کی خاموش صبح دریا کے کنارے ٹہلتے ہوئے حسب معمول انڈر گریجویٹ بحث ہو رہی ہے۔ میں ٹوری نوجوان ہوں، فریڈ کارٹر بالشویک ہے۔ مسعود علی اور رامانا تھن ہندوستانی قوم پرست۔

"ہماری قدیم تہذیب"۔ رامانا تھن گرج رہا ہے۔

"سر ــــ؟ آپ کی قدیم تہذیب؟ وہ کبھی حکمراں طبقے اور پروہتوں تک محدود تھی۔ اور اشوک کے عہد کی کلچر یا شاہ جہاں کے عہد کی کلچر کی طرح آج کی برٹش یا مغربی کلچر بھی آپ کے مٹھی بھر طبقے تک ہی محدود ہے"۔ میں جواب دیتا ہوں۔

"یورپ میں تعلیم عام ہوئی۔ کیونکہ وہ آزاد تھا۔ ہم غلام تھے۔ اس لئے جاہل اور پسماندہ رہ گئے"۔ مسعود علی کہتا ہے۔

"خوب! آپ کا مغل دور تو آزادی کا دور تھا۔ اس وقت اسکول اور یونیورسٹیاں تھیں؟ ڈیڈ بتاتے تھے کہ جب گرینڈ ڈیڈ اڑیسہ پہلی بار گئے اس وقت وہاں ایک چھپی ہوئی کاغذ کی کتاب موجود نہیں تھی۔

فریڈ۔ غور سے سنو۔ سارے صوبے میں ایک چھپی ہوئی کاغذ کی کتاب موجود نہ تھی۔ پروہت لوگ تاڑ کے پتوں پر کچھ لکھ دکھ لیا کرتے تھے۔"

"یہ جہالت فیوڈلزم کی کارستانی تھی"۔ بالشویک فریڈ جواب دیتا ہے۔

"بکواس"۔ میں بات جاری رکھتا ہوں۔"اور سنو۔ جب کلکتے میں ہم نے کتابیں چھاپنا شروع کیں تو اسٹیمروں پر لدے ہوئے ہندو طلبہ چلّا چلّا کر ان کتابوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ مکالے نے کہا تھا کہ یورپ کی کسی لائبریری کا ایک شیلف ہند اور عربستان کے سارے نیٹو لٹریچر پر حاوی ہے"۔

میری سنی ان سنی کر کے راما ناتھن اپنا وظیفہ شروع کر دیتا ہے۔"انیسویں صدی کے پہلے نصف میں سات قحط پڑے جس میں پندرہ لاکھ لوگ مرے۔ دوسرے نصف میں چوبیس قحط پڑے، جن میں ایک کروڑ انسان مرے"۔ پھر سیاہ فام راما ناتھن بڑی شیرینی سے مسکرا کر مجھ سے پوچھتا ہے۔"ہاں۔ وہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کا کیا ذکر تھا؟"

"کبھی نالندہ اور ٹکسلا کا نام سنا ہے؟" اور اس کے سفید دانت جھلملاتے ہیں۔ گویا بازی جیت لی۔

ہم تینوں ناؤ میں جا بیٹھتے ہیں۔ مسعود علی پتوار سنبھالتا ہے۔

اب راما ناتھن کہہ رہا ہے۔"اگر تم لوگ نہ آئے ہوتے تب بھی ہندوستان مغربی علوم سے بہرہ ور ہو جاتا۔ ٹیپو سلطان شہید اور راجہ رام موہن رائے دونوں فرانس کے مداح تھے"۔

"گوڈ آل مائٹی۔ ٹیپو صاحب تو سخت اینٹی ہندو تھا۔ اب ہمارے مقابلے پر ایک ہیرو کی ضرورت محسوس ہوئی، تم چالاک لوگوں نے اسے اور سراج الدولہ کو ہیرو بنا لیا۔ دونوں اینٹی ہندو تھے معاف کرنا مسعود۔ اولڈ چیپ"۔

"ہماری تاریخ تم لوگوں نے مسخ کی ہے"۔ راما ناتھن غراتا ہے۔"ہم نے تمھیں انگریزی زبان کے ذریعے متحد کیا"۔ میں جواب دیتا ہوں۔"تم اور مسعود ایک دوسرے سے انگریزی میں بات کیوں کرتے ہو ــــ؟" کنارے پر کھڑی ایک حسین لڑکی ہاتھ ہلاتی ہے۔ وائلٹ! ہم کشتی کھیتے، ہنستے بولتے کشتی کا رخ اس کی طرف موڑ لیتے ہیں ــــ وائلٹ جو اب میری بیوی ہے۔

خدا کرے وائلٹ خیریت سے ہو۔

وہ اب آہستہ سے اٹھ کر میز تک گیا اور تصویر دیکھنے لگا۔ ڈارلنگ۔ تم اس وقت نیم تاریک لندن کے کس پب میں کس فوجی کے ساتھ بیٹھی ہو گی۔ بیر کا مگ تمھارے ہاتھ میں بھی ہو گا۔ مگر کس کی معیت میں؟

یہ حسین عورت مجھ سے تین بار بے وفائی کر چکی ہے۔ اوٹی میں، فلورنس میں، ہیٹ فیلڈ میں،

وائلیٹ مائی لو۔ تم یہ بھی جانتی ہو میں نے تم سے کتنی بار بے وفائی کی۔

موڈرن میرج۔

اور یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ اور جنگ میں سب کچھ روا ہے۔ اس محفوظ و مامون ہماری زندگی میں اچانک کیسا زلزلہ آگیا۔ جنگ، بغاوت، تباہی۔

ٹام۔ ٹام نو سال کا ہوگیا۔ میرا پیارا بیٹا۔ کیا میں تم سب کو زندہ دیکھ سکوں گا؟

امریکن بہت دلکش ہوتے ہیں۔ برطانوی عورتوں کے لئے۔ وائلٹ تم ہمیشہ سے فلرٹ رہی ہو۔ بلیس یور لٹل ہارٹ، WAC کے یونیفارم میں کتنی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ میری بیوی۔ این شیریڈن کی طرح دلفریب۔

اس وقت کیا کر رہی ہو، ڈارلنگ؟ سینٹ جانز وڈ کا کوئی میوز؟ کوئی کنٹری ان یا ہمارے اپنے گھر کا ـــــ ۱۴ اینڈریوز کریسنٹ کا بیڈروم ـــــ؟

یہ سب جانتے ہوئے بھی تم پر عاشق ہوں، جانِ من۔ اور تم بھی میری اس کمزوری سے واقف ہو۔

اس نے بیر کا مگ زور سے میز پر پٹخ دیا۔ باہر بارش کا زور بڑھ چکا تھا۔

بنگال کی برسات، ملیریا، مچھر، کیچڑ، تعفن، طوفان، سانپ، مینڈک۔ اس برسات کے لئے ٹیگور اور سارے بنگالی شاعری کرتے کرتے مرے جاتے ہیں۔

اس وقت میں بے حد اینٹی انڈین ہو رہا ہوں۔

وائلیٹ۔

لاچار غصے سے پھر میرا خون کھول رہا ہے۔ مجھے اس سے اتنی نفرت ہے۔ اتنا عشق ہے۔ یہ آج تک معلوم نہ تھا۔

کمبخت خط بھی نہیں لکھتی۔ شاید میں اس کے لئے مر چکا ہوں۔ شاید وہ یہ سمجھتی ہے کہ باغیوں نے مجھے بھی قتل کر دیا ہوگا۔

ما۔ آنٹ میٹی۔

اُس نے آنٹ میلڈا کی تصویر پھر اپنے سامنے رکھی اور سر ہلانے لگا۔

آنٹ میٹی تم نے بھی اتنے دنوں سے خط نہیں لکھا۔ مگر اُن کے ہاتھ میں رعشہ ہے۔ ٹھیک سے قلم نہیں پکڑ سکتیں۔ آنٹ میٹی تم ایک زمانے میں کتنی خوب صورت تھیں۔ اپنی یہ پرانی تصویر دیکھو۔

وائلیٹ۔ ایک دن تم بھی بوڑھی ہو جاؤ گی۔ یہ نہ بھولو۔ تم نے آنٹ میٹی کو کسی ہوم میں ڈال دیا۔ تاکہ آزادی سے عیش کرو۔ میں تمھیں کبھی معاف نہ کروں گا۔ میں ہندوستانی ہوں۔ میں سخت دل

انگریزوں کی طرح کبھی بوڑھے ماں باپ اور رشتے داروں کو گھر سے نکال کر کسی ہوم میں پھینکنا برداشت نہیں کر سکتا۔

اب اس کے آنسو بہنے شروع ہوئے۔ اب تک وہ کتنی شراب چڑھا چکا تھا۔

خداوندا۔ اگر تو واقعی کہیں موجود ہے، وائلیٹ کو، ٹام اور کیرل کو، آنٹ میٹی کو، ایلس کو، ان سب کو اپنی حفاظت میں رکھ۔

اولڈ پیپلز ہوم۔

کسی دن شاید میں بھی، مجھے بھی ٹام اور اس کی بیوی گھر سے نکال کر اولڈ پیپلز ہوم میں ڈال دیں گے۔ بے چارہ بڈھا جو ہر وقت ہندوستان کے متعلق بڑبڑاتا اور آہیں بھرتا ہے۔ (نرسیں آپس میں کہیں گی)

تم آنٹ میٹی کی طرح مفلوج اور بوڑھی ہو جاؤ گی۔ اور تمھاری بہو تمھیں ہوم میں پھینک دے گی۔

اسی برسات میں، میں نے وائلیٹ کے ساتھ اپنی لانچ پر پدما کے کیسے رومانی سفر کئے ہیں۔ اسٹیمر پر ہم ہنی مون کے لئے سندر بن گئے تھے۔ اسٹیمر کا کیا نام تھا ــــ؟ کنگ فشر۔

آج ہماری شادی کو پورے گیارہ سال ہو گئے۔ یارک شائر کی تازہ وارد لڑکی، شروع شروع میں کیسی حیرت سے یہاں کی ہر چیز کو دیکھتی تھی۔

۳۱ء ہماری شادی کا پہلا سال، باریسال میں، جہاں میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑوایا۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑوایا۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑوایا۔

میری سروس کا سب سے نمایاں کارنامہ۔

سیاہ آنکھوں والا دلکش، میرا ہم عمر نوجوان، میرے سامنے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اوکسفرڈ میں میرا ہم جماعت ہوتا۔ کشتی کھیتے ہوئے مجھ سے بحثیں کرتا۔ مگر وہ کال کوٹھری میں جانے سے قبل میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ بڑا جیّد انٹلکچوئل ہے۔ میں اس سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔

جس روز اس کی اپیل ہائی کورٹ سے مسترد ہوئی مجھے بے حد۔ کتنا ــــ بے حد دکھ ہوا تھا کیوں؟ وہ بالآخر میری قوم کا جانی دشمن تھا۔ اگر میں نے اسے نہ پکڑا ہوتا تو اس نے مجھے ہلاک کر دیا ہوتا ــــ مجھے اس کی اپیل مسترد ہونے کا بڑا رنج ہوا تھا۔

جس روز علی پور جیل میں اسے پھانسی ہوئی، اسی روز ہمارے یہاں ٹام پیدا ہوا تھا۔

منجو آیا، وائلیٹ کی منہ چڑھی اس سے کہنے لگی۔ میم صاحب، ہم ہندو لوگ آواگون میں بیلیو

کرتا ہے۔ شکر ہے کہ دنیش بابو کی پھانسی کے دو گھنٹے پہلے ٹام بابا پیدا ہوا۔ اگر تھوڑا منٹ بعد پیدا ہوتا تو بہت سا ہندو لوگ بولتا کہ دنیش بابو نے بدلہ لینے کے لئے آپ کے گھر میں جنم لیا ہے۔

واٹ اے ہوربل تھوٹ ـــــ بے چاری وائلیٹ نے ذرا سا کانپ کر کہا تھا۔

اور یہ واقعہ ہے کہ آیا کی اس عجیب و غریب بات کے بعد لاشعوری طور پر میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ ٹام دنیش سرکار کی پھانسی سے دو گھنٹے قبل پیدا ہوا ـــــ کرائسٹ۔ اس دیوانے، وہمی ملک میں رہ کر انسان خود دیوانہ ہو جاتا ہے۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو ـــــ

اور ایک اور بھیانک خیال :-

جف گگ کی بتائی ہوئی خبر تازہ ترین خبر ہے وہ تو کل ہی لندن سے یہاں پہنچا ہے۔ اس نے اُس امریکن افسر سے ملاقات بھی کی ہے۔

نمبر ۱۴۔ اینڈریوز کریسنٹ میں ایک امریکن کرنل BILLET کر دیا گیا ہے۔ اس میں وائلیٹ کا کیا قصور؟

اس امریکن کا نام کرنل ڈونلڈ جوئیل ہے۔ بہت خوب صورت طرحدار جوان ہے۔ میں طرحدار کہاں ہوں۔ موٹا، بھدا، اتنی موٹی ناک، وائلیٹ میری جان، میں ہرگز تمہارا مستحق نہیں تھا۔ مگر تم نے بھی تو میرے عہدے سے شادی کی تھی۔

مارچ ۳۹ء کی اس پُر امن دنیا میں ہم آخر بار برطانیہ گئے تھے۔ کاش وہ بچوں کا داخلہ کرانے کے بعد میرے ساتھ ہی واپس آ گئی ہوتی۔

اب میں پھر الف چیم کی تلاوت کرتا ہوں۔

وہ آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ صدمے، رنج، پچھتاوے، بہت کم ایسا ہوتا ہے جب انسان کو اتنی مہلت ملے کہ وہ یک سوئی سے اپنی ساری زندگی کا جائزہ لے، اپنے اندر جھانکے۔

اب اُسے نیند سی آ رہی تھی۔ ماضی محفوظ ہے۔ یادوں کا قبرستان محفوظ ہے۔ اس نے کاہلی سے نغماتِ ہند اٹھائی۔ اور اس کے صفحے پلٹتا رہا۔ نیم وا آنکھیں، ذرا سی کھول کر اونگھتے اونگھتے کتاب کے آخر میں دوسری کتب کے اشتہاروں پر نظر ڈالی۔ ایک شفیق تبسم اس کے ہونٹوں پر بکھرنے لگا۔

"نیل کی کاشت ـــــ ایک پلانٹر کی زندگی کا دلچسپ مرقع"۔

"پرانے کلکتے کی آوازِ بازگشت"۔ از ڈاکٹر بسٹیڈ۔ سرورق پر بلیک ہول کی تصویر۔

فہرست مضامین :- فلپ فرانسس کا دور، نن کو مار، فرنسس اور ہیسٹنگز کا ڈوئیل، وغیرہ وغیرہ۔

"انگلش ایٹی کیٹ فور انڈین جنٹل مین، سوشل اینڈ اوفیشیل"۔ از :۔ ڈبلو ٹریگو دیب۔ بنگال ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ۔

"بہار کی پرانی یادیں"۔ ایک پرانے پلانٹر کے قلم سے۔

"جسٹس اونوکول چندر مکرجی آنجہانی"۔ از :۔ ایم مکرجی۔ انڈین انگلش یا بابو انگلش کا بے حد مزیدار نمونہ ـــــ قارئین سے درخواست ہے کہ اس جنٹل مین کی سوانح حیات جو اُن کے بھتیجے نے لکھی ہے، ضرور پڑھ کر تفریح حاصل کریں۔

"آسام میں ایک ٹی پلانٹر کی زندگی"۔ از جارج بارکر۔

"انڈین ریسنگ کی چند یادیں"۔

"گھوڑے، آدمی اور اسپورٹس"۔

"سیونی"۔ ست پڑہ پہاڑیوں میں کیمپ لائف۔

"بنگلے کے پیچھے"۔ از "ایہا"۔ مزاحیہ کتاب۔

ابواب :۔ بوائے کو ملازم رکھنا، ڈوگ بوائز، مشعلچی، حمال، ہری درزی، بٹلر"۔

عبدالغفور ـــــ ابھی بنگلے کے پیچھے میرا بٹلر عبدل زندہ ہے۔ میں محفوظ ہوں، چارلس بارلو نے اونگھنا شروع کر دیا۔ اور پھر کرسی کے ہتھے پر سر رکھ کر سو گیا۔

خاصی بوسیدہ چھتری لگائے، بارش میں بھیگتے حواس باختہ ریورنڈ بنرجی دور پھاٹک میں داخل ہو رہے تھے، اس وقت دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔ اور ڈی۔ ایمز ہاؤس کے برآمدے کے ایک در میں کھڑے عبدالغفور ہیڈ چپراسی سے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

"صاحب چھوٹا حاضری کے بعد سے دروازے بند کئے اسٹڈی میں بیٹھا ہے۔ بیر پہ بیر پئے چلا جا رہا ہے۔ اللہ جانے کیا معاملہ ہے۔ شاید ولایت سے میم صاحب کی کوئی خیر خبر نہیں آئی ـــــ"

چپراسی نے متانت سے سر ہلایا، اتنے میں اس کی نظر پادری صاحب پر پڑی جو برساتی میں پہنچ چکے تھے۔

پادری بنرجی نے سیڑھیاں چڑھ کر جلدی جلدی پائیدان پر جوتے رگڑے، اور برآمدے میں آئے، چھتری بند کی تو اس میں سے پانی کی بوندیں فرش پر گریں۔ شفاف فرش خراب ہو گیا۔ اور وہ اور زیادہ گھبرائے۔ اور دہشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ عبدالغفور نے لپک کر چھتری ان کے

ہاتھ سے لی، ہیٹ ریک کے کونے میں ٹکادی۔ اور سلام کیا۔

"صاحب کہاں ہے؟" پادری بنرجی نے ہیبت زدہ آواز میں دریافت کیا۔ عبدالغفور ان کی اس حالت پر متعجب ہوئے۔

"صاحب کتاب والے کمرے میں ہے پادری صاحب"۔

"صاحب کو بولو، مہربانی ہوگی، ایک دم ضروری بات کرنا ہے۔ مہربانی ہوگی"۔

عبدالغفور نے سر ہلایا اور اندر گئے، لائبریری کا دروازہ دھیرے سے کھٹ کھٹایا اور کواڑ آہستہ سے کھول کر کمرے میں داخل ہوئے۔ آرام کرسی کے پاس جاکر ذرا سا کھنکارے۔

چارلس بارلو نے آنکھیں کھولیں۔

"صاحب۔ کالا پادری آیا ہے"۔

"کون؟" چارلس نے ذرا چونک کر آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

"کالا پادری۔ بنرجی بابو"۔

"اوہ ــــ کیا کام ہے؟"

"صاحب۔ وہ ایک دم ضروری بات کرنا مانگتا ہے۔ گول کمرے میں بٹھادوں؟ بے چارہ بہت گھبرایا ہوا دکھتا ہے ــــ"

چارلس نے سر اونچا کیا۔ "ایں ــــ؟ کیا ــــ؟ نہیں، ادھر ہی بھیج دو"۔

"ادھر صاحب؟" لائبریری صاحب کا بے حد ذاتی کمرہ تھا۔

"یس، یس، یو ایڈیٹ"۔ چارلس نے گرج کر کہا۔ عبدالغفور کان دبا کر غائب ہوگئے۔ چارلس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ سر میں درد، خیالات میں انتشار، دل میں دکھ، کیا کروں، اب اس کالے پادری کی فریادیں سنوں۔ میں کہ ہندوستانیوں کا مائی باپ ہوں، مائی باپ، غریب پرور ــــ جب اس نے آہٹ پر آنکھیں کھولیں، پادری بنرجی سولا ہیٹ دونوں ہاتھوں میں لئے سکینی سے کمرے میں داخل ہو رہے تھے ــــ

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور خوش خلقی سے مسکرایا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"گڈ آفٹرنون مسٹر بارلو"۔

"ہلو ــــ پادرے ــــ گڈ آفٹرنون ــــ گڈ ہیونز۔ کیا دوپہر ہوگئی؟"

پادری بنرجی لجاجت سے مسکرائے، مگر مسکراہٹ نے فوراً ساتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ پھر ہیبت زدہ نظر آرہے تھے ــــ

"کیا بات ہے پادرے آپ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ ڈُو ہیوائے ڈرنک، اوہ یو ڈونٹ ڈرنک ڈُو سِٹ ڈاؤن پادرے"۔

"نو، یس، مسٹر بارلو"۔ پادری بنرجی ہکلائے اور ایک کرسی پر ٹک گئے۔ ہیٹ گود میں رکھ لی۔ کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ چارلس نے مگ میں بیر انڈیلی، مگ اٹھا کر کہا۔ "ٹو دِ کِنگ"۔

پادری بنرجی نے اسی بھونچکے انداز میں سر ہلایا۔ چارلس پھر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب ساری چیزیں دھندلی دھندلی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ آئی ایم ڈرنک، ہرے۔ سامنے کالا پادری بیٹھا تھا۔ مجھے ہمیشہ یہ حیرت رہی ہے کہ انسان اپنا آبائی مذہب کیسے بدل لیتا ہے۔ اپنی کھال اتار کر دوسری کھال کیسے منڈھ لیتا ہے (مثال کے طور پر اگر میں مسلمان ہو جاؤں۔ ہاہاہا) سیاہ سوٹ پہنے، سفید کالر لگائے پال میتھیو بنرجی بھی مضحکہ خیز ہے۔ جس طرح ایڈورڈ بارلو مضحکہ خیز تھے ـــــ ریحان الدین احمد مضحکہ خیز ہے۔ میں مضحکہ خیز ہوں، سارا ہندوستان، ساری دنیا، ساری انسانیت، ساری زندگی اتنی مضحکہ خیز ہے کہ اس پر آنسو بہانے چاہئیں۔

"مسٹر بارلو ـــــ"

وہ چونکا۔ میں اپنے فرض میں کوتاہی کر رہا ہوں۔ نیٹو پادرے، فریاد لے کر آیا ہے۔ عدل چاہتا ہے۔ ہاہاہا۔

"مسٹر بارلو"۔

"اوہ جسٹ ون منٹ پادرے"۔ اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی، اور اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا، بھاری بھاری، اونچا اونچا، جُھکا جھکا سا کمرہ عبور کر کے ریڈیو کے پاس گیا۔ اور دھم سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ریڈیو کی سوئی گھمانے لگا۔

"دِس از بی۔ بی۔ سی لندن"۔ ایک دم آواز گونجی۔

پادری بنرجی چونک پڑے۔

ہزاروں میل پرے۔ ڈبکنی کشتیوں سے معمور سمندروں، گرم صحراؤں میں پھٹتے بموں، جلتے ہوئے یورپ کے اس پار، جلتی ہوئی اوکسفرڈ اسٹریٹ کے ایک تہہ خانے میں بیٹھا ہوا اناؤنسر ٹائیٹ اپر لپ کے ساتھ اپنے ہم قوم چارلس بارلو سے مخاطب تھا۔

دس منٹ تک وہ چارلس بارلو کو بتاتا رہا کہ اتحادی کہاں کہاں فتح مند رہے ہیں۔ اور برطانیہ میں کہاں کہاں بمباری ہوئی ہے۔ پھر ونسٹن چرچل کے تازہ ہمت افزا بیان کے اقتباس کے بعد خبریں ختم ہوئیں گوڈ سیو دی کِنگ بجا۔ چارلس بارلو فوراً اٹینشن کھڑا ہو گیا۔ پادری بنرجی بھی کھڑے ہو گئے۔

ریڈیو بند کر کے دائیں چھنگلی پلکوں پر پھیرتے ہوئے چارلس بارلو واپس اپنی کرسی پر آن بیٹھا۔

اب جاکر پادری بنرجی نے کانپتے ہاتھوں سے اخبار جیب سے نکالا۔ اخبار بھی بارش میں بھیگ چکا تھا۔ انھوں نے اسے ذرا احتیاط سے مسٹر بارلو کے سامنے پیش کیا۔ ایک خبر پر سُرخ نشان لگا تھا۔

چارلس بارلو نے جھک کر خبر پڑھی، تیوری پر بل ڈالا۔ پادری کو دیکھا۔ ہونٹ کاٹے۔

"مجھے بڑا افسوس ہے، پادرے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کی لڑکی بھی ——"

"میں بالکل مجبور اور لاعلم تھا مسٹر بارلو ——"

"آپ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں؟"

"میری بچّی —— میری بچّی —— گمراہ ہے۔ مسٹر بارلو۔ اسے بچا لیجئے۔" پادری نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے۔

وہ جھنجھلا گیا۔ اب اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا، وہ اپنی ذاتی اندرونی دنیا سے واپس آکر اپنے فرض منصبی پر مستعد ہو چکا تھا۔ "آپ کی لڑکی بالغ اور سمجھ دار ہے، جان بوجھ کر اس غنڈہ گردی میں شامل ہوئی ہے۔ بہت جلد اس رومان پرستی سے اس کا جی بھر جائے گا یا ممکن ہے وہ ساری عمر اسی میں لگی رہے۔ آئیڈیلزم خدمت قوم، اور خدمتِ خدا کا جنون انسان کو عجیب و غریب طریقوں سے اپنی زندگی تجنے اور تباہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میری بہن ——" اب اس نے ہاتھ پھیلائے۔ "میری بہن ایلس پچیس سال سے ناگا جنگلوں کی خاک چھانتی پھر رہی ہے اور غالباً بہت مسرور ہے۔ آپ کی بیٹی بھی جیل میں خوش رہے گی۔ اور خود کو مجاہد سمجھے گی۔"

"مسٹر بارلو ——"

"پادرے ——" چارلس نے دفعتہً بیحد چڑ کر کہا۔ "اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ روزی کے ہتھ گولے نے کسی کی جان لی ہے تو اسے عمر قید ہو گی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

پادری بنرجی کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو ڈبڈبانے لگے۔ چارلس دوسری طرف دیکھنے لگا۔ یہ شایستہ اشارہ تھا کہ اب ملاقات کا وقت ختم ہوا۔ مگر پادری بنرجی ڈٹے رہے، ایک آخری کوشش اور۔

"مسٹر بارلو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مس بارلو آج کل کسی کام سے پٹنہ میں آئی ہوئی ہیں۔ اگر آپ ان کو ٹرنک کال کر دیں، کہ —— کہ وہ جیل کے ہسپتال میں روزی کو جاکر دیکھ لیں —— اور —— اور —— میں نے یہ خط بھی ان کو۔" انھوں نے جیب سے ایک خط نکال کر چارلس کو تھما دیا، اور ملتجی اور پُر امید نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

چارلس نے پڑھنا شروع کیا۔

"ڈیر سسٹر ان کرائسٹ۔

اس مصیبت کے وقت میں ——"

چپراسی کمرے میں داخل ہوا۔

"یس ــــ ؟" بارلو نے پرچہ پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر پوچھا۔ سنہری اور سُرخ وردی والے چپراسی کے ہاتھ میں چاندی کی پلیٹ تھی۔ جس میں ایک پیلا لفافہ رکھا تھا۔

ہندوستان کے اہلکاروں، چپراسیوں اور سائیسوں کی وردیاں، پگڑیاں اور ٹوپیاں برطانوی حکومت نے پچھلی صدی میں قدیم ہندوستانی امراء و شرفاء کی ملبوسات کے نمونے کی بنوائی تھیں۔ گویا کہتے ہوں، دیکھو، جو تمہارا لباس ہے، وہ ہم اپنے نوکروں کو پہنائیں گے۔

چپراسی نے پلیٹ چارلس بارلو کو پیش کی۔ چارلس نے کیبل گرام کھولا۔ اُسے پڑھا۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔ ہونٹ ذرا سے لرزے۔ وہ چند لحظوں تک بالکل ساکت بیٹھا رہا۔ پھر کندھے سیدھے کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ کیبل گرام جیب میں رکھا، ابرو کے اشارے سے چپراسی سے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ پھر وہ لمبا، گہرا سانس لے کر کھولی لیکن مضبوط آواز میں پادری سے مخاطب ہوا۔ "اکسکیوزمی پادرے۔ میں ابھی آتا ہوں"۔ اور جلدی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

پادری بنرجی حیران پریشان بیٹھے رہے۔ مس ایلس بارلو کے نام خط قالین پر گر پڑا تھا۔ اُسے اٹھا کر دوبارہ جیب میں رکھا اور صبر سے چپکے بیٹھ گئے۔

پندرہ منٹ، آدھ گھنٹہ، پینتالیس منٹ، ایک گھنٹہ۔

پورا ایک گھنٹہ گذر گیا۔ تب پادری بنرجی لائبریری سے باہر نکلے۔ کوٹھی پر ایک دم ہُو کا عالم طاری تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر شاگرد پیشے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس کے نزدیک سارے ملازم ایک ہجوم کی صورت میں جمع آپس میں کھُسر پھُسر کر رہے تھے، عبدالغفور ان کی طرف آئے۔

"کیا بات ہے عبدل"۔

"صاحب!" عبدالغفور نے دھیرے سے کہا۔ اور ان کو ساتھ لے کر باغ کی روش پر آ گئے۔ خوبصورت ڈک پونڈ میں بطخیں بڑے سکون سے تیر رہی تھیں۔ دور مرغی خانے میں ایک مرغی کٹ کٹائے جا رہی تھی۔ باورچی خانے کی چمنی میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

"صاحب"۔ عبدالغفور نے کہا۔ "میم صاحب گذر گئیں"۔

"گوڈ ہیومرسی۔ کیسے عبدل؟"

"صاحب بیڈ روم میں بت بنا بیٹھا ہے۔ ابھی اس نے مجھے آواز دی تھی۔ میں اندر گیا تو آہستہ

سے بولا۔ عبدل۔ ہمارا میم صاحب گذر گیا۔ ولایت سے تار آیا ہے۔ جرمن والا بم گرا رہا تھا۔ راکٹ بولتے ہیں۔ کیا بولتے ہیں"۔

"دی ٹو راکٹ"۔

"جی پادری صاحب، وہ بدھ کی رات کو صاحب کے مکان پر گرا۔ مکان جل کے راکھ ہو گیا۔ میم صاحب اندر سو رہی تھی، وہ بھی ــــ"

"مگر اُدھر تو عبدل ایر ریڈ کا بھونپو بجتا ہے۔ سب لوگ تہ خانوں میں چلا جاتا ہے"۔

"معلوم نہیں، صاحب نے اتنا ہی بولا۔ اور بولا کہ بابا لوگ لندن سے باہر اسکول کے بورڈنگ میں ہے، اس وجہ سے وہ بچ گیا۔ اور میٹی مس صاحب بھی بچ گئی۔ اس کو میم صاحب نے بڈھا لوگ کے ہوم میں ڈال دیا تھا"۔

"شکر ہے"۔

"صاحب نے بولا ہے پادری صاحب سے کہو ہم ابھی آتے ہیں"۔

"اچھا۔ تھینک یو عبدل"۔

عبدالغفور واپس چلے گئے۔ پادری بنرجی واپس آکر لائبریری کے سامنے والے برآمدے میں ٹہلنے لگے۔

بوٹ کی چاپ سنائی دی۔ چارلس بارلو برآمدے میں نمودار ہوا۔ پادری بنرجی اس کی طرف بڑھے۔

"مسٹر بارلو"۔

"پادرے بدھ کی رات کو مسز بارلو کا ایر ریڈ میں انتقال ہو گیا"۔

"اس کی مرضی پوری ہو"۔

"آیئے بیٹھئے"۔ اُس نے پھولدار گدیلوں والی بید کی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

چند منٹ خاموشی چھائی رہی۔ باغ میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ فطرت اسی بے نیازی سے زندہ رہتی ہے۔

"غم نہ کیجئے مسٹر بارلو، مسز بارلو ایک بہت بہتر جگہ چلی گئیں"۔

"بہتر جگہ ــــ؟ آپ کو کیسے معلوم۔ اس وثوق سے کس طرح کہتے ہیں؟" چارلس نے جھنجھلا کر کہا۔ "بہتر جگہ صرف یہ دنیا ہے۔ باقی آپ لوگوں کی خام خیالی اور خوش فہمی ہے"۔

پادری بنرجی خاموش رہے۔

چارلس بارلو تلخی سے ہنسا۔ THE LORD IN HIS INFINITE MERCY ہاہاہا"۔

پادری بنرجی نے آہستہ سے کہا۔ "خدا واقعی بڑا رحیم و کریم ہے۔ میرے بیٹے۔"

"ہاہاہا۔ اس رحیم و کریم نے میرے جوان اور نیک دل باپ کو آدم خور شیر کا نوالہ بنا دیا۔ میری جوان اور معصوم پھوپھی کو چینیوں سے RAPE کروا کے قتل کرا دیا۔ اس رحیم و کریم نے میرے جوان بھائی کے جرمنی کے اندھیرے آسمانوں پر پرخچے اڑا دیئے۔ وہ رحیم و کریم اس وقت ساری دنیا کے لاکھوں بے گناہ انسانوں کو طرح طرح کی موت مار رہا ہے۔ وہ رحیم و کریم اسی بنگال میں ہر سال ان گنت بے گناہ اور مصیبت زدہ انسانوں کو طوفانوں اور سیلابوں اور وباؤں کی نذر کرتا ہے۔ اور یاد رہے تمہارا وہ رحیم و کریم خدا ننھے بچوں کو اپاہج اور اندھا کر دیتا ہے۔" وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ "سوری پادرے۔"

پادری بنرجی ذاتی کرائسس کے مواقع پر اسرار ربانی سے لاعلم فانی انسانوں کے منہ سے اس قسم کے کلماتِ کفر سننے کے عادی تھے۔ انھوں نے جیب سے بائیبل نکالی اور تیئسواں لحن پڑھنا شروع کیا کہ تیئسواں لحن جادو کا اثر رکھتا ہے۔

خداوند خدا میرا گڈریہ ہے، مجھے کوئی ڈر نہیں وہ مجھے ہری چراگاہوں میں آرام کرواتا ہے، وہ مجھے خاموش پانیوں کے کنارے کنارے لے جاتا ہے۔

پادری بنرجی نے کتاب گود میں رکھی اور پڑھنا شروع کیا۔

اور گو میں موت کے سائے کی وادی میں چل رہا ہوں ——

لیکن ان کے ساتھ ساتھ لحن کی تلاوت کر کے کے بجائے چارلس تیوری پر بل ڈالے سر ہلائے جا رہا تھا۔ اور اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ پادری بنرجی نے لحن ختم کر کے بائیبل کے ورق گردانی شروع کی تاکہ کوئی اور سکون بخش حصہ پڑھ کر سنائیں۔ مگر عجیب بات تھی کہ ہر صفحے پر ان کی نظریں بڑی پریشان کن سطروں پر ہی جا پڑتی تھیں۔

اے یعقوب! تم اپنی ان مصیبتوں پر جو آنے والی ہیں رؤو اور واویلا کرو، تمہارا مال بگڑ گیا، تمہاری پوشاکوں کو کیڑا کھا گیا، دیکھو! جن مزدوروں نے تمہارے کھیت کاٹے ان کی وہ مزدوری جو تم نے دغا کر کے ضبط کر لی تھی چلاتی ہے۔ اور فصل کاٹنے والوں کی فریاد رب الافواج کے کانوں تک پہنچ گئی۔ دیکھو منصف دروازے پر کھڑا ہے۔

پادری بنرجی نے گردن آگے بڑھا کر ورق پلٹے۔ یوحنا کا مکاشفہ ——

خدا کا بیٹا جس کی آنکھیں آگ کے شعلے کے مانند اور پاؤں خالص پیتل کے مانند ہیں فرماتا ہے کہ تیرے کاموں اور محنت اور ایمان اور خدمت اور صبر کو تو جانتا ہوں اور یہ بھی ——

اور آگے ــــ

اور جب اس نے چھٹی مہر کھولی تو میں نے دیکھا کہ سورج کمبل کے مانند کالا اور سارا چاند خون سا ہو گیا اور ستارے انجیر کے درختوں کے کچے پھلوں کی طرح گر پڑے۔ آسمان اس طرح سرک گیا جس طرح مکتوب لپٹنے سے سرک جاتا ہے۔

پھر آسمانوں پر لڑائی ہوئی اور ــــ

پھر میں نے شیشے کا سا ایک سمندر دیکھا جس میں آگ ملی ہوئی تھی ــــ

شہر بابل گر پڑا۔ زمین کے بادشاہ جب اس کے جلنے کا دھواں دیکھیں گے تو اس کے لئے روئیں گے اور دنیا کے سوداگر اس کے لئے ماتم کریں گے۔ اور سب ناخدا اور مسافر اور ملاح دور کھڑے اپنے سروں پر خاک ڈالیں گے کہ افسوس افسوس وہ بڑا شہر جس کی دولت سے سمندر کے جہاز والے دولتمند ہوئے۔

پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا۔ اور کیا دیکھتا ہوں ایک سفید گھوڑا ہے اور اس پر ایک سوار ہے، وہ خون آلود پوشاک پہنے ہے اور قوموں کے مارنے کے لئے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے ــــ اور ــــ

پھر میں نے ایک فرشتے کو آفتاب پر کھڑا دیکھا اور اس نے بڑی آواز میں چلا کر آسمان میں اڑنے والے سب پرندوں سے کہا اور خدا کی بڑی ضیافت میں شریک ہونے کے لئے جمع ہو جاؤ تاکہ تم بادشاہوں کا گوشت اور فوجی سرداروں کا گوشت اور گھوڑوں اور ان کے سواروں کا گوشت کھاؤ۔

پھر میں نے ایک نئے آسمان اور نئی زمین کو دیکھا۔ کیونکہ پہلا آسمان اور پہلی زمین جاتی رہی تھی اور سمندر بھی نہ رہا۔

اور روح اور دلہن کہیں آ اور سننے والا بھی کہے آ اور جو پیاسا ہو وہ آئے اور آب حیات لے۔

پادری بنرجی نے گہرا سانس لے کر نیا عہد نامہ بند کر دیا اور سوچ میں ڈوب گئے۔

تب چارلس کی بھاری آواز نے انھیں چونکایا۔

"پادرے! مجھے ایوبؑ کی گریہ وزاری سناؤ۔"

"بہت اچھا۔ اور آپ بھی صبر ایوبؑ سے سبق لیجئے۔ مسٹر بارلو۔"

"سبق بعد میں لوں گا۔ تم مجھے پہلے اس عبرانی بڈھے کی گریہ وزاری ــــ"

"خاموش مسٹر بارلو۔" پادرے نے دفعتہً ڈانٹ کر کہا ــــ "بہت بے ادبی کر لی۔ اب خاموش۔"

"سوری پادرے۔"

پادری نے دوبارہ عینک کا کیس کھولا، عینک تبدیل کی، اور جیب سے مداری کی طرح پرانا

عہدنامہ نکالا۔

" جستہ جستہ پڑھ کر سناؤں گا، بہت طویل باب ہے ——

" اور پھر ایوبؑ راکھ میں بیٹھ گیا۔ اور اس کے تین دوست پُرسے کو آئے، اور انھوں نے خاک سروں پر ڈالی اور اس کے ساتھ زمین پر بیٹھ رہے۔ اور سات دن اور سات رات زمین پر بیٹھے رہے۔ اور ایوبؑ نے کہا، لعنت ہو اس دن پر جب میں پیدا ہوا تھا، میرے جسم پر کیڑے رینگ رہے ہیں، میری کھال اکھڑ گئی، میرے دن جولاہے کی تکلیوں کی مانند تیز رفتار ہیں۔ میری زندگی ہوا بن گئی۔

" خدا بے گناہوں کے مصائب پر ہنستا ہے اس نے زمین کو ظالموں کے حوالے کر دیا۔ منصفوں کے چہرے چھپا دیئے۔ میری زندگی تیز رفتار جہاز کی مانند گزر رہی ہے۔ مجھے اپنے غموں سے ڈر لگتا ہے۔

" میں خدا سے کہوں گا تجھے زیب دیتا ہے خداوندا کہ اپنے بندے سے متنفر ہو اور ظالموں کا ساتھ دے؟ کیا تو بھی انسان ہے؟ ڈاکو عیش کر رہے ہیں اور خدا ان کو بڑھاوا دیتا ہے وہ قوموں کو ترقی دیتا ہے اور تباہ کرتا ہے اور پھر ترقی دیتا ہے۔ میری آنکھوں نے یہ سب کچھ دیکھا۔ کانوں نے سنا۔ اور عقل نے سمجھا۔ اور اب میں خدا سے ذرا منطقی جرح کرنا چاہتا ہوں ——

" ابن حوّا کی مختصر زندگی کلفتوں سے پُر ہے وہ پھول کی طرح کھلتا ہے اور کٹ کر گر جاتا ہے۔ سائے کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ پانی کی خوشبو کٹے درخت کو از سر نو زندگی بخشتی ہے۔ مگر ابن آدم ایک مرتبہ لیٹ جائے پھر نہیں اٹھتا۔ اے کہ تو جب تک تیرا طیش زائل نہ ہو۔ مجھے قبر میں چھپائے گا۔ میں اپنے وقت کا منتظر ہوں۔

" پانی پتھروں کو بہالے جاتا ہے، تو انسان کی امیدوں پر پانی پھیرتا ہے۔ تو اس کی شکل بدل دیتا ہے۔ تو نے مجھے ہلکان، پاش پاش کر دیا۔ میرے چہرے پر جھریاں ڈال دیں۔ مجھے جابروں کے حوالے کر دیا۔ میری باگیں توڑ ڈالیں۔ میرا چہرا روتے روتے بدہیت ہو چکا ہے۔ میری پلکوں پر موت کا سایہ لرزاں ہے۔ اے زمین میرا خون نہ چھپا۔ میری شنوائی نہ کر، میری قبریں میرے لئے تیار ہیں۔ میری آنکھیں وفورِ غم سے دھندلا گئیں۔ مجھے تم سب میں ایک دانش مند نظر نہیں آتا۔ میرے مقاصد کا خاتمہ ہوا۔ میرے خیالات تک ٹوٹ کر بکھر گئے۔ قبر میرا مکان ہے۔ میں نے اپنا بستر اندھیرے میں بچھایا ہے۔ میں نے جسم کی گلن سے کہا۔ تم میرے باپ ہو۔ کیڑوں سے کہا تم میری ماں اور بہنیں ——

" جانو کہ خدا نے مجھے اپنے جال میں گرفتار کیا۔ میری راہ میں روڑے اٹکائے، اور اندھیرا پھیلایا۔ اس کے لشکر نے میرے معبد کو گھیر لیا۔ میرے بھائی اور میرے عزیز اور میرے دوست مجھے بھول گئے۔ میں اپنی بی بی کے لئے اجنبی ہوں، دوستو مجھ پر ترس کھاؤ کہ اس قہار و جبار کے ہاتھ نے مجھے

چھو لیا ہے۔

"میں غموں کا شاکی نہیں۔ لیکن اشقیا بربط اور ارغنون بجاتے ہیں۔ جبکہ میں آگے بڑھتا ہوں تو مجھے خدا نہیں ملتا، پیچھے دیکھتا ہوں تو بھی نظر نہیں آتا۔ میں اس حاظر و ناظر کی موجودگی سے مضطرب ہوں، مجھے اس سے ڈر لگ رہا ہے۔ اس نے میرا دل گداز کر دیا ہے۔

"اہل ثروت حاجت مندوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔ مفلس سردی میں ٹھٹھرتے ہیں۔ کوہستانی بارش میں کانپ رہے ہیں۔ چٹانوں میں پناہ گزیں ہیں۔ امرا ان بھوکوں کا اناج چھینتے ہیں۔ جنھوں نے ان کے لئے کولہو چلائے، جو ان کے لئے شراب کشید کر کے خود پیاسے رہتے ہیں۔ جو شہر پناہ سے باہر کراہتے ہیں۔

"میں نے خیر کی آرزو کی اور مجھے شر ملا۔ روشنی کا منتظر رہا اور تاریکی پائی۔

"جب وہ ربِ کریم میرے شامل حال تھا اور میری اولاد میرے ساتھ تھی، جب میں اپنی سیڑھیاں مکھن سے دھوتا تھا۔ میں شہر میں نکلتا تھا۔ تو نوجوان مجھے دیکھ کر چھپ جاتے۔ بوڑھے تعظیماً اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ شہزادے بات کرتے کرتے خاموش ہو جاتے تھے۔ کیونکہ ان غربا کا حامی و نگہبان تھا۔ میری جڑیں ندی کنارے پھیلی تھیں۔ میری شاخ پر شبنم گرتی تھی، میری عظمت و شوکت تر و تازہ تھی۔ لیکن اب نوجوان جن کے باپوں کو میں اپنے گلے کے کتوں کے ساتھ بھی نہ بٹھاتا، میری تضحیک کرتے ہیں۔ اور آندھی کی مانند مجھ پر حملہ آور ہیں۔ اور تب میں نے اٹھ کر مجمع سے کہا۔ میں اژدہے کا بھائی اور بوم کا ساتھی ہوں۔ میری کھال جل گئی۔ میرا بربط رو رہا ہے۔ کیا خدا میری حالت نہیں دیکھتا۔ کاش وہ میری فریاد سنے، کاش میرے دشمن ایک کتاب لکھیں جسے میں اپنے کندھوں پر رکھوں اور تاج کی طرح پہنوں، اگر میری زمینیں میری وجہ سے نالہ کناں ہیں، تو کاش گیہوں کے بجائے کوکھرو اور جو کے بجائے گھاس پھونس ان پر اگیں ـــــ ایوبؑ کے الفاظ ختم ہوئے۔

"تب بگولے میں سے خداوند عالم نے ایوبؑ کو جواب دیا ـــــ"

پادری نے بائیبل بند کر دی، چارلس کرسی کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ اس نے چونک کر پادری کو دیکھا ـــــ

"ان تینوں دانش مند دوستو کے نام کیا تھے جو ایوبؑ کو سمجھانے آئے تھے؟"

"ایلی ہُو۔ بل داد۔ اور ایلی فاز ـــــ" پادری نے جواب دیا۔

"ایلی ہُو، بل داد، اور ایلی فاز۔" چارلس نے ذرا اکتائی ہوئی آواز میں دہرایا۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ کیونکہ وہ بہت دیر سے سوچ رہا تھا ـــــ کرنل جوئیل جو مکان میں مقیم تھا وہ بھی اسی رات ان شعلوں میں بھسم ہوا، تم بھی اس کے ساتھ جل کر کوئلہ ہوئیں۔

تمہارا خوب صورت جسم کوئلہ بنا۔ تم مرتے وقت بھی مجھ سے بے وفا تھیں۔ افسوس۔ افسوس۔ افسوس۔

اس نے میز پر سے نیا عہد نامہ اٹھایا اور صفحے الٹنے لگا۔ اسے بھی "یوحنا کے مکاشفے" نے متوجہ کیا۔ اور سب سے پہلے اس کی نظر پڑی ـــــ "اور پھر جب میں نے نگاہ کی تو آسمان کے بیچ میں ایک عقاب کو اڑتے دیکھا۔ اور بڑی آواز سے کہتے سنا کہ ان تین فرشتوں نے نرسنگوں کی آوازوں کے سبب سے جن کا پھونکنا ابھی باقی ہے زمین کے رہنے والوں پر افسوس، افسوس، افسوس ـــــ

"اور ان سات فرشتوں میں سے جن کے پاس سات پیالے تھے، ایک نے مجھ سے کہا آ میں تجھے اس بڑی کسبی کی سزا دکھاؤں جو بہت سے پانیوں پر بیٹھی ہے ـــــ"

چارلس بارلو نے زور سے کتاب بند کر لی۔ یہ سطور بابل کے متعلق ہیں۔ لندن ـــــ وائلیٹ بارلو ـــــ مرحومہ ـــــ کے متعلق کبھی نہیں۔ بابل ـــــ بابل ـــــ بابل ـــــ اب میں بیمار پڑ جاؤں گا۔ اب مجھے حاضری کھانا چاہئے۔ اب مجھے ـــــ

کادیری کے کنارے اجاڑ بنگلہ ـــــ پدما کے کنارے اجاڑ بنگلہ ـــــ اجاڑ ـــــ "عبدل" اس نے زور سے آواز دی۔

عبدالغفور اچانک سامنے آن موجود ہوئے۔ وہ بے حد ملول اور پریشان نظر آ رہے تھے۔

"صاحب چل کر تھوڑا سا حاضری کھا لیجئے۔ اب تین بج رہا ہے۔"

چارلس بارلو نے انتہائی مشکور نگاہوں سے اولڈ عبدل کو دیکھا۔ "اچا۔ تھینک یو عبدل ـــــ پادرے میرے ساتھ لنچ کھا کر جاؤ۔"

"تھینک یو، مسٹر بارلو۔"

وہ دونوں کھانے کے کمرے میں گئے۔ میز پر بیٹھ کر پادری نے گریس پڑھی۔ سوپ کے بعد عبدالغفور نے باقی کورس خاموشی سے سرو کئے۔ اسی خاموشی سے کھانا ختم کر کے چارلس اور پادری باہر نکلے۔

"پادرے۔ میں ایلس کو آج ہی پبنہ ٹرنک کال کر دوں گا کہ وہ روزی کی خیریت معلوم کر لیں۔ مگر افسوس ہے کہ میں رہائی کی کوشش نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر وہ معافی مانگ لے۔"

"وہ معافی نہیں مانگے گی۔"

"تو پھر میں بھی کچھ نہیں کر سکتا، پادرے۔" چارلس نے پادری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"خدا حافظ پادرے۔"

"خدا حافظ، گوڈ بلیس یو۔ مسٹر بارلو۔"

چارلس بارلو اندر چلا گیا۔ پادری بنرجی نے ہیٹ ریک میں سے چھتری اٹھائی۔ اب ان کے

قدم من من بھر کے ہو چکے تھے۔ اب ان کو معلوم تھا کہ روزی کی قسمت میں بہت طویل قید ہے۔ عمر قید ——

وہ سر جھکائے جوں کی چال چلتے برساتی سے باہر نکلے اور پھاٹک تک اس طرح پہنچے جیسے کسی جنازے کے ساتھ جا رہے ہوں —— پھاٹک پر کھڑے ہو کر انھوں نے آسمان دیکھا۔ پھر سوچا اب کدھر جاؤں۔ بارش بہت دیر سے تھمی ہوئی تھی۔ وہ پھاٹک سے باہر آکر ایک طرف کو چند قدم چلے، پھر تذبذب کے عالم میں ٹھٹھک گئے۔ پھر چلنے لگے۔

## (۲۵)

# نواب قمرالزماں چودھری

نواب قمرالزماں چودھری پچھلی سیٹ پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے چھڑی کی نقرئی موٹھ پر ہاتھ دھرے اپنی سیاہ بیوک میں ارجمند منزل کی طرف جا رہے تھے۔ جو ڈی ایمز ہاؤس سے چند فرلانگ پر واقع تھی۔ وہ اپنے گھر کے قریب پہنچ چکے تھے، جب ان کو پادری بنرجی کچھوے کی چال چلتے منھ اٹھائے ایک طرف کو جاتے نظر آئے۔ ان کے چہرے کی حالت دیکھ کر نواب صاحب کا دل دہل گیا۔ انھوں نے موٹر رکوائی۔ اور اتر کر پادری کے پاس پہنچے۔

پادری نے ان کو دیکھا اور یک لخت اطمینان کی سانس لی۔ نواب قمرالزماں اس وقت ڈوبتے کو تنکے کا سہارا معلوم ہو رہے تھے یا فرشتۂ رحمت۔ نواب صاحب نے خاموشی سے ان کو اپنے برابر کار میں بٹھایا۔ وہ صبح کا اخبار پڑھ چکے تھے۔

ارجمند منزل پہنچ کر وہ برآمدے میں پڑے صوفے پر بیٹھ گئے۔ پادری کو بٹھایا اور چائے منگوائی۔ سامنے لان پر مالا نیرالزماں کے نوزائیدہ بچے کو گود میں لئے ٹہل رہی تھی۔ اندر گراموفون بج رہا تھا۔

پادری بنرجی نے جیب سے اخبار نکال کر نواب صاحب کے سامنے پیش کیا۔

"میں پڑھ چکا ہوں۔ بنگلہ اخباروں میں زیادہ مفصل خبریں ہیں"۔ انھوں نے آہستہ سے کہا۔

شیر چارے کر آیا۔

"میں ابھی ڈی ایم کے پاس گیا تھا۔ اس نے کوئی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا"۔

نواب صاحب نے چائے بنائی۔

"ڈی، ایم کی بیوی لندن کی بمباری میں ماری گئی اور آبائی مکان بھی جل گیا۔"

اب نواب صاحب نے آنکھیں پھیلا کر پادری کو دیکھا۔ پادری اس وقت ایک سیاہ پوش پیغامبر نظر آرہا تھا۔ جس کے پاس بُری خبروں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

"اللہ رحم کرے۔" نواب صاحب نے آہستہ سے کہا۔

اچانک پادری کھڑا ہو گیا۔ "نواب صاحب میں ڈاکٹر سرکار سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسی وقت فوراً۔"

صدمے کی وجہ سے پادری بوکھلا گیا ہے۔ بے چارہ۔ بے چارہ۔

"آپ بیٹھئے پادری صاحب۔ میں بنوئے بابو کو ابھی بلواتا ہوں۔ کیا وہ آپ کی کچھ مدد کر سکیں گے؟"

"میں ڈاکٹر سرکار سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" پادری نے دہرایا۔

نواب نے تالی بجائی۔ ٹہلتی ہوئی مالا قریب آئی۔

"ڈرائیور کو بلاؤ۔"

ڈرائیور حاضر ہوا۔

"بنوئے بابو کو فوراً ساتھ لے آؤ۔ کہنا بے حد ضروری کام ہے۔"

پادری اور نواب چپ بیٹھے رہے۔

کچھ دیر بعد موٹر دوبارہ برساتی میں داخل ہوئی۔ چادر لپیٹے بنوئے بابو وقار سے سیڑھیاں چڑھے۔ نواب نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور قریب کی کرسی پر بٹھایا۔ بنوئے بابو نے پادری کو نمسکار کیا اور نواب سے پوچھا۔ "میں ابھی ابھی فرید پور سے واپس آیا ہوں۔ نہا کر سفر کے کپڑے بھی نہیں بدلے کیا بات ہے۔ خیریت؟"

"خیریت؟" پادری ایک دم برس پڑا۔ "میں آپ کو بتانا چاہتا تھا، یہ سب کچھ آپ کی لڑکی کی وجہ سے ہوا ــــ سب کچھ۔"

بنوئے بابو نے حیرت سے پہلے پادری کو دیکھا اور پھر نواب کو۔

"تمھیں نہیں معلوم بنوئے۔" نواب نے آہستہ آہستہ کہا۔ "روزی کل صبح اِشرڈی کی بغاوت میں پولس چوکی پر حملہ کرتی ہوئی قید کر لی گئی۔ پولس فائرنگ سے کئی حملہ آور مارے گئے۔ روزی کے سخت زخمی ہونے کی اطلاع خبر میں شامل ہے۔ یہ کل رات کی خبر ہے۔ یہ شاید کل صبح کے اخباروں سے معلوم ہوگا کہ اس کا کیا حال ہے اور کس جیل میں بھیجا گیا ہے۔ زخمی قیدیوں کو تو شاید جیل کے اسپتال میں رکھا جاتا ہے۔"

اندر کسی کمرے میں نیر الزماں گراموفون بجا رہے تھے۔ اچانک نذرل کا ریکارڈ بجنا شروع ہوا۔ توڑو۔ پھوڑو۔ مارو۔ آگ لگا دو۔ آندھی طوفان بن جاؤ۔ میں سرکش ہوں۔ اصول شکن۔ بربادی کا دیوتا۔ باغی۔ میں ہمیشہ سربلند رہوں گا۔

"لاحول ولاقوۃ۔" "اسٹاپ اِٹ۔" نواب نے بے حد آزردگی کے ساتھ زور سے آواز دی۔

گیت ختم ہو گیا۔

پادری نے سر اٹھا کر بنوئے بابو پر نظر ڈالی۔ اتنی دیر میں شاید وہ اپنے غصہ پر قابو پا چکے تھے۔ انھوں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "بنوئے بابو میری فرمانبردار بچی کو دیپالی نے اس راستہ پر لگایا۔ اسے دیپالی کی صحبت نے برباد کیا۔ بس میں آپ سے اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی کہ باپ کی حیثیت سے آپ کا فرض تھا کہ آپ دیپالی کو غنڈوں سنگت سے روکتے۔ میں نے اپنے بھرپوری کوشش کی۔ اپنی بچی کو بچانے کی۔ مگر اس کے دماغ میں زہر بہت اچھی طرح بھرا جا چکا تھا۔"

"آپ لوگ سب غالباً مجھے ایک رجعت پسند مسلمان زمیندار سمجھتے ہیں۔ مگر لڑکیوں کی آزادی کے یہی سب نتائج ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے اپنی لڑکیوں کو اجازت نہیں دی کہ گھر سے قدم نکالیں۔" نواب نے کہا۔

"مجھے معلوم نہیں کہ دیپالی کس حد تک سیاسی مشاغل میں حصہ لیتی ہے۔ اس نے ایک دفعہ مجھ سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ٹررسٹ تحریک میں شامل نہ ہوگی۔ اور میں نے اس کے قول کا اعتبار کیا ہے۔ علاوہ ازیں اگر وہ مجھ سے چھپا کر کسی سیاسی تحریک میں شامل ہے تب بھی میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے منع کر سکتا ہوں۔ ہر نئی نسل اپنا راستہ خود بناتی ہے۔ آپ نے بھی اور میں نے بھی اپنے اپنے طریقے سے اپنے لئے نئے راستے تلاش کئے تھے۔ منو موہن بابو۔ آئیے خدا سے امید کریں کہ روزی خیریت سے ہو۔ آپ پر اس وقت جو بیت رہی ہے وہ میں سمجھ سکتا ہوں۔ دینیش بھی ——" پھر وہ چپ ہو گئے۔

ملازم نے پیچوان لا کر نواب صاحب کے پاس رکھا۔ پادری نے سر اٹھا کر دفعتاً نواب کو مخاطب کیا۔ "اور آپ بھی —— آپ کا انگریز کے چلے جانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ نہرو نے دسیوں بار کہا ہے، رجواڑے ختم کر دیئے جائیں گے۔"

نواب حقہ گڑگڑاتا رہا۔ سیاست حد سے زیادہ گنجلک ہو گئی ہے۔ اللہ اکبر۔ یہ خستہ حال کالا پادری اور یہ خستہ حال ڈاکٹر۔ ان دونوں کو غالباً آزادی سے فائدہ ہوگا۔ مگر واقعی مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ ریاست البتہ چلی جائے گی۔ میں نے اقتصادی پہلوؤں پر زیادہ غور نہیں کیا۔ مگر اقتصادی مسائل پر غور کر کے رونے نے پہلے ہی کافی آفت مچا رکھی ہے۔

رونوں کے خیال نے انھیں یک لخت بے حد مضطرب اور ملول کر دیا۔ وہ پیچوان گڑگڑایا کئے۔

پھر انھوں نے پادری سے کہا۔ "منو موہن بابو۔ میں بھی سمجھ سکتا ہوں، آپ کے دل پر کیا گذر رہی ہوگی۔ مجھے جب اپنے لاڈلے بھانجے کا خیال آتا ہے تو میرا دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس نے کس طرح میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ تم نئی نسل کی بات کرتے ہو بنوئے۔ یہ بڑی احسان فراموش، نمک حرام نئی نسل ہے۔ پچھلے سال تمھاری بچی مجھ سے بحث کرنے لگی۔ قربانی اور تیاگ۔ یہ اور وہ۔ میں اس بچی سے کیا کہتا کہ سیاست کی قربان گاہ پر میں اپنی مسرتوں کی قربانی دے چکا ہوں۔ میرے ہونہار۔ بھانجے کو سیاست ہڑپ کر گئی۔"

"تمھارا کون بھانجا کومر میاں؟" بنوئے بابو نے پوچھا۔

"تم سے بنوے برسوں میری ملاقات نہیں ہوتی۔ تم میرے حالات سے اجنبی ہو چکے ہو۔ یوں بھی اس قصہ کو بھلائے رکھنا ہی میرے لئے بہتر ہے۔ میں اپنی اس ٹریجڈی اور اپنی بیٹی کی بدقسمتی کی ہر ممکن پردہ پوشی ہی میں عافیت سمجھتا ہوں۔ رہنے دو یوں ہی بات سے بات نکل آئی۔"

"سوری کومر میاں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔"

مگر اب نواب آہستہ آہستہ پیچوان گڑگڑاتا اور کہتا رہا۔ "میری آنکھوں کا تارا۔ میری مرحومہ بہن کی نشانی۔ میرا لاڈلا۔ جس پر فخر کرتے کرتے میں پھولا نہ سماتا تھا جس کی میں نے زندگی بنا دی۔ اور اس نے میرے ساتھ ــــ میری لڑ ــــ میرے ساتھ کیا کیا؟ ــــ یہی ــــ منو موہن بابو ــــ یہی۔ توڑ دو، پھوڑ دو، آگ لگا دو، اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ منو موہن بابو۔ آپ اور میں اور بنوئے ہم سب ایک ناؤ میں سوار ہیں۔ روتو۔ روزی۔ دیپالی۔ یہ سب مل کر ہم کو اس چیز کی سزا دے رہے ہیں کہ ہم نے ان کے لئے ایک محفوظ دنیا تخلیق کی تھی۔ یہ لوگ اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ اس محفوظ اور مامون دنیا کے معماروں کو نیست و نابود کر دیں۔"

"مگر کس لئے ــــ؟" پادری نے پوچھا۔ "نیست و نابود کرنے کے بعد یہ کس قسم کی دنیا بنائیں گے؟"

"اس بات کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔" نواب نے افسردگی سے کہا۔

بنوئے بابو صوفے سے اٹھے، پادری صاحب بھی اٹھے، "مجھے معاف کر دینا بنوئے بابو، میں ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں۔" بنوئے بابو نے پادری کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

نواب صاحب کرسی ہٹا کر پادری کے نزدیک آئے۔

"منو موہن بابو۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ دعا کرتے رہئے۔ روزی یقیناً خیریت سے بہت جلد گھر لوٹے گی۔"

پادری نے بے یقینی سے اقرار میں سر ہلایا۔ نواب نے نیچے اتر کر بیوک کا دروازہ کھولا پادری

اور ڈاکٹر پیچھے بیٹھ گئے۔ ڈرائیور لپک کر آیا۔ موٹر میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ موٹر آگے بڑھ گئی۔

رات کو ارجمند منزل میں نواب کی پہلوٹھی کے پوتے منوّر الزماں کے عقیقے کے سلسلے میں بڑا بھاری ڈنر تھا۔ آٹھ بجے مہمان آنے شروع ہو جائیں گے۔

—— بابر بہ عیش کوش ——؟

نواب برساتی سے نکل کر پائیں باغ کی سمت چلے گئے۔

ہم تینوں۔ میں۔ سرکار اور بنرجی۔ ہم تین بنگالی، تین مختلف راستوں پر کھڑے ہیں۔ میں اور بنرجی دو ایسے کھمبے ہیں جن کو گھن لگ چکا ہے۔ مگر پال متھیو بنرجی بے چارہ یہ بات سمجھ نہیں سکتا، اور سمجھ کر بھی کیا کرے گا۔

پچھلے لان پر پہنچ کر ان کو بارلو کی میم کا خیال آیا۔ پادری نے بتایا تھا کہ سناؤنی سن کر بارلو نے بڑی بہادری اور ضبط سے کام لیا۔ خالص اسٹِف اپر لپ۔ بھئی اگر ایسی ہمتیں نہ ہوتیں تو ساری دنیا پر حکومت کیسے کرتے۔ نواب لان پر ٹہلنے لگے۔ کل سارے عمائدین شہر تعزیت کے لئے جائیں گے۔ مجھے بھی جانا ہوگا۔ ڈائلٹ بارلو بنگال کی یوروپین سوسائٹی میں کافی دل پھینک مشہور تھی۔ خاصی آوارہ۔ مچھلی کی طرح پیتی تھی۔ بے حد حسین۔ مر گئی غریب۔ بارلو اس کی وجہ سے بہت دکھی رہتا تھا۔ اب روزی کے لئے کیا کیا جائے —— کچھ نہیں ہو سکتا —— روزی کی ماں پندرہ سالہ گری بالا اسی تالاب کے کنارے بیٹھ کر برتن مانجھا کرتی تھی۔ اور میں اس درخت کے پیچھے چھپ چھپ کر اسے طرح طرح سے چھیڑنے کی کوشش کرتا تھا۔ وقت کس طرح گذرتا ہے، کس طرح بدلتا ہے، اللہ غنی،

"نواب صاحب ——" ایک کلرک نما نوجوان باغ کی سڑک پر پہنچ کر سائیکل سے اترا، اور ان کے نزدیک آکر سلام کیا۔ "کل شام آفس میں یہ فون آیا تھا۔ یہ پیغام ہے۔" اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر پیش کیا۔ "میں نے آپ سے ملاقات کا وقت آج ساڑھے پانچ کا دے دیا ہے۔ کیونکہ آپ کو اسی وقت ——"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے ——" نواب کارنگ پرچہ پر لکھا نام پڑھ کر پیلا پڑ چکا تھا۔

"تم جاؤ۔ اندر جاؤ۔ متعلقہ کاغذات میز پر لگا دو ——" انھوں نے خالی خالی آواز میں کہا۔

"بہت اچھا۔" نوجوان سائیکل سنبھال کر کتب خانہ کی طرف بڑھ گیا۔

نواب چند لمحوں تک گھاس پر ٹھٹھکے کھڑے رہے۔ پھر نظریں اٹھا کر اوپر کی منزل کو دیکھا، جہاں آرار کے کمرے کی نیلے شیشوں والی کھڑکی ہوا کے جھونکے نے کھٹ سے بند کر دی۔ وہ اس کھڑکی کو چند لحظوں تک مبہوت تکتے رہے۔ پھر اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی، اور سر جھکائے آہستہ آہستہ کتب خانے کی سمت روانہ ہو گئے۔

# (۲۶)

# ریحان الدین احمد

اس صبح جس وقت چارلس بارلو چھوٹا حاضری کے بعد اپنی اسٹڈی میں جاکر "نغماتِ ہند" کے مطالعے میں مصروف تھا۔ ڈی ایمز ہاؤس سے کچھ فاصلے پر وڈلینڈز میں کریم خاں نے بریکفاسٹ کی میز پر حسب معمول تازہ پتر یکالاکر رکھا۔ اور چائے دانی لینے کے لئے اندر چلا گیا۔ اوما رائے نے ٹوسٹ پر مکھن لگاتے لگاتے اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ ورق الٹے۔ اندر کے صفحے پر ایک سرخی نے ان کو متوجہ کیا، انھوں نے گھبرا کر آواز دی۔ "ریحان ـــــ جلدی آؤ"۔

بریکفاسٹ کی میز وڈلینڈز کے پہلو کے برآمدے میں لگی تھی۔ گیسٹ روم کا دروازہ برآمدے کے سرے پر کھلتا تھا۔ شیو کے صابن کا جھاگ تولیہ سے صاف کرتا ریحان الدین احمد کمرے سے نمودار ہوا۔

"کیا ہوا ـــــ؟"

"یہ دیکھو ـــــ سنسنی خیز گرفتاری"۔ اُوما دیبی نے سر اٹھا کر اخبار اس کی طرف سرکا دیا۔ ان کی کرسی کے قریب جھک کر اس نے اچٹتی نظروں سے پورے کالم کا جائزہ لیا۔

"کماری روزی بنرجی، کماری سندھیا گھوش اور ـــــ" وہ تیوری پر بل ڈال کر بیٹھا اور خبر کو دوبارہ غور سے پڑھنا شروع کیا ـــــ

بیرہ چائے دانی لے کر حاضر ہوا۔ اُوما نے ریحان کے لئے چائے بنائی۔

"لو چائے تو پی لو"۔

"پی لوں گا ـــــ غضب ہوگیا۔ اوما۔ محمود الحق اور جیوتی دونوں شہید ہوگئے۔ روزی جانے کتنی بری طرح زخمی ہوئی ہوگی۔ اس خبر کا کیا، کیا بھروسہ ہے"۔

"پُور گرل"۔

"محمود اور جیوتی دونوں ـــــ" ریحان نے اخبار پرے سرکا کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اور چند منٹ تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔

"اوہ ریحان ـــــ پلیز ـــــ" اوما نے اس کے بازو پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔

"سوشلسٹ فرنٹ! ابھی جانے اور کتنے مارے جائیں گے ـــ اوہ گاڈ ـــ ابھی اس روز جیوتی نے کس جوش و خروش سے مجھ سے بحث کی تھی ـــ اُروناڈی، جے پی، لوہیا انڈر گراؤنڈ میں جان پر کھیل کر جن اندولن کو ڈائرکٹ کر رہے ہیں، اور آپ ریحان دا۔ انگریزوں کے پٹھو بن گئے ـــ" اوہ رولو ـــ نو ـــ نو ـــ لوٹ جیوتی ـــ لوٹ ـــ"

"اتنا غم نہ کرو ریحان۔ اندولن میں اسی طرح جانیں جاتی ہیں۔ سال بھر پہلے تم بھی کسی وقت مارے جا سکتے تھے ـــ لو چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے ـــ"

"اُدما ـــ" ریحان نے غصّے سے کہا۔

"سُوری اولڈ چیپ ـــ تم ہمیشہ یوں ہی مارے مارے پھرتے ہو۔ نہ کھانے کی فکر، نہ ڈھنگ کی چائے ملتی ہوگی۔ چند روز کے لئے میرے یہاں ہو تو اپنی صحت کا خیال رکھو"۔

"اوہ۔ سوری اوما۔ لاؤ۔ میں بہت UPSET ہوں"۔

"میں کیا UPSET نہیں ہوں۔ تم آملیٹ کھاؤ گے نا ـــ؟"

"ہاں۔ دے دو"۔

"اب کچھ دیر کے لئے یہ تکلیف دہ حالات بھول جاؤ۔ آرام سے ناشتہ کرو۔ آج پھر تم کو دن بھر دوڑ دھوپ کرنی ہے۔ آتے ہی فرید پور بھاگ گئے"۔ انھوں نے ٹوسٹ دو حصوں میں کاٹ کر ریحان کے سامنے رکھا۔ آملیٹ پر کالی مرچ نمک چھڑکا۔ اور بچوں کی طرح چھری کانٹا اٹھا کر اس کے ہاتھ میں پکڑوایا۔ وہ مسکرایا۔

"ناؤ بی اے گڈ بوائے، اینڈ ایٹ"۔

"وہ سر جھکا کر کھانے میں مشغول ہو گیا۔ اُوما اس کو دیکھتی رہیں"۔

"تمھارے ابا کیسے تھے، خیریت سے تھے؟"

"کون ـــ؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"تم اپنے گاؤں گئے تھے نا۔ شونا پور۔ مجھ سے تو یہی کہہ گئے تھے"۔

"اوہ ـــ ہاں۔ نہیں۔ ہاں بالکل اچھے ہیں۔ تھینک یو"۔ اس نے ایک لقمہ نگل کر پھر اخبار کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اوما نے جھپٹ کر اخبار اٹھا لیا۔

"نہیں ملے گا۔ فنش یور بریکفاسٹ فرسٹ"۔

وہ پھر پلیٹ پر جھک گیا۔

"رات تم بہت دیر سے آئے۔ کیا پارٹی ـــ میں اتنی دیر لگ گئی؟"

"رات ـــ اوہ ـــ ہاں ـــ نہیں۔ رات میں دیپالی کے ہاں چلا گیا تھا۔ دیپالی ـــ؟"

"ہاں۔ کیا بھول گئیں اُسے؟ دیپالی سرکار۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ "نورالرحمٰن میاں" کے زمانے کے بعد بھی تمھاری اس سے جان پہچان ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں تھی جس کا تم سے ذکر کرتا۔ دراصل وہ بھی کل ہی فریدپور سے لوٹی ہے۔ اسٹیمر پر اس سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔"

"اوہ۔ آئی سی ـــ" اوما نے زور سے چھری کانٹا پلیٹ پر پٹخا اور غصہ سے بیرے کو آواز دی ـــ "کریم خاں ـــ"

بیرہ سرعت سے نمودار ہوا۔

"کریم خاں۔ روز منع کرتی ہوں کہ انڈا ہاف بائل مت کرو۔" غصے سے ایک دم ان کا چہرہ سُرخ ہو چکا تھا۔

"اوہ اُوما۔ دوسرا انڈا بنوا لو۔ ایسی بھی کیا قیامت آگئی۔"

"نہیں۔ تم جانتے نہیں۔ ممی گھر پر نہ ہوں تو یہ لوگ بالکل بیگار ٹالتے ہیں ـــ ڈیم ـــ"

بیرہ غائب ہو چکا تھا

"کم آن ـــ اوما ـــ" ریحان نے ہنس کر کہا۔ "کوئی کانگریس سوشلسٹ سنے گا تو کہے گا کمیونسٹ لیڈر اس طرح اپنے نوکروں کو ڈانٹتے ہیں!"

"اوہ شٹ اَپ۔"

"اُوما تمھارا غصہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔" وہ آملیٹ ختم کرنے میں مصروف ہو گیا۔

سیزر سیڑھیاں پھلانگتا برآمدے میں آیا اور اپنی مالکن کے قدموں کے پاس ڈھیر ہو گیا۔ اُوما نے ناگواری سے اس پر نظر ڈالی۔

بیرے نے دوسرا انڈا لا کر اوما کے سامنے رکھا۔ ریحان نے نظر بچا کر شرارت سے کریم خاں کو آنکھ ماری۔ بوڑھا بیرہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ ہونٹ پچکا کر پیچھے ہٹا اور جا کر میز سے کچھ فاصلے پر اپنی ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد یہ جان کر کہ اوما دیبی کا غصہ اب ٹھنڈا ہو گیا ہو گا، ریحان نے کہا ـــ "اُوما میں تم کو ایک ضروری بات بتانا چاہتا تھا ـــ"

"کریم خاں ـــ دھوبی سے پوچھو میری ساریاں استری کر دیں۔"

کریم خاں اشارہ سمجھ کر غائب ہو گیا۔

"ہاں بتاؤ کیا بات ہے۔"

"میں دیپالی سے شادی کر رہا ہوں"۔

انڈے کا چمچہ سنبھالے اُوما دیبی کا ہاتھ ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔

"اس کے بغیر اگر میں جیتے جی مر گیا تو مُوڈ منٹ کا نقصان ہوگا"۔ ریحان نے مصنوعی سنجیدگی سے وضاحت کی۔

اُوما اب عینک اتار کر بھونچکی سی اسے دیکھ رہی تھیں۔

"کیوں اُوما؟"

"تم ــــ تم ریحان۔ جب سے ہم کالج میں داخل ہوئے۔ لندن میں رہے ایک ساتھ سیاسی کام کیا۔ تم نے آج تک مجھ سے اپنا کوئی راز نہیں چھپایا تھا ــــ پھر اتنی بڑی بات مجھ سے کیوں پوشیدہ رکھی ــــ؟"

ریحان ذرا سُرخ ہو گیا۔ عورتیں۔ "اُوما ــــ" اس نے متانت سے کہا۔ "مانتا ہوں تم میری دوست، فلسفی اور گائیڈ ہو۔ مگر یہ میرا بہت ہی ــــ بہت ہی ذاتی معاملہ تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ ایک عورت دوسری عورت کے سلسلے میں کبھی غیر جانبدارانہ رائے نہیں دے سکتی"۔

"یہ تم میرے لئے کہہ رہے ہو؟ میں جو تم کو اپنا ــــ اپنا ــــ"

"اوہ ــــ کم آن اُوما ــــ مجھے افسوس ہے کہ تم کو میری اس رازداری سے دکھ پہنچا"۔

"کیوں ــــ" اُوما نے کرسی پر پہلو بدلا۔ "اگر مجھے پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ تم اسے پسند کرتے ہو تو میں پہلے سے دوگنا اس کا خیال کرتی۔ مجھے خود وہ لڑکی پسند ہے"۔

"تمھیں بھی پسند ہے اُوما؟" ریحان کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ "ونڈرفل۔ تو تم میرے انتخاب کو مانتی ہو؟"

"مجھے بہت پسند ہے۔ میں ہی اسے مُوڈ منٹ میں لائی ہوں۔ تم بھولتے ہو کہ ایک لحاظ سے میری ہی وساطت سے اس سے تمھاری ملاقات ہوئی"۔

"یہ تو غلط ہے اُوما۔ اس پر تو میں بہت پہلے زہر کھا چکا تھا۔ لَوایٹ فرسٹ سائیٹ وغیرہ۔ وغیرہ"۔

"تم جذباتی طور پر ابھی تک بے حد امیچور ہو"۔

"ابھی تو تم میرے انتخاب کی تعریف کر رہی تھیں، پھر میں امیچور کیسے ہوا؟ اُوما اپنا ہارڈ بوائلڈ انڈا تو کھاؤ۔ تم کو اس اطلاع سے ایسا ــــ ایسی حیرت ہوئی ہے کہ بے چارے محمود اور جیوتی کی شہادت کا بھی ایسا ری ایکشن نہیں ہوا تھا ــــ کمال ہے"۔

اُوما چہرہ سخت کر کے چاندی کے ننھے چمچے سے انڈے پر کھٹ کھٹ کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

ریحان کہنیاں میز پر رکھے انھیں دیکھتا رہا۔ یہ شاید میری زیادتی ہے۔ ایسی مخلص دوست کے ساتھ میں ایسی سخت باتیں کر رہا ہوں۔" سوری اُدما ـــ واقعی مجھے بہت پہلے تم کو اپنا ہم راز بنانا چاہئے تھا۔ مگر حالات بھی تو کیسے ابنارمل تھے۔ مستقل انڈر گراؤنڈ، مسلسل احتیاط، اور پھر وہ احمق بھی نہ جانے کیوں مجھ سے خفا ہو گئی تھی۔ نہایت محنت سے اب جا کر اسے ذرا راہ راست پر لایا ہوں ـــ افوہ یہ عشق کرنا بھی خاصی مشقت ہے۔ تم تو کبھی اس چکر میں پڑی نہیں، تمھیں کیا معلوم"۔

اُدما چپ چاپ انڈا کھانے میں مصروف رہیں۔

" لو۔ اب تم خفا ہو گئیں۔ یہ کیا مصیبت ہے یار"۔ پھر اس نے دفعتاً بڑی گمبھیر آواز میں کہا:۔

" اوما۔ تم جانتی ہو، میں مدتوں گاؤں جا کر اپنی بہن سے نہیں مل پاتا۔ ڈھاکے میں اپنے نواب رشتہ داروں سے ملنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ صرف تم ہی میرے لئے سب کچھ ہو۔ تمھارے خلوص کی وجہ سے یہ گھر تک مجھے اپنا گھر معلوم ہو رہا ہے۔ حالانکہ"۔ وہ تمسخراً ہنسا۔ "وڈ لینڈز کو اپنا گھر سمجھنا حماقت ہے مگر بہر حال اتفاق سے تم اسی محل میں پیدا ہوئیں۔ کیا کیا جائے۔ تم جہاں رہو گی وہی میرا گھر ہو گا"۔

اوما نے پلکیں جھپکائیں۔ ان کی عینک کا شیشہ دھندلا ہو چکا تھا۔ ریحان جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ جذباتیت سے بے انتہا گھبراتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی خاصا جذباتی ہو رہا ہے۔ وہ جلدی سے کرسی پیچھے سرکا کر اٹھا۔ اور لپک کر اپنے کمرے سے سگریٹ اور ماچس اٹھا لایا۔ سگریٹ سلگا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بشاش آواز میں اس نے کہا "لاؤ گرما گرم چائے تو بنا کر دو ـــ"

اُدما نے آہستہ سے ٹی کوزی اٹھا کر چائے اس کی پیالی میں انڈیلی۔

" میں۔ میں تو اب چلا جاؤں گا واپس بمبئی۔ دیپالی تمھارے حوالے۔ تم میری غیر موجودگی میں اس کا خیال رکھنا۔ وہ ذرا بیوقوف سی لڑکی ہے۔ اگر کبھی کوئی حماقت کی بات کرے تو میری خاطر اسے معاف کر دینا۔ وعدہ ـــ؟"

" وعدہ"۔

" گڈ اولڈ اُوما"۔ وہ اطمینان سے چائے پینے میں جٹ گیا۔

" تمھارا خیال ہے بنوئے بابو اس شادی کی اجازت دے دیں گے؟"

" کوشش تو میں یہی کروں گا"۔

" اور تم دونوں ہول ٹائمر کی تنخواہ پر گذر کر لو گے؟"

" اُوما۔ تم تو کسی بورژوا بڑی بی کی طرح بات کر رہی ہو۔ اتنے ہول ٹائمرز نے آج تک کس طرح شادیاں کی ہیں؟ ان سب کی بیویاں بھی کام کر رہی ہیں۔ دیپالی اتفاق سے گریجویٹ ہے اور سنگیت کی ماہر ـــ کمال ہے بھئی تم جب بیاہ کرو گی تو کوئی مارواڑی سیٹھ یا ڈپٹی کمشنر تلاش کرو گی۔

اپنے لئے ؟"

" بکواس مت کرو"۔

" اوہ ۔ سوری ۔ سوری"۔

" چنانچہ ـــــ دیپالی گا بجا کر گھر کا خرچ چلائے گی ۔ ریڈیو پروگرام اور ریکارڈوں کی مختصر سی رائلٹی اور میوزک کے ٹیوشن ۔ اور آپ بیوی کی کمائی پر ـــــ"

" اُوما ـــــ" ریحان کو اب پہلی بار غصہ آیا۔" تم آج کیسی عجیب و غریب باتیں کر رہی ہو۔ مجھے یقین نہیں آتا۔"

" میں بورژوا بڑی بی نہیں ہوں۔ محض چند پریکٹیکل باتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہوں۔ یہ تمھاری ہینڈ ٹو ماؤتھ خانہ بدوش زندگی ـــــ شادی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے ـــــ"

" اُوما ـــــ تم سچے دل سے کمیونسٹ کبھی نہیں تھیں ـــــ اس کا یہ مطلب ہے"۔

" میں سچے دل سے تمھاری دوست ہوں۔ اور دوسری بات ـــــ اگر تم اس خوش فہمی میں ہو کہ بنوئے بابو تمھیں بہ خوشی اپنا داماد بنا لیں گے ـــــ وہ قدامت پسند ہندو ہیں"۔

" جہاں تک میں نے چند ملاقاتوں میں اندازہ لگایا تھا، وہ بالکل کمیونل نہیں ہیں۔ اور بہرحال میں نے کہا تو، وہ اگر اجازت نہ بھی دیں تو کیا مضائقہ ہے۔ دیپالی اکیس سال کی ہو چکی ہے۔ ہم لوگ کلکتہ جا کر سول میرج کر لیں گے"۔

" مجھے تمھاری طرف سے بے حد پریشانی ہے ریحان۔ نہ جانے تم کس آفت میں پھنس جاؤ"۔

" افوہ ۔ تم تو اتنی متفکر ہو گئیں گویا آج تک ہندوستان میں کوئی انٹر کمیونل شادی ہی نہیں ہوئی۔ اچھا۔ تم ایک کام کرو"۔

" کیا ـــــ ؟"

" چندر کنج جا کر میری سفارش کر دو۔ جھٹ پٹ"۔

" میں ـــــ ؟"

" دیپالی کہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر سرکار پہلی ملاقات ہی میں تم سے بے حد متاثر ہو گئے تھے۔ جب تم "کلثوم آپا" کی سازش کے سلسلے میں اسے اپنے ساتھ فرضی طور پر کو میلا لے گئی تھیں۔ یوں اسے اگر اپنی سہیلیوں کے ہاں دیر لگ جائے تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں ـــــ"

" دیپالی کیا کہہ رہی تھی ؟"

" کیا ـــــ ؟ تمھارے متعلق ـــــ ؟" اس نے ہنس کر جواب دیا۔" کہہ رہی تھی ایسا لگتا تھا جیسے

ادما دی نے بابا پر جادو کر دیا ہو"۔

"گڈ گاڈ"۔

"قسمیہ۔ ادما تم سچ مچ جا کر ذرا ان کے خیالات کا اندازہ تو لگاؤ"۔

"مجھے مڈل کلاس ہندو بنگالیوں کے خیالات کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ بھدرا لوگ"۔

"مجھے بھی اندازہ ہے۔ مگر میں ہندو بنگالی بورژوازی بھدرا لوگ کی نظروں میں کم از کم اشراف تو ہوں۔ ذرا غور کرو"۔ وہ پھر ہنسا۔ "ہمارے بنگال کی ہندو بورژوازی مسلم بورژوازی کو کس سرپرستانہ انداز میں "اشراف" کہہ کر گویا TOLERATE کرتی ہے۔!!"

"اگر کوئی تمہارے اس لہجے کو سنے تو سمجھے کہ شاید تم بھی کمیونل ہو۔ سچے دل سے کمیونسٹ نہیں"۔ ادما نے ہنس کر جواب دیا۔

ریحان بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "بہر کیف تم اب اپنے دوسرے مشن پر چندر کنج جاؤ"۔

"کوئی ہندو یا مسلمان باپ چاہے وہ کتنا ہی روشن خیال کیوں نہ ہو اپنی لڑکی کو دوسرے فرقہ میں شادی کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا"۔

"تمہارے ڈیڈی بھی؟"

"میرے ڈیڈی کا یہاں کیا ذکر ہے"۔

"کیوں؟" وہ ہنستا رہا۔ "فرض کرو تم کسی اشراف سے بیاہ کرنا چاہو، یا عیسائی سے یا انگریز سے، یا چینی، جاپانی، روسی سے، تو سرپرستی توش اجازت نہ دیں گے؟ وہ تو بے حد آزاد خیال ہیں"۔

"میرے بیاہ کا کیا ذکر ہے"۔

"اوکے، اوکے ادما۔ بچیوں کی طرح شرماؤ نہیں۔ ہے کوئی مرغا نظر میں؟ چلو میں سرپرستی توش سے تمہاری وکالت کر دوں گا۔ تم بنوئے بابو سے میرا پروپیگنڈہ کرو۔ لاؤ ملاؤ ہاتھ ــــ" اس نے دوستانہ بے تکلفی سے ادما کا ہاتھ کھینچ کر زور سے مصافحہ کیا۔ ادما نے غصے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ "ریحان۔ تمہارا لونڈہارپن کب جائے گا؟"

"اسی لونڈہارپن کو ختم کرنے کے لئے تو اب گھر بسانے کا ارادہ ہے ہمارا"۔

"کل شام کیا پروپوز ــــ؟"

"نہیں"۔

"ابھی تک کوئی بات ہی نہیں کی؟"

"یوں ہی ــــ ذرا شاعری واعری بگھارتا رہتا ہوں۔ اس سے کہا تو ہے کہ شادی کرنا چاہتا

ہوں مگر باقاعدہ سنجیدگی سے ایسا کہتے ہوئے بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ اگر وہ اپنی یار دوست اور کامریڈ نہ ہوتی، محض لڑکی ہوتی تو دوسری بات تھی۔ اب عجیب مسخرہ پن سا لگتا ہے۔ تم۔ تم میرا مطلب سمجھ نہیں سکتیں۔ اس سے FORMAL طور پر کیا کہوں؟ بس ایک روز بھگا کر لے جاؤں گا۔ بھگانے کا الٹی میٹم اسے البتہ دے دیا ہے"۔

"تم بالکل دیوانے ہو رونو"۔

"ہوں تو سہی"۔

اب ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ پہلو کا باغ بیحد تر و تازہ اور دلفریب معلوم ہو رہا تھا۔

اچانک اوما نے کہا ـــ "تم بے چاری جہاں آرا کو اتنی جلدی بھول گئے"۔

وہ ایک دم اس غیر متوقع تذکرے سے ششدر سا رہ گیا۔ اس نے سگریٹ کا کش لگایا اور جھینپ کر سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ "اتنی جلدی تو نہیں، کافی عرصہ ہو گیا"۔

"اوہ ـــ یُو مین (MEN)"۔

وہ خاموش ہو گیا۔ سیزر اب اوما دیبی کے قدموں سے اٹھ کر گرانباری سے چلتا ہوا کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہیں۔ پھر انھوں نے دوسرا سوال کیا ـــ "دیپالی کو معلوم ہے؟"

"نہیں ـــ"

"تم نے اُسے کچھ نہیں بتایا؟"

"بتانے کی کیا خاص بات تھی۔ جہاں آرا، بے چاری کی میری موجودہ زندگی میں اب کیا اہمیت ہے کہ میں خواہ مخواہ اس کا تذکرہ چھیڑتا۔ اور بات بھی کیا تھی کہ جہاں آرا کے والد مجھے اپنا گھر داماد بنانا چاہتے تھے۔ ایسا اکثر مسلمان گھرانوں میں ہوتا ہے ـــ"

"دیپالی جہاں آرا کی گہری دوست ہے"۔

"میں جانتا ہوں"۔

"تم ابھی کہہ رہے تھے کہ پچھلے دنوں وہ تم سے خفا ہو گئی تھی۔ ممکن ہے اسے معلوم ہو گیا ہو، اور اس وجہ سے وہ تم سے ـــ"

وہ جھنجھلا گیا ـــ "اگر اس وجہ سے ناراض تھی تو مجھے بآسانی بتلا سکتی تھی۔ وہ بے انتہا صاف دل اور منہ پھٹ لڑکی ہے"۔ وہ دفعتاً چپ ہو گیا۔ اور تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "پتہ نہیں لاحول ولا قوۃ ـــ عورتوں کے دماغ بھی عجیب انداز سے کام کرتے ہیں۔ اسے مجھے بتانا تو چاہئے تھا۔ اگر یہی بات ہے ـــ مگر تم کو یہ خیال کیسے آیا؟"

"میں بھی عورت ہوں۔"

"لائیک ہیل ——" وہ یک لخت بے حد پریشان ہو کر پیالی میں چمچہ بجانے لگا —— "اومائی گاڈ"۔ اوما تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں واقعی عجیب آفت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ مجھے پارٹی کی طرف سے ماموں جان سے ہی بات چیت کرنی ہے۔ ارجمند منزل جا کر —— اوہ ہل ——"

"ارجمند منزل کب سے نہیں گئے؟"

"مدتیں گذر گئیں"۔

"کیوں نہیں جاتے، کیا احساسِ جرم ستاتا ہے؟"

"یہی سمجھ لو"۔

"کبھی جہاں آرا یاد آتی ہے؟"

"اپنی پہلی محبت کو انسان کبھی نہیں بھول سکتا ہے؟"

"تم نے مجھے ایک بار لندن میں سرسری سا بتایا تھا۔ وہ تمھاری فرسٹ کزن ہے نا؟"

"سکنڈ۔ اب چھوڑو اس قصہ کو۔ گڑے مُردے اُکھیڑنے بیٹھ گئیں"۔

"بے چاری لڑکی"۔

"یو آر اے ڈیم کروک اُوما"۔

وہ ہنسنے لگیں۔

"اور میں نے کون سا ایسا جرم کیا ہے جس کے کنفیشن کی ضرورت ہے؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کے متعلق تمھیں دیپالی اندھیرے کو میں نہ رکھنا چاہیے"۔

"ویٹ —— آئی ایم افریڈ —— از مائی اون بزنس"۔

اُوما نے تازہ چائے کے لئے گھنٹی بجائی۔ وہ اس جذباتی چھوکرے کو ہینڈل کرنا خوب جانتی تھی۔ اخبار سرکا کر انھوں نے چند لمحوں بعد موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا —— "بے چارے محمود اور جیوتی —— ہم اپنی باتوں میں ان دونوں کو بالکل بھول ہی گئے"۔

ریحان نے پلکوں پر انگلیاں پھیریں۔ "خدا کے لئے چپ رہو اُوما"۔

وہ بھی خاموش ہو کر بارش کو دیکھنے لگیں۔ خدمت گار برآمدے میں آیا۔ اُوما نے چائے دانی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ چائے دانی اٹھا کر اندر چلا گیا۔ اوما نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے اس وقت گرٹرڈ یاد آرہی ہے۔ کس طرح گولیوں سے چھلنی ہو کر مری بے چاری۔ اسپین سے اتنے دنوں بعد ہمیں اطلاع ملی تھی۔ یاد ہے؟"

ریحان نے الم سے سر ہلایا۔

"اور مجھے یاد ہے جب تمھاری امّی کے انتقال کی خبر آئی تو تم نے کہا تھا۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ اگر میں بھی گرٹرڈ کی طرح کہیں موت کے گھاٹ اتروں تو امّی زندہ نہ رہ سکتیں۔ اس وقت نہ جانے بے چارے محمود کی ماں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ جیوتی کے ماں باپ تو غالباً اس کے بچپن ہی میں مر چکے تھے۔"

ریحان اب یہ غمناک تذکرہ ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اب اتنے عرصہ بعد اچانک اس کی امّی اس کے تصوّر میں آن موجود ہوئیں ـــــ میری امّی ـــــ میری امّی ـــــ اُس نے دفعتاً سر ہاتھوں میں چھپا کر میز پر ٹکا دیا۔

"رونو ـــــ"

صرف اس کی امّی اتنے پیار سے اسے رونو پکارتی تھیں۔ رونو لو چائے آگئی۔ اٹھو۔

"رونو۔ لو چائے آگئی۔ اٹھو۔" اُدما کہہ رہی تھیں۔

اُس نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا۔ اور چوروں کی طرح اُدما پر نظر ڈالی۔ مائی لٹل مدر۔

اُدما چائے گھولنے میں مصروف رہیں۔ وہ چپ چاپ اپنی پیالی کا انتظار کرنے لگا۔

"ایک بات سنو۔ مذاق برطرف۔" اُدما نے اسے پیالی دے کر کہا۔ "تم نے اپنی غیر موجودگی میں دیپالی میرے حوالے کی ہے۔ فرض کرو وہ تمھارے اس قصّے کے بارے میں مجھ سے پوچھے تو میں اسے کیا بتاؤں؟"

"کوئی ایسی بات نہیں ہے، تم خواہ مخواہ اتنی دیر سے لمبا چوڑا میلوڈرامہ بنا رہی ہو۔" ریحان نے پھر جھنجھلا کر کہا۔

"مگر مجھے پوری تفصیل تو معلوم ہونی چاہئے۔ فرض کر جہاں آرا اس سے کچھ کہے تو خود اُس کی پوزیشن کتنی نازک اور AWKWARD ہوگی۔ اور وہ تمھارے متعلق کیا سوچے گی کہ تم نے دو لڑکیوں کو جُل دیا۔ پہلے جہاں آرا کو دغا دی اور پھر اسے دھوکے میں رکھا۔ جبکہ وہ جہاں آرا کی اتنی گہری دوست ہے ـــــ مجھے یقین ہے وہ اسی وجہ سے تم سے بدک گئی تھی۔ نواب صاحب تم کو گھر داماد بنانا چاہتے تھے۔ مگر تم کو جہاں آرا سے خود کوئی دلچسپی نہ تھی؟ تم بالکل بے قصور ہو ـــــ؟"

"کیا میرا ٹرائل ہو رہا ہے؟ تم کو تو واقعی بیرسٹر ہونا چاہئے تھا۔"

"تمھاری امّی نواب قمر الزماں کی سگی چچازاد بہن تھیں۔؟"

میری امّی ـــــ میری امّی۔

بارش کی لطیف دھند باغ پر منڈلاتی رہی۔ ہوا میں پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

"پھر تمھیں جائداد میں حصہ کیوں نہیں ملا؟"

"اوہ اُدما ـــــ اُدما ـــــ ڈونٹ بی سچ اے بور۔ تم کو بتلا چکا ہوں۔" ریحان نے اکتا کر جمائی

لیتے ہوئے کہا۔ "مگر تم ساری الف لیلیٰ نہ جانے کیوں پھر سننا چاہتی ہو۔ آل رائٹ ــــ مجھے جائداد میں حصہ نہیں ملا۔ جس کی مجھے مطلق پرواہ نہیں۔ میرے نانا نواب زادہ فخرالزماں چودھری نواب نورالزماں چودھری کے چھوٹے بھائی تھے۔ آیا خیال میں۔ یاد کرلو۔ گرہ میں باندھ لو۔ اور بار بار اپنے سوالوں سے مجھے بور نہ کرنا۔ میرے نانا فخرالزماں چودھری نواب قمرالزماں کے والد نواب نورالزماں کے اکلوتے چھوٹے بھائی تھے۔ اب رٹ کر سبق سناؤ۔ چلو۔ تم بھی کیا یاد کروگی"۔

ادما قہقہہ لگا کر ہنسیں۔ "آگے بتاؤ۔ بڑا الف لیلوی قصہ ہے"۔

"لائیک ہل۔ الف لیلوی قصہ یہ ہے کہ نانا جان اپنے بڑے بھائی کی طرح بے حد رنگین مزاج تھے۔ صرف کلکتہ کی گوہر جان پر ایک گاؤں نچھاور کردیا تھا۔ اور ایک وہ۔ بچپن میں سنا کرتا تھا لکھنؤ کی ننھا بچوا اور دلّی کی چھمیا اور بنارس کی بے نظیر۔ فیوڈل ڈیکڈنس کی بات کرتے ہیں آپ لوگ"۔ اس نے پیالی ذرا زور سے طشتری میں رکھی۔

"تم کو پتہ ہے ہم بورژوا لوگوں کو تم فیوڈل لوگ بے حد فیسی نیٹ کرتے ہو"۔ ادما نے مسکرا کر کہا۔

"بکواس۔ بہرحال"۔ ریحان نے ماچس کے لئے پہلے کرتے کی ایک جیب میں پھر دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"سگریٹ پینے بند کردو۔ ہاں پھر کیا ہوا۔؟"

"پھر یہ ہوا کہ نانا جان نے ایک تھیٹر کمپنی میں روپیہ لگایا۔ مرحوم خود بھی ناٹک لکھتے تھے۔ ارجمند منزل میں باقاعدہ جلسہ گھر تھا۔ بہرحال۔ تھیٹر کمپنی کا منیجر سارا روپیہ غبن کرکے رنگون بھاگ گیا۔ نانا جان محض گنارے دار نہیں تھے ان کی اپنی زمینیں بھی تھیں۔ اور جب عین عالم جوانی میں نانا جان کا اچانک حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔ اُس وقت ان کے حصّے کی زمینداری مہاجن کے ہاں رہن رکھی ہوئی تھی۔

"امّی ان کی اکلوتی لڑکی تھیں۔ جب نانا جان مرے وہ شاید چھ یا سات سال کی تھیں۔ والد کے مرنے کے دوسرے سال کالرا کی وبا پھیلی۔ اور اس میں ان کی والدہ بھی چل بسیں۔ امّی اپنے تایا کے یہاں پلنے لگیں۔ نواب زادہ فخرالزماں کی جو جائداد فضول خرچی اور عیاشی سے باقی بچی تھی نواب نورالزماں نے رہن سے چھڑا کر بھتیجی کے قانونی سرپرست کی حیثیت سے اپنے قبضہ میں لے لی۔ قاعدے سے امّی کی شادی اپنے تایا زاد بھائی یعنی نواب قمرالزماں سے ہونی چاہئے تھی۔ بیگم نورالزماں اب شوہر کی یتیم اور نادار بھتیجی کو کیوں خاطر میں لاتیں۔ وہ کشتیہ کے ایک نواب کی لڑکی کو دیکھ آئی تھیں جو جہیز میں گاؤں، مکانات باغات اور پٹ سن کے کھیت لے کر آئی"۔

وہ سانس لینے کے لئے رکا۔ ماچس سے کھیلنے لگا۔ اور بولا۔ "امّی ابھی پندرہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھیں کہ نواب نورالزماں نے ان کی شادی ایک نوجوان غریب مولوی سے کردی ـــــ جو ان کے لڑکے کو عربی فارسی پڑھایا کرتے تھے"۔

"اوہ ـــــ"

"امّی کا حمایتی یا پرسانِ حال ان کے ننھیال میں بھی کوئی نہ تھا۔ باقی رشتے دار حسب معمول آپس کی زمینداری کی مقدمہ بازیوں میں جٹے ہوئے تھے۔ ایک یتیم لڑکی کی ذمہ داری کون سنبھالتا۔ ان کے ماموں اور نانا وغیرہ سب مرچکے تھے۔ نواب نورالزماں کے قریبی رشتے دار ہی امّی کے ننھیالی لوگ تھے۔ اور سب نواب کی مطلق العنانی اور دبدبے سے خائف تھے۔ نواب صاحب نے کہا کہ لڑکا سید اور بے حد شریف ہے۔ اور نکاح پڑھوادیا۔ اور واقعی ابّا بہت فرشتہ صفت اور بھولے انسان نکلے۔ ابّا کا گاؤں شونا پور نواب صاحب کے علاقے کے پڑوس میں تھا۔ ان کے ہاں کاشتکاری ہوتی تھی۔ میرے ابّا، تینوں چچا اور ان کے لڑکے کاشتکار ہیں۔ خود کھیت بوتے اور جوتتے ہیں۔ خود فصل کاٹتے ہیں۔ حُقّہ لے کر چوپال پر بیٹھتے ہیں۔ ہم اصل انسان کسان ہیں۔ اوما"۔

"تمھاری امّی خوش رہی تھیں؟"

"تم جدید لڑکی ہو اوما اور تم پچھلی نسل کی مسلمان اور ہندو لڑکیوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ صبر و قناعت اور شوہر کی خدمت جن کا دین ایمان تھا۔ امّی کو تو اپنے تایا سے بھی شکایت نہ تھی، نہ اپنے باپ سے جن کی رنگ رلیوں کا اثر اس طرح ان کی اپنی زندگی پر پڑا"۔ وہ چپ ہوگیا۔

"کمال ہے۔ تم نے مجھے یہ سب اس مرتبہ لندن میں نہیں بتایا تھا۔ ہمیشہ کتراتے رہے"۔

"میرے ذاتی حالات سے کسی کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے"۔

"مجھے تو ہے روزو۔ کیا تم واقعی مجھے اپنا پرخلوص دوست نہیں سمجھتے؟"

جب لندن میں اس کے پاس ماموں جان ـــــ نواب قمرالزماں کا کیبل آیا تھا کہ اس کی امّی کا گاؤں میں نمونیہ سے انتقال ہوگیا۔ وہ خود بیمار پڑا ہوا تھا۔ اس زمانے میں اوما نے کس لگن سے اس کی دلجوئی کی تھی۔ دن رات وہ اس کے ارلز کورٹ کے ڈگز میں سرہانے بیٹھ کر اس کا ٹمپریچر لیتی۔ اسے دوا پلاتی۔ اس کے لئے کھانا پکاتی۔ اس کے کپڑے تک دھوتی اور استری کرتی۔ صرف اس کی امّی ہی نے اس کی ایسی دیکھ بھال اور خدمت کی تھی۔ اوما کا یہ بے لوث سلوک وہ عمر بھر نہ بھول سکتا تھا۔

"پھر کیا ہوا روزو ـــــ؟"

"ارے تمھیں بتلایا تو تھا یار ـــــ"

"تمھاری امّی غریب کسان گھر میں کس طرح خوش رہیں؟"

وہ اداسی سے مسکرا دیا۔ "مجھے یاد ہے۔ میں چھوٹا سا تھا اور ایک اندھیری رات برآمدے میں چٹائی بچھائے لالٹین سامنے رکھے اسکول کا سبق یاد کرنے میں مصروف تھا۔ جب اندر سے امّی کے آہستہ آہستہ رونے کی اور ابّا کے چلانے کی آواز آئی۔ میں امّی کو بے حد چاہتا تھا۔ ان کے رونے کی آواز سے گھبرا کر میں نے باشا کی دیوار سے کان لگا دئے اور پھر سوراخ میں سے جھانکا۔ امّی دن بھر کام کاج کی محنت کے بعد تھک کر رونے لگی تھیں۔ وہ چولہے کے پاس پیڑھی پر سر جھکائے بیٹھی تھیں اور میرے ابّا ـــــ مجھے وہ منظر اب تک یاد ہے۔ میرے ابّا کمرے کے دروازے میں کھڑے اس متانت سے تقریر کر رہے تھے گویا جمعہ گھر کے منبر پر وعظ کہتے ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے، میں نے تم کو حلیمہ بی بی شادی کے دوسرے دن سمجھا دیا تھا کہ بھول جاؤ کہ تم نواب فخرالزماں مرحوم کی بیٹی اور نواب نورالزماں چودھری رئیس اعظم فریدپور کی بھتیجی ہوں ـــــ اور ہمیشہ یاد رکھو ـــــ انھوں نے شہادت کی انگلی اٹھا کر کہا ـــــ کہ تم ایک غریب سیّد کی بیوی اور آلِ رسولؐ کی بہو ہو ـــــ اور یاد رکھو حلیمہ بی بی کہ شہنشاہِ کائناتؐ کی بیٹی مولا علیؑ کے گھر میں چکّی پیستی تھیں۔ اور ایران کی بادشاہ زادی شہید کربلاؑ کے گھر میں فاقہ کرتی تھی۔ تم تو ان سب کی خاک پا بھی نہیں ہو۔ توبہ استغفار کرو۔ اور اللہ سے ڈرتی رہو۔ وہ بخشش والا اور مہربان ہے ـــــ ابّا رسولؐ اللہ کا نام لینے کے بعد درود پڑھ کر بار بار داڑھی پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ ان کی سنجیدہ شکل اور ہوا میں لرزتی داڑھی پر میری نظر پڑی تو باشا کی دیوار کے اُدھر مجھے اپنی پریشانی کے باوجود بے اختیار ہنسی آگئی۔ اور میں اپنی شیتل پاٹی پر واپس آن بیٹھا۔ امّی ساری کے آنچل سے آنسو پونچھ کر پھر چولہے پر جھک گئیں۔ اور ابّا باہر چلے گئے۔

"اس کے بعد مجھے یاد ہے، امّی نے ابّا سے پھر کوئی شکایت نہیں کی، اور خاموشی سے شوہر، ساس سسر، دیور، جیٹھ اور نندوں کی ٹہل میں لگی رہیں۔ انھیں واقعی یہ فخر تھا کہ سیّد کی بیوی ہیں۔ بے حد مذہبی تھیں۔ پانچ وقت کی نماز، روزے رکھتیں۔ میرے لئے طرح طرح کے وظیفے پڑھتیں، منّتیں مانتیں" ـــــ ریحان کی آواز بھرّا گئی اور اس نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"یہ سب لوگ کون تھے؟" اوما نے پوچھا۔

"کون ـــــ؟" ریحان نے چونک کر دریافت کیا۔

"یہی سب جن کی محنت کشی کی مثال تمھارے ابّا نے ان کے سامنے پیش کی۔"

"پروفٹ محمدؐ کی بیٹی اور ان کے نواسے کی بیوی۔ وغیرہ ـــــ ارے چھوڑو اوما۔ تم کو ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کیا پرانے قصّے لے کر بیٹھ گئیں"۔ وہ کرسی سے اٹھ کر برآمدے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔

"تمھارے ابّا بڑے بلند کردار انسان معلوم ہوتے ہیں"۔

"ابا ـــــ" وہ ٹہلتے ٹہلتے ٹھٹھک گیا۔ "ابا حیرت انگیز بے مثال شخصیت کے مالک ہیں! اسی وجہ سے ان کے گھر والے ان کو ذرا سا خبطی گردانتے ہیں۔ مگر گاؤں والے ان کو اچھا خاصا ولی اللہ بھی سمجھتے ہیں ـــــ جب امی کی شادی ہوئی تو نواب نورالزماں نے ان کو جہیز دیا۔ نواب زادہ فخرالزماں کا چھوڑا ہوا تھوڑا سا روپیہ موجود تھا اور بہرحال امی نواب نورالزماں کے سگے بھائی کی اولاد تھیں اور وہ ان کی جائیداد قبضے میں کر کے ان کی کافی حق تلفی کر چکے تھے۔ بہرحال۔ تو امی کا تھوڑا بہت جہیز بنایا گیا۔ جو غریب کسانوں کے لئے کسی شاہی خزانے سے کم نہ تھا۔ مگر جب ابا کشتیوں پر لدے مولویوں اور کاشتکاروں کا قافلہ بارات میں لے کر پہنچے تو انھوں نے جہیز کا سامان قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ امی بتایا کرتی تھیں کہ کہنے لگے وہ نواب نورالزماں کے ایسے غریب داماد نہیں کہلانا چاہتے جنھوں نے بیوی کے روپے سے اپنا گھر بھر لیا۔ لہٰذا وہ صرف امی کے کپڑوں کے صندوق اٹھوا کر امی کو رخصت کرا لے گئے۔ امی کے زیور البتہ جب میری بہن رابعہ پیدا ہوئی تو نواب صاحب نے اس کے نام سے بینک میں محفوظ کر دیئے تھے۔ ابا بہرحال اسی طرح دھان اگاتے اور جمعہ گھر میں نماز پڑھاتے رہے ـــــ"

"سچے کمیونسٹ ـــــ" اُدما نے کہا۔

ریحان ہنسنے لگا۔

"اصل قصہ تو تم نے اب تک بتایا نہیں"۔

"لاحول ولاقوۃ"۔ وہ عاجز آ کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"جب میں گاؤں کے اسکول میں داخل ہوا اور بقول شخصے میری ذہانت کی دھوم مچنے لگی تو نواب قمرالزماں امی ابا سے مصر ہو کر مجھے ڈھاکے لے آئے۔ میں جب چھ سات سال کا تھا تب نواب نورالزماں کا جنھیں میں بڑے نانا کہتا تھا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ بالکل پرانے فیشن کے، کارچوبی چوغہ پہنے ہوئے چغادری زمیندار۔ جیسے پرانی کتابوں کی تصویروں میں ہوتے ہیں۔ بہرحال۔ اب قمرالزماں ریاست کے مالک تھے۔ وہ مجھے ڈھاکے لے آئے۔ اور اسکول میں داخل کر دیا۔ میں اس وقت بارہ تیرہ سال کا تھا۔ میں ارجمند منزل رہ رہا تھا۔ اور نیّرالزماں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اسکول جایا کرتا تھا۔ ابا کو ماموں جان نے یقین دلایا تھا کہ امی کا روپیہ جو ابا نے شادی کے وقت لینے سے انکار کیا تھا میری تعلیم پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود بیس روپیہ مہینہ باضابطہ ہر مہینے ابا گاؤں سے میرے نام منی آرڈر کرتے۔ ماموں جان مسکرا کر وہ روپیہ وصول کرتے۔ اور میرے نام ڈاک خانے میں جمع کرتے رہتے۔ اصلیت یہ تھی کہ میں ارجمند منزل میں ماموں جان کے لاڈلے نورِ نظر کی حیثیت سے پروان چڑھایا جا رہا تھا۔ ان کا بیٹا نیّر خاصا کوڑھ مغز تھا۔ ماموں جان اس کی طرف سے بہت مایوس تھے۔ اور مجھے آئیڈیلائز کر رہے

تھے۔ اور اصل بات ساری یہ تھی کہ وہ جہاں آرا سے میری شادی کرنا چاہتے تھے۔ ماموں جان علی گڑھ کے معتقد تھے، انھوں نے ایف۔ اے کے لئے علی گڑھ بھیج دیا۔ وہاں میں مزید لائق اور ہونہار ثابت ہوا۔ ماموں جان بے چارے کے سارے خاندان میں واحد معقول اور ہونہار نوجوان صرف میں تھا۔ ماموں جان میرے لئے طرح طرح کے خواب دیکھنے لگے۔ بیرسٹری۔ آئی۔ سی۔ ایس کا مقابلہ، ان کے پٹ سن کے کاروبار کی دیکھ بھال۔

"جہاں آرا چھوٹی سی تھی۔ مجھ سے پانچ چھ سال چھوٹی ہوگی۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ بڑی ہوئی اور پتہ چلا کہ ماموں جان اس سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں، تو میں بے حد خوش ہوا۔ میرا خیال تھا میں کالج سے نکل کر کسی اخبار میں کام کروں گا۔ میں انگریز سرکار کی ملازمت کے سخت خلاف ہوگیا تھا۔ کسی یونی ورسٹی میں پڑھاؤں گا۔ اور جہاں آرا کو لے کر اپنا گھر الگ بناؤں گا۔

"ماموں جان کو واقعی مجھ سے محبت تھی۔ لیکن میری ذہانت وغیرہ کے علاوہ ماموں جان میرا اتنا خیال رکھتے تھے اس کی غالباً ایک وجہ اور بھی تھی"۔ ریحان نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ان کے والد نواب نورالزماں پرانے ٹائپ کے جابر اور مطلق العنان زمیندار تھے، ماموں جان۔ قمرالزماں۔ ان کے برعکس ایک جدید انسان ہیں۔ اور نیک دل۔ ان کو یہ احساس تھا کہ ان کے والد نے اپنی بے زبان بھتیجی کے ساتھ ہر طرح سے بڑی بے انصافی کی۔ وہ مجھے اپنا داماد بنا کر تلافی کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ ـــــ اس کے علاوہ ـــــ" وہ یک لخت چپ ہوگیا۔

اُدما ہمہ تن گوش اسے دیکھتی رہیں۔ "اس کے علاوہ کیا رونو ـــــ؟"

ریحان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ ماموں جان امّی کو بے حد پسند کرتے تھے۔ انھیں بچپن سے اپنی بنتِ عم ہی سے محبت تھی۔ اور اگر ان کا بس چلتا تو وہ کشٹیہ کی رئیس زادی کے بجائے امّی سے شادی کرتے ـــــ"

"زندگی ـــــ واقعی کتنی عجیب چیز ہے ـــــ" اُدما نے آہستہ سے کہا۔ "اور تمھاری امّی بھی نواب قمرالزماں کو پسند کرتی تھیں؟"

"یقیناً۔"

"اور کسی نے ان سے نہ پوچھا کہ ان کے دل پر کیا گذری ہوگی"۔

"نہیں۔ کسی نے ان سے نہیں پوچھا۔ اور نہ انھوں نے کسی کو بتایا۔ وہ مرتے دم تک پتی ورتا بی بی رہیں۔ آخر دم تک شوہر کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں لگی رہیں"۔

"بنگالی عورت ـــــ!"

"ہاں۔ بنگالی عورت! ہندوستانی عورت!!"۔

"وہ کبھی ارجمند منزل آتی تھیں؟"

"بہت کم۔ کسی خاندانی تقریب کے لئے کبھی کبھار آجاتی تھیں اور ماموں جان ان کی خاطر مدارات میں دوڑے دوڑے پھرتے تھے۔ جاتے وقت دستور سے زیادہ تحفے تحائف ان کے ساتھ کرتے، مگر وہ سب کچھ یہیں چھوڑ جاتیں۔ کیونکہ ابا دولت مند سسرال کا ایک پیسہ لینے کے روادار نہ تھے۔ اور امی نے ساری عمر اُن کا یہ حکم مانا۔"

"شی مسٹ ہیو بین اے گریٹ وومن۔"

"شی واز۔"

اب بارش تھم چکی تھی، اور باغ کی ابر آلود فضا بیحد خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ ریحان نے گھڑی پر نظر ڈالی اور جلدی جلدی داستان ختم کرنا چاہی۔

"جب میرے ولایت جانے کا پروگرام بنا تو امی نے چاہا کہ اپنے زیورات جو بینک میں محفوظ تھے فروخت کر کے میرے ولایت کے خرچ کا انتظام کریں۔ ماموں جان نے ابا کو تو یہ پٹی پڑھائی کہ مجھے سرکاری وظیفہ مل گیا ہے۔ اور امی سے چپکے سے کہا بی بی تم زیور اپنی بیٹی کے جہیز کے لئے رکھو۔ میں اپنے بھانجے کو جو مجھے نیر کی طرح عزیز ہے، اپنے روپئے سے لندن بھیج رہا ہوں، امی کو معلوم تھا کہ ماموں جان کا ارادہ جہاں آرا کو مجھ سے بیاہ دینے کا ہے۔ وہ بے چاری بے حد مسرور تھیں۔ وہ اپنے شوہر کی ضد کی وجہ سے ساری عمر تنگدستی میں گذار چکی تھیں۔ انھیں اب خوشی تھی کہ اس رشتے سے ان کے غریب بیٹے کی زندگی بن جائے گی۔"

"تمھاری امی کے پاس بہت گہنے تھے؟" اُوما نے خالص عورتوں کی سی دلچسپی سے پوچھا۔

ریحان نے ایک بار تعجب سے اس پر نظر ڈالی۔ "کہہ تو چکا ہوں، ان کی والدہ کے زیور تھے جو ان تایا نے بینک میں رکھوا دیئے تھے۔ وہ ہیرے جواہرات جو امی کو ملنے چاہئیں تھے۔ ان پر ان کی والدہ کے انتقال کے بعد بیگم نورالزماں ان کی تائی پہلے ہی قبضہ کر چکی تھیں۔

"چنانچہ میں ماموں جان کے خرچ پر لندن گیا۔ وہاں سے لوٹ کر آیا تو یہاں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مجھے ہار پھول پہنائے گئے۔ ارجمند منزل میں زوردار دعوت ہوئی۔ شونا پور پہنچا تو سارا گاؤں گھاٹ پر استقبال کے لئے موجود تھا۔ صرف امی نہیں تھیں۔ جن کو میری آمد کا سب سے زیادہ انتظار تھا۔ وہ سال بھر پہلے مر چکی تھیں۔ ابا نے جمعہ گھر میں جا کر شکرانے کی نماز پڑھی۔ چوپال میں گانے کی محفل ہوئی۔ بیاتیوں نے فوراً میرے لئے گیت بنائے۔ میں گاؤں والوں کے لئے ایک عجوبہ روزگار ہستی بن چکا تھا۔ جب میں ڈھاکے واپس آیا ــــ (تم تو ابھی لندن میں تھیں۔ یہاں کیا کیا ہنگامے رہے

میرے ساتھ) تو شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ ماموں جان نے مجھے گلے لگا کر سر پر ہاتھ پھیر کر مجھ سے کہا کہ شادی کے بعد میں ان کا پاٹ کا کاروبار اپنے ذمے لوں۔ وہ اپنے کتب خانے کی میز پر زمینداری کے کاغذات اور رجسٹر کھولے بیٹھے تھے۔ میری رہائش کے لئے بالائی منزل کے کمرے آراستہ کئے جا چکے تھے۔ ہر چیز پہلے سے طے شدہ تھی۔

"تب میں نے ان کو اطلاع دی کہ میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا ممبر ہو چکا ہوں۔ یہ سن کر ان پر بجلی سی گر پڑی۔"

"آئی ڈونٹ بلیم ہم ـــــ" ادما نے کہا۔

"مجھے ان کو صدمہ پہنچاتے ہوئے بڑا دکھ ہوا۔ مگر میں نے نرمی سے ان سے کہا کہ میں نہ ڈپٹی مجسٹریٹ بننے کا ارادہ رکھتا ہوں نہ ان کا خانہ داماد بن کر ان کی ریاست سنبھالوں گا۔ بلکہ میں جہاں آرا کو لے جا کر اپنے پھونس کے مکان میں رکھوں گا۔ آخر آپ کی بہن بھی تو اسی محل سے رخصت ہو کر میرے باپ کے جھونپڑے میں گئی تھیں۔

"ماموں جان بھونچکے ہو کر مجھے تکنے لگے۔ پھر غم و غصے سے تھر تھر کانپے۔ انھیں یقین نہ آیا کہ یہ میں کہہ رہا ہوں۔ میں نے ان کو پارٹی کارڈ دکھایا۔ اور رسان سے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں نے کیوں یہ راستہ اپنے لئے منتخب کیا ہے۔"

"عمر بھر میں پہلی بار میں نے ان کو طیش کے عالم میں دیکھا۔ وہ یک لخت اپنے مرحوم چغادری باپ کی تصویر بن گئے، انھوں نے گرج کر کہا۔ نمک حرام، احسان فراموش، کسان کی اولاد، ملانے کا چھوکرا، تیرا مستقبل میں نے سنوارا، ورنہ آج ہل چلا رہا ہوتا، دھان کے گٹھے ڈھو رہا ہوتا۔ مکتب میں بچے پڑھا رہا ہوتا بدبخت۔

"میں نے دبی زبان سے کہا۔ "دھان کے گٹھے تو میں اب ڈھوؤں گا ماموں جان!"

"مگر وہ اسی طرح گرجتے برستے رہے۔ اور مجھے خیال آیا کہ میرے نانا جان مرحوم کے لکھے ہوئے اسی قسم کے میلوڈرامیٹک ناٹک، پچاس برس قبل ارجمند منزل کے جلسہ گھر میں اسٹیج کئے جاتے ہوں گے۔ کون کہتا ہے ہمارا ہندوستانی تھیٹر زندگی کی صحیح عکاسی نہیں کرتا۔

"تین دن تک گھر میں ہنگامہ ہوتا رہا۔ ماموں جان نے ہر طرح مجھے سمجھایا۔ روئے گائے۔ گرجے برسے، اپنی عزت کا، اپنی لڑکی کی زندگی کا واسطہ دیا۔"

"آپ اس کے روادار ہیں کہ آپ کی لڑکی گھٹ گھٹ کے مر جائے، مگر آپ اس کا ہاتھ ایک کمیونسٹ کے ہاتھ میں نہ دیں گے۔" میں نے کہا۔

"دہریہ، کنگال، باغی، جیلوں میں سڑے گا۔ مارا مارا پھرے گا۔ روپوشی اور سر پر انعام۔ اور

اور وہ ـــــ (سچ پوچھو امّا۔ جب وہ یہ سب کہہ رہے تھے تو مجھے ان پر پیار آگیا۔) میں اپنی نازوں میں
پلی بچی تیرے پلّے باندھ کر اس کی قسمت پھوڑ دوں۔

"غرضیکہ نہ وہ مانے، نہ میں مانا۔ ممانی جان کو اختلاجِ قلب کے دورے پڑنے لگے۔ گاؤدی سا
مجھ سے کترانے لگا۔ ماموں جان نے اس کو حکم دے دیا تھا کہ مجھ سے بات نہ کرے۔ شادی کی تیاریاں
موخر ہوئیں۔ ارجمند منزل پر بڑا بھیانک سناٹا چھا گیا۔

"ماموں جان نے ایسا بندوبست کیا کہ شادی کی تیاریوں کی یا رشتہ ٹوٹنے کی خبر ارجمند منزل
سے باہر نہ نکلے۔ ویسے بھی اس وقت تک ماموں جان نے اپنے اس ارادے کا تذکرہ ممانی اور میری امّی کے
سوا کسی سے نہیں کیا تھا۔ زمینداروں کے ہاں شادی بیاہ کے معاملات میں بہت رازداری برتی جاتی
ہے۔ ورنہ کٹنیاں اور مشاطائیں اور مخالف زمینداروں کے حالی موالی رشتہ تڑواتے ہیں اور جانے کیا کیا
کرتے ہیں۔ اور یہاں جہاں آرار کے اپنے ماموں یعنی کشتیہ کے رئیس اعظم اپنے بھدیسل صاحبزادے کے
تلے بیٹھے تھے۔ بہرحال۔ ڈھاکہ میں اس میلوڈرامہ کی خبر زیادہ نہیں پھیلی۔ جہاں آرار خود حد سے زیادہ
دبیلی اور تھوڑی سی گھنّی لڑکی تھی۔ اس نے بھی اسکول یا کالج میں میرا تذکرہ کسی سے نہ کیا تھا۔ اسی وجہ
سے دیپالی کو اتنے برسوں اس کے ساتھ پڑھنے اور اس کی دوستی کے باوجود یہ بات معلوم نہ ہوئی۔

"بھئی میں سمجھتا ہوں، اب لنچ بھی یہیں منگوالو، میرا تو داستانِ امیر حمزہ سناتے سناتے حلق
سوکھ گیا۔"

"کہئے جاؤ۔ میں پانی منگواتی ہوں۔"

"بس میں حسب سابق اپنے پرانے کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جہاں آرار کا خیال کر کے میرا دل
کٹ جاتا۔ وہ میری لندن سے واپسی کے بعد دستور کے مطابق مجھ سے سخت پردہ کر رہی تھی۔ بلکہ
کمرے میں مایوں بیٹھ چکی تھی۔ جب یہ ٹریجڈی ہوئی۔ اس کی دونوں بہنیں بوکھلائی بوکھلائی میرے پاس
آئیں۔ آپا روتے روتے نیم جان ہو گئی ہیں۔ آپا کی آنکھیں سوج گئی ہیں۔ آپا ان تین دنوں میں آدھی بھی
نہ رہیں۔ کہاں وہ دلہن بننے کے لئے مایوں بیٹھی تھیں اور کہاں یہ خوفناک المیہ۔ رو تو بھائی۔ خدا کے
لئے آپا کو مرتے نہ دیجئے۔ یہ سب سُن سُن کر میرے حواس باختہ ہو جاتے۔

"چوتھی رات میرا آخری فیصلہ سننے کے بعد کہ میں اپنی سیاسی زندگی ہرگز ترک نہیں کروں گا ماموں
نے مجھ سے کہا، تو آج سے ارجمند منزل کے دروازے تمہارے اوپر بند ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگے۔

"چند منٹ بعد انھوں نے ـــــ بڑے چالاک ہیں میرے قمر ماموں ـــــ جذباتی بلیک میل
کے لئے ایک چال چلی۔ اس وقت مجھے ایسا خیال ہوا۔ مگر اب سوچتا ہوں کہ وہ خلوص اور صدق دل سے

ایسا کہہ رہے تھے، مگر جوانی کی اکڑ اور اپنے اصول پرستی کے زعم میں، ہم یہ نہیں سمجھ پاتے کہ ہمارے بزرگوں کے بھی جذبات ہیں۔ ان کی اندرونی جذباتی زندگی ہے۔ انھوں نے بھی شکستہ دلی کا سامنا کیا ہے ــــ ماموں جان مجھ سے کہنے لگے۔ ملیحہ مر گئی، تم اس کی نشانی تھے۔ تم نے بھی میرے ساتھ یہ کیا۔ اتنا کہہ کر وہ دقت سے اپنی کرسی پر سے اٹھے، اور کمرے کے باہر چلے گئے۔

"امی کے مرنے کا غم تازہ تھا۔ میں بھی بڑی مشکل سے آنسو ضبط کر کے اپنے کمرے میں واپس آیا۔ پھر میں نے اپنا سامان باندھنا شروع کیا۔ اور انجم آرا کو بلا کر اس سے کہا اپنی آپا سے کہو رات کو باہر تالاب پر آجائیں۔ مجھے ان سے بے حد ضروری بات کرنی ہے۔ انجم آرا کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ فوراً اوپر دوڑ گئی۔

"رات کو جہاں آرا مجھے تالاب کے کنارے ملی۔ میں نے تین سال بعد اسے دیکھا۔ تین سال تک میں اسے لندن سے خط لکھتا رہا تھا۔ اس کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ مگر زیادہ نہیں۔ مجھے معلوم تھا وہ میری ہونے والی ہے۔ اس لئے مجھے اس کے لئے کوئی خاص اضطراب نہیں محسوس ہوتا تھا۔ مجھے اس سے محبت تھی۔ مگر کوئی جنوں خیز عشق نہیں تھا۔ ہو نہیں سکتا تھا۔ بچپن سے ہم اکٹھے پلے بڑھے تھے۔ وہ میرے لئے ایک پُرسکون سی چیز تھی۔ مجھے ہمیشہ یہ معلوم رہتا تھا۔ کہ میں دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں کیسی حالت میں ہوں۔ کیسی کٹھن مسافت طے کر کے لوٹوں، وہ سایہ دار درخت اور میٹھے پانی کے کنویں کی طرح میری منتظر ہوگی۔ اور اب وہ میرے سامنے موجود تھی۔ میری امی کی طرح پتی ورتا کی ایک اور تصویر ــــ میں اس کے سامنے گونگا سا ہو گیا۔ وہ تالاب کی سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ انجم آرا، اختر آرا اور مالا ملازمہ پہرے پر ادھر اُدھر چوکس تھیں۔ اگر ماموں جان کو اس ملاقات کا علم ہو جاتا تو نہ جانے وہ ہم دونوں کا کیا حشر کرتے۔ خیر۔ تو میں نے اس سے کہا۔ وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلی چلے۔"

"تم لڑکیوں کو بھگا کر لے جانے کی تجویز کرنے میں بہت اکسپرٹ معلوم ہوتے ہو!" ادما نے بات کاٹی۔

"میں نے اس سے کہا، میرے ساتھ جھونپڑوں میں رہے۔ روکھی سوکھی کھائے اور یہ یاد رکھے کہ وہ نواب فخر الزماں چودھری کے نواسے کی نہیں بلکہ مولوی برہان الدین احمد کاشتکار کے لڑکے کی بیوی ہے۔"

"بالکل ایسی ہی بات تمھارے ابا نے تمھاری امی سے کہی تھی"۔ ادما نے کہا۔

"ہاں۔ عجیب بات ہے نا۔ بہر حال۔ مگر جہاں آرا میں اپنے والد سے اتنی بڑی بغاوت کی ہمت نہ تھی۔ وہ بیٹھی ہچکیوں سے روتی رہی، اور میں اسے اسی طرح روتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے ارجمند منزل سے باہر آگیا۔

"چند روز بعد ہی مجھے انڈر گراؤنڈ ہونا پڑا۔ اور وہ سارا قصہ خواب و خیال ہو گیا۔"

"اور اس کے فوراً بعد تم نے ایک اور خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ واہ رے مرد کی ذات۔"

"اب اجازت ہے؟ دوپہر ہو گئی۔"

"ابھی نہیں۔ تمہاری بہن پڑھ رہی ہے؟"

"نہیں، میں کتنا چاہتا ہوں، اس کی تعلیم کا انتظام ہو جائے۔ مگر رابعہ امی کے انتقال کے بعد گھر سنبھالنے میں جُٹ گئی۔ اگر مجھے کبھی ڈھاکے آنا ملا تو مکان لے کر اسے یہاں بلا لوں گا۔ اگر میں ابا کو یہ یقین دلا دوں کہ وہاں پردے کا مکمل انتظام ہے تو ابا شاید علی گڑھ گرلز کالج بھی بھیجنے کو تیار ہو جائیں۔"

وہ ہنس پڑا۔ "ابا کو اگر یہ معلوم ہو کہ میں دہریہ ـــــ دہریہ ہو گیا ہوں تو ان پر آسمان گر پڑے۔ میں اُدما جب بھی گاؤں جاتا ہوں، تو باقاعدہ ابا کے ساتھ جمعہ گھر میں نماز پڑھتا ہوں۔"

"اوہ ـــــ ہاؤ فنی ـــــ" اُدما نے زور سے قہقہہ لگایا۔

نہ جانے کیوں ریحان کو اُدما کا یہ قہقہہ ناگوار گزرا، وہ نظریں اٹھا کر باغ کو دیکھنے لگا۔

اُدما نے اس کی طویل خاموشی سے گھبرا کر پوچھا۔ "تمہارا گھر تو بڑا خوبصورت ہوگا۔ آرٹسٹک۔"

"ہاں بے حد خوبصورت ہے۔ تمہارے وڈ لینڈز سے کہیں زیادہ خوبصورت۔ اس کی پھونس کی چھت زرد پھولوں کی بیل سے ڈھکی ہوئی ہے۔ سامنے سبزی باڑی ہے۔ اور گھنی، سرسبز بنسلی۔ پیچھے ہمارا تالاب کنول کے پھولوں سے بھرا رہتا ہے۔ اس کے کنارے سُپاری اور ناریل کے سڈول درخت کھڑے ہیں۔ باڑے میں گائیں رہتی ہیں۔ پچھلے برآمدے میں پالکی رکھی ہے۔ ندی پر ابا کی ناؤ بندھی رہتی ہے۔ اسی کو کھیتے ہوئے ابا پار کی مسجد میں نماز جمعہ پڑھانے جاتے ہیں۔ ناؤ ہی میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے ان کی عمر گزری۔ اس کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں جانتے ـــــ امی بتاتی تھیں کہ یہی نوکا کھیتے وہ ان کے چچازاد بھائیوں کو پڑھانے اپنے گاؤں سے نواب نورالزماں کی دیہاتی حویلی جایا کرتے تھے۔ کیسا زمانہ تھا ـــــ کیسے لوگ ـــــ ابا ساری عمر میں صرف تین چار مرتبہ ہی موٹر میں بیٹھے ہیں۔ جب میرا داخلہ اسکول میں کرانے ڈھاکے آئے تھے اور ماموں جان کی بیوک ان کی خدمت میں حاضر رہتی تھی ـــــ

"اور پھر ہمارا گاؤں۔ کسانوں کے خوبصورت جھونپڑے۔ گاؤں کا ٹول۔ کالی باڑی۔ نٹ مندر۔ جمعہ گھر، چوپال، بازار، منڈی۔ برگد تلے گھاٹ۔ درگاہ ـــــ میرا گاؤں دنیا کا حسین ترین گاؤں ہے اور میرا گھر دنیا کا حسین ترین گھر ـــــ کبھی میں تم کو اپنا گھر لے جا دکھاؤں گا ـــــ اور دیپالی کو ـــــ

"اور قبرستان جہاں امی کی قبر ہے ـــــ" وہ چپ ہو گیا۔ چند منٹ بعد اس نے اُدما کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری امی اتنی کم عمر تھیں۔ وہ مجھ سے صرف سولہ برس بڑی تھیں، اور میری بڑی بہن معلوم ہوتی تھیں۔ اگر آج زندہ ہوتیں تو تم سے بھی زیادہ بڑی نہ لگتیں ـــــ بعض مرتبہ تم میں ان کی جھلک سی دکھائی پڑتی ہے۔ خصوصاً جب ڈانٹتی ہو ـــــ تو بالکل امی جیسی لگتی ہو۔"

ادما کے چہرے پر کرب اور ناگواری کا بادل گذر گیا۔ جسے ریحان نے نہیں دیکھا۔ وہ کہتا رہا۔

"امی تو مر گئیں۔ اب کہیں تم نہ مر جانا ادما۔"

"ریحان۔" ادما نے درشتی اور تلخی سے اس کی بات کاٹی۔ "اب اٹھنا چاہئے۔ تم جا کر تیار ہو۔"

"ہاں۔" وہ چونک کر بولا۔ "ابھی جاتا ہوں۔"

"کھانا کھاتے جانا۔"

"نہیں۔ کھانا سریندر کے ساتھ کھاؤں گا، اور اس کے بعد۔" اس نے اٹھ کر طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ارجمند منزل میں نواب قمر الزماں چودھری سے سیاسی گفت و شنید۔ کل شام لیگ آفس کے سکریٹری سے ان کے ساتھ ساڑھے پانچ بجے کا اپوائنٹمنٹ کروایا تھا۔ ابھی سریندر کے ہاں بیگم بازار جانا ہے۔ بھاگتا ہوں۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف لپکا۔

"ارجمند منزل جاتے ہوئے ڈر تو نہیں لگ رہا؟" ادما نے پیچھے سے آواز دی۔ "اگر وہاں ٹھکائی وغیرہ ہو تو مجھے فون کر دینا۔ تمہاری مدد کے لئے آجاؤں گی۔"

"یو آر نوٹ بینگ ویری فنی ادما۔" ریحان نے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

ادما کھوکھلی سی ہنسی ہنسیں اور میز پر بیٹھی کانٹے سے لکیریں کھینچتی رہیں۔ پھر سیزر کو بلانے کے لئے باغ میں اتر گئیں۔

## ۲۷

# جہاں آراء بیگم

اس وقت ارجمند منزل پر یک لخت ایسی خاموشی چھا گئی، جیسے ساگوان کے جھرمٹ میں چھپے کسی جادوگر نے چپکے سے کوئی منتر پھونک دیا ہو۔ اور چرند پرند، شجر حجر، انسان سب سکتے میں رہ جائیں۔

جہاں آراء اوپر کی منزل پر پچھلے برآمدے میں چق کے پیچھے آرام کرسی پر بیٹھی نوزائیدہ بھتیجے کے لئے موزے بُن رہی تھی۔ اور اپنے پاؤں جنگلے کی نچلی جالی میں اٹکا رکھے تھے۔ جنگلے کی سلاخوں میں

سے اس نے ابا کی جھلک دیکھی۔ جو سوچ میں ڈوبے پائیں باغ میں ٹہل رہے تھے۔ اور پھر لیگ آفس کا بھاری کلرک ان کے نزدیک پہنچا اور ابا اس کے پیچھے باہر چلے گئے۔

باورچی خانے میں جاکر دعوت کی دیگوں کا معائنہ کرنا ہے۔ پلاؤ دم کروانا ہے۔ شاہی ٹکڑے تیار کرنے ہیں ـــــ دلہن بھابی اپنے کمرے میں آرام سے سو رہی ہیں۔ امی حسبِ معمول اپنے کمرے میں صاحب فراش ہیں۔ جانے ان کو اختلاج کے دورے اتنے کیوں پڑتے ہیں۔ ابا تو ان کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ امی کو ہر طرح سے خوش رہنا چاہئے۔ ان کے پاس کیا نہیں۔ سہاگ، اولاد، دولت و ثروت بہو بیاہ لائیں۔ پوتا کھلا رہی ہیں۔ کیا وہ اب تک نہیں بھول سکیں کہ ابا ان کے بجائے ملیحہ پھوپھی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ مگر وہ تو اتنی پرانی بات ہو گئی۔

بے چارے ابا۔ یہ بات کسی کو معلوم نہیں۔ صرف میں نے محسوس کی ہے۔ اور امی کو تو یقیناً معلوم ہے ـــــ کہ ابا ملیحہ پھوپھی کو کبھی نہ بھلا سکے۔ وہ مر گئیں تب بھی نہیں۔ مر کے شاید وہ ابا کے دل میں زیادہ محفوظ ہیں۔ جہاں پھوپھا جان کا کوئی دخل نہیں۔

یا اللہ۔ کیسی دنیا بنائی تو نے، انسانی زندگیوں کے ساتھ ایسے بھیانک مذاق۔

انجم اور اختر آرا رسگن بگیچے سے اب تک نہیں لوٹیں۔ ہر وقت اپنی دلچسپیاں۔ صرف میں ہی اس لئے ہوں کہ ہاؤس کیپر بنی رہوں۔ دلہن بھابی نیّر بھائی کو نخرے دکھاتی رہتی ہیں۔ شادی کو ایک سال ہو گیا مگر کیا مجال، جو ہل کر پانی بھی پی لیں۔ اب تو بھئی نئے ولی عہد کی ماں ہیں۔

بس میں سب کی دیکھ بھال کے لئے وقف۔ امی نے کل کیا منہ بھر کے شمّہ خالہ کے سامنے کہہ دیا کہ اپنا گھر تو نصیبے میں نہیں، اسی گھر کی ذمہ داری اچھی طرح سنبھال لو ـــــ

اچھا اللہ۔ ٹھیک ہے۔

ایک موزہ مکمل ہو گیا۔ اللہ رکھے میرا منوّر کتنا پیارا ہے۔ ماشاء اللہ۔ خدا بُری نظر سے بچائے۔ میں نے تو گلابی اون بھی اتنی خریدی تھی۔ اس کی بھی چیزیں بُن ڈالوں گی۔ لڑکے کیا گلابی رنگ نہیں پہن سکتے۔

"بی بی ـــــ بی بی"۔

جہاں آرا نے چونک کر سر اٹھایا۔ مالا سامنے کھڑی ہانپ رہی تھی۔ بھاگتی ہوئی اوپر آئی تھی۔

"بی بی۔ وہ آئے ہیں"۔

دل پھر دھک سے رہ گیا۔

"کون ـــــ؟"

"رونو میاں"۔

"رونو ــــ کیا کہہ رہی ہے؟"

"اللہ قسم۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ باہر بیٹھے ہیں"۔

"باہر تو روزی اور دیپالی کے بابا آئے تھے"۔

"وہ تو کبھی کے چلے گئے۔ ابھی بشیر چائے کی ٹریل لے کر باہر گیا تھا۔ اس نے آکر بتایا، تو میں بھاگی بھاگی گئی۔ باغ والی کھڑکی میں سے جھانکا۔ سرکار اور رونو میاں دونوں دفتر میں بیٹھے ہیں۔ دروازے بند کئے۔ دونوں جنوں میں مسکوٹ ہو رہی ہے"۔

ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

"جھوٹ مت بول مالا کی بچی"۔

"اللہ رسول کی قسم، چل کے دیکھ لیجئے"۔

"دونوں میں بڑی سنجیدگی سے باتیں ہو رہی ہیں؟"

"ہاں ہاں بی بی"۔

کیا دعائیں کامیاب ہو گئیں؟ دعائیں۔ نمازیں، وظیفے، اللہ اللہ۔

وہ اُون اور سلائیاں میز پر ڈال کر جلدی سے اٹھی۔

"ٹھہر۔ مالا۔ بھائی جان کہاں ہیں؟"

"نیّر میاں موٹر لے کر باہر گئے ہیں۔ چلئے"۔

وہ مالا کے ساتھ زینہ اتر کر کھانے کے کمرے میں پہنچی۔ جو کتب خانے سے ملحق تھا۔ درمیانی دروازہ اندر سے بند تھا۔ عموماً بند رہتا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ایک درز پر آنکھ جما دی۔

وہ عین سامنے بیٹھا تھا۔ بڑی میز کے اس طرف، بالکل نہیں بدلا تھا۔ وہی شکل، وہی آنکھیں وہی بال، وہی بات کرنے کا انداز۔ مقابل میں ابا بیٹھے تھے۔ چہرہ چٹان کی طرح سخت، درمیان میں کاغذات اور چائے کی کشتی۔ خالی پیالیاں۔ ہائے اللہ۔ مجھے معلوم ہوتا تو کشتی سجا کر بھیجتی۔ اس نے درز سے کان لگا دیئے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "جی ہاں۔ میں کامریڈ جوشی کو مفصل بتا دوں گا"۔

ابا نے عینک ماتھے پر چڑھائی۔ اور کچھ پڑھنے لگے۔ پھر انھوں نے کہنا شروع کیا۔ "جناح صاحب کے نکات"۔

اس پر بجلی سی گری۔ وہ اس کے متعلق نہیں اس نامراد سیاست کے متعلق "مسکوٹ" کر رہے تھے۔

بولتے بولتے ابّا نے سر اٹھا کر سامنے بند دروازے پر نظر ڈالی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نزدیک ہی گیلری کے صدر دروازہ پر چوکس کھڑی تھی۔ اس نے وہاں سے اشارہ کیا۔ بیٹھی رہئے۔ بھی رہئے۔

وہ پھر کواڑ سے لگ گئی۔

اب ابّا کاغذ سمیٹ رہے تھے، وہ کھڑا ہو چکا تھا۔

"اندر جا کر اپنی ممانی کو دیکھ آؤ، بہت علیل ہیں"۔ ابّا ذرا رکھائی سے کہہ رہے تھے۔ مجھے معلوم ے، مجھے معلوم ہے۔ ابّا کی یہ سرد مہری مصنوعی ہے۔ ابّا کی خودداری کی وجہ سے ہے۔ ابّا انھیں کتنا تے ہیں۔

"بہت اچھا"۔

اللہ، اب بھی ان کا دل نرم کر دے۔ ابّا کا دل بھی نرم کر دے۔ اللہ۔ ابّا اُن سے میرے لئے ت کرلیں۔ مولا معجزہ دکھا دے۔

"نیّر میاں۔ کہاں ہیں؟" ریحان پوچھ رہا تھا۔

"معلوم نہیں کہیں باہر گئے ہیں"۔ نواب نے جواب دیا۔

ابّا انھیں رات کی دعوت کے لئے ہی روک لیجئے۔ ایک اجنبی مسافر کی طرح واپس نہ جانے ئے۔ ابّا پلیز۔

"ممانی جان ـــــ اپنے کمرے میں ہوں گی؟"

"ہاں ہاں۔ وہیں ہوں گی"۔

"اچھا ماموں جان۔ خدا حافظ"۔ اس نے مصافحہ کے لئے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ اور بڑے سے جھک کر ابّا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ "میں دلّی پہنچتے ہی نواب زادہ لیاقت علی خاں کو ٹکٹ کر دوں گا"۔

"ٹھیک ہے"۔

"آداب عرض ماموں جان"۔

"جیتے رہو"۔

وہ فائل اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ گیلری میں مالا نے اشارہ کیا۔ جہاں آرا سرعت ڈائننگ روم کے پچھلے دروازے سے باغ میں اتر گئی۔ اگر کہیں مڈبھیڑ ہو جاتی۔ گیلری میں سے چاہئے تھا۔ ضرور مڈبھیڑ ہوتی، اور پیچھے سے ابّا آجاتے۔ تو کیا ہوتا؟ ابّا کا حکم ہے کہ اگر کبھی بھی رونو ند منزل آئے تو جہاں آرا کا اس سے سخت پردہ کرایا جائے۔ وہ تیر کی طرح پچھواڑے پہنچی۔ اور

ہانپتی کانپتی سنسان تالاب کے کنارے شکستہ "راج سنگھاسن" پر دھم سے جا کر بیٹھ گئی۔

چند منٹ بعد مالا دبے پاؤں درخت کے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ "میں نے اندر جا کر جھانکا تھا رونو میاں بیگم صاحب کے کمرے میں گئے تھے۔ مگر وہ سو رہی تھیں بے سدھ، وہ باہر نکل آئے۔ اب جانے کدھر سے ——" یک لخت وہ چپ ہو گئی۔

وہ پچھلے برآمدے سے اتر کر باہر جانے کے ارادے سے تالاب کی طرف چلا آ رہا تھا۔ جس کا چکر کاٹ کر باغ کی سڑک سامنے کے پھاٹک کی طرف جاتی تھی۔

پھر وہ عین اس کے مقابل میں آن کھڑا ہوا۔ رنگین تخت کے پاس۔ بالکل اسی طرح، جیسے اس روز خواب میں آیا تھا۔ خواب میں دیکھا تھا۔

بارش شروع ہو گئی۔ وہ جلدی سے سیمل کے نیچے آ گیا۔

اور تب اس نے جہاں آرا کو دیکھا۔

"اوہ ہلو۔ ہلو جہاں آرا۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"آداب رونو بھائی۔"

کوئی بھونچال نہیں آیا۔ زمین نہیں ہلی۔ قیامت نہیں آئی۔ وہ اس کے سامنے موجود ہے اس رات، چار سال قبل، وہ اسی جگہ سے اسے خدا حافظ کہہ کر، اسے روتا بلکتا چھوڑ کر گیا تھا۔ اب سامنے موجود ہے۔ اور اس سے بات کر رہا ہے۔

مالا چپکے سے کھسک کر درخت کی اوٹ میں ہو گئی۔

"آپ کب آئے رونو بھائی۔" مضبوط، پُرسکون آواز۔

"ابھی تھوڑے دن ہوئے۔"

"آج کل کہاں رہتے ہیں۔"

"بمبئی —— تم، تم اب کس کلاس میں ہو؟"

"میں نے کالج چھوڑ دیا۔ کافی دن ہوئے —— پھوپھا جان کیسے ہیں۔ آپ شوناپور گئے تھے؟"

"ہاں۔ ٹھیک ہیں۔"

"اور رابعہ۔؟"

"وہ بھی خیریت سے ہے۔ اچھا جہاں آرا اب ہم چلیں۔ بارش تیز ہو گئی تو مشکل ہو جائے گی۔ اچھا۔ خدا حافظ ——" اس نے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا پھاٹک کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ آیا، اتنے برسوں، اتنی رات دن کی دعاؤں کے بعد، اور دو منٹ میں چلا گیا۔ مگر دنیا ویسی ہی موجود تھی۔ درخت، پرندے، آسمان، زمین، بادل۔

مالا پیڑ کے پیچھے سے نکلی۔

وہ ہونقوں کی طرح مالا کی شکل تکنے لگی۔

"بی بی اندر چلئے"۔

اور تب جہاں آرا نے تخت پر زور کا مُکا مارا اور دوہری ہو گئی۔ "کیوں آئے تھے مالا۔ کیوں آئے تھے، جب میں ادھر بیٹھی تھی، تو کیوں آئے تھے۔ سیدھے کیوں نہیں چلے گئے۔ تجھے معلوم ہے مالا کیوں آئے تھے؟ کیا کہہ رہے تھے؟"

"اٹھو بی بی۔ اٹھو"۔

"کیوں آئے تھے"۔

"بی بی پاگل مت بنو۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ توبہ۔ توبہ ——"

اس نے جلدی سے آنچل سے اپنا چہرہ پونچھا۔ شاید مجھے ہسٹریا ہو جائے گا، اس نے لرز کر سوچا۔ امی کی طرح —— اختلاجِ قلب کی مریضہ کہلاؤں گی —— لوگ مجھ پر ترس کھائیں گے —— ہنسیں گے —— اللہ —— اللہ ——

مالا نے اس کا ہاتھ تھام کر "راج سنگھاسن" کے نیچے سے بہتے ایک منے سے برساتی نالے کو پھلانگنے میں مدد کی۔ پھر بارش کی تیز بوچھار میں وہ دونوں، سر پر آنچل ڈال کر جھکی جھکی تیزی سے کوٹھی کی طرف بھاگیں۔

## (۲۸)

# رونگیلا نائیر مانجھی

ستمبر ۴۲ء کی ابر آلود شام کی نیم تاریکی میں دو آوازیں چندر کُنج کے پھاٹک کے ترچھے، نیم شکستہ ستون کے قریب۔

"اچھا بھائی۔ یہ لو تینوں کتابیں۔ بہت سنبھال کر رکھنا۔ اس پر ہم نے سروجنی دیبی سے دستخط لئے ہیں۔ دیکھو انھوں نے تمھارے لئے کیا لکھا ہے"۔

"کہاں۔ کہاں ——؟"

ماچس جلانے کی آواز۔

"یہ دیکھو ــــ"

"اوماں ــــ انھوں نے اپنے ہاتھ سے میرا نام لکھا ہے ــــ ہاؤ ــــ اِن کریڈ بیل آپ کو کہاں ملیں ؟"

"یہ سب تفصیلات نہ پوچھا کرو۔"

"نہیں بتائیے۔"

"دہلی میں۔"

"اور آپ نے ان سے میرے متعلق کیا بتایا ؟"

"کچھ نہیں۔ صرف یہی کہا تھا کہ ایک باؤلی سی لڑکی ہے۔ اس کے لئے اپنی طرف سے اس مجموعے پر کچھ لکھ دیجئے۔"

"اوماں ــــ"

"اور یہ لو ــــ"

"اوہ ــــ نوکشی کانتار ماٹھ ! اور یہ ــــ ؟"

"رونگیلا نائیر مانجھی ــــ !"

"اوماں ــــ !"

"مولوی جشیم الدین سے بھی دستخط کروائے بھائی۔ دونوں کتابوں پر۔ اور یہ لو ــــ مولوی منصور الدین احمد کی نئی جلد ــــ"

"ہیرا مونی۔ ؟ دوسری جلد آگئی ؟"

"ہاں۔ مع مصنف کے دستخط۔ اب تم بھی کیا یاد کروگی۔ کس سُوپر انٹلیکچول چاہنے والے سے واسطہ پڑا ہے ــــ"

"یاسمین ایک دن کہہ رہی تھی۔ ایک روز وہ اپنا ٹروپ بنائے گی۔ اور نوکشی کانتار ماٹھ کا پلے تخلیق کرے گی۔"

"وہ بھی تمھاری چیلی ہے ؟"

"یاسمین ؟ نہیں۔ دراصل وہ روزی بیچاری کی چیلی تھی۔ پھر میری چیلی بھی بن گئی۔"

"بس تو پھر اب اللہ اس پر رحم کرے۔ روزی کا حشر دیکھو تمھاری چیلی بن کر کیا ہوا۔ اچھا بھئی، اب ہم بھاگتے ہیں۔ تمھارے بابا آ ہی نہیں چکتے۔"

"وہ شاید متراہابو کی طرف چلے گئے۔ آپ پھر کب آئیں گے ؟"

"جب بھی تم بلاؤ گی ــــ فوراً ــــ اچھا ــــ اب چلتے چلتے یہ بتادو کہ کیوں خفا تھیں۔"

"افوہ۔ وَن ٹریک مائینڈ۔"

"ہرگز نہیں بتلاؤ گی وجہ؟"

"نہیں۔"

"میں اُوما سے کہے جا رہا ہوں کہ معلوم کر رکھیں۔ ان کو بتا دو گی؟"

"ہرگز نہیں ـــــ دہلی میں ڈھاکہ صاف سنائی دیتا ہے؟"

"ہمیں بالکل صاف سنائی دے گا۔ ۲۹ تاریخ شام کے ساڑھے چھ بجے۔ پھر ساڑھے سات، پھر سوا دس، تمہارا ہندوستانی پروگرام کس وقت ہے؟"

"ساڑھے سات۔"

"کیا کیا گا رہی ہو؟"

"ہندوستانی پروگرام میں؟ 'مائی ری میں تو' والا بھجن۔"

"سناؤ۔ سناؤ۔"

"یہاں سڑک پر ـــــ؟"

"یہ سڑک ہے؟ سنسان، جنگل بیابان، ہُو کا عالم، آہستہ سے گنگناؤ۔"

خاموشی۔

"مائی ری میں تو لیور میتو مول۔"

"ہاں۔ ہاں اور آگے۔"

"کوئی کہے چھانے، کوئی کہے چوڑے۔ لیو ہے بجنتا ڈھول۔"

خاموشی۔

"پھر رک گئیں، ارے گاؤ بھائی۔"

"کوئی کہے کارو، کوئی کہے گورو۔ لیو ہے انکھیاں کھول۔"

"شاباش بالکل ٹھیک کہتی ہو۔"

"جائیے ہم نہیں گاتے۔"

"کیری اَون۔ کیری اَون۔ ایڈیٹ۔"

"کوئی کہے ہلکو، کوئی کہے بھارو۔ لیو ہے ترازو تول۔

تن کا گہنا میں سب کچھ دینا۔

دیو ہے باجو بند کھول۔"

"اور تین عدد بالوچر ساڑیاں بھی۔"

"دِل یُو شٹ اَپ"۔

"آگے"۔

"آگے کیا۔ بس ختم۔ مائی ری میں تو لیور میو مول"۔

خاموشی۔ پتوں کی سرسراہٹ، بہت دور کوئی کھول یکسانیت سے بجے جا رہا ہے۔ کیرتن اور کرتال کی مدھم گونج۔

"کیا آج منگل کی شام ہے؟"

"جی ہاں"۔

"افوہ۔ یاد ہے۔ وہ شام بھی اتنی ہی اندھیری تھی۔ جب "نورالرحمٰن میاں"۔ پہلی بار اس پھاٹک پر آکر کھڑے ہوئے تھے۔ ۲۵ر اکتوبر ۳۸ء"۔

"نہیں۔ ۲۴ر اکتوبر"۔

"ہرگز نہیں ۲۵ر اکتوبر۔ ہمارے تو دل پر نقش ہے بھائی۔ اچھا سنو، ابھی تمھارے میوزک کے کورس میں دو سال اور باقی ہیں؟"

"جی ہاں"۔

"اس کے بعد کیا کہلاؤ گی ـــــ لیکچرر ـــــ؟"

"جی جناب۔ لیکچرر۔ فیکلٹی آف میوزک۔ وشوا بھارتی انٹرنیشنل یونی ورسٹی!"

"افوہ۔ رعب پڑ گیا بہت سخت، مگر ساتھ ہی ساتھ اپنی ایم۔اے کی پڑھائی بھی شروع کر دینا"۔

"بہت اچھا"۔

"گُڈ۔ تو تمھارے فوری مستقبل کی طرف سے تو اطمینان ہے، ویسے یہ یاد رکھو کہ جب تک میں زندہ ہوں تمھارا مستقبل محفوظ ہے ـــــ سنو۔ گِری راج کیا کہیں گے؟"

"گری راج۔؟"

"ہاں ان کی لاڈلی گوری ایک بے تکے سنیاسی کے ساتھ چلی جائے گی تو بہت خفا ہوں گے؟"

"میرا خیال ہے کہ زیادہ خفا نہیں ہوں گے۔ آپ بابا کو نہیں جانتے۔ بس مجھے صرف اپنی پشی ماں کے غصے سے ڈر لگتا ہے۔ وہ ایک کٹر مذہبی خاتون ہیں۔ مگر بابا ان بے چاری کو سمجھا بجھا لیں گے۔ وہ بابا کی UNCONVENTIONAL باتوں کی عادی ہیں۔ بابا خالصے قدامت پسند ہیں۔ مگر جہاں میرے رنج و راحت کا سوال پیدا ہو وہ سماجی قوانین کو بالکل نظر انداز کر سکتے ہیں۔ پہلے ہی انھیں اپنے سماج سے کیا سروکار ہے۔ برسوں سے گوشہ نشین بیٹھے ہیں"۔

"تو اب میں اطمینان سے پردیس جاؤں؟"

"بالکل اطمینان سے۔"

"بھئی واہ۔ کیا چرخ چوں گاڑی چلی آ رہی ہے۔"

"کہاں ـــــ؟ ارے، ارے بھاگئے۔ پشی ماں آ رہی ہیں۔"

"اس وقت کہاں گئی تھیں؟"

"ریس کورس کے قریب جو پرانا مندر ہے نا، وہاں ہر منگل کی شام کو کیرتن ہوتا ہے۔"

"تمھارے عبدالقادر میاں کس قدر چرخ چوں گاڑی ہانکتے ہیں۔"

"بھاگئے۔"

"ہشت۔ میں ڈرتا ہوں تمھاری پشی ماں سے؟ مگر یہ گاڑی تو ادھر نہیں آ رہی۔"

"پشی ماں سیدھی جا کر ڈیوڑھی پر اتر جائیں گی۔ تھینک گوڈ۔"

"تو اب میں اطمینان سے کھڑا رہوں۔؟"

"نہیں۔ اب بھاگئے۔ تینوں لڑکے آتے ہوں گے۔ اور بعد میں طرح طرح کے سوال کریں گے۔ نہیں ابھی مت جائیے۔"

"بھائی فیصلہ کر لو۔"

"کیا آپ کے فیصلے کرنے مشکل نہیں لگتے؟"

"قطعی نہیں۔"

"مجھے بھی نہیں۔ میں کسی سے ڈرتی ہوں۔"

"اب کی بار میں تم کو شونا پور لے جاؤں گا۔"

تبسم

"کیوں کیا خیال ہے۔"

"سادھو! میں تمھارے گھر ہرگز نہ آؤں گی۔"

"ہاہاہا ـــــ گوری ـــــ! میں نے تمھارے لئے تالاب کھودا ہے۔ سبزی باڑی بنائی ہے ں تمھارے لئے سیندور کی ڈبیا اور تیشوری ساری لاؤں گا۔ ڈھاکے سے سینگ کی چوڑیاں۔ میں جہ کا ملازم ہوں۔ تمھارے بالوں سے کھینچتا ہوا لے جاتا۔ مگر کیا کروں عورت کی عزت کرتا ہوں[1]۔"

بشاش ہنسی۔

"اچھا سنو۔ روزی کے متعلق کوئی اطلاع ملے تو مجھے ضرور لکھنا۔"

---

[1] بنگلہ لوک گیت

"بہت اچھا۔"

"اب واقعی چلوں۔ ورنہ ٹرین چھوٹ جائے گی۔ دیکھو میں اوما سے کہے جا رہا ہوں کہ وہ میری غیر موجودگی میں تمہاری دیکھ بھال رکھیں۔ اور تمہارے بابا سے بھی ذرا خوب تعریف واریف کر دیں۔ راستہ ہموار کرنے کے لئے۔ اور یہ یاد رکھو۔ اوما۔ فرشتہ خصلت بے مثال لڑکی ہے۔ اس سے بڑھ کر پُرخلوص دوست تمہیں اور کوئی نہ ملے گا۔ یہ بات میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اچھا اب چلے۔ بہت لمبا سفر ہے۔ کلکتہ۔ دلّی۔ بمبئی۔"

"اپنا خیال رکھئے گا۔"

خاموشی، کیلے کی ڈالیوں کی سرسراہٹ ـــــ دور ایک کتّا روئے جا رہا ہے ـــــ اندر رسوئی گھر میں روشنی جل گئی۔

"مسکراؤ ـــــ لو ہم روشنی میں تمہارا چہرہ دیکھیں"۔

ماچس جلانے کی آواز۔

"اے لو وہ لب پہ آئی ہنسی۔ اے لو وہ مسکراتے ہیں"۔

"کیا مطلب؟ سُوں سُوں؟"

"ہم نے اردو کا ایک حسب موقع مصرعہ پڑھا تھا۔ بے وقوف"۔

"آپ نے اتنی فرفر اردو کہاں سے سیکھ لی"۔

"علی گڑھ میں بیوقوف"۔

"مجھے بھی سکھلا دیجئے؟ سُوں سُوں"۔

"ضرور سکھلا دیں گے"۔

دُور گھنٹے کی آواز۔

"ارے آٹھ بج گئے۔ اب چلوں۔ بائی۔ بائی ـــــ"

آواز بازگشت

آواز بازگشت

آواز بازگشت

# (۲۹)

# شریمتی رادھیکا سانیال

ڈیریسٹ دیپالی!

میں تم سے دلی معافی چاہتی ہوں۔ اگست کی اس طوفانی رات اپنی مہم پر جانے سے پہلے تمہارے گھر آ کر میں نے تمھیں بہت بُرا بھلا کہا تھا۔ مگر ہم سب ایک زبردست قومی کرائسس سے گذرے ہیں۔ اور اتنی قربانیاں دے کر محمود دا میری آنکھوں کے سامنے گولی کا نشانہ بنے۔ جیوتی دا کو پولس نے اتنا مارا کہ انھوں نے حوالات میں ہی دم توڑ دیا۔ جب ہمارے ساتھیوں نے پولس چوکی پر حملہ کیا میں بالکل نہتی تھی۔ اور صرف جلوس کی قیادت کر رہی تھی۔ اسی وجہ سے میرے اوپر کوئی فرد جرم فوجداری کی عائد نہیں کی جا سکی۔ جب ہمارے ساتھیوں نے تھانے پر ہتھ گولے پھینکے پولس نے فوراً گولی چلا دی۔ ہجوم پر اشک آور گیس چھوڑی اور لاٹھی چارج کیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میری بائیں ٹانگ میں سخت تکلیف تھی۔ اور میں ہتھکڑی پہنے زنانہ حوالات کے فرش پر پڑی تھی۔ اور باہر شام ہو چکی تھی۔ بالکل سناٹا۔ کچھ دیر بعد کچھ سپاہی اندر آئے۔ مجھے پولس کی لاری میں بٹھال کر جیل لے گئے۔ اور زنانہ وارڈ میں ڈال دیا۔ جہاں مچھر ہی مچھر تھے۔ ایک لالٹین میرے پاس رکھ دی گئی۔ باہر کھٹ سے تالا۔ جب میں زور زور سے کراہنے لگی تو ایک بڑھیا وارڈر اندر آئی۔ اور بڑبڑاتی ہوئی پھر باہر نکل گئی۔ چند منٹ بعد جیلر آیا۔ اس نے گندا سا اسٹریچر منگوایا۔ مجھے پھر پولس کی لاری میں لادا گیا۔ دو مسلح سپاہی میرے ساتھ بیٹھے۔ لاری ہچکولے کھاتی اندھیرے شہر میں سے گذرتی سول ہسپتال پہنچی۔ مجھے اتار کر زنانہ جنرل وارڈ کے ایک میلے سے لوہے کے پلنگ پر ڈال دیا گیا۔ اس طرح ہتھکڑیوں سمیت وارڈ میں مجھے دیکھ کر ہنگامہ سا ہو گیا۔ ایک بوڑھی عورت زور زور سے بین کرنے لگی۔ اس کا لڑکا بھی چند روز قبل اندولن میں شہید ہو گیا تھا۔ خیر ڈاکٹر آیا۔ میری مرہم پٹی ہوئی۔ کھانا کھلایا گیا۔ سپاہی دروازے پر پہرے پر بیٹھ گئے۔

تین دن تک جنرل وارڈ میں رہی۔ مریض عورتیں ہمدردی سے ہر وقت میرے پاس گھری رہتیں۔ چنانچہ حکام نے میرا پلنگ ایک خالی کمرے میں منتقل کر دیا۔

خوش قسمتی سے میری ٹانگ کی ہڈی پر ضرب نہیں آئی تھی۔ سر میں البتہ زیادہ چوٹ لگی

تھی۔ ہسپتال کے ڈاکٹر توجہ سے میرا علاج کرتے رہے۔ رات کو جنرل وارڈ کی عورتیں سپاہیوں کی نظر بچا کر مجھے پھل اور مٹھائیاں دے جاتیں اور ہر طرح میری خدمت کو تیار رہتیں۔ اور میں سوچتی میں اس لائق نہیں ہوں کہ میری بے بس قوم کے افراد میرا اتنا خیال کر رہے ہیں۔

اسی طرح ایک ہفتہ گذر گیا۔ تب ایک روز صبح صبح کمرے میں ایک میم صاحب داخل ہوئیں۔ سرہانے آکر میرے اوپر جھکیں اور آہستہ سے کہا۔ "روزی"! ادھیڑ عمر کی خاتون۔ چھوٹا سا جوڑا باندھے۔ بھورے بال بھورے رنگ کا فراک۔ پاؤں میں بھدے بوٹ۔ یہ مس ایلس بارلو تھیں۔ اور ان کو دیکھتے ہی باہر بیٹھے سپاہیوں نے انھیں فوراً اندر آنے دیا۔ مس بارلو چارلس بارلو کی بڑی بہن ہیں۔ مشنری۔ انھوں نے نرمی سے بتایا کہ میرے پاپا پریشان حال مسٹر بارلو کے پاس پہنچے تھے۔ اور مسٹر بارلو نے فوراً پبنہ کے انگریز بڑے پادری کو ٹرنک کال کیا تھا۔ جن کے ہاں مس بارلو گارو ہلز سے آئی ہوئی تھیں۔ میں چپ چاپ لیٹی اس عجیب و غریب پچویشن کی تفصیل سنا کی۔ مس بارلو نے اسٹول پر بیٹھ کر مجھے سمجھانا بجھانا شروع کیا۔ جیزس کے رحم و کرم کی تبلیغ کی۔ اور کہا کہ وہ اپنی گمشدہ بھیڑوں کی واپسی کا منتظر ہے اور یہ کہ اگر میں معافی نامے پر دستخط کر دوں تو مجھے فوراً رہا کر دیا جائے گا۔ اور پبنہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سرکاری حفاظت میں ڈھاکے پہنچوا دیں گے۔ (پبنہ کے ڈی۔ ایم مسٹر پروفل سین گپتا ہیں) میں نے صاف انکار کر دیا۔ مس بارلو اٹھ کر چلی گئیں۔ دوسرے روز صبح پھر آئیں۔ کیک، پھل بسکٹ، چار کا فلاسک اٹھائے چپراسی ساتھ (میری یہ نئی شان و شوکت دیکھ کر ہسپتال کے عملے اور پہرے کے سپاہی بہت مرعوب ہوئے اور ان کا رویہ بدل گیا) مس بارلو نے پھر مجھے اس نرمی سے لیکچر پلانا شروع کیا گویا میں کوئی کم عقل ناگا قبائلی ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنا وقت ضایع کر رہی ہیں۔ وہ مایوس ہو کر چلی گئیں۔

اس رات زنانہ جنرل وارڈ کی ایک مریض لڑکی خدیجہ چپکے سے میرے پاس آئی (اس کا باپ کچہری کا معمولی اہلکار تھا) اور کہنے لگی دیدی ہم سب عورتیں برابر آپ کی صحت کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ لیکن آپ نے اگر معافی نامہ پر دستخط کر دیئے تو ہم آپ کو کبھی معاف نہ کریں گے۔

میں نے اس سے کہا۔ خدیجہ۔ تم سب اطمینان رکھو۔ میں ہرگز معافی نہ مانگوں گی۔ اسی وقت باہر پہرے کے سپاہی نے ڈنڈا بجایا اور وہ چپکے سے کھسک گئی۔

ایلس بارلو تیسرے روز شام کو آئیں۔ اب کے ایک بنگالی افسران کے ساتھ تھے! انھوں نے تعارف کرایا۔ مسٹر سین گپتا کے اسسٹنٹ، مسٹر بی کمار سانیال۔ یہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مسٹر سانیال نے بھی مس بارلو کے الفاظ دہرائے۔ معافی نامے پر دستخط کر دیجئے۔ میں نے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔ مسٹر سانیال نے کہا۔ میں کل معافی نامہ لے کر آؤں گا۔ کل تک اچھی

طرح سوچ لیجئے۔ ایلس بارلو کو شاید امید ہو چلی تھی کہ میں نرم پڑ جاؤں گی۔ چند منٹ بعد وہ اور مسٹر سانیال واپس چلے گئے۔

چوتھے روز صبح صبح مسٹر سانیال پھر آن موجود ہوئے۔ لیکن ان کے ہمراہ مس بارلو کے بجائے ان ہی کے ہم شکل ایک اور صاحب تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ان کے کزن بسنت کمار سانیال ہیں۔ کلکتہ کے ایڈوکیٹ اور جرنلسٹ۔ اشتراکی کے معرکے کے بعد کے حالات "کور" کرنے کے لئے کلکتے سے آئے ہوئے ہیں۔ اور میرا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ذرا حیرت سے سوچا کہ ایک سرکاری افسر اس قسم کے انٹرویو کی اجازت کس طرح دے رہا ہے۔ مگر یہ اندولن کا اب نارمل زمانہ تھا۔ ہر چیز ممکن تھی۔ کچھ پتہ نہیں کون ہمارا ساتھی ہے کون دشمن۔

ربی کمار سانیال مسکرا رہے تھے۔ مسٹر بسنت کمار سانیال اب تک بُت کی طرح بیٹھے مجھے تکے جا رہے تھے۔ میں ایک دم گھبرا گئی۔ میرا حلیہ بھی کیا رہا ہوگا۔ اس وقت ماتھے پر پٹی بندھی۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ۔ جیسے برسوں کی روگی سات آٹھ دن سے آئینہ تک نہ دیکھا تھا۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ یہ انٹرویو کی کیا تک ہے اور میں کون سی اتنی بڑی قومی ہیروئن ہوں۔ میری جیسی ان گنت لڑکیوں نے کہیں زیادہ بہادری سے یہ اندولن چلایا ہے۔ میں تو پولس کی ایک لاٹھی سے ہی چکرا کر گر پڑی۔

خیر۔ تو بسنت کمار سانیال نے مجھ سے چند عام سے سوالات کئے۔ کہاں پڑھا ہے۔ تحریک میں کب سے ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور نمشکار کر کے دونوں باہر چلے گئے۔

میں نے چونکہ معافی مانگنے سے قطعی انکار کر دیا تھا اور میری ٹانگ اور سر کے زخم ٹھیک ہو چکے تھے اس لئے دس روز بعد مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر پولس گاڑی میں سوار کر دیا گیا اور دوبارہ جیل پہنچا دیا گیا۔

اس روز رات بھر زنانہ وارڈ میں رت جگا رہا۔ مریض لڑکیاں چپکے چپکے قاضی نذرالاسلام کے گیت الاپتی رہیں۔ صبح کو جب میں اپنے کمرے سے نکل کر جا رہی تھی بہت ساری مریض عورتیں برآمدے میں کھڑی رو رہی تھیں۔ ان سب کو معلوم تھا کہ اگر ہتھ گولے پھینکنے کا جرم مجھ پر ثابت ہو گیا تو عمر قید ہو سکتی ہے جو عورتیں پلنگ سے نہ اٹھ سکتی تھیں وہ بھی نرسوں کے چلانے کی پرواہ کئے بغیر کھسکتی کھسکتی وارڈ کے دروازے میں آ گئی تھیں۔

چنانچہ میں ڈسٹرکٹ جیل کے زنانہ وارڈ میں پہنچا دی گئی۔ کوٹھری میں پہنچ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اب میں واقعی قیدی ہوں۔

شام کو ملاقات کے وقت بسنت کمار سانیال آن پہنچے۔ انھوں نے کہا کہ میں قطعی فکر نہ کروں ان کے بڑے بھائی کلکتہ کے نامور بیرسٹر ہیں۔ اگر مجھ پر مقدمہ چلا تو وہ پیروی کریں گے۔

میں نے کہا کہ آپ میرے لئے اتنی پریشانی کیوں اُٹھا رہے ہیں۔ وہ ایک دم ہنسنے لگے۔

قصہ مختصر کرتی ہوں دیپالی بسنت کمار سانیال روزانہ شام کو جیل آکر مجھے قانونی صورت حال سے باخبر کرتے رہے۔ اشردی کے معرکے کے بعد ہم پینتالیس لوگوں کو بغیر مقدمہ چلائے جیل میں رکھا گیا تھا۔ سندھیا اور دوسری لڑکیاں کشتیہ جیل بھیجی جا چکی تھیں۔

اب دیپالی غور سے سنو۔ مجھے یہ انکشاف ہوا کہ بسنت کمار مجھے بے حد پسند کرنے لگے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ جو صرف دو روز کے لئے پبنہ آئے تھے آج ایک مہینے سے یہاں ڈٹے ہوئے تھے۔ یہ صحیح تھا کہ وہ قومی ناتے میری مدد کرنا چاہتے تھے مگر اور بھی تو اتنی لڑکیاں جیلوں میں بھر دی گئی تھیں۔ صرف میری مدد ہی کیوں؟ اس کے جواب میں انھوں نے کہا۔ کہ ان سب لڑکیوں کے گھر والے ان کے لئے دوڑ دھوپ کریں گے۔ میری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ (میں ان کو پاپا کے متعلق بتا چکی تھی) مگر مجھے لگتا ہے یہ بھی گپ تھی۔ دراصل ان کو مجھ سے عشق ہو گیا تھا۔ لو ایٹ فرسٹ سائیٹ گپ نہیں ہے۔

ایک روز وہ خوش خوش آئے اور کہنے لگے مجھے دس ہزار کی ضمانت پر رہا کیا جا سکتا ہے۔ میری اتنی بھاری ضمانت کون دے گا۔ میں نے کہا۔ اس کے متعلق سوچنا ہی بیکار ہے۔ دراصل دیپالی میں نے اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا کہ ایک نامعلوم مدت تک جیل میں پڑی رہوں گی اور پاپا میرے غم میں روتے روتے اندھے ہو جائیں گے یا مر جائیں گے۔ (ایلس بارلو ہسپتال کے بعد ایک مرتبہ جیل بھی آئیں تھیں۔ مگر میرے ارادہ کی مضبوطی کا اندازہ لگا کر دوبارہ نہ آئیں۔ گارو ہلز واپس چلی گئیں۔)

دوسری صبح دروازہ کھلا۔ جیلر نے اندر آکر کہا آپ کو رہا کیا جاتا ہے۔ ضمانت مسٹر بسنت کمار سانیال نے دی تھی۔ میں بالکل ہی بھونچکی رہ گئی۔

جیل کے پھاٹک پر بسنت کمار اپنے بھائی بھاوج ربی اور رنجنا سانیال کے ساتھ موٹر لئے منتظر تھے۔ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ ربی کمار سانیال کی کوٹھی سول لائینز میں تھی۔ وہاں پہنچ کر افوہ دیپالی مجھے ایسا عجیب لگا۔ زنانہ جیل اور ہسپتال کے زنانہ جنرل وارڈ کے بھیانک، افسردہ ماحول کے بعد یہ دوسری دنیا معلوم ہوئی۔ میں نے سوچا۔ میں خوش قسمت ہوں۔ میں جو اکثر اپنی بلی کالج کی محدود سی زندگی سے شاکی رہا کرتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اسی دنیا میں بیشتر انسان کتنی تکلیفوں میں زندہ رہتے ہیں کیسی کیسی ذلتیں اور اذیتیں اٹھاتے ہیں۔ مجھے وہ سب زنانہ جنرل وارڈ کی غریب، میلی کچیلی لیکن باہمت عورتیں یاد آئیں۔ اور مجھے پتہ چلا کہ ہماری جنتا، ہماری عورتیں واقعی کتنی بہادر ہیں۔ کیسی بہادری سے زندہ رہتی ہیں۔ اور کیسی بہادری سے مرتی ہیں۔

اتنے دنوں بعد اچھے سے غسل خانے میں اچھی طرح نہائی۔ صاف ساری پہنی۔ میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور برابر یہ احساس رہا کہ کروڑوں انسانوں کو زندگی کی یہ بنیادی آسائشیں ہی میسر نہیں۔ یہ احساس

مجھے سچ مچ پہلی بار ہوا۔

شام کو ہم تینوں برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بسنت نے مجھ سے کہا۔ کل روانگی ہے۔ سامان باندھ لو (میرے پاس سامان ہی کیا تھا، جو ساری پہن کر میں مہم پر گئی تھی وہ خون میں تر بتر ہو چکی تھی۔ ہسپتال میں انھوں نے ایک بھدا سا روب پہننے کو دے دیا تھا۔ مجھے وہ روب بہت چبھتا تھا۔ بے چاری خدیجہ نے مجھے اپنی ساری اور بلاؤز اور پیٹی کوٹ پہننے کو دے دیا تھا۔ روزانہ وہ اپنی ایک ساری دھو کر سکھا کر مجھے پہننے کو دیتی۔ وہ خود بہت غریب لڑکی تھی۔ ایک مسلمان چپراسی کی بیٹی۔ دوسری عورتوں نے بھی مجھے اپنی ساریاں پہننے کو دیں۔ یہ سب مفلس عورتیں تھیں۔ دیپالی۔)

"سامان میرے پاس کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے۔ "بالکل عادتاً منہ سے نکل گیا۔"

"میں روزی کو کل بازار لے جاؤں گی۔" رنجنا بولیں۔

"یہاں کے بازار میں کیا رکھا ہے۔ جب وہ کلکتہ پہنچے گی تو ——" بسنت بابو نے کہنا شروع کیا۔

"کلکتہ کیوں ——؟" میں نے ان کی بات کاٹی۔

"کلکتے اس لئے کہ میں تم سے شادی کر رہا ہوں۔" بسنت بابو نے جواب دیا۔

اسے ویمنز میگزین رومانس، طوفانی محبت، سنڈریلا اسٹوری وغیرہ وغیرہ کیا کہتے ہیں۔ اپنا تجربہ تو بہر حال یہ بتاتا ہے کہ اس طرح کے واقعات زندگی میں یقیناً ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

میں نے پاپا کا غیض و غضب، یہ انوکھی، پُرخطر صورت، ہر چیز نظر انداز کر دی۔

سول میرج کے لئے عدالت جانا پڑتا۔ اور نئے قصے اٹھ کھڑے ہوتے۔ چنانچہ دوسرے روز رات کو چپکے سے پنڈت کو بلایا گیا۔ ٹپکل موٹا تازہ برہمن۔ ڈرائینگ روم میں پھیرے پڑے۔ باقاعدہ میرا نام رادھیکا رکھا گیا۔ بسنت نے مجھے بتایا کہ بنگالی ویشنومت میں ہر مرد کرشن اور ہر عورت رادھا کا تصور ہے۔ لولی آئیڈیا۔

مذہب وذہب سب میرے لئے بے معنی بات ہے۔ چرچ کا پادری چند الفاظ دہرا دیتا۔ پنڈت نے بھی اسی طرح کچھ جمبو جمبو کہہ دیا۔ اصلی چیز محبت ہے۔

تین روز بعد ہم لوگ کلکتے آ گئے۔ بسنت کی کوٹھی بالی گنج میں ہے۔ بے حد اعلیٰ خاندان۔ ان کے بابا کلکتے کے مشہور سرجن ہیں۔ بڑے بھائی بیرسٹر۔ بسنت کی بھابھی بھی ڈاکٹر ہیں۔ میری نند برو بورن کالج میں کیمسٹری کی لیکچرر ہے۔ بڑا روشن خیال اور کلچرڈ خاندان ہے۔ میرے سُسر اور جیٹھ نے جو بڑے جوشیلے قوم پرست ہیں فخر سے میرا سواگت کیا۔ لیکن ساس اور کنبے کی دوسری بڑی بوڑھیاں اس شادی سے

خوش نہیں ہیں۔ کیونکہ بہرحال میں عیسائی ہوں۔ اور ایک گم نام غریب پادری کی لڑکی۔ مگر یہ لوگ اتنی شائستہ ہیں کہ اپنے کسی رویّے سے اپنی ناخوشی کا اظہار نہیں کرتیں۔ اور انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ بسنت کمار مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک بے حد SOPHISTICATED خاندان ہے۔ اومارائے کے خاندان جیسا۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد میری ساس اور دوسری بوڑھی خواتین میرے برتاؤ سے خوش ہو جائیں گی۔

ہماری کوٹھی سر پری توش رائے کے بیٹے کی کوٹھی کے پڑوس ہی میں ہے۔ میرے جیٹھ اور بسنت کی مسٹر رائے سے بہت دوستی ہے۔ چنانچہ دیپالی اب میں جہاں آرا اور اومارائے والے اس اونچے طبقہ میں شامل ہو چکی ہوں جس پر مجھے اپنے احساس کمتری کی وجہ سے اتنا رشک آیا کرتا تھا۔ یہ سب باتیں میں اس سچائی سے تم کو لکھ رہی ہوں۔ کسی اور کو نہیں لکھ سکتی۔

سانیال بہت دولت مند خاندان ہے اور دیپالی میری ساری عمر عسرت میں کٹی۔ اب خوش ہوں کہ آسائش اور آرام کی زندگی گذاروں گی۔ روپئے کی قدر اسی کو ہوتی ہے جس نے ہمیشہ تنگی و ترشی سے بسر کی ہو۔ ہماری بلی کاٹج کی زندگی تمھیں یاد ہے؟

پاپا اکثر اسرار ربانی کی بات کیا کرتے تھے۔ اور ذرا سوچو تو مجھے بسنت کس ذریعے سے ملے۔ اپنے پرانے دشمن چارلس بارلو کے ذریعے! اگر چارلس بارلو اپنی بہن کو ٹرنک کال نہ کرتا، وہ مجھ سے ملنے نہ آتیں۔ وہ اپنے ساتھ ربی بابو کو لے کر آئیں اور ربی بابو کے ساتھ بسنت کمار آئے!!

پاپا ظاہر ہے کہ ہندو سے شادی کرنے کی وجہ سے مجھے قطعی معاف نہ کریں گے۔ میں نے بھی ایک کے بعد ایک ان کو کتنے عظیم صدمے پہنچائے ہیں۔ کلکتے پہنچتے ہی میں نے اور بسنت نے اکٹھے پاپا کو خط لکھا اور ان سے ان کی BLESSINGS کی درخواست کی۔ آج صبح ان کا چند سطروں میں جواب آیا۔ لکھا ہے کہ وہ خداوند خدا کے شکر گذار ہیں کہ میں زندہ بچ گئی۔ اور خیریت سے ہوں۔ مگر میں نے یسوع کا دامن چھوڑ کر ایک بت پرست کافر سے شادی کر لی۔ اس وجہ سے وہ عمر بھر میری شکل نہ دیکھیں گے۔ بلی کاٹج کے دروازے میرے اوپر ہمیشہ کے لئے بند ہیں۔ اور یہ کہ وہ میری روحانی نجات اور بخشش کے لئے برابر دعا کرتے رہیں گے۔

اب ختم کرتی ہوں۔ دیپالی۔ بہت لمبا خط ہو گیا۔ ڈائننگ روم میں لنچ کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ اب بھاگوں۔ سسرال کا معاملہ ہے بھائی! پی۔ ایس۔ بسنت نے تم کو بہت بہت سلام کہا ہے۔ اور تم سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ اب تم جلدی سے ہمارے پاس کلکتہ آؤ۔

تمھاری

رادھیکا روزی سانیال

بالی گنج کلکتہ۔ ۸ر اکتوبر ۴۲ء

## ۳۰

# ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار

بھوتارنی دیبی نے کھانے کے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا کالے رنگ کی لمبی موٹر پھاٹک پر کھڑی تھی۔ یہ مس صاحب کل بھی آئیں تھیں۔ بنوئے گھر پہ نہیں تھا۔ باہر سے باہر چلی گئیں۔ اب آج پھر آئی بیٹھی ہیں۔ بھوتارنی دیبی نے بیٹھک خانے کے دروازے میں جاکر پردے کے پیچھے سے نظر ڈالی۔ مہمان خاتون کو تیوری پر بل ڈال کر غور سے دیکھا۔ اور کھڑاویں پہنے کھٹ کھٹ کرتی رسوئی کی طرف چلی گئیں۔

ٹونو نے جاکر ڈاکٹر سرکار کو ان کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ اچھا۔ بٹھاؤ۔ میں آتا ہوں"۔

مریض اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر سرکار نے چلمچی میں ہاتھ دھوئے اور تولیہ سے کلائیاں پونچھتے بیٹھک خانے میں آئے۔ اس وقت مہمان بی بی مسز سرکار مرحومہ کی تصویر کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

" نومشکار۔ اوما دیبی"۔

" نومشکار۔ بنوئے بابو"۔ انھوں نے چونک کر کہا۔

" دیپالی تو بول پور جا چکی ہے"۔

" مجھے معلوم ہے"۔ وہ مسکرائیں۔

شیریں مسکراہٹ۔ ڈاکٹر سرکار صوفے پر چپکے بیٹھے رہے۔ بڑی عجیب بات ہے۔ شبانی کے مرنے کے بعد سے آج تک، اس گھر میں، اس کمرے میں۔ دیپالی اور بھوتارنی کے علاوہ اور کسی عورت کے قدم ہی نہیں آئے تھے۔

اُوما نے باتیں شروع کیں۔ سوشل "اسمال ٹاک"۔ ٹونو اندر سے سلیٹی بید کی کشتی میں چار لے کر آیا۔ بھوتارنی دیبی نے باقاعدہ چاندی کا سیٹ مقفل الماری سے نکال کر نئی پیالیوں کے ساتھ چار بھیجی تھی۔ عمدہ ٹرے کلاتھ۔ جلدی میں ٹی کوزی کا غلاف تبدیل کرنا البتہ بھول گئیں۔

" دیپالی تو اسی اتوار کو بول پور گئی ہے۔ اگر آپ جب آگئی ہوتیں تو اس سے ملاقات ہو جاتی"۔

"کیوں بنوئے بابو۔ کیا میں آپ سے ملاقات کرنے نہیں آسکتی ہے"

بنوئے بابو جھینپ گئے۔ "کیوں نہیں۔ کیوں نہیں" ـــــ وہ ذرا سیلف کونشس ہو کر میز پر

انگلیاں بجانے لگے۔ شبانی کے مرنے کے بعد سے انھیں خواتین سے غیر ضروری "اسمال ٹاک" کرنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی۔

اُوما نے اُن پر ایک محظوظ نظر ڈال کر دنیش چندر آنجہانی کے پورٹریٹ کو دیکھا۔ واقعی دونوں بھائیوں میں بڑی گہری مشابہت تھی۔ بنوئے بابو بھی خاصے دلکش تھے۔ یہ آج غور سے دیکھنے پر پتہ چلا۔ دیپالی نے اس روز پہلے روز وڈ لینڈز کے مورننگ روم میں ان کے متعلق غلط نہیں کہا تھا۔ بنوئے بابو واقعی بہت جاذب نظر تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بنوئے بابو ان کو پہنچانے کے لئے پھاٹک تک گئے۔ واپس آکر پھر مطب میں جا بیٹھے۔

چند روز بعد اُوما پھر چندر کنج آئیں۔ یہ اتوار کا روز تھا۔ کوئی پندرہ منٹ مطب میں بیٹھیں اور کہا کل شام آؤں گی۔

دوسری شام وہ دیر تک دنیش چندر آنجہانی کی باتیں کرتی رہیں۔ جن کی وہ عقیدت مند اور پرستار تھیں۔ پھر شبانی کا تذکرہ چھڑا۔ ڈاکٹر سرکار مرحومہ شبانی کے متعلق کسی سے باتیں نہ کرتے تھے وہ ان کے نہاں خانۂ دل کا ایک ایسا انمول خزانہ تھا کسی دوسرے سے اس کا ذکر کرنا ہی اس کی توہین سی تھی۔ مگر اُوما نے ایسے خلوص اور محبت سے شبانی کے متعلق پوچھا کہ وہ بے اختیار اس کا تذکرہ کرنے لگے۔ اس عورت کو وہ اپنا ہمراز بنا سکتے تھے۔ یہ عورت شاید جانتی تھی کہ مرد دراصل کتنا HELPLESS ہوتا ہے۔ اور ہر عورت میں شاید اپنی ماں کو ڈھونڈتا ہے۔

اب وہ شام کے وقت اُوما کا انتظار سا کرنے لگے تھے۔ تینوں لڑکے اس وقت کھیلنے کے لئے باہر چلے جاتے تھے ورنہ اپنے بابا کو برآمدے میں ذرا الجھن کے ساتھ ٹہلتا دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھتے۔ مگر بھوتارنی دیبی ان کو بخشنے والی نہ تھیں۔ وہ تو ایسے کسی موقع کے لئے برسوں سے ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔ ایک روز انھوں نے بنوئے بابو سے کہا۔ سر پری توش رائے کی ولایت پلٹ لڑکی میرے چاند سے بھیا پر لٹو ہو گئی ہے۔ اب اسے زیادہ دبدھے میں نہ رکھو۔ بڑھیا ہوئی جا رہی ہے لاکھوں کا جہیز لائے گی ــــ کیوں کھوکا ــــ؟"

"دیدی ــــ" بنوئے بابو نے یک لخت بیحد جھنجھلا کر کہا۔ "آئندہ ایسی لچر۔ حماقت کی بات نہ کہنا۔"

وہ ہونٹ پچکا کر مسکراتی اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

مگر کہاں ماننے والی تھیں۔ دوسری شام جب اوما دیبی آئیں بھوتارنی دیبی نے جھپاک سے اندر پہنچ کر پان پیش کیا۔ اوما دیبی کھڑکی کے پاس بیٹھی ڈاکٹر سرکار کا وہ ذاتی البم دیکھ رہی تھیں جس میں

ان کی لڑکپن، کالج کے زمانے، سیاسی دور، شادی اور ہنی مون کی تصویریں تھیں۔ اُن کی فرمائش اور اصرار پر بنوئے بابو نے فوراً یہ البم لاکر ان کو دے دیا تھا۔ اور خود کسی کام سے اپنے مطب کی طرف چلے گئے تھے۔

اُوما کی بھوتارنی دیبی سے اب تک ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ ان سے بھی بہت گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد بڑی بی نے پھٹ سے کہا۔ "اے تم بیاہ کب کروگی بٹیا؟"

اسی لمحے ڈاکٹر سرکار کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے انتہائی کوفت اور ندامت سے بڑی بہن کو دیکھا۔ "دیدی ــــ!"

اُوما بھی صاف جھینپ گئی تھیں۔ لیکن بھوتارنی دیبی نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اے کیوں؟ تمھیں تو اپنی بیٹی تک کی شادی کی فکر نہیں۔ تم کو ان معاملات سے کیا غرض۔ جاؤ۔ تم باہر جاکر اپنے نقلی مریضوں کا ٹمپریچر لیتے رہو۔"

اُوما دیبی سر جھکا کر مسکرانے لگیں۔ اس ہینڈسم، شرمیلے، تارک الدنیا ڈاکٹر سے ہلکا ہلکا فلرٹ کرنے میں لطف آرہا تھا۔ بڑی بی نے لے کے بیچارے کو بالکل ہی شرم سے لال بھبوکا کر دیا۔

بھوتارنی دیبی اٹھیں اور فاتحانہ انداز سے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"آپ۔ دیدی کی حماقت کا بُرا نہ مانئے گا۔ اُوما دیبی۔"

"قطعاً نہیں۔ میں پرانی نسل کی خواتین کو کیا جانتی نہیں ہوں!" انھوں نے شگفتگی سے جواب دیا۔

لیکن اسی رات جب سب لوگ سو گئے۔ تو بھوتارنی دیبی نے سرہانے کی کارنس سے قلم دوات اتارا۔ بچوں کے کمرے میں دبے پاؤں گئیں اور کھوکھو کی کاپی بک میں سے چند سادے کاغذ پھاڑے اپنے کمرے میں آکر پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی اور بھتیجی کو خط لکھنا شروع کیا۔ احتیاط سے آہستہ آہستہ حروف بنا کر انھوں نے لکھا۔ بیٹی۔ بھگوتی ماتا نے میری برسوں کی پرارتھنائیں سن لیں۔ شاید تمھارے باپ کا گھر بس جائے۔ اُوما دیبی کے آنے کی تفصیل۔ اُوما دیبی کی محبت اور خلوص۔ (اتنے بڑے باپ کی بیٹی۔ مگر غرور نام کو نہیں) کھوکا کو پسند کرنے لگی ہے۔ کھوکا کا بھی عورت کے معاملے میں میں سمجھتی ہوں اب جاکر شاید دل نرم پڑا۔ یہ رشتہ مجھے لگتا ہے بہت مبارک ثابت ہوگا۔ کھوکا کے اور تم سب کے دن بدل جائیں گے۔ اب تم ہی سوچو۔ تمھاری شادی ہو جائے گی (ماں سے پرارتھنا ہے تم کو کوئی ڈپٹی مجسٹریٹ ملے۔ رانی بن کر رہو۔ تم نے میری بچی بہت مصیبتیں بھوگ لیں) لڑکے کالج چلے جائیں گے۔ رہ گئی میں۔ کسی روز بھی میری آنکھ بند ہو گئی تو میرے کھوکا کا پُرسان حال کون ہوگا۔ تو بیٹی خوش ہو جاؤ کہ اُوما جیسی امیر اور سمجھ دار ماں ملے گی۔ باقی اس خط کا کھوکا سے

ذکر نہ کرنا۔ میں تمھیں بڑے راز سے خط لکھ رہی ہوں۔

تمھاری پھوپھی

بھوتارنی دیبی

ڈاکٹر سرکار کے ایک مریض مترا بابو سر پری توش رائے کے موکل تھے۔ اور اکثر مطب آتے رہتے تھے زیادہ تر اڈے کی خاطر۔ انھوں نے کئی بار سر پری توش رائے کی کار باہر دیکھی۔ اور اُوما دیبی کو آتے جاتے دیکھا۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ دیپالی گھر پر موجود نہیں ہے۔ پھر انھوں نے ذرا کرید کر بنوئے بابو سے پوچھا کہ کیا آج کل اُوما دیبی ان سے اپنے درد سر کا علاج کروا رہی ہیں۔ بنوئے بابو صاف گو اور بھولے آدمی تھے۔ کہنے لگے۔ نہیں ایسے ہی ملنے کے لئے چلی آتی ہیں۔

مترا بابو نے فوراً گھر پہ جا کر اپنی بی بی کو یہ قصہ سنایا۔ مسز مترا دوسرے ہی روز وڈ لینڈز پہنچیں۔ لیڈی رائے پچھلے برآمدے میں بیٹھی صبح کی کافی پی رہی تھیں اور اسٹیٹسمین پڑھتی جا رہی تھیں۔ جب مسز مترا سج سج چلتی آکر نزدیک کی کرسی پر بیٹھ گئیں اور نمسکار کیا۔

"اوہ ہلو ادرن دھتی"۔ لیڈی رائے نے مسکرا کر اخبار رکھ دیا۔ اور ان کے لئے کافی بنانے لگیں تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد مسز مترا اس خوبصورتی اور فن کاری سے جو اس قسم کے معاملات میں صرف خواتین کا حصہ ہے، اصل مقصد کی طرف آئیں۔ "اوما کی طبیعت اب کیسی ہے؟" انھوں نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے دریافت کیا۔

"اب تو بالکل ٹھیک ہے۔ آپ تو جانتی ہیں وہ ہمیشہ سے کتنی زود رنج اور چڑچڑی رہی ہے"۔ لیڈی رائے نے جواب دیا۔

"جبھی تو میں نے پوچھا"۔

"نہیں اب تو شکر ہے کچھ دنوں سے کافی شگفتہ نظر آ رہی ہے"۔

"یہ بھی ہمیشہ مجھ سے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر سرکار کا علاج بالکل جادو کا اثر رکھتا ہے"۔

"ڈاکٹر سرکار ــــ؟"

"یہ بھی ڈاکٹر صاحب سے اپنے دمے کا علاج کروا رہے ہیں۔ بہت تعریف کرتے ہیں۔ انھوں نے ہی کئی مرتبہ اُوما کو ڈاکٹر صاحب کے مطب میں دیکھا تو مجھ سے آکر بولے کہ یہ بڑا اچھا ہوا ــــ"

"اچھا۔ اُوما نے مجھ سے ذکر نہیں کیا"۔

مسز مترا اب باقاعدہ GLOAT کر رہی تھیں۔ انھوں نے بات جاری رکھی۔ "آپ نے اُن کا نام تو سنا ہوگا۔ بنوئے چندر سرکار۔ وہی جن کی لڑکی دیپالی سرکار ریڈیو پر گاتی ہے"۔

"اوہ ــــ"

"بے چارے بڑے شریف آدمی ہیں۔ بی بی تو عرصہ ہوا پرلوک سدھاریں۔ چار بچے ہیں۔ لڑکی بس دیپالی ہی ہے۔ بڑا اچھا خاندان ہے۔ ان کے بابا میمن سنگھ کے زمیندار تھے۔"

لیڈی رائے قطعاً بیوقوف نہیں تھیں۔ وہ مسز مترا کا لہجہ اور عندیہ دونوں بھانپ گئیں۔ اور فوراً ذرا رکھائی اور ناگواری سے دوسری طرف دیکھنے لگیں۔ لیکن مسز مترا کہے گئیں۔ "یہ تو بنوئے بابو کو بالکل دیوتا سمجھتے ہیں۔ ایسے خاندانی اور وضعدار لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں۔ اور رہا روپیہ پیسہ تو وہ تو ہاتھ کا میل ہے۔" اس نکتے تک پہنچ کر مسز مترا نے کوئی بالکل غیر متعلق موضوع چھیڑ دیا۔ اس کے دس منٹ بعد گھما پھرا کر بات کو پھر وہیں لے آئیں۔ "لڑکیوں کی شادی آج کل ایسا کٹھن مرحلہ بنتی جا رہی ہے۔ آخر کیا کیا جائے۔ میری ماشی ماں کے دیور کی لڑکی انجلی داس گپتا تو آپ کو یاد ہوگی اُوما کی سہیلی تھی۔ اس کی عمر نکل گئی بال سفید ہو گئے وہ تنگ آکر بھگوان جانے لنکا یا برما یا کہاں چلی گئی۔ اسکول پڑھانے۔ اب خیال آتا ہے۔ بنوئے بابو جیسا کوئی مل جاتا تو بے چاری کی قسمت بن جاتی۔ بنوئے بابو بے چارے اب جا کر کوئی چوالیس پینتالیس سال کے ہوئے ہوں گے۔ زمیندار کے لاڈلے بیٹے تھے۔ باپ ماں نے نوعمری میں بیاہ کر دیا تھا۔" یہاں تک پہنچ کر مسز مترا نے سوچا کہ اتنا آج بھر کے لئے کافی ہے۔ اور پھر دوسری باتوں میں لگ گئیں۔

لیڈی رائے مسز مترا کی گفتگو سے کافی پریشان ہو چکی تھیں۔ رات کو ڈنر کے بعد انھوں نے سر پری توش سے اس کا تذکرہ کیا۔ ڈھاکہ بہت چھوٹا اور پرونشل قسم کا شہر تھا۔ اوما کی چندر گنج جانے کی خبر اڑتی اڑتی سر پری توش تک بھی پہنچ چکی تھی۔ وہ ڈاکٹر سرکار سے واقف تھے۔ اس وقت انھوں نے لیڈی رائے سے کہا۔ "شکر کرو کہ اُوما نے کسی میں دلچسپی لینی شروع تو کی۔"

"اس کا مجھے احساس کھائے جا رہا ہے کہ وہ اکتیس سے اوپر ہو چکی ہے۔ مگر ایسا بھی کیا ــــ" لیڈی رائے نے آزردگی سے کہا۔ وہ اب تک آس لگائے بیٹھی تھیں کہ شاید کوئی ہم رتبہ داماد مل جائے حالانکہ لڑکی روز بروز زیادہ چڑچڑی اور موٹی اور بھدی ہوتی جا رہی تھی۔ ہماری قسمت میں نہ جانے یہ دکھ کیوں لکھا تھا۔ معمولی معمولی لوگوں کی لڑکیاں ایک سے ایک حسین، نازک، دلچسپ۔ ہماری بیٹی شکل و صورت اور حلیے سے استانی لگتی ہے۔ باتیں شروع کرتی ہے تو سوائے اس کے ان بے تکے کامریڈز کے، سمجھ دار نوجوان ڈر کر دور بھاگ جاتے ہیں۔ کارل مارکس اور لینن اور اسٹالن اور یہ اور وہ۔ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا ہمارے مصلحین کی شاید ہمالیہ سے بھی بڑی غلطی تھی۔

بالی گنج کلکتہ میں سر پری توش اور لیڈی رائے کے اکلوتے فرزند نرمیلندو کمار رائے کے پڑوس میں ایک بے حد دولت مند سانیال خاندان رہتا تھا۔ اس خاندان کے چھوٹے بیٹے بسنت کمار

سے زمیلندو کی بڑی دوستی تھی۔ پچھلے دنوں جب اُوما کلکتہ اپنے بھائی کے پاس جا کر رہی۔ تو وہ نوجوان اس سے بھی ملنے آیا کرتا تھا اور لیڈی رائے کو امید بندھی تھی کہ شاید بسنت اُوما میں کچھ دلچسپی لے۔ مگر اس نے بھی ادبدا کر اُوما کو دیدی کہنا شروع کر دیا اور پھر وہی کارل مارکس اور لینن اور اسٹالن اور اُوما نے بھی ذرا سی جو اس میں دلچسپی لی ہو۔ بس وہی کمبخت اینگلز اور مارکس۔ اور بسنت نے اس غریب کالے پادری کی حسین لڑکی روزی سے بیاہ کر لیا۔ غضب خدا کا۔

اور اب ساری دنیا دیکھنے کے بعد یہ بے چارہ بنوئے چندر سرکار اُوما کو بھایا ہے۔ چلو۔ واقعی شکر ہے۔ کوئی تو پسند آیا۔ سرکاری افسر سے شادی کرے گی نہیں۔ کمیونسٹ ہو گئی ہے۔ تو ظاہر ہے کسی ایسے ہی نادار آدمی کو چھانٹے گی۔

"مگر بنوئے بابو بہر حال خاندانی آدمی ہیں۔ ان کے باپ زمیندار رومیش چندر کو لوگ آج بھی ڈھاکے میں بھولے نہیں ہیں"۔ سر پری توش کہہ رہے تھے، لیڈی رائے نے گہرا سانس بھرا۔

"ان کی ایک جوان لڑکی بھی ہے"۔ لیڈی رائے نے سوچ کر کہا۔

"دیپالی ــــ؟ اس کے گانے تو تم بڑے شوق سے سنتی ہو۔ اور ہمارا نرمل اس کے ریکارڈ بڑی لگن سے بجایا کرتا ہے"۔ سر پری توش نے ہنس کر کہا۔

لیڈی رائے خاموش ہو گئیں اور سوچنے لگیں۔ دیپالی کچھ عرصے بعد اپنے گھر چلی جائے گی۔ لڑکے اپنی اپنی راہ لیں گے۔ ٹھیک ہے۔ بہ حالت مجبوری اُوما کے لئے بنوئے بابو ہی بالکل ٹھیک ہیں۔ اگر وہ آج ہی اپنا عندیہ ظاہر کر دے تو بات آگے بڑھائی جائے۔

صبح کو لیڈی رائے نے اُوما سے ڈاکٹر سرکار کے متعلق گول گول الفاظ میں استفسار کیا تو وہ مسکرا کر چپ ہو گئیں۔ لیڈی رائے نے فوراً چپکے چپکے بنوئے بابو کے متعلق مزید معلومات شروع کروا دیں۔

ایک روز اُوما چندر کنج گئیں تو ڈاکٹر سرکار سے کہنے لگیں۔ "دیپالی کے لئے اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"دیپالی ــــ؟ ابھی تو وہ اپنے میوزک ڈپلومے کے لئے پڑھ رہی ہے"۔

"اس کے بعد؟"

"پتہ نہیں"۔

"آپ کے خیال میں ہے کوئی لڑکا؟"

"نہیں۔ آپ اتنے لوگوں کو جانتی ہیں آپ ہی کوئی تجویز کیجئے۔ مگر آپ کو معلوم ہے میں لمبا چوڑا

جہیز نہیں دے سکتا۔"

"مجھے وہ اپنی چھوٹی بہن کی طرح عزیز ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد اس کا اچھی جگہ بیاہ ہو جائے۔"

"جلد از جلد ـــــ؟ ابھی دو سال تو اس کے میوزک ڈپلوما میں باقی ہیں۔ پھر اس کی ضد ہے کہ ایم۔ اے کرے گی۔ ابھی اس کی عمر زیادہ نہیں ہے۔"

"نہیں۔ جلد ہی وہ اپنے گھر چلی جائے تو بہتر ہے آج کل زمانہ ـــــ"

"ـــــ بڑا خراب ہے؟" بنوئے بابو ہنس پڑے۔ "آپ جیسی ترقی پسند یہ کہہ رہی ہیں۔"

"میں آپ کو قدامت پرست سمجھتی تھی مگر آپ شاید مجھ سے بھی زیادہ ترقی پسند ہیں!"

"نہیں۔ میں پرانی وضع کا آدمی ہوں۔ مگر میں دیپالی کی خلاف مرضی اس کا بیاہ ہرگز نہ کروں گا۔"

"اگر وہ آپ کی خلاف مرضی کرلے تو؟"

"وہ کبھی ایسا نہیں کرسکتی۔ بڑی معصوم، سیدھی بچی ہے۔"

اُوما ذرا مسکرائیں۔ بنوئے بابو نے ان کو تعجب سے دیکھا۔

"ہر باپ اپنی بیٹی کو معصوم سیدھی ننھی بچی ہی سمجھتا ہے!"

"آپ کے والد بھی آپ کو یہی سمجھتے ہوں گے ـــــ!" بنوئے بابو نے ہنس کر جواب دیا۔ اُوما رائے لاجواب ہو گئیں۔ چند سیکنڈ بعد انھوں نے کہا۔ "فرض کیجئے۔ دیپالی غیر فرقے میں شادی کرنا چاہے؟"

"غیر فرقے میں؟ آپ کو یہ خیال کس طرح آیا؟"

"بنوئے بابو۔ وہ ایک مسلمان لڑکا نہیں ہے۔ کامریڈ ریحان۔ وہ شاید آپ کے ہاں بھی کئی بار آچکا ہے۔ میں نے کچھ یونہی افواہ سنی تھی کہ ـــــ"

"افواہ ـــــ؟" بنوئے بابو نے گھبرا کر پوچھا۔

"لیکن آپ نے کیا سنا؟"

"کچھ نہیں۔" اُوما نے اطمینان سے صوفے پر پہلو بدل کر عینک اتاری۔ لگائی۔ اور ذرا بے پرواہ آواز میں کہنے لگیں۔ "دیپالی پچھلے سال جون میں جب بول پور سے گھر آنے کے بجائے سندرن چلی گئی تھی نا۔"

"سنتھال پرگنے ـــــ" بنوئے بابو نے تصحیح کرنا چاہی مگر اُوما دیبی کہے گئیں۔ "وہ سندرن گئی تھی نا۔" پچھلے سال جون میں۔ ریحان سے ملنے۔ آپ کو تو خیر معلوم ہی ہوگا۔ تب ڈیڈی کے کسی موکل نے ضلع کھلنا کے ایک ریلوے اسٹیشن پر، شاید باگیرہاٹ پر ریحان کو اسے ٹرین پر سوار کراتے دیکھا

تھا۔" اچانک وہ سراسیمگی کے ساتھ بات ادھوری چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ کیونکہ ان کو لگا جیسے بنوئے بابو پر دل کا دورہ پڑنے والا ہے۔ وہ بھونچکے سے انھیں تکے جا رہے تھے۔

" اوہ ــــ آئی ایم سو سوری۔ بنوئے بابو۔ میرا خیال تھا کہ آپ جانتے ہوں گے۔ آئی ایم سوری ــــ پلیز ــــ اوہ ــــ"

بنوئے بابو نے ہاتھ اٹھا کر ان کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ذرا کرب سے ان پر نظر ڈالی اور صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور تیوری پر بل ڈال کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔

" مجھے افسوس ہے بنوئے بابو۔" اُوما نے پھر کہنا شروع کیا۔" میرا خیال تھا آپ خود جانتے ہوں گے۔ دیپالی بڑی راست باز بچی ہے۔ وہ آپ سے جھوٹ نہیں بولتی ہوگی۔"

" اسے جھوٹ بولنا آپ نے سکھایا ہے اُوما دیبی۔" بنوے بابو نے مدھم آواز میں کہا۔

" میں نے ــــ؟ میں نے بنوئے بابو ــــ؟" اوما نے عینک اتار کر حیرت سے پوچھا۔

جس طرح آپ اسے ایک ہفتے کے لئے اپنے ساتھ گویا کو میلا لے گئی تھیں۔ مجھے آج تک معلوم نہیں کہ دراصل وہ کہاں گئی تھی۔ یہ سب آپ کی ٹریننگ کا نتیجہ ہے اُوما دیبی۔"

" مجھے افسوس ہے بنوئے بابو ــــ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں۔" اُوما اب ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئیں۔

" میں آپ کو پانی لا دوں؟" بنوئے بابو خاموش رہے۔ اُوما جلدی سے کھانے کے کمرے میں گئیں۔ ڈولی پر رکھی صراحی میں سے گلاس میں پانی انڈیلنے سے قبل ایک نظر سے کمرے کا جائزہ لیا۔

شام کا وقت تھا اور رسوئی گھر سے کڑاہی کی چھن چھن کی آواز آ رہی تھی۔ کھانے کمرے کی کھڑکی کے باہر عبدالقادر کا مریل گھوڑا گھاس چر رہا تھا۔ اُوما گلاس لے کر بیٹھک خانے میں واپس پہنچیں۔ مگر بنوئے بابو اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ اور دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ اوما تذبذب کے عالم میں دروازے کے پاس کھڑی رہیں۔ اتنے میں بھوتارنی دیبی کھڑاویں پہنے کھٹ کھٹ کرتی اندر آئیں۔

" کیا ہوا ــــ؟" انھوں نے بھویں جوڑ کر دریافت کیا۔

" کچھ نہیں۔ شاید بنوئے بابو کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔" یہ لیجئے۔ گلاس بڑی بی کو تھما کر وہ جلدی سے باہر کار میں جا بیٹھیں۔ اور گھر روانہ ہو گئیں۔

دوسری صبح اُوما پھر چندر کنج پہنچیں۔ مطب کے دروازے میں تالا پڑا تھا۔ بچے اسکول جا چکے تھے۔ بھوتارنی دیبی عبدالقادر کی گاڑی میں بیٹھ کر مہینے کی جنس لانے بازار گئی ہوئی تھیں۔ اُوما نے اندر جا کر بنوئے بابو کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بنوئے بابو نے اخبار ہاتھ میں لئے لئے کواڑ کھولا۔

"اوہ ــــ تھینک گوڈ ــــ" اوما نے کہا۔

"کیوں ــــ؟"

"رات بھر مجھے فکر کے مارے نیند نہیں آئی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو یہ صدمہ پہنچایا۔"

"میں زندگی میں بڑے سے بڑے دھچکے کو سہار لینے کا عادی ہو چکا ہوں۔ مگر میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اصل صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔" وہ باہر بیٹھک خانے میں آنے لگے مگر اُوما ان کے کمرے میں داخل ہو چکی تھیں۔ انھوں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔

"آپ تو واقعی بالکل سادھو بن چکے ہیں۔"

بنوئے بابو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اوما نے عینک اتار کر آنکھیں ہتھیلیوں سے ملتے رہنے کے بعد کہا۔ "بنوئے بابو آپ سے اب صرف ایک درخواست ہے۔"

"کہیئے ــــ"

"آپ دیپالی پر ہرگز ہرگز یہ نہ ظاہر کیجئے کہ میں نے آپ کو اس کے سُندر بن جانے کا واقعہ بتایا ہے۔"

"آپ کو یہ درخواست کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس سے اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہونگا۔"

"کچھ بھی نہیں کہیں گے؟" اُوما نے حیرت سے دُہرایا۔

"نہیں ــــ" بنوئے بابو آہستہ آہستہ دروازے کی سمت بڑھے۔ "آئیے باہر چل کر بیٹھیں دیپالی سمجھ دار اور بالغ لڑکی ہے۔ آپ کا خیال ہے میں اس طرح کی کوئی بات کہہ کر اسے شرمندہ کروں گا۔"

اُوما ان کے پیچھے پیچھے بیٹھک خانے میں آکر ایک کرسی پر ٹِک گئیں۔

بنوئے بابو آہستہ آہستہ کہتے رہے۔ "اُوما دیبی۔ شاید۔ شاید ایک غیرت مند باپ کی حیثیت سے مجھے دیپالی کو کال کوٹھری میں بند کر دینا چاہئے۔ اور شاید فوراً کوئی ہندو لڑکا تلاش کر کے اس کی شادی کر دینی چاہئے۔ لیکن اُوما دیبی ــــ" انھوں نے ایک لمبا سانس لیا۔ "میں یہ سب کچھ نہیں کروں گا۔" اس اثنا میں وہ تھکے تھکے سے، کمرے کا ایک چکر لگا کر شکستہ صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔

"میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ اپنی نوعمری کی رومانیت، آئیڈیلزم، اس مسلمان لڑکے سے محبت، جو کچھ بھی ہو، اس کی وجہ سے مجھ سے بہانہ بنا کر ریحان سے ملنے اکیلی وہاں چلی گئی اور غالباً اس کے ساتھ ایک ہی جگہ رہی۔ مگر اس نے کوئی بھی ایسی حرکت نہ کی ہوگی جو اسے نہ کرنا چاہئے ــــ مجھے اس کا یقین ہے۔"

"کس طرح ــــ؟"

"آپ اُدما دیبی ـــــ آپ ولایت میں تین چار سال اکیلی رہیں۔ آپ کے والد کو کس طرح یقین ہے کہ آپ نے وہاں کوئی ایسی حرکت نہ کی ہوگی جو آپ کو نہ کرنا چاہئے۔"

اُدما پھر لاجواب ہوگئیں۔ انھوں نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔ "اب آپ کیا کریں گے؟ دیپالی اور ـــــ اور ریحان کو بیاہ کی اجازت دے دیں گے؟ میں ریحان کو عرصہ سے جانتی ہوں۔ وہ کافی لاابالی اور غیر ذمہ دار لڑکا ہے۔ ایک مرتبہ وہ اپنی کزن کو LET DOWN کر چکا ہے۔ اور یوں بھی، وہ بالکل HAND TO MOUTH زندگی گذارتا ہے۔ دیپالی ایک ہول ٹائمر کے الاؤنس پر کس طرح گزر کرے گی۔؟ علاوہ ازیں وہ مسلم سماج میں کس طرح ایڈجسٹ کرے گی؟ خود اس شادی سے آپ کی اپنی پریکٹس پر بُرا اثر نہیں پڑے گا؟ آپ کے زیادہ تر مریض کٹر ہندو بھدرا لوگ ہیں ـــــ معاف کیجئے گا بنوئے بابو آپ تو ایک لامذہب رشی ثابت ہوئے مگر میں آپ کی ایک پُرخلوص دوست کی حیثیت سے دیپالی کی بھلائی کے خیال سے یہ سب کہہ رہی ہوں۔ حالانکہ "IT IS NONE OF MY BUSINESS!"

بنوئے بابو سر پیچھے ڈالے چھت کو تک رہے تھے۔ وہ ذرا سا مسکرائے۔ "اُدما دیبی۔ آپ یقیناً میری اور دیپالی کی بھلائی کے لئے یہ سب کہہ رہی ہیں۔ اور میں آپ کا ممنون ہوں۔ مگر بات یہ ہے۔" انھوں نے پھر ایک لمبا سانس لیا۔ "میرے نزدیک انسانی زندگی ایک انتہائی انمول شے ہے۔ اپنی نوجوان بیوی، اور اپنے نوجوان بھائی کو کھو دینے کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ زندگی کتنی انمول شے ہے ـــــ اور انسان کا دل ـــــ انسان کا دل ـــــ" ایک دم ان کی آواز میں جوش سا آگیا ـــــ "اُدما دیبی آپ کو کیا اتنا بھی علم نہیں ـــــ آپ اتنا پڑھ لکھ گئیں۔ دنیا گھوم آئیں۔ اتنا نہیں جانتیں کہ انسان کا دل کتنی قیمتی چیز ہے؟ جوان دل اور جوان زندگی بے حد ـــــ بے حد بیش قیمت چیزیں ہیں۔ اُدما۔ اور اس ایک مختصر سی انسانی زندگی کو دکھی بنانا دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ زندگی بار بار نہیں ملتی۔ انسان صرف ایک بار جنم لیتا ہے میں پُنر جنم میں یقین نہیں رکھتا۔ وہ ایک لغو تصور ہے۔ انسان کا دنیا سے، دوسرے انسانوں سے صرف ایک بار رشتہ بندھتا ہے اور موت آتی ہے تو یہ رشتہ بھی ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جاتا ہے ـــــ اگر ـــــ اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ دیپالی اس لڑکے کو اتنا چاہتی ہے۔ وہ لڑکا دیپالی کو اتنا چاہتا ہے، کہ ان کے راستے میں حائل ہونے کی وجہ سے ان کی زندگیاں ہمیشہ کے لئے خزاں آلود ہو جائیں گی۔ تو میں یقیناً اسے شادی کی اجازت دے دوں گا ـــــ ہندو سماج اور مسلم سماج اور میری پریکٹس، میری بچی کی مسرت سے زیادہ اہم نہیں۔"

"شادی کی اجازت دے دیں گے ـــــ؟" اُدما نے بھونچکی ہو کر دہرایا۔

"یقیناً ـــــ!" وہ بہت محظوظ ہو کر اُدما کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انھوں نے کہا ـــــ "تعجب

ہے۔ اکٹر پروگریسو تو آپ تھیں۔ آپ کو میرے ان پروگریسو خیالات پر بہت خوش ہونا چاہئے۔"
اُوما کرسی سے اٹھیں۔

"جا رہی ہیں۔؟ بیٹھئے۔ چار دائے پی کر جائیے گا۔ دیدی ابھی بازار سے آتی ہوں گی۔"

"نہیں اب میں چلوں۔" اُوما نے جواب دیا۔

بنوئے بابو صوفے پر سے اٹھے اور انھیں کار میں سوار کرانے کے لئے باہر آگئے۔ جب اُوما کار میں بیٹھ گئیں تو انھوں نے ہاتھ اونچا کر کے مسکراتے ہوئے نمسکار کیا۔ اور فوراً دو مریضوں سے بات چیت میں منہمک ہو گئے جو اسی وقت پھاٹک پر پہنچے تھے۔

وڈلینڈز واپس پہنچ کر اوما رائے نے سر پری توش کے سکریٹری کو حکم دیا کہ جلد از جلد بولپور جانے کے لئے اسٹیمر اور ٹرین میں ان کا ریزرویشن کروا دے۔ وہ دیپالی سے ملنے شانتی نکیتن جا رہی تھیں۔

## ۳۱

# دلہن کی پالکی

دیپالی دیدی آداب

پرسوں یعنی جمعے کے روز جہاں آرا آپا کی شادی ہو گئی۔ آپ کو معلوم کر کے ضرور تعجب ہو گا مگر چپکے چپکے بات چیت چلائی جا رہی تھی تاکہ بقول شمسہ خالہ کوئی باہر والا اڑنگا نہ لگا دے۔ خود جہاں آرا آپا کو تاریخ طے کرنے سے چند روز قبل ہی اطلاع دی گئی۔ یہ شادی بھی شمسہ خالہ ہی نے کروائی ہے۔ نواب اجمل حسین مرشد زادہ نیر بھائی کی دلہن کے سگے خالو ہیں۔ دلہن بھابھی کی خالہ کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔ اولاد کوئی نہیں ہے۔ بقول شمسہ خالہ جہاں آرا آپا کی عمر بڑھ رہی تھی اور کنوارا کم عمر لڑکا مل نہیں رہا تھا۔ خصوصاً جبکہ جہاں آرا آپا کی صورت شکل بھی معمولی ہے۔ نواب اجمل حسین مرشد زادہ آپا سے عمر میں دوگنے بڑے ہیں۔ وہ بھی دیناج پور کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ میٹرک پاس ہیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ بقول شمسہ خالہ وہ اپنے سسر نواب قمر الزماں چودھری کے توڑ کے رئیس ہیں۔ تین موٹریں اور تین چار ہاتھی رکھتے ہیں۔ آپا کے لئے سیروں زیور چڑھا دے میں آیا۔ شمسہ خالہ امی سے کہہ رہی تھیں لڑکا میٹرک پاس ہے تو کیا ہوا کون سا جہاں آرا کو اس کے ساتھ بیٹھ کر شیکسپیئر ڈسکس کرنا ہے۔

لیکن امّی نے مجھ سے کہا کہ بے چاری جہاں آرا کی قسمت پھوٹ گئی۔ سنا ہے اجمل حسین صاحب کافی عیّاش ہیں۔ شراب بھی پیتے ہیں۔ امی نے شمسہ خالہ سے ان کی عیّاشی کی خبر پر پوچھ گچھ کی تو وہ بولیں۔ لو بہن بس اب چپکی رہو۔ جب لڑکی والوں نے سب طرح سے اطمینان کروالیا ہے تو ہم غیر لوگ کیوں فکر میں گھلیں۔ دوسرے یہ کہ لڑکا ایک زمانہ میں ذرا رنگین مزاج ضرور تھا۔ کلکتہ جاکر ریس کھیلتا تھا۔ اور ذرا پینے پلانے اور گانا وانا سننے کا شوقین تھا۔ مگر غریب کیا کرتا۔ بیوی مرچکی تھی۔ اکیلا دم۔ اللہ کا دیا پیسہ بہت۔ مزے اڑاتا تھا۔ مگر اب پھر سے گھر گرہست میں لگ کر ٹھیک ہوجائے گا۔ جہاں آرا بڑی نیک بخت ہے۔ اس کی اصلاح کرلے گی۔

سچ کہتی ہوں دیدی۔ مجھے شمسہ خالہ اور نیّر بھائی کی دلہن دونوں پر بڑا غصّہ آیا کہ انھوں نے مل کر آپا کو کہاں جھونک دیا۔ نواب صاحب اس رشتے سے قطعی خوش نہیں ہیں مگر سب گھر والوں نے مل کر ان کا پیچھا لے لیا۔ اُدی کیا لڑکی کا کوارکوٹ چُننا ہے۔ جب تک وہ بیٹھی رہے گی انجم آرا، اختر آرا کے لئے بھی پیغام نہیں آسکتے۔ نواب صاحب نے پھر بھی حامی نہ بھری تو جہاں آرا کی امّی پر فوراً اختلاجِ قلب کا دورہ پڑگیا۔ (اختلاجِ قلب نہیں دیدی۔ اب میں بڑی ہوتی جارہی ہوں تو دنیا کی بہت سی باتیں سمجھ میں آتی جارہی ہیں۔ بیگم قمرالزماں کو دراصل ہسٹریا کا مرض ہے اور نواب صاحب بے چارے امن پسند آدمی ہیں بیوی کے ان دوروں سے ان کی روح فنا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے بیچارے نے ساری عمر اپنے اس ڈیپریسنگ کتب خانے میں بیٹھے بیٹھے گذار دی۔) بہر حال تو بیگم قمرالزماں نے الٹی میٹم دے دیا کہ لڑکی کا رشتہ اس جگہ نہ ہوا تو وہ زمین آسمان ایک کردے گی۔ نواب صاحب تب بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔

اور تب ان کی بیوی نے ایک تُرپ چال چلی۔ یہ مجھے بالکل اتفاقیہ معلوم ہوا اور بڑی سخت حیرت ہوئی۔ ایک روز میں ارجمند منزل گئی ہوئی تھی۔ جہاں آرا آپا باورچی خانے کی طرف جاچکی تھیں۔ میں نیّر بھائی کے بچّے منوّر کو گود میں لے کر پیچھے والے برآمدے میں ٹہلنے لگی کہ اندر بیگم قمرالزماں کے کمرے سے آواز آئی۔ نواب صاحب بے چارے اپنی بیوی سے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے ــــ "میں جہاں آرا کو جان بوجھ کر کنویں میں نہیں ڈھکیلوں گا۔" تو وہ چمک کر بولیں۔ "اور کیا کروگے؟ چاہتے ہو کہ وہ تمھاری چہیتی ملیحہ کے لفنگے بیٹے کے ساتھ بھاگ جائے؟" نواب صاحب نے متانت سے کہا۔ "انوری بیگم خاموش رہو۔ خاموش رہو۔" وہ بھلا کہاں خاموش رہتیں۔ بولیں۔ "معلوم بھی ہے وہ لفنگا جیل سے چھوٹ گیا۔ پھر ڈھاکے کے چکّر لگا رہا ہے، ابھی پرلے روز یہاں آیا تھا۔ میں سو رہی تھی۔ وہ میرے کمرے سے باہر نکلا تو آہٹ سے میری آنکھ کھلی جاتے ہوئے اس کی جھلک دیکھی تو گھبرا کر کھڑکی میں گئی۔ باہر جھانکا تو کیا دیکھتی ہوں۔ باہر تالاب کے کنارے دونوں کھُسر پُسر کر رہے ہیں۔ تمھیں کچھ بسنت کی خبر بھی ہے نواب

صاحب۔ تم اپنی اسٹڈی میں بیٹھے پاکستان زندہ باد کرتے رہو۔ تمھیں یہ ہوش کہاں کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اب تم یہی چاہتے ہو کہ صاحبزادی تمھارے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا کر اس منحوس اٹھائی گیرے کے ساتھ گھر سے نکل جائیں؟ اور فرض کرو وہ بھاگ نہ بھی سکے تو یہ خبر کہ رونو میاں واپس آ گئے ہیں کم بدنامی کی بات ہے؟ بے چاری شمسہ بہن اور اللہ رکھے نیّر کی دلہن نے جوڑ توڑ کر کے ایک رشتہ لگایا ہے وہ بھی ٹوٹ جائے گا۔ رونو میاں کا قصہ اب تک چھپا ہوا تھا۔ مگر اب بات پھیل گئی تو جہاں آرا تو خیر ہیں ہی بدنصیب۔ چھوٹی دونوں کے بھی رشتے نہیں آئیں گے۔"

نواب صاحب چپ چاپ بیگم کی یہ تقریر سنتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے۔ "انوری بیگم۔ رونو اگر شادی کے لئے اب کہے تو میں اسے اجازت دے دوں گا۔ چار برس قبل میں نے حماقت کی تھی۔ اب اجازت دے دوں گا۔" یہ سُننا تھا کہ انوری بیگم پر دورہ سا پڑ گیا۔ کہنے لگیں۔ "میں مرتی مر جاؤں گی یہ شادی نہ ہونے دوں گی۔ اور یاد رکھو وہ اب تمھاری لڑکی سے بیاہ کرے گا بھی نہیں۔ میں اس روز کے بعد شمسہ بہن کے ذریعے اس کے رتی رتی حالات معلوم کروا چکی ہوں۔ وہ اس ہندو بیرسٹر کی لڑکی کے چکر میں مبتلا ہے۔ سر پری توش کی لڑکی۔ یوں کہو کہ بیرسٹر کی لڑکی نے اسے رکھا ہوا ہے۔ توبہ توبہ توبہ۔ اس خاندان میں ایسا بے غیرت آدمی پیدا ہوا۔ مگر کیا کرے۔ ہے بھی تو پاٹ کوٹنے والے دو ٹکے کے کسان کی اولاد۔ اجی وہ تو اب سونے کا بن کر بھی آئے تو میں اس دہلیز کو نہ پھلانگنے دوں۔ آوارہ۔ دو کوڑی کی اوقات۔ میری شہزادی کو لے جائے گا؟ اور اجی تم بھی سٹھیا گئے ہو کیا۔ یا مرحومہ ملیحہ بیگم کی محبت نے جوش مارا ہے؟ بلواؤ تو اس کو۔ ذرا دیکھوں کیسے شادی کرتے ہو جہاں آرا سے اس کی۔" اتنا کہہ کر وہ تو سسکے بہانے لگیں اور نواب صاحب کمرے سے باہر چلے گئے۔

جب اندر یہ باتیں ہو رہی تھیں تو انجم آرا بھی برآمدے میں آ گئی تھی اور کان لگا کر والدین کا یہ مکالمہ سن رہی تھی۔ جب باپ باہر چلے گئے تو وہ لمبا سانس بھر کر مجھ سے بولی۔ "اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔ اللہ کرے ایسا ہو جائے۔ اللہ کرے ایسا ہو جائے۔" میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ قصہ کیا ہے۔ انجم کہنے لگی ابھی آپا سے کچھ ذکر نہ کرنا۔ ممکن ہے کچھ بھی نہ ہو اور آپا پھر غلط آس لگا کر بیٹھ جائیں۔

مگر دیدی بے چاری انجم کو ٹوہ لگ گئی کہ اب ابا کیا کرتے ہیں۔ اور وہ اور مالا دونوں جاسوسی پر مستعد ہو گئیں۔ انھوں نے اپنی جاسوسی کے ذریعے معلوم کیا کہ نواب صاحب نے شمسہ خالہ کو بلا کر اُن سے پوچھا۔ "رونو میاں اور اُدمارائے کا قصہ کیا ہے؟" شمسہ خالہ ہاتھ کانوں پر رکھ کر بولیں۔ "بھیا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں نے تو ایسے ہی اُڑتی اُڑتی سنی تھی۔ وہی میں نے انوری بہن کو بتلا دیا۔" اب نواب صاحب نے جلد از جلد اپنے رونو میاں کو کونٹیکٹ کرنے کی کوشش کی۔ ان کو دہلی خط لکھا کہ فوراً آ کر ملیں۔ اُدمارائے کو فون کر کے پوچھا کہ رونو اس وقت کہاں ہیں۔ انھوں نے کچھ گول سا جواب دے دیا۔

ادھر دیناج پور سے عقد کی تاریخ جلد طے کرنے کے تقاضے پر تقاضے آرہے تھے۔ اور بیگم قمرالزماں کے اختلاج قلب میں زیادتی ہوتی جارہی تھی۔ جس روز نواب صاحب نے ان سے کہا کہ وہ جب تک رونو میاں سے بات نہ کرلیں نکاح کی تاریخ طے نہ کریں گے۔ تو اُن کی بیگم نے قیامت برپا کردی۔ نواب صاحب نے دلّی۔ بمبئی، کلکتہ جانے کہاں کہاں ہر ممکن پتے پر رونو میاں کو تار دیئے ٹرنک کال کئے۔ مگر وہ حضرت جانے کہاں غائب ہوچکے تھے۔ کوئی جواب نہ آیا۔ ادھر انوری بیگم پر اتنا زبردست دورہ پڑا کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔ نواب قمرالزماں نے ہار مان لی۔ نواب اجمل حسین سے شادی کی تاریخ طے کر دی گئی۔

مجھے اس زمانہ میں دیدی نواب صاحب پر اتنا ترس آیا کہ کیا بتاؤں۔ ایسے ٹوٹے ہوئے اور دکھی اور غمزدہ لگتے تھے کہ دیکھا نہ جاتا تھا۔ آپا کو مایوں بٹھایا گیا۔ ان کو بس چپ سی لگ گئی تھی۔ بڑی دھوم دھام کی شادی ہوئی۔ روزی آپا کی اور آپ کی عدم موجودگی کا ہم سب کو افسوس تھا۔ (روزی آپا کا اب تک کچھ پتہ نہیں چلا۔ ایک خبر ہے کہ معافی مانگ کر جیل سے نکل آئیں۔ دوسری خبر ہے کہ کالے پانی بھیج دیا گیا۔ اور ایک خبر ہے کہ کسی انگریز سے بیاہ کرلیا۔ اور ایک خبر ہے کہ ہتھکڑیوں سمیت جیل سے فرار ہوگئیں۔ افواہوں کی کوئی حد نہیں!) اس بدامنی کے زمانے میں بھی بڑی شان و شوکت کی تقریب رہی۔ نواب قمرالزماں چودھری کی بیٹی کی شادی تھی کوئی مذاق تھوڑا ہی تھا دیدی۔ دیناج پور سے برات آئی۔ جو دراصل سب نیّر بھائی کے سُسرال والے ہی تھے۔ ایک سے ایک دقیانوسی زمیندار نرائن گنج میں اسٹیمر سے اترا۔ (پچھلے سال ہم لوگ اسی برسات کے زمانے میں نیّر بھائی کی بارات لے کر دیناج پور گئے تھے۔) خیر صاحب تو جب بارات ارجمند منزل کے دروازے پر آئی اور دولہا ہاتھی سے اترا تو ہم سب دھک سے رہ گئے۔ کالا بھجنگ۔ تمباکو کا پنڈا۔ منہ پان سے رچا ہوا۔ بس ٹپکل قصباتی زمیندار۔ نواب اجمل حسین نواب قمرالزماں کے ہم عمر ہیں بلکہ ایک آدھ برس نواب صاحب سے بڑے ہی لگتے ہیں۔ اور ان کے گھر کی عورتیں ٹھیٹھ قصباتی ان پڑھ بنگالنیں جن کے نزدیک ڈھاکہ بھی لندن سے زیادہ آزاد ہے۔ یا اللہ۔ یہ آپا کی سسرال ہے۔ اور یہ آپا کے شوہر ہیں۔ اللہ کی شان ہے۔

اب اللہ کی ایک اور شان کا قصہ بھی سنئے اور غور کیجئے کہ بڑی بوڑھیاں جو "قسمت کا کھیل"۔ "قسمت کا کھیل" رٹتی ہیں تو کچھ غلط نہیں کہتیں۔

رخصتی کے وقت رونو میاں بحیثیت مہمان آن موجود ہوئے! نکاح ہوچکا تھا۔ نیچے چھواروں کی لٹس مچی تھی۔ قہقہے لگ رہے تھے۔ میں نے فرید پور سے آئے ہوئے کسی نوجوان رشتے دار کی آواز سنی۔ "رونو بھائی۔ آپ بھی کھا لیجئے۔ جلدی سے دو کیلے ہو جائیں گے"۔ میں نے پلٹ کر دیکھا مگر

ہال میں اتنی بھیڑ تھی کہ کچھ پتہ نہ چلا۔ اتنے میں انجم میرے پاس بھاگی بھاگی آئی۔ اور کہنے لگی "غضب ہوگیا یاسمین۔ رونو بھائی آپہنچے۔ ان کو اب آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اُن کو ابا کے تار نہیں ملے؟ اور اگر مل گئے تو ان کا جواب کیوں نہ دیا۔ پہلے کیوں نہ آئے؟ اب کیوں آئے ہیں۔ زخموں پر نمک چھڑکنے؟" اتنے میں شور مچا۔ دولہا آرہا ہے۔ دولہا آرہا ہے۔

آپا جو بالکل بے جان سی ہوگئی تھیں۔ ان کو زینے سے اتار کر زنانہ دیوان خانے میں لایا گیا۔ اور مسند پر بٹھال دیا گیا۔ دولہا میاں مسکراتے ہوئے آئے۔ آرسی مصحف ہوا۔ ساری رسمیں ادا کی گئیں۔ ہم لوگوں کا (انجم، اختر آرا اور میرا) جی جوتا چُرانے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر مجبوراً چُرایا۔

اس وقت مجھے پہلی بار رونو میاں نظر آئے جو دیوان خانے کے دروازے میں کھڑے اطمینان سے نیّر بھائی سے باتیں کر رہے تھے۔

اب دیدی اللہ کی تیسری شان سنیئے ـــــ یہ رونوں میاں آپ کے مشہور و معروف ریحان الدین احمد ہیں۔ جن کو آپ بھی شاید جانتی ہوں۔ کمال ہوگیا۔ یہ آپا کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ ان کی منگنی آپا سے کیسی ٹوٹی ایک اور لمبا قصہ ہے جو مجھے انجم آرا نے بعد میں بتایا۔ اور اگر میں اس خط میں لکھوں تو خط بہت ہی طویل ہو جائے گا۔ زبانی بتاؤں گی۔ بہر حال تو دیوان خانے میں عورتوں کی وہ بھیڑ جمع تھی کہ دم گھٹا جا رہا تھا۔ اسی وقت میں نے آپا کے خاندان کی چند بڑھیوں کی کھُسر پُسر سُنی ـــــ فرید پور سے آئی ہوئی ایک بڑی بی بولیں۔ "اے ہے یہ تو اللہ بخشے فخرو بھائی کا نواسہ ہے"۔ دوسری نے کہا۔ "وہ تو رو پوش تھا میں نے سنا ہے"۔ تیسری بولیں۔ "نکل آیا جیل سے نگوڑا۔ یونہی خدائی خوار پھرتا ہے"۔ چوتھی نے فرمایا۔ "اے جنت مکانی ملیحہ کا پوت"۔ "ہاں۔ ہاں وہی۔ اچھا ہوا جہاں آرا سے بیاہ نہ ہوا۔ بے چاری کی قسمت پھوٹ جاتی۔ کیا خود کھاتا۔ کیا نواب کی بیٹی کو کھلاتا نگوڑا دہریہ کمیونسٹ"۔

اب رخصتی کا وقت آیا۔ نیّر بھائی نے پکارا۔ "کمرہ خالی کرو۔ بھیڑ کم کرو۔ دلہن کے بزرگ آرہے ہیں۔ بزرگ آرہے ہیں"۔ خیر بہت سارے بزرگ آئے۔ آپا کو دعائیں دینے (ہاں دیدی آپ کے بابا، پشی ماں اور تینوں بھائی بھی آئے تھے شادی میں) آپ کے بابا آپا کے لئے ایک بنارسی ساری لائے تھے۔ دوسرے بزرگوں کے ساتھ جب وہ آئے سر پر ہاتھ رکھنے تو وہ آپا کے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک منٹ کے لئے چُپ سے کھڑے رہے۔ نواب صاحب نے کہا۔ "بیٹی تمہارے ڈاکٹر چچا آئے ہیں۔ نواب صاحب دراصل رخصتی کے وقت دیوان خانے کے ایک گوشے میں گم سم کھڑے تھے۔ (میں نے کسی مرد کو روتے زندگی میں پہلی بار جبھی دیکھا۔ مگر سنا ہے کہ بیٹیوں کی شادی پر باپ لوگ روتے ہیں) جب دیدی آپ کے بابا آپا کے قریب آئے تو نواب صاحب اُن سے کہنے لگے۔ "بنوئے! ایک دن دیپالی بھی اسی طرح رخصت ہو جائے گی۔ تم بہت سمجھ بوجھ کر اسے وداع کرنا"۔ میں مسند کے پیچھے والے دریچے

میں چڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور یہ سارا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ پھر پادری بنرجی روزی کے پاپا آگے بڑھے۔ انھوں نے بھی آپا کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ اور "آئیڈیل وائف" قسم کے عنوان کی ایک مذہبی و اخلاقی پند و نصائح کی مجلد کتاب ربن سے بندھی ان کے پاس رکھ دی۔ پھر نواب صاحب سے کہا خدا باپ کا شکر ہے۔ آپ نے اپنی لڑکی اپنے ہاتھوں سے، عزت کے ساتھ اپنے گھر سے رخصت کی۔ خدا کا شکر ہے۔ اور سر جھکائے کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے باہر چلے گئے۔

وہ کوا گوہار مچی تھی کہ کیا بتاؤں۔ اور انجم بار بار جب موقع ملتا مجھ سے آکر کان میں کہہ جاتی۔ رونو بھائی کو نہ آنا چاہئے تھا۔ ایسی بے رحمی کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کہاں کی جدلیاتی مارکسیت ہے۔ کیا آدمی مارکسسٹ بن کر جذبات سے عاری ہو جاتا ہے؟

رونو میاں اُدما دیبی کے ساتھ آئے تھے۔ مہمانوں میں سر پری توش اور لیڈی رائے بھی شامل تھیں۔ مگر رونو میاں اُدما دیبی کے ساتھ بعد میں پہنچے۔ رخصتی کے وقت وہ دروازے میں کھڑے نیر بھائی سے باتیں کر رہے تھے۔ نیر بھائی نے کہا اخاہ۔ رونو بھائی یہ عید کا چاند کہاں سے نکلا۔ آپ سے تو آج چار سال چار برس بعد ملاقات ہوئی ہے۔ کہنے لگے۔ ہاں بھئی۔ ذرا ادھر خاصا مصروف رہا (یہ بھی کس قدر زبردست انڈر اسٹیٹمنٹ تھا!) میں ابھی پچھلے مہینے ڈھاکہ آیا تھا۔ تب تم لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکی۔

انجم تو اس موقع کی تاک میں تھی کہ ان سے چمٹا کر سکے۔ وہ بچپن سے ان کی کافی منہ چڑھی کزن ہے لپک کر آگے بڑھی اور بولی۔ "رونو بھائی آپ ڈھاکے سے کہاں گئے تھے۔ دلی؟" کہنے لگے۔ "نہیں بی بی میں دلی کے بجائے پارٹی کے ایک ضروری کام سے سیدھا لاہور چلا گیا تھا اور وہاں سے پشاور یہ پچھلا مہینہ پنجاب اور سرحد کے دورے میں گذرا۔ پشاور میں مجھے پارٹی ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے حکم پہنچا کہ فلاں کام کے لئے پھر فوراً ڈھاکے واپس جاؤ۔ تو دوبارہ سیدھا یہاں آرہا ہوں۔ آج صبح ہی پہنچا تو اُدما نے بتلایا کہ شام کو جہاں آرا کی شادی ہے ـــــ کیوں بھئی۔ اب تم کب شادی کر رہی ہو۔ کم از کم تم تو آگے پڑھ ڈالو۔ بے چاری جہاں آرا کو ماموں جان نے کالج سے نہ جانے کیوں اٹھا لیا تھا۔"

انجم مجھے بتا رہی تھی کہ جب وہ اس قدر سادگی سے یہ سب کہہ رہے تھے تو میرا جی چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روؤں اور پھر ان کو قتل کر ڈالوں۔ آپا ان کے دکھ میں رو رو کر زندہ درگور ہو گئیں۔ اور یہ ان کی شادی میں کس قدر مطمئن اور بے نیاز نظر آرہے تھے۔

ساتھ ہی اُدما کھڑی تھیں۔ دیوار سے لگی۔ اور عینک کے پیچھے سے آنکھیں چمکا چمکا کر رخصتی کا نظارہ ملاحظہ کر رہی تھیں۔

اب وداع کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ آپا کو گود میں اٹھا کر صدر دروازے تک لایا گیا۔ پھر رونا پیٹنا مچا۔ نیر بھائی آپا کو پالکی میں بٹھانے لگے۔ اس وقت رونو میاں بھی قریب کھڑے تھے۔ شمسہ خالہ بھی ایک

ہی خرانٹ ہیں۔ چمک کر بولیں۔" اے ہے رونو میاں۔ تم بھی تو بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے رخصت کرو۔"

اس وقت دیدی مجھے ایسا لگا جیسے سُرخ گٹھری بنی آپا سر سے پیر تک لرز کر رہ گئیں۔ چنانچہ رونو میاں نے آگے بڑھ کر ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے کہا ALL THE BEST بی بی۔ اور جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔ نواب صاحب قریب کھڑے تھے۔ وہ چہرہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ دراصل اس وقت وہ زار و قطار رو رہے تھے۔ اور اسی بھیڑ بھڑکے میں ایک بڑی بی دوسری بڑی بی سے بولیں۔" اے ہے۔ اسی طرح دکھیا ملیحہ کو بھائی کی حیثیت سے قمر میاں نے رخصت کیا تھا۔"

باہر بینڈ بج رہا تھا۔ ہاں ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی۔ میں انجم اور اختر اس کی شادی سے اس قدر ڈیپریسڈ تھے جن دنوں شادی کی تیاریاں کی جا رہی تھیں میں نے سوچا کہ دل خوش کرنے کے لئے کچھ تو کیا جائے۔ چنانچہ سروجنی دیبی کی وہ نظم "پالکی بردار" ہے نا۔ کالج کی چند لڑکیوں کے ساتھ مل کر میں نے اس کا بیلے بنایا اور اسے رخصتی سے کچھ دیر پہلے ارجمند منزل کے جلسہ گھر میں پیش کیا۔ آپا کی پالکی سامنے ہی رکھی تھی۔ اور دیناج پور پہنچ کر بھی آپا اسٹیمر گھاٹ سے بیس میل دور اپنی سسرال پالکی میں جائیں گی۔

ہمارا بیلے دیکھنے کے لئے سارے مہمان مرد عورتیں جلسہ گھر پر ٹوٹ پڑے۔ بہت سے اوپر جا کر روشن دانوں میں سے جھانکنے لگے۔ بے حد پسند کیا گیا۔ دیدی یہ گویا میری پہلی پبلک پیش کش تھی۔ ابا بہت خفا ہوتے مگر وہ خوش قسمتی سے جل پائے گوری گئے ہوئے تھے۔ آپ کو معلوم ہے نا ابا بڑے قدامت پسند پکے مولوی ہیں۔

بھیڑ بھڑکے میں رونو میاں بھی جلسہ گھر کی ایک دیوار سے لگے "پالکی بردار" دیکھ رہے تھے۔ اُدمارائے ان کے ساتھ کھڑی تھیں۔ وہ بڑے سوچ میں ڈوبے ہمارا رقص دیکھا کئے۔ جب بیلے ختم ہوا تو وہ بھیڑ چیرتے میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ بھئی تم تو کریوگرافی کی خوب صلاحیت رکھتی ہو۔ شاباش۔ کہاں سیکھ رہی ہو۔ میں نے جواب دیا۔ کہیں بھی نہیں۔ کہنے لگے مگر یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ تم کو باقاعدہ یہ فن سیکھنا چاہئے۔ میں نے کہا ابا کی اجازت نہیں۔ حالانکہ میں شانتی نکیتن جانا چاہتی تھی وہاں ہماری دیپالی دیدی بھی ہیں۔

'دیپالی' کے نام پر دیدی وہ مسکرانے لگے۔ بولے۔ اچھا۔ تمھاری دیپالی دیدی وہاں ہیں۔ بہت خوب۔ کوشش کر کے تم وہاں ضرور جاؤ۔ اور ان کے چہرے پر ایک دم آپ کا نام سنتے ہی روشنی سی آگئی۔ کیوں دیدی؟ کیا قصہ ہے؟ چھپی رستم؟

جس وقت رونو بھائی مجھ سے باتیں کر رہے تھے اُدمارائے عینک کے گول گول شیشوں کے

پیچھے سے کھڑی مجھے گھورے جا رہی تھیں۔ میں تو بھیّا فوراً وہاں سے کھسک گئی۔ ارے بھئی آپ ہی سوچئے رونو میاں سے مجھے مطلب؟

دیدی سروجنی دیبی کے "پالکی والوں کا گیت" کتنا دل دوز ہے۔ پالکی چلے ہو ہو ـــــ پالکی چلے ہو ہو ـــــ گیتوں کی تھاپ پر پھولوں سی جھومتی۔ ندیا کے جھاگ پر چڑیا سی ڈولتی ـــــ پالکی چلے ہو ہو ـــــ ہنس ہنس ہم گاتے چلیں، تیز تیز، جلدی جلدی، گیتوں کی شبنم میں تارا سی پالکی، بھاٹا کی موجوں پر کرنوں کی لہریں ـــــ یا دلہن کے آنسو ـــــ سہج سہج پالکی چلے ـــــ پالکی چلے۔" سچ دیدی اس گیت پر بہت ہی موثر بیلے بنا۔ خوب تالیں بجیں۔ اس کے بعد آپا کو پالکی میں بٹھا لا گیا۔ وہ بے چاری روتی بلکتی سسرال سدھاریں۔ جب ان کی پالکی ارجمند منزل کے پھاٹک سے باہر نکلی رونو میاں اس وقت لان پر ایک طرف کھڑے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایسوں کو تو بس پیسے پہ رکھ کے مارے۔

اچھا دیدی بائی بائی فقط

یاسمین مجید
سگن بگیچہ۔ ڈھاکہ
۲۱ / اکتوبر ۱۹۴۲ء

## ۳۲

# کمل اور اکمل

اکتوبر ۴۲ء۔ تیسرا پہر۔ ارجمند منزل کا پچھلا برآمدہ۔ جہاں آرا، روزی، یاسمین، انجم آرا اور اختر آرا بڑے تخت پر بیٹھی ہیں۔ جہاں آرا، روزی کے تین ماہ کے بچے کو گود میں لئے کھلا رہی ہے۔ روزی جہاں آرا کے ڈھائی ماہ کے بچے کی گاڑی پر جھکی "بے بی ٹاک" میں مشغول ہے۔ پھر وہ دونوں لڑکیوں کو مخاطب کر کے کہتی ہے۔ "کلکتے میں میں نے بسنت سے کہا۔ جہاں آرا کے بیٹے کا نام اس کے باپ اجمل حسین کے نام کے وزن پر اکمل رکھا گیا ہے۔ میں اپنے بیٹے کا نام اکمل کے وزن پر کمل رکھوں گی۔ بسنت ہنسنے لگے۔ بولے۔ سنسکرت میں کسی شبد کا مخالف شبد بنانا ہو تو اس کے شروع میں آ ا لگا دیتے ہیں۔ دیکھو کہیں تمہارا اکمل کمل کا مخالف نہ ہو جائے!"

جہاں آرا روزی کے بچے کو اس کے گدیلے پر لٹا کر کہتی ہے۔ "کیوں ماسٹر کمل! تم بڑے ہو کر میرے اکمل سے لڑو گے؟"

نیّر الزماں کا سوا سالہ لڑکا منور الزماں اپنے گڈولنے کو برآمدے میں ڈھکیلتا پھر رہا ہے۔ تینوں بچوں کی آیائیں گٹ بنائے سامنے تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھی پان چبا رہی ہیں، روزی سانیال اپنے شوہر، بچے اور آیا کے ہمراہ چند روز قبل کلکتے سے ڈھاکے آئی ہے۔

"روزی آپا اپنی مہم کا قصہ تو سنائیے۔ جب آپ کل لِلی کاٹج پہنچیں تو کیا ہوا؟" اختر آرا پوچھتی ہے۔

"کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں کمل کو لے کر لِلی کاٹج گئی تھی۔ ماما کو کلکتے سے خط لکھ دیا تھا کہ پاپا کے ڈر کے مارے سیدھی گھر نہیں آؤں گی۔ دوڈ لینڈز والے بسنت کے خاندانی دوست ہیں۔ نرملیندو رائے نے اصرار کیا تھا کہ ڈھاکے جاؤ تو ہمارے ہاں ہی اترنا۔ ڈھاکے پہنچ کر اسی شام دوڈ لینڈز سے میں لِلی کاٹج گئی۔ ماما بے چاری صبح سے راہ دیکھ رہی تھیں۔ سارا مشن کمپاؤنڈ پھاٹک پر جمع تھا۔ میں کمل کو لے کر لیڈی رائے کی کار سے اتری۔"

"بسنت بابو ساتھ گئے تھے؟" یاسمین مجید نے پوچھا۔

"نہیں۔ ماما تو روتی ہوئی آ کر لپٹ گئیں۔ بے چاری نے پھولوں سے سارا گھر سجایا تھا۔ دعوت کا انتظام کیا تھا۔ میں اندر گئی تو بولیں۔ تمھارے پاپا اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ چلی جاؤ کچھ نہیں کہیں گے۔ میں سہمی سہمی اندر گئی۔ پاپا کھڑکی میں کھڑے کچھ پڑھ رہے تھے۔ ماما نے کہا پال ——!

"وہ کچھ نہ بولے۔ معلوم تھا میں دہلیز پر کھڑی ہوں۔ ماما نے پھر کہا۔ پال! خدا باپ کے ناشکرے نہ بنو۔ ایک سال ہوا تمھاری لڑکی اس طوفانی رات موت کے منہ میں جانے کے لئے گھر سے نکلی تھی۔ خدا باپ نے اسے زندہ سلامت رکھا۔ اسے برکت دو۔ دیکھو اس کے ساتھ ایک ننھا فرشتہ تمھارے گھر مہمان آیا ہے۔ (گڈ اولڈ ماما ——! میں نے دل میں کہا) غرضیکہ پاپا شاید کیو CUE کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ذرا چہرہ سخت کر کے میری طرف مڑے۔ عینک ماتھے پر سرکائی۔ ذرا جھجک کر آگے بڑھے۔ اور میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ کمل اپنی غوں غاں کرنے لگا۔ پاپا بولے۔ خدا باپ لمبی عمر کرے۔ اور پُر تکلف لہجے میں مجھ سے پوچھا —— کیا نام رکھا ہے؟ کمل میں نے جواب دیا۔"

"بسنت بابو کے لئے کچھ نہ پوچھا؟" جہاں آرا نے دریافت کیا۔

"نہیں۔"

"چلو۔ خیر کچھ تو برف پگھلی۔" اختر آرا بولی۔

"بالکل پگھل گئی۔ کچھ دیر بعد پاپا نے کمل کو گود میں لیا۔ اس سے لاڈ پیار کرنے لگے۔ اس نے

کے ان کا سوٹ بھی خراب کر دیا۔ مگر پھر وہ اسے اپنے سے الگ ہی نہ کریں۔ جب میں چلنے لگی پوچھا کہاں جا رہی ہو؟ میں نے کہا میں وڈ لینڈز میں ٹھہری ہوں۔ کہنے لگے۔ کیوں؟ کیا یہ گھر تمھارا نہیں ہے؟ میں نے کہا۔ کل آجاؤں گی۔ چنانچہ دوسرے روز جو میں گئی تو وہ جیسے کمل کے انتظار میں باہر ہی ٹہل رہے تھے اسے دیکھ کر کھل اٹھے۔ ماما نے چپکے سے پوچھا۔ بسنت بابو کو نہ لیتی آئیں؟ میں نے جواب دیا۔ کل لاؤں گی آپ ذرا راستہ ہموار کر رکھئے۔"

"پھر لے کر گئیں بسنت بابو کو؟" یاسمین مجید نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ کل تو نہیں جا سکی۔ پرسوں نرسوں کسی روز لے جاؤں گی۔"

"اتنی دیر کیوں لگا رہی ہو روزی آپا؟ میں تمھاری جگہ ہوں تو فوراً لے جاؤں۔" یاسمین نے اپنی سابق استانی سے کہا۔

روزی چپ ہو گئی۔ اتنے میں ماسٹر اکمل حسین مرشد زادہ نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ پانچوں لڑکیاں اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ جہاں آرا نے روزی سے کہا۔ "بسنت بابو کو آج ہی بلی کانچ لے جاؤ روزی ——"

کل شام تو ہم لوگ سر پری توش سے باتوں میں لگ گئے تھے۔ میرے سسر بسنت کو دلی بھیجنے کی فکر میں ہیں کہ وہ وہاں رہ کر قانون کی پریکٹس شروع کریں۔ نئی دلی میں ان کی کوٹھی بھی ہے۔ اس کے کرائے دار کے جانے کا انتظار ہے۔ اسی سلسلے میں ضروری باتیں ہونے لگیں۔ اور آج شام کو سر پری توش اور لیڈی رائے نے ہم دونوں کے اعزاز میں ڈنر کیا ہے۔ اس لئے آج بھی نہ جا سکیں گے۔"

"سر پری توش اور ان کے ڈنر کی وجہ سے روزی تم اپنے ماں باپ کے گھر نہیں گئیں۔" جہاں آرا نے کہا۔

"جہاں آرا ——" روزی نے آہستہ سے ذرا کوفت کے ساتھ جواب دیا۔ "میں بسنت کو وہ پھیٹچر بلی کانچ دکھلانا نہیں چاہتی۔"

جہاں آرا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا ——" روزی۔ تم کو اب اپنے گھر سے شرم آتی ہے اپنے والدین کو اپنے POSH شوہر سے ملاتے بھی شرم آتی ہے۔ تم جھینپتی ہو کہ پادری بنرجی کی لڑکی ہو۔"

اسی وقت بیگم قمر الزماں اپنے کمرے سے نکلیں۔ ڈھاکے کی سرخ پاڑ والی سفید ساری بنگالی طرز سے باندھے۔ بے حد نازک اندام آکر تخت کے کنارے پر ٹک گئیں۔ کمل کو گود میں لے کر قریب آئی مالا کو ابرو سے اشارہ کیا۔ وہ اندر سے صندوقچہ نکال کر لائی۔ بیگم صاحبہ نے صندوقچہ کھول کر دو سو ایک روپے کے نوٹ نکالے اور کمل کے گدیلے کے نیچے چپکے سے سرکا دیئے۔

"اور سناؤ روزی۔ ماں باپ سے صلح صفائی ہو گئی؟" انھوں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔"

"اچھا ہوا۔ اللہ مبارک کرے۔" لڑکیوں سے چند منٹ باتیں کرنے کے بعد بیگم قمرالزماں اندر واپس چلی گئیں۔

روزی نے قیمتی جارجٹ کی ساری پہن رکھی تھی اور نونگے کا پورا سیٹ۔ مالا نزدیک آکر بڑے اشتیاق سے اس کے گہنے چھو چھو کر دیکھنے لگی۔ ارجمند منزل کی خواصوں کے لئے بے چارے غریب پادری صاحب کی بیٹیا کی بڑے گھرانے میں شادی نہایت اہم واقعہ تھی۔ خواصوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ پادری صاحب سے شادی سے پہلے روزی کی ماں گری بالا ارجمند منزل میں ماما گیری کر چکی تھیں۔ ان سب کو وہ قصہ معلوم تھا۔ کس طرح ایک غریب برہمن بال ودھوا سسرال والوں کے مظالم سے بچنے کے لئے فریدپور کے ایک گاؤں سے بھاگ کر اپنے زمیندار آقا نواب قمرالزماں چودھری کی پناہ میں ارجمند منزل پہنچی تھی۔ یہاں برتن مانجھنے کے کام پر لگادی گئی تھی۔ کس طرح نواب صاحب نے اسے اپنے نوعمر بیٹوں کی عنایات سے بچانے کے لئے انگریز لاٹ پادری کی میم کے حوالے کر دیا تھا۔ جس نے اسے عیسائی کر کے اس کی شادی نوجوان کالے پادری بنرجی سے کر دی تھی ـــــ روزی کو بھی ماضی کی ان تلخ حقائق کا شدت سے احساس تھا۔

ملازمہ مالا مصاحب خاص کی حیثیت رکھتی تھی اور صاحبزادیوں کی گپ شپ میں حصہ لیتی تھی۔ اس نے روزی سے پوچھا۔ "یہ سب سسرال سے ملا ہے بی بی؟"

"ہاں۔ مالا۔"

"کیا کیا ملا؟"

"ایک سیٹ ہیرے کا۔ سات جڑاؤ اور سادے۔ یہ والا سیٹ ہماری شادی کی پہلی سالگرہ پر کمل کے ڈیڈی نے دیا ہے۔"

"اللہ مبارک کرے۔"

مسز ایستھر گری بالا بنرجی نے اپنے گلے کی باریک طلائی زنجیر جس میں ننھی سی صلیب آویزاں تھی اور کانوں کے مختصر سے پھول اور چار باریک چوڑیاں اتار کر اس کے لئے رکھ لی تھیں جب لدھیانہ مشن کے مسٹر لوتھر بسواس سے اس کا رشتہ طے ہوا تھا۔ اور پچھلے سال جب روزی نے کلکتے سے ان کو اپنی شادی کی اطلاع بھیجی تو مسز بنرجی نے گھر کے خرچ میں سے تھوڑے تھوڑے پیسے بچا کر، اپنے بنائے ہوئے اچار مربے، میز پوش اور سوئیٹر بیچ بیچ کر روپیہ جمع کیا۔ اور ساری عمر کی گرہستی میں جو چند سو روپے انھوں نے پس انداز کئے تھے ان کو اس رقم میں ملا کر ڈھاکہ کا مخصوص کھوکھلے سونے کا ایک سیٹ خرید پائیں۔ اور تین ریشمی ساریاں۔ ان کی اپنی شادی میں ان کے انگریز مربی رایٹ

ریورنڈ والفرڈ براؤن اور مسز براؤن نے چاندی کا ٹی سیٹ دیا تھا۔ انھوں نے اسے بھی روزی کے لئے محفوظ رکھا ہوا تھا۔ یہ سب چیزیں جب روزی پہلے روز ملی کاٹج گئی تو انھوں نے ایک سوٹ کیس میں رکھ کر اسے دیں۔ روزی سانیال نے آج ارجمند منزل میں اپنی بلند مرتبت سہیلیوں سے اور مالا سے اس کم مایہ جہیز کا ذکر نہ کیا۔)

ارجمند منزل کی ایک باندی چار کی کشتی لے کر حاضر ہوئی۔ جہاں آرا نے اکمل کو اختر آرا کی گود میں دیا اور چار بنانے میں مصروف ہو گئی۔

نواب قمر الزماں چودھری باہر تشریف لائے۔ پانچوں لڑکیاں تعظیماً کھڑی ہو گئیں۔ انھوں نے روزی سے بات کی۔ اس کے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کیا نام رکھا ہے؟"

"کمل کمار سانیال"۔

"اکمل کے وزن پر"۔ اختر آرا نے خوشی سے کہا۔ اور بسنت کمار سانیال کی کہی ہوئی بات دہرائی کہ کسی لفظ میں آ کی اضافت اس لفظ کا الٹ ظاہر کرتی ہے۔

"کیوں بے؟ میرے اکمل سے لڑے گا؟ کان کھینچوں گا"۔ نواب صاحب نے خوش دلی سے کہا۔

"جی نہیں نواب صاحب ــــ!" روزی نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "اکمل کمل کا مخالف ہے تو وہ اس سے ــــ میرے کمل سے لڑے گا"۔

"دونوں کے کان کھینچوں گا۔ بدمعاش کہیں کے ــــ!" پھر نواب صاحب ٹہلتے ہوئے برآمدے سے نیچے اتر گئے۔ اور پائیں باغ کی روشوں پر چہل قدمی کرنے لگے۔ کچھ دیر قبل نیر الزماں کی دلہن ایک سو ایک کے نوٹ کمل کے گدیلے کے نیچے سرکا گئیں تھیں۔ جہاں آرا نے چاندی کے ننھے منے برتنوں، نقرئی جھنجھنوں، بیش قیمت انگریزی کھلونوں اور کپڑوں سے بھرا سوٹ کیس مع ایک سو ایک روپے کے دیا تھا۔ سوٹ کیس تخت کے نزدیک رکھا تھا۔

"پوتڑوں کا رئیس!" روزی نے چارپائی پر بیٹھے ہوئے شگفتگی سے کہا۔ "دیکھو ہر طرف سو سو کے نوٹ بکھرے پڑے ہیں"۔

روزی کے اس جملے سے تینوں نواب زادیاں اور یاسمین جھینپ گئیں۔ روزی بہ طور مسز سانیال اپنی نئی دولت مند حیثیت سے بے حد مسرور تھی۔ یاسمین کو بہت مایوسی ہوئی۔ شاید روزی آپا تھوڑی سی بد دماغ بھی ہو گئی ہیں۔ وہی روزی جو آج سے صرف سال بھر قبل سر پر کفن باندھ کر میدان کارزار میں کود پڑی تھی۔ پولیس کی لاٹھیاں کھائی تھیں۔ جیل میں معافی مانگنے سے انکار کیا تھا۔ دولت، مرتبہ

ور آسائش انسان کی اتنی جلدی کایا پلٹ دیتے ہیں ؟ اب یہ کس مربیانہ انداز میں مجھ سے باتیں کر رہی ہیں کیونکہ میں محض ایک غریب مولوی کی لڑکی ہوں۔ یہ بھی بھول گئیں کہ سال بھر قبل تک پندرہ روپے ماہوار پر مجھے ٹیوشن دیتی رہی ہیں۔ یاسمین نے سوچا۔

عین اسی لمحے روزی نے اسے مخاطب کیا۔ "ارے یاسمین اب تم بھی جھٹ پٹ شادی کر ڈالو۔ دیپالی کو بھی چاہئے بیاہ کرلے۔ اور نکلے اپنے اس ڈیپرسنگ چندر کنج سے۔"

"وہ دیپالی دیدی کا گھر ہے روزی آپا۔ اور وہ ان کے لئے شاید بالکل ڈیپرسنگ نہیں ہے۔" یاسمین نے نرمی سے جواب دیا۔

"نون سنس۔ شادی سے پہلے ماں باپ کا گھر لڑکی کے لئے قید خانہ ہوتا ہے۔ آزادی تو شادی کے بعد ملتی ہے۔ خود مختاری کی زندگی۔ کیوں جہاں آرا؟"

جہاں آرا مسکرا کر خاموش رہی۔

روزی نمائش پسند، چھچھوری اور بد دماغ ہونے کے علاوہ ذرا سی بیوقوف بھی ہو گئی ہے۔ جہاں آرا نے افسوس کے ساتھ سوچا ــــ اور اسے ایک نہایت کمینہ خیال آیا ــــ آخر ہے تو ہماری پرانی کرانی کی اولاد ــــ دوسرے لمحے اسے اپنے اس خیال پر ندامت ہوئی۔ اس نے جلدی سے کہا ــــ

"ارے دیپالی کا بیاہ ہوگا تو دیکھنا میں کیسی دھوم دھام کروں گی۔ اس کے بابا تو کچھ کرنے سے رہے۔ سادھو آدمی ٹھہرے۔ میں دو مہینے پہلے سے دیناج پور سے آجاؤں گی۔ سارا انتظام خود کروں گی۔ مگر وہ روزی کی طرح چھپ کر کسی سے بیاہ نہ کرلے ــــ سول میرج ــــ"

"آپا تم اپنے ہاتھی بھی لیتی آنا۔ دیناج پور سے۔" انجم آرا نے لقمہ دیا۔

"ضرور۔ ہاتھی گھوڑے پالکی سب لاؤں گی۔ مگر دیپالی کوئی مرغا ڈھونڈے تو سہی جیسے روزی نے ڈھونڈ لیا۔"

"دیپالی ہے کہاں ؟ تم سسرال سے آئی ہوئی ہو۔ کیا تم سے ملنے اسے نہیں آنا چاہئے تھا؟" روزی نے ذرا بلندی سے ترش لہجے میں کہا۔

"آپا کے ڈھاکہ آنے سے پہلے ہی دیپالی دی ریڈیو پروگرام کے لئے دلّی بلائی گئیں۔ آج کل یہ خبر گرم ہے کہ اُدمارائے ڈاکٹر سرکار سے بیاہ کرنے والی ہیں۔ شاید دیپالی دی کو یہ بات پسند نہ ہو۔ ذرا سی وجہ سے وہ زیادہ سے زیادہ گھر سے دور رہتی ہوں۔" اختر آرا نے کہا۔

"ڈاکٹر سرکار سے ــــ ؟ اُدمارائے ــــ ؟ میں نے تو وڈلینڈز میں کوئی تذکرہ نہیں سنا۔" روزی نے حیرت سے کہا۔

"کیوں ــــ ؟ اُدمارائے جیسی ہیں ویسی ہیں۔ ڈاکٹر سرکار نے انھیں قبول کرلیا تو اُدمادیبی کی

خوش قسمتی ہوگی۔ مگر دنیا یہی سمجھے گی کہ ڈاکٹر سرکار نے اُدما رائے کی دولت سے شادی کی ہے"۔ جہا
آرا نے جواب دیا۔

انجم آرا اٹھ کر اندر گئی اور ایک قیمتی ولایتی کھلونا لا کر کمل کے قریب رکھ دیا۔

" ہائے تم لوگوں نے کتنی پیاری پیاری چیزیں کمل کو دی ہیں"۔ روزی نے تینوں نوابزادیو
کو مخاطب کیا۔

" ڈونٹ بی سلی"۔ جہاں آرا بولی۔

تخت کے کنارے بیٹھی ہوئی یاسمین نے سوچا۔ میرا تحفہ ان سب تحائف کے مقابلے میں حقی
اور کم قیمت ہے۔ مگر میں نے کتنے پیار سے بچے کے یہ دو فراک سی کر انھیں دیئے ہیں۔ انھوں نے میر
پریذنٹ کا ذکر تک نہیں کیا۔ اب وہ دوستی کو تحائف کی قیمت سے ماپا کریں گی؟"

" لیڈی ارچنا رائے نے تو بس ایک چیک دے دیا ہے"۔ روزی بے پروائی کے لہجے میں کہہ
رہی تھی"۔ کہ کمل کے نام جمع کروالوں۔ ویسے تو اس کے ٹھاکر دادا نے اس کے پیدا ہوتے ہی بنک میں
اس کا اکاؤنٹ کھول دیا ہے"۔

بے چاری روزی نئی نئی دولت پاکر بوکھلا گئی ہے۔ چاروں لڑکیوں نے سوچا۔

برآمدے سے موٹر آن لگی۔ اور نواب اجمل حسین مرشد زادہ چوڑی دار پائجامہ، سیاہ شیروانی
ترکی ٹوپی نیچے اترے۔ برآمدے میں آکر وہ تخت کے قریب ذرا سا ٹھٹھکے۔ جہاں آرا نے روزی سے ان
کا تعارف کرایا۔ انھوں نے ذرا گھبرا کر" آداب عرض۔ آداب عرض۔ مزاج شریف ــــ؟" کہا اور زینے
کی سمت چلے گئے۔

یہ پان چباتے، بھدے، حبشی نما، بدہیئت، میٹرک فیل جاگیردار جہاں آرا کے خدائے مجازی
روزی سوچ رہی تھی۔ اسرارِ خداوندی! میں جہاں آرا کو کتنا خوش قسمت سمجھا کرتی تھی اور خود کو کتنی
بدنصیب۔ مجھے بسنت کمار سانیال جیسا دل کش اور اسمارٹ شوہر ملا۔ جہاں آرا بے چاری کی تقدیر میں
نواب اجمل حسین لکھے تھے۔ اسرار ربانی!

نواب قمرالزماں پائیں باغ میں ہوا خوری کرکے برآمدے کی طرف آرہے تھے۔

" ارے بھئی بیگم ــــ ذرا یہاں آیئے گا۔ میری سفید شیروانی کہاں ہے"۔ اوپر زینے پر آکر
نواب اجمل حسین نے آواز دی۔

" جی ابھی آئی"۔

" اور تازہ پان ــــ"

" جی۔ آتی ہوں ــــ" جہاں آرا نے فوراً کمل کو تخت پر لٹایا۔ اور چپل پیروں میں ڈال کر

سُرعت زینے کی طرف بھاگی۔

نواب قمرالزماں اس وقت برآمدے میں پہنچ کر گیلری کی جانب جا رہے تھے۔ انھوں نے کرب کے ساتھ جہاں آرا پر نظر ڈالی۔ بے زبان ملیحہ چودھری کی بے زبان بھتیجی۔ اسی کی طرح پتی ورتا! ملیحہ کی شادی ایک غریب کسان مولوی کے ساتھ کر دی گئی تھی۔ وہ اس سے نباہ لے گئی۔ لیکن یہ کالج کی تعلیم یافتہ لڑکی بھی اس زبردستی کے بے تکے رشتے کو کس سلیقے سے نباہ رہی ہے۔ مَیں تجھ سے شرمندہ ہوں بچّی! اور اپنی مجبوریوں سے شرمندہ ہوں۔ میں تو ساری عمر ملیحہ سے بھی نادم رہا تھا۔ مگر میری ندامت سے ملیحہ کے لئے کیا فرق پڑا؟ میری شرمندگی یا پشیمانی سے تیرے لئے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تو مرتے دم تک اپنے اس نامعقول خدائے مجازی کی اسی طرح خدمت کرتی رہے گی۔ میری بچّی — میری بے چاری بچّی — کاش — کاش میں نے ریحان سے تیرا بیاہ کر دیا ہوتا — شاید میں ملیحہ کی روح کے سامنے بھی سرخرو ہو سکتا — کاش — کاش۔ وہ آہستہ آہستہ گیلری میں سے گذرتے ہوئے جائے پناہ — اپنے کتب خانے کی طرف چلے گئے۔

ڈوڈ لینڈز سے مسٹر بسنت کمار سانیال کا فون آیا۔ "تھوڑی دیر میں مسز سانیال کے لئے کار بھیج دی جائے گی"۔ نیّر الزماں نے برآمدے میں آکر روزی سے کہا۔

روزی کی آیا تالاب کی منڈیر سے اٹھ کر آئی۔ اور کمل کا سامان اور تحائف پیک کرنے میں مصروف ہو گئی۔ کمل اور اکمل دونوں برابر گدیلوں پر پڑے بے خبر سو رہے تھے۔ ڈھائی تین ماہ کی دو مختصر، کمزور، نازک ننھی منّی سی جانیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ تالاب کا پانی گلنار ہو گیا۔ گلاب خاص کے نیچے رکھے "وکرم آدتیہ کے سنگھاسن" کی رنگین مورتیاں کرنوں میں جھلملا اٹھیں۔

جھٹ پٹے کا وقت کمروں کے اندر بہت ڈیپریسنگ ہو سکتا ہے۔ نواب قمرالزماں گھبرا کر اپنے کتب خانے سے پہلو کے باغ میں اُتر گئے اور ٹہلتے ہوئے تالاب کے کنارے آکر "راج سنگھاسن" پر ٹک گئے۔

برآمدے میں تخت پر لیٹے دونوں بچّے سوتے میں کنمنائے۔

سنا ہے جب ننھے بچّے کوئی پیارا سا خواب دیکھتے ہیں تو کنمناتے ہیں۔ یاسمین نے مسکرا کر بچّوں پر نظر ڈالی۔ اسی لمحے اس نے دل ہی دل میں روزی کے نئے کمینے پن اور نو دولتے پن کو معاف کر دیا۔ اور اپنی فطری نیک دلی سے اسے مخاطب کیا۔ "روزی آپا۔! آپ نے یہ نام خوب سوچا۔ کمل بروزن اکمل —! اور دونوں ایک مہینے — ایک سن کی پیدائش —! دو نئے ہندوستانی!"

"انسان — جدید ترین موڈل —" روزی نے کہا۔

دونوں لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"روزی آپا ـــــ سروجنی دیبی کی ایک نظم ہے ـــــ" فن کار یاسمین کمل اور اکمل کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بولی ـــــ

"سو جاؤ میرے بچّو ـــــ
صبح تک کے لئے محفوظ و مامون۔
سوتے رہو۔
کہ ہمارا رت جگا بہت طویل ہے۔
جتنی دیر تم سوؤ۔ ہم کھیتی بوئیں گے۔
ہم آرزوؤں، اور رنجوں اور آنسوؤں سے بھرپور سپنے بوتے ہیں۔
تاکہ جب تم جاگو تو ان کی فصل کاٹ سکو۔
بچّو ـــــ
صبح ہوتی ہے۔ رات گذر گئی۔
ہماری مشقت ختم ہوئی ـــــ ہماری کھیتیاں لہلہا رہی ہیں
ہمارے ہاتھ کمزور تھے۔
لیکن اندھیارے میں ہم نے تمھاری آنے والی شان و شوکت کے خواب دیکھے۔
تمھارے بیجوں کو اپنے آنسوؤں سے سینچا ـــــ ہمارا رت جگا ختم ہوا۔
جاگو بچّو
ہم نے سپنوں کی جو فصل تمھارے لئے بوئی ہے
اس کے صلے میں
ہماری محنتوں کے ثمر کو
تم توصیف سے یاد کرو گے۔
یا دکھ سے؟
ہمیں ملزم ٹھہراؤ گے۔ یا ہمیں معاف کر دو گے؟"

یاسمین مجید نے سر اٹھایا۔ نواب قمر الزماں برآمدے میں آچکے تھے اور تخت کے قریب کھڑے غور سے سن رہے تھے۔ انھوں نے یاسمین کے سر پر ہاتھ رکھا اور چُپ چاپ واپس اندر چلے گئے۔

پائیں باغ کے درخت شام کی سنہری ہوا میں لوریاں گنگنا رہے تھے۔

کمل اور اکمل بے خبر سویا کئے۔

---

## (۳۳)

# برڈز آف پیراڈائز

"اگر تمھارا وہ خط مجھے صرف ایک دن پہلے مل گیا ہوتا تو شاید ہم لوگ آج یہاں نہ ہوتے۔" دیپالی نے کہا۔

ہسپانوی لباس پہنے مسٹریس سرسوتی نے کیلے کے جھنڈ میں سے نکل کر قہوے کی کشتی میز پر رکھی۔ ایک برڈ آف پیراڈائز رین ٹری کی شاخوں سے اتر کر نیچے آئی اور گھاس پر چلنے لگی۔ یاسمین اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ پہاڑی کے نیچے اسپنش کولونیل وضع کے بنگلے میں سے کلیپسو میوزک کی آواز آنے لگی۔ "شونو کی گرل فرینڈ سان فرینڈو سے آئی ہوئی ہے۔" دیپالی نے کہا۔ پانی کی ایک بوند ٹپ سے میز پر آن گری۔ یاسمین نے اوپر دیکھا۔ بادل کریبین پر سے سرکتے ٹیلے کی سمت آرہے تھے۔ چوڑے پتوں اور موٹے تنے والے رین ٹری کے جھرمٹ میں شفاف نالہ بہہ رہا تھا۔ سر پر سرخ بندکیوں والا بندانا باندھے اسکرٹ میں ملبوس ایک ایسٹ انڈین عورت نالے کے کنارے کپڑے دھو رہی تھی۔ سامنے ایک درخت پر بنے ٹری ٹاپ ہاؤس پر بورڈ لگا تھا ــــ ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار۔ پلانٹیشن میڈیکل آفیسر۔ ڈسپنسری۔ اس درخت کے نیچے بھی پرند فردوس اڑتے پھر رہے تھے۔ چند مریض جمع تھے۔ چینی۔ ایسٹ انڈین نیگرو۔ اپنی اپنی جنتوں سے نکالے ہوئے انسان۔ آدمی کی عادت ہے اسے اس کی جنت سے نکالو تو وہ اپنے لئے بُری بھلی ایک اور جنت بنالیتا ہے۔

"دیدی۔ کیا ہوا تھا ــــ؟" یاسمین نے کمزور آواز میں پوچھا۔

"ماسٹر کا فون ــــ" مسٹریس سرسوتی نے بنگلے کے برآمدے سے آواز دی۔ دیپالی نے کہا۔ "ابھی آئی۔" اور اٹھ کر بنگلے کی سمت چلی گئی۔ مسٹر سرسوتی باہر آکر کرسی پر بیٹھیں۔ اور بولیں۔ "ہمارا میم صاحب کہت ہے تم ڈانسر ہے۔ پاکستان سے آیا ہے۔" "ہاں مسٹریس سرسوتی۔ ہم تمھارا میم صاحب کو بہت زمانے سے جانتا ہے۔" یاسمین نے بنگلہ اردو میں جواب دیا۔ "ہم اور دیپالی میم صاحب ایک ہی کنٹری کا رہنے والا ہے ــــ مطلب ــــ پہلے ایک ہی کنٹری تھا۔"

"تم سینما میں بھی ناچتا ہے۔؟ جیسے مس ککو۔" مسٹریس سرسوتی نے کھڑے ہو کر دو تین چک

پھیریاں لیں۔ یاسمین کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

سُرخ بندانا والی عورت اسکرٹ گھاتی کپڑوں کی ٹوکری کمر پر رکھے نالے کی طرف سے آئی۔ گارڈن امبریلا کے قریب پہنچ کر اس نے ٹوکری گھاس پر رکھی۔ اور مسٹریس سرسوتی کے ساتھ ناچنے لگی۔ اب وہ دونوں ہسپانوی رقص کر رہی تھیں۔ سمرسٹ ماہم کے کسی قبل از جنگ استوائی سیٹنگ کے ناول کا سین۔ یاسمین نے آنکھیں ملیں۔

سُرخ بندانا والی عورت نے گلے میں پنجتن پاک کا بڑا سا تعویز پہن رکھا تھا۔ وہ مسٹریس سرسوتی سے زیادہ خوبصورتی سے ناچ رہی تھی۔ دیپالی بنگلے سے واپس آئی۔ کرسی پر بیٹھ کر چار بنانے لگی۔

کتنی بے فکری کی زندگی ہے یہاں یاسمین نے سوچا۔ "یہ لڑکی بہت اچھی ڈانسر ہو سکتی ہے۔ کون ہے؟" یاسمین نے پوچھا۔

"مسٹریس خیرالنساء؟ بابا کے کمپاؤنڈر شرافت علی کی بیوی۔" دیپالی نے جواب دیا۔

مسٹریس خیرالنساء نے عقیدت سے پوچھا۔ "آپ پاکستان سے آیا ہے؟"

"ہاں۔" یاسمین نے جواب دیا۔

"آپ نے نورجہاں کو دیکھا ہے؟"

"کون نورجہاں؟"

"میرے لئے جہان میں چین ہے نہ کرار ہے۔" مسٹریس خیرالنساء نے گا کر جواب دیا۔ "خاندان مُووی والا۔ ہم نے سب موویز دیکھی ہیں۔ کنگن، بندھن۔ گاجی صلاح الدین، سکندر، جندگی ہے پیار سے پیار میں بتائے جا۔ عشک کے حجور میں اپنا سر جھکائے جا ــــ"

"مگر یہ تو بہت پرانی فلمیں ہیں۔" یاسمین نے کہا۔

"بس وہی یہاں چلتا ہے۔ اور دو نئی فلم دیکھا۔ انداج اور برسات" ــــ مسٹریس سرسوتی نے جواب دیا۔

"ہم لوگ مس صاحب یہ مُوویز دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ ہمیں پتہ چلتا ہے ہمارا اولڈ کنٹری ایسا ہی ہوگا ــــ" مسٹریس خیرالنساء نے اداس آواز میں کہا۔

دیپالی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"فرگٹ اِٹ دیدی۔" یاسمین نے کہا۔

"تم بہت خوش ہو۔ تم دنیا کے TOP پر ہو۔ ورلڈ ٹور پر نکلی ہو۔ اپنے ملک کی مشہور ڈانسر۔ اور ڈھاکہ اب بھی تمہارا وطن ہے ــــ" دیپالی نے ذرا ترشی سے جواب دیا۔

"سوری دیپالی دی"۔ یاسمین نے کہا۔ واقعی میں بہت مسرور ہوں۔ ساری دنیا اب میرے قدموں میں ہے۔ کامیاب کریر۔ اَن گنت مدّاح۔ گلیمر۔ پبلسٹی۔ شہرت۔ ان بے چاری دیپالی دیدی کو کیا ملا۔؟ اور جہاں آرا آپا کو ــــ؟ محض مایوسی ــــ لیکن مجھے روزی سانیال کی طرح اپنی کامیابی پر مغرور نہیں ہونا چاہئے۔" گو میں نے اپنی کامیابی کی بھاری قیمت ادا کی۔ اپنے ابّا کو ڈیفائی کیا ــــ مگر آرٹسٹ کی لگن ــــ" اس نے باآواز بلند اضافہ کیا۔

"بَوش ــــ" دیپالی بولی پھر اچانک چپ ہو گئی۔

شاید یہ مجھ سے جلنے لگی ہیں۔ انھیں اب کون جانتا ہے۔ مجھے ساری دنیا جاننے لگی ہے۔ جیرلڈ کہتا ہے اگر کوشش کی جائے تو میں اپنے "موڈرن اور نٹیل بیلے" کا نیویارک میں باقاعدہ اسٹوڈیو قایم کر سکتی ہوں۔ مگر ابھی یہ بات ان کو نہیں بتاؤں گی اور جل جائیں گی۔ کیا پتہ لاشعوری طور پر متعصب بھی ہوں۔ بہرحال ایسٹ پاکستان سے ان کو نکلنا ہی پڑا ــــ نہیں ــــ پرانی مارکسسٹ ہیں۔ متعصب تو شاید نہیں ہیں۔ اتنی پرانی دوست ہیں۔ اگر ان کو یہ بتا دوں کہ ہینڈسم، مشہور انگریز فیشن ڈیزائنر جیرلڈ بلمونٹ سے شادی کرنے والی ہوں تو شاید اور حسد کریں نہیں بتاؤں گی۔ نظر لگ جائے گی۔ پری زاد جیرلڈ ایک طرف ــــ بے مثال یونانی مجسمہ۔ اور ایک طرف ان بے چاری کے موٹے کالے للت موہن سین۔ وہ تو جہاں آرا آپا کے میاں سے بھی گئے گذرے ہیں۔

سرسوتی اور خیرالنسار گھاس پر بیٹھی ایک اجنبی زبان میں گفتگو کر رہی تھیں۔ شونو نے بنگلے کے برآمدے میں آکر آواز دی ــــ "دیدی ــــ آپ کا فون ــــ" دیپالی پھر اٹھی اور عمارت کی طرف چلی گئی۔

سرسوتی نے آہستہ سے پوچھا۔ "مس صاحب ہمارا میم صاحب رو کیوں رہا تھا؟ ہم نے دیکھا ہے۔ وہ کبھی کبھی ایسے ہی بیٹھے بٹھائے رونے لگتا ہے"۔

"معلوم نہیں۔ مسٹریس سرسوتی۔ شاید۔ شاید ان کو اپنا کنٹری یاد آتا ہے ــــ اور ــــ اور"۔

"اور کون ــــ؟"

یاسمین نے جلدی سے بات بنائی ــــ "وہ ــــ مسٹریس سرسوتی ادھر ڈھاکہ میں دیدی کا ایک فرینڈ تھا۔ جہاں آرا بیگم ــــ"

"جہاں آرا بیگم ــــ!" مسٹریس خیرالنسار نے خوشی سے دہرایا۔ "بادشاہ کا بیٹی؟"

"نہیں۔ ایک معمولی سے نواب کا بیٹی ــــ"

"پھر کیا ہوا ــــ کیا ہوا ــــ؟" دونوں عورتوں نے بے صبری سے پوچھا۔

"جہاں آرا بیگم کا لو اسٹوری بہت ٹریجک تھا۔ اُسی کو یاد کر کے تمہارا میم صاحب دُکھی ہو جاتا ہوگا ــــ"

"کیا ہوا ؟ ــــ کیا ہوا ؟ ــــ عاشکی معشوکی ــــ ؟" سرسوتی نے پوچھا۔

خیرالنسار نے سوال کیا۔ "عشک مجاجی تھا یا عشک جکیکی ــــ ؟ ہیرو کون تھا ــــ ؟"

یہ عورتیں بے حد سینما دیکھتی تھیں۔

"خیرالنسار شاید عشک مجاجی اور جکیکی دونوں تھا۔ جہاں آرا آپا اپنے کزن کو لو کرتا تھا۔ وہ اُس کو۔"

"سمجھ گیا۔" مسٹریس سرسوتی نے طمانیت سے کہا۔

"پھر اُن کا کزن اُن کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

"کیوں ــــ ؟ چچ چچ۔ ہائے ہائے۔ ہائے رے۔"

"آئیڈیالوجی کی خاطر ــــ"

"آئیڈیالوجی ــــ کیا ــــ ؟" خیرالنسار نے دریافت کیا۔

"مطلب ــــ مطلب ــــ ایسا کہ ــــ غریب امیر سب برابر ہونا چاہئے۔ ہیرو امیر لوگ کو HATE کرتا تھا ــــ ہیروئن بہت امیر تھا ــــ اُس زمانے میں خیرالنسار لڑکا لڑکی آئیڈیالوجی کی خاطر ایک دوسرے کو چھوڑ دیتا تھا ــــ"

"تب تو وہ پاگل لوگ تھا۔" سرسوتی نے کہا۔

"ہاں۔ ایک دم پاگل۔ اور اگر سوچو تو ــــ تو ہم بھی پاگل ہے۔ ہم نے آئیڈیالوجی کی خاطر ڈانس سیکھا۔ کہ ہمارا دیش میں کلچر خوب پھلے پھولے۔ ہم نے اس کے لئے بہت محنت کیا۔ بہت کوشش کیا۔ ہمارا ایک انکل کا دوست سنٹرل منسٹر تھا۔ اس نے ہمیں فارن ٹور پر بھجوایا ــــ پاکستان گورنمنٹ نے ــــ"

"کون گورنمنٹ ــــ ؟" سرسوتی نے پوچھا۔

"ہمارا اپنا پاکستان گورنمنٹ۔ تم لوگ تو ابھی برٹش کولونی ہے۔"

"کولونی ہے تو ٹھیک ہے۔ آرام سے ہے۔"

"آہا۔ تمہاری مینٹیلٹی اب تک کولونیل ہے۔" یاسمین نے حقارت سے کہا۔ بے چاریاں غلاموں کی اولاد۔ خود غلام۔

"اور تمہاری مینٹیلٹی کیا ہے ؟" سرسوتی نے چمک کر پوچھا۔ نیو ورلڈ میں پیدا ہو کر ہندی نژاد مزدور بھی نڈر ہو جاتے ہیں۔ اور بے ادب۔ اب ان جاہلوں سے کون بحث کرے۔ وہ چُپ ہو گئی۔

دیپالی واپس آئی۔ "میرے شوہر کا فون آیا تھا کہ تم سے کہہ دوں۔ انھوں نے کل رات کو تمھارے ڈانس کا پروگرام گورنمنٹ ہاؤس میں رکھوا دیا ہے ـــــ گورنر جنرل کے لئے ـــــ"

"گورنر جنرل کے لئے ـــــ؟" یاسمین نے خوشی سے اچھل کر دہرایا۔ مسٹریس سرسوتی زیرلب مسکرائی۔ قہوے کی ٹرے اٹھا کر بنگلے کی طرف چلی۔ یاسمین نے اس کی طنزیہ مسکراہٹ دیکھی اور جھینپ گئی۔

"اچھا اب ہم بھی چلتا ہے ـــــ" خیرالنسار نے کہا۔ سر خم کر کے مسکرائی اور کپڑوں کی ٹوکری اٹھا کر شاگرد پیشے کی سمت روانہ ہو گئی۔

"عجیب مسخری عورتیں ہیں"۔ یاسمین نے اظہار خیال کیا۔ "تم کن لوگوں میں آ پھنسیں"۔

"بہت بھلے لوگ ہیں"۔ دیپالی نے جواب دیا۔ "انھیں یقیناً ہم اور تم مسخرے لگتے ہوں گے۔ اپنی سرزمین کو چھوڑے انھیں سو سال سے اوپر ہو گئے۔ اب تک اسے یاد کرتے ہیں۔ یہ خیرالنسار اور سرسوتی ان دونوں کے پُرکھے یو۔ پی کے ضلع اعظم گڈھ سے آئے تھے۔ سو سال پہلے۔ جب انگریزوں نے یہاں اپنے نیگرو غلاموں کو آزاد کیا تھا۔ تب ان کی جگہ اپنے نئے ہندوستانی غلام یہاں منگوائے تھے۔ اب یہ آدھے اسپینش آدھے ایسٹرن یوپی کے ہندو یا مسلمان آدھے برٹش ہیں۔ سترہویں صدی کے انگریزی الفاظ یہاں رائج ہیں۔ پچ میل زبانیں۔ یہ بے چارے اب تک بُش قلی کہلاتے ہیں۔ مگر یہ بڑے ذہین لوگ ہیں انھیں معمولی مت سمجھنا ـــــ"

"دیدی۔ کہاں سے کہاں بات نکل گئی۔ کچھ دیر ہوئی میں نے آپ سے پوچھا تھا ـــــ کیا ہوا تھا؟ اس کا جواب تو دیجئے۔ مجھے اب تک معلوم نہیں۔ کیا ہوا تھا ـــــ ذرا سوچنے کی بات ہے۔ ۴۲ء کے بعد آپ سے اب ملاقات ہوئی ہے ـــــ اور اس اجنبی دور افتادہ جگہ ـــــ آخر ہوا کیا تھا ـــــ؟"

دیپالی نے ایک برڈ آف پیراڈائیز کو دیکھ کر کہا ـــــ "دیکھو یہ کتنے خوبصورت پرندے ہیں"۔

"دیدی۔ پلیز۔ بات مت ٹالئے"۔ یاسمین بھائی تم تو ہمیشہ کی نوزی پارکر ہو!"

"پوری بات بتائیے نا۔ آپ ستہ بیالیس میں جب جہاں آرا آپا کی شادی ہوئی اس کے بعد کبھی اُن سے ملی کیوں نہیں؟ وہ جب بھی دیناج پور سے ڈھاکہ آتیں آپ کے لئے معلوم کراتیں۔ اطلاع ملتی کہ شانتی نکیتن میں ہیں یا ریڈیو پروگرام کے لئے کلکتہ گئی ہوئی ہیں"۔

"نہیں۔ میں چند ایک بار جہاں آرا سے ملی تو تھی۔ دراصل اس سے نظریں چار کرتے ہوئے مجھے احساسِ جرم ستاتا تھا ـــــ"

"آخر کیوں ـــــ؟ کیا ہوا تھا؟"

دیپالی ہنس پڑی۔ "کیا ہوا تھا؟ اُس نے دُہرایا۔ "کچھ بھی نہیں۔ جہاں آرا کی شادی کی اطلاع

کا جب تمہارا خط آیا اس سے صرف دو روز قبل اُدمارائے شانتی نکیتن پہنچیں ـــــ مجھ سے بہت میلوڈریمٹک انداز میں کہا ـــــ ریحان اپنی کزن کا بچپن کا منگیتر ہے۔ تم بیچ میں آگئیں بڑے شرم کی بات ہے۔ تم اپنی سہیلی کی زندگی برباد کر رہی ہو۔ اپنے نیک دل باپ کو صدمہ پہنچا رہی ہو۔ جہاں آرا اور ڈاکٹر سرکار دونوں کہیں تمہاری وجہ سے اپنی جانوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔

"جب سے میں نے بالکل غیر متوقع جہاں آرا کی الماری میں ریحان کی تصویر رکھی دیکھی تھی میں بھونچکی تھی۔ اور احساسِ جرم مارے ڈال رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے ریحان سے بات نہیں کی۔ ان کے بہت اصرار پر جب اُن کو وجہ بتائی انھوں نے پورا قصّہ سنایا۔ کس طرح ان کی نسبت ٹوٹی۔ اور وہ ان سے میری ملاقات سے پہلے کی بات تھی۔ پھر بھی مجھے تشفّی نہیں ہوئی۔ بہت سمجھا بجھا کر ریحان نے مجھے ان سے بیاہ کر لینے پر راضی کر لیا۔ لیکن اب شانتی نکیتن پہنچ کر اُدمادیبی کہنے لگیں۔ جہاں آرا اب تک یہ آس لگائے بیٹھی ہے کہ ریحان شاید ارجمند منزل واپس آجائے اور نواب اس سے شادی کر دینے کے لئے تیار بھی ہو جائیں۔ اگر تم نے ریحان سے بیاہ رچایا تو جہاں آرا غریب شاید زہر کھالے۔ پردہ نشین محمڈن لڑکیوں کے ایسے ٹریجک قصّے سنے ہیں۔ علاوہ ازیں ریحان ایسا ناقابلِ اعتبار شخص ہے۔ جب اس نے اپنی کزن سے بے وفائی کی جس کے باپ کے روپے سے وہ ولایت پڑھنے گیا تو وہ بھلا تمہارا کب تک ساتھ دے گا۔ تم کو بھی چھوڑ دے گا ـــــ پھر تم کیا کرو گی۔ چندر کنج کے دروازے بھی تمہارے لئے بند ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں کم سن تھی اور ناتجربہ کار۔ یہ سب سن کر دہل گئی۔ اُدمارائے کے واپس جانے کے بعد اسی رات میں نے ریحان کو بڑا کڑا خط لکھا کہ آئندہ مجھ سے کبھی نہ ملیں۔ اسی رات میں نے وہ خط پوسٹ کر دیا۔ اس کے دوسرے روز تمہارا خط ملا۔ جس میں تم نے اطلاع دی تھی کہ بیچاری جہاں آرا کی شادی دیناج پور کے کسی زمیندار سے ہو گئی۔ اگر تمہارا وہ خط مجھے دو روز پہلے مل گیا ہوتا تو میں اُدمارائے کے بھرّے میں نہ آئی ہوتی اور پروگرام کے مطابق ریحان سے سول میرج کرنے کلکتہ چلی جاتی۔ مگر ہونی کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔

"ریحان کلکتہ جا چکے تھے۔ میرا عتاب نامہ موصول ہونے کے بعد انھوں نے مجھ سے ملنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ میں نے ان کو بہت ہی سخت خط لکھا تھا۔ آئیڈیالوجی کی خاطر۔ یعنی یہ کہ انسان انسان کا دل نہ دکھائے۔ اور وہ جہاں آرا کا دل دکھا رہے تھے۔ اور میں اپنے والد کا۔"

"دیپالی دیدی۔ ایک بات بتاؤں۔ ہم سب پاگل لوگ تھا۔ بقول مسٹریس سرسوتی۔ صرف اُدمادیبی صحیح الدماغ تھیں۔ اور ریحان بھائی کے بارے میں آگے میں بتاؤں؟ سنئے۔ سن پینتالیس میں آل انڈیا کسان سبھا کی طرف سے ایک لوک گیت کانفرنس ہوئی تھی۔ یاد ہے؟ لوک گیت منڈلیاں سارے ملک سے آئی تھیں۔ اس کانفرنس میں ریحان بھائی میرے پیچھے لگ لئے۔"

"راسکل ــــ!" دیپالی نے قہقہہ لگایا۔

"آپ اُس میں نہیں آئی تھیں۔"

"مجھے معلوم ہوا تھا کہ ریحان اور اُوما وہاں جانے والے ہیں اس لئے نہیں گئی تھی۔"

"مسلمان فوک سنگرز بہت بڑی تعداد میں آئے تھے۔ کیونکہ بنگال کی فوک میوزک زیادہ تر مسلمانوں کی تھی ــــ یہ دراصل مجھے اب مشرقی پاکستان بننے کے بعد اندازہ ہوا۔ ریحان بھائی ان فوک سنگرز کے کیمپ کے انچارج تھے۔ ایک دستہ منی پور سے آیا تھا۔ گارو ہلز سے مس ایلس بارلو کو انھوں نے بھگا دیا تھا۔ کیا زمانہ تھا کہ منی پور کے راجہ کا بھائی کمیونسٹ لیڈر تھا! آج یہ سب قصے اتنے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ پیپلز تھیٹر کے لوگ تھے۔ کیا جوش و خروش تھا۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ شونار بنگال عنقریب تقسیم ہونے والا ہے۔ بس صرف یہی خیال تھا کہ انگریز کو نکالتے ہی ملک میں دودھ کی ندیاں بہہ جائیں گی

"اور کتنی جنگجو اصطلاحات تھیں! ہماری ٹولیاں اسکواڈ کہلاتی تھیں ــــ چاٹگام اسکواڈ سُرما ویلی اسکواڈ۔ منی پور اسکواڈ۔ پیپلز تھیٹر اسکواڈ ــــ دیدی وہاں اڑیہ اسکواڈ نے ایک گیت سنایا تھا۔ اس پیٹ کی خاطر میں بنگال گیا۔ پاپڑ بیلے۔ دھان کوٹے۔ دھان کاٹی۔ چاکری کی۔ پیٹھ پر کوڑے کھائے۔ ناچا۔ چرخہ کاتا۔ گالیاں دیں۔ یم راج سے ملا۔ اس پیٹ کی خاطر ــــ"

"اور ہم ڈھاکہ سے ٹری نڈاڈ آگئے۔ اس پیٹ کی خاطر۔" دیپالی بولی۔

یاسمین کہتی رہی۔ "ایک گونڈ گیت تھا۔ 'میں نے گائے بیچ کر جنگل کا ٹیکس دیا۔ بیل بیچ کر ــــ اب بھی کافی نہیں۔ انگریز کے راج میں ہم بھوکے رہتے ہیں'۔ ہمیں اس وقت ایسا پکا معصوم یقین تھا کہ اپنے قومی راج میں کوئی بھوکا نہیں رہے گا ــــ اور وہ حیدرآباد اسکواڈ ــــ ہم سرخ سپاہی شانِ وطن ــــ"

"ریحان کے متعلق بتاؤ یاسمین۔"

"ہاں دیدی تو وہ اس کانفرنس میں میری بہت سرپرستی کرتے رہے۔ میں نے ان کو بتایا میں دیپالی سرکار کی دوست ہوں۔ ان پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اچانک میں بہت بور ہو گئی۔ طبیعت بیزار ہو گئی۔ پارٹیشن سے ذرا پہلے میں اپنے کٹر مذہبی قدامت پرست مولوی والد اور سارے گھر والوں سے بغاوت کر کے ایک اسکالرشپ پر بھرت ناٹیم سیکھنے مدراس چلی گئی۔ اور وہاں سے ایک سال بعد اپنے ایک روشن خیال رشتے دار کے پاس سیدھی کراچی۔ وہ بہت بارسوخ آدمی تھے۔ انھوں نے ایک بنگالی سنٹرل سنٹر کے ذریعہ کوشش کر کے مجھے باہر بھجوانے کا بندوبست کیا۔ اُنہی دنوں ڈھاکہ سے جہاں آرا آپا نے لکھا کہ آپ لوگ چندر کنج فروخت کر کے کلکتہ اور وہاں سے ٹری نڈاڈ جا چکے ہیں ــــ جہاں آرا

آپا کو بڑا افسوس تھا کہ جاتے وقت آپ ان سے ملی نہیں۔ خط تک نہ لکھا۔ ان کو صدمہ زیادہ یہ تھا کہ شاید ہندوستان پاکستان کی سیاست کی تلخی آپ دونوں کے درمیان آگئی ــــ"

"کاش میں اسے سمجھا سکتی کہ اس کا سامنا کرنے کی مجھے ہمت کیوں نہ پڑتی تھی۔ شاید اسے بھی تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ قصور میرا بالکل نہ تھا۔ اس کی نسبت ٹوٹنے کے بعد ریحان مجھ سے ملے تھے ــــ بہر حال حالات پر انسان کا بس نہیں۔ میں تقدیر کی قائل ہو چکی ہوں شاید جہاں آرا بھی تقدیر کی قائل ہو گی۔ اور جس وقت پارٹیشن ہوا جہاں آرا دیناج پور میں تھی میں اس سے کس طرح مل سکتی تھی۔ گو ہم لوگ سن اڑتالیس تک ڈھاکہ میں رہے ــــ بابا کے ایک مریض مترا بابو تھے ان کی بیوی بابا سے اُوما رائے کی شادی کی بات چیت چلا رہی تھیں۔ مترا بابو کلکتے کے کسی مسلمان سے اپنا مکان ایکس چینج کر کے پارک سرکس کلکتہ چلے گئے تھے۔ سر پری توش رائے کا خاندان بھی جا چکا تھا ــــ وڈلینڈز میں ایسٹ پاکستان گورنمنٹ کا کوئی دفتر بن گیا تھا۔ پارٹیشن سے ان بڑے لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ لیڈی رائے اطمینان سے ڈھاکہ آ کے وڈلینڈز کا کرایہ وصول کرتیں۔ پرانے دوستوں کے ساتھ ڈھاکہ کلب میں اپنی شامیں گذارتیں۔ اور واپس چلی جاتیں۔ کلکتے میں وہ لوگ نرملیندو کے پاس بالی گنج میں مقیم تھے۔ نرملیندو کلائیو رو کا بڑا کاروباری تھا۔ بے حد شراب پیتا تھا۔ اور کنفرمڈ بیچلر تھا۔

"اب مترا بابو نے کلکتے سے بابا کو لکھا کہ وہ فوراً وہاں آجائیں۔ کھوکھو پہلے ہی ویسٹ بنگال جا چکا تھا۔ اور شیاما پرشاد مکرجی کا ورکر بن گیا تھا۔ اس نے کہا تھا وہ سکنڈ کلاس شہری بن کر ایسٹ پاکستان میں نہیں رہے گا۔ بالکل یہی بات انڈیا سے آنے والے مسلمان وہاں کے لئے کہہ رہے تھے۔ آخر ایک روز بابا رکشا پر بیٹھ کر ارجمند منزل نواب قمر الزماں سے مشورہ کرنے گئے۔ انھوں نے کہا ہرگز مت جاؤ۔ یہاں ڈاکٹروں کی کمی ہے۔ ہندو ڈاکٹر سب جا رہے ہیں۔ تمھاری پریکٹس چمک جائے گی۔ بابا نے کہا لیکن میرے بچوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ چندر کنج ایک بہاری مسلمان کے ہاتھ اونے پونے بیچ کر ہم لوگ کلکتے روانہ ہو گئے۔ رخصت کرتے وقت نواب قمر الزماں اور عبدالقادر کو چوان بہت روئے۔ بے چاری جہاں آرا دیناج پور میں تھی۔

"گوالندو گھاٹ پر اسٹیمر کے فرسٹ کلاس ڈیک پر چارلس بارلو اکیلا ایک کونے میں بیٹھا بیئر پیتا نظر آیا۔ بڑا علامتی منظر تھا۔ معلوم ہوا انگلستان واپس جانے کے بجائے آسٹریلیا جا رہا ہے۔ وہاں فارمنگ کرے گا۔

"سیالدہ اسٹیشن پر پہنچ کر ہم لوگ سیدھے مترا بابو کے ہاں گئے۔ بابا نے دوستی کی وجہ سے برسوں ان کا مفت علاج کیا تھا۔ مترا بابو مزے میں تھے۔ بزنس شروع کر رکھی تھی۔ کسی تارک الوطن مسلمان سے تبادلے میں لیا ہوا بڑا سا مکان تھا۔

"مترا بابو نے نہ جانے کس طرح یہ طے کر لیا تھا کہ بابا اُوما رائے پر عاشق ہو گئے ہیں۔ لیڈی رائے بھی چاہتی تھیں کہ اُوما کسی سے بھی جلد از جلد شادی کر لیں۔ اور ریحان کے FIXATION سے آزاد ہوں۔ ریحان بھی شہر میں موجود تھے۔ میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ نیا نیا پارٹیشن ہوا تھا کیو نلزم بہت شدید تھی۔ ریحان سے دوستی کی افواہ کی وجہ سے اپنی ساری دولت کے باوجود اُوما دیبی کے لئے رشتے مفقود تھے۔ نرملیندو بھی بہت پریشان تھا۔ وہ ایک پکا سرمایہ دار۔ وہ بہن کے سیاسی رجحانات سے ہمیشہ نالاں تھا۔ اب اس نے بھی اُوما پر شادی کے لئے زور ڈالا۔ آخر ایک روز اُوما دیبی خود ہی آکر ہڑبڑاہٹ میں بابا سے کہہ گئیں کہ وہ ان سے بیاہ کر لیں گی۔ شاید ان کی اسکیم یہ بھی رہی ہو کہ بیاہ کے بعد شوہر کی موجودگی میں ریحان سے ملنا جلنا اتنا قابلِ اعتراض نہ سمجھا جائے گا۔

"میرے بابا بہت سادہ لوح ہیں۔ وہ کسی انسان کو بُرا سمجھ ہی نہیں سکتے۔ مگر اُوما کے وہ بھی مدّاح نہ تھے۔ اس کے باوجود، چونکہ اپنی جگہ سے اکھڑ چکے تھے، وہ کسی جذباتی سہارے کے متلاشی تھے۔ اور اُوما دیبی ان کو بھی خوب FLATTER کر رہی تھیں۔ مترا بابو جو شادی کی گفت و شنید ڈھاکے کے زمانے سے چلا رہے تھے بڑے کائیاں بزنس مین تھے۔ بابا رائے خاندان کے داماد بن جائیں تو اُن کے ذریعے وہ نرملیندو رائے سے اپنے دسیوں کام نکلوا سکیں گے۔ کیونکہ نرملیندو اتنا "براؤن صاحب" اور بد دماغ مغرور آدمی تھا کہ کوئی نتھو خیرا اس کے پاس پھٹک ہی نہ سکتا تھا۔

"میں محو حیرت یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ اصول پرست بابا نے مجھ سے ریحان کے بارے میں کبھی ایک لفظ نہ پوچھا تھا۔ اوما دیبی سے میں بات ہی نہیں کرتی تھی۔ بڑے شدید تناؤ میں وقت گذر رہا تھا۔

"اب دیکھو۔ کلاس کی پیدائشی خود ماغی کبھی جاتی نہیں۔ اُوما پرانی "فیلو ٹریولر" تھیں۔ بابا سے شادی کرنے والی تھیں مگر ہمارے کنبے سے اس طرح کا برتاؤ کرنے لگی تھیں جیسے ہم غریب ریفیوجی لوگ ان کے محتاج کرم تھے۔

"میں نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ بابا مطب جمانے کی فکر میں تھے۔ چندر نگر کی قیمت کا روپیہ آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ شونو اور ٹونو آوارہ گردی کرنے لگے تھے۔ مترا بابو کے گھر پر رہتے ہم لوگوں کو تقریباً ایک سال ہو گیا۔ اب منسر مترا نے پشتی ماں سے لڑنا شروع کر دیا۔ بھوتارنی دیبی گوڈ بلیس ہر ــــ خود ایک لڑاکا خاتون۔ گھر میں روز کھٹ پٹ ہونے لگی۔ میں گھبرا کر باہر نکل جاتی۔ ریڈیو پروگراموں سے ذرا سی آمدنی ہو جاتی تھی باقی وقت میں میوزیم یا کسی لائبریری میں گذارتی۔ مترا بابو کے گھر واپس جاتے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ اور اس چیز سے اور زیادہ کوفت ہوتی کہ ریحان اسی شہر میں موجود ہیں۔ اور ان کو معلوم ہے کہ میں کس حال میں ہوں۔ ایک بے روزگار ریفیوجی۔

" ایک صبح میں وکٹوریہ میموریل میں گھوم رہی تھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں ٹیپو سلطان کے بیٹے عبدالخالق کے پورٹریٹ کے نیچے کھڑی جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ سراج الدولہ، کلائیو، کارنوالس ٹیپو۔ ٹیٹو میر — اچانک اوما دیبی کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا وہ کسی انگریز کے ساتھ وہاں موجود تھیں۔ مجھے اس سے ملوایا۔ وہ ان کا لندن کا کوئی پرانا ہم جماعت تھا۔ کلکتہ آیا ہوا تھا۔ اسے سیر کرا رہی تھیں۔ پھر انھوں نے نہایت بلندی سے میرا تعارف کرایا — مس دیپالی سرکار — میرے بھائی نرملیندو رائے کی پرسنل اسسٹنٹ —

" میں ہکا بکا ان کی شکل دیکھنے لگی۔ غصّے کے مارے میرا بھیجا آؤٹ ہو گیا۔ میں نے فوراً کہا معاف کیجئے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کسی مسٹر نرملیندو رائے کی پی۔ اے نہیں ہوں۔

" اُوما دیبی نے جو اس وقت وکٹوریہ میموریل کے اندر انگریز دوست کے ساتھ بڑی شان سے کھڑی تھیں مجھے گھور کر دیکھا۔ اور اسی برطانوی ڈچز کے سے انداز میں کہا۔ اس کے متعلق ہم پھر بات کریں گے۔ کم ایلونگ برٹ —

" انگریز بہت مہذب ہوتا ہے۔ وہ اس غیر متوقع چھیڑ سے خاصا نادم نظر آیا۔ میں لال پیلی ہو کر وہاں سے ہٹ گئی۔

" اسی روز شام اُوما رائے مترا بابو کے ہاں پہنچیں۔ میں باہر چبوترے پر کھڑی تھی انھوں نے موٹر سے اترتے ہی مجھے پھٹکارنا شروع کیا۔ تم۔ تم کو میرے انگریز دوست کے سامنے مجھے جواب دینے کی ہمّت کیسے ہوئی۔

" آپ حد سے آگے بڑھ رہی ہیں اُوما دیبی۔ میں نے جواب دیا۔

" حد سے تم آگے بڑھ چکی ہو۔ احسان فراموش۔ تم پہلی تاریخ سے نرملیندو کے آفس میں کام کرو گی۔ تمھاری جیسی ریفیوجی لڑکیوں سے کلکتہ پٹا پڑا ہے۔ ہر چوتھی بنگالی لڑکی تمھاری طرح گاتی ہے۔ تم عجوبہ روزگار نہیں ہو۔ یہاں تم کو ویسٹ بنگال کا گورنر کوئی نہیں بنا دے گا۔ شکر کرو کہ میں نے نرملیندو کے دفتر میں تمھاری ملازمت کا بندوبست کر دیا۔

" اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں آپ کے شرابی، بدمعاش، بددماغ بھائی کی سکریٹری بننا قبول کروں گی تو آپ بہت سخت غلطی پر ہیں۔ اُوما دیبی۔ میں نے اب ذرا سکون سے جواب دیا۔

" میں تمھارے باپ سے بات کرتی ہوں — انھوں نے پیر پٹخ کر کہا۔

" کر لیجئے — میں نے جواب دیا۔

" بابا اور مسٹر مترا گھر پر موجود نہ تھے۔ پشی ماں کالی گھاٹ گئی ہوئی تھیں۔ مسز مترا کان لگائے اندر سے یہ سارا مکالمہ سن رہی تھیں۔ اُوما دیبی اُلٹے پاؤں واپس گئیں۔ جب بابا گھر آئے مسز مترا نے یہ

سارا قصہ نمک مرچ لگا کر ان کو سنایا۔ بابا نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ نزدیک میدان میں ٹہلنے جاتے تھے۔ کھانے کے بعد مجھے آواز دی۔ میں باہر چبوترے پر آئی۔ اس رات میں اُوما کے جانے کے بعد کمرہ بند کر کے بہت روئی تھی۔ بابا نے کہا۔ دیپالی ہمت سے کام لو۔

" میں نے کہا۔ بابا کیا آپ واقعی اس خوفناک عورت سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟

" وہ چپ رہے۔ میں نے کہا کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں نرملیندو رائے کی پرسنل سکریٹری بنوں؟ علاوہ ازیں سرپری توش اُوما دیبی کے لئے علیحدہ کوٹھی بنوا رہے ہیں۔ آپ وہاں رہیں گے۔ ریحان بھی وہاں آیا کریں گے۔ میں ریحان کی ساری عمر شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ یہ کیسی ہولناک صورت حال ہے۔ پھر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس روز میں نے پہلی بار بابا کے سامنے ریحان کا نام لیا تھا۔

" بابا چند منٹ خاموش رہے۔ پھر بولے۔ چلو۔ ہم اس ملک کو ہی خیرباد کہتے ہیں۔

" واپس ڈھاکہ ــــ؟ میں نے پوچھا۔

" نہیں۔ ٹری نیڈاڈ۔ مُسکل کا خط آیا تھا۔ اگر میں وہاں آنا چاہوں تو وہ میرے لئے وہاں انتظام کر سکتا ہے۔ کسی بھی پلانٹیشن پر میڈیکل آفیسر کی جگہ مل سکتی ہے۔

" بابا کے ایک چچازاد بھائی مدتیں گذریں ڈھاکہ سے پورٹ آف اسپین چلے گئے تھے۔ ڈاکٹر تھے وہاں بہت پیسہ کمایا۔ ایک مرتبہ وطن آئے تو چندر کنج آئے تھے۔ بڑھیا سُوٹ۔ ہوانا سگار۔ میری ماں زندہ تھیں۔ انھوں نے جھینپ جھینپ کر گھر کا افلاس چھپاتے ہوئے ان کی میزبانی کی تھی۔ اب میں نے بابا سے کہا۔ مگر آپ اب اُوما دیبی کو کس طرح SHAKE OFF کریں گے؟

" بابا ہنس پڑے کہنے لگے۔ میں ان سے کہوں گا شادی کے بعد وہ میرے ساتھ ٹری نیڈاڈ چلیں۔ وہ انکار کریں گی۔ قصہ ختم ہو جائے گا۔"

" ایسا ہی ہوا۔

" چندر کنج کی قیمت کا جو روپیہ باقی بچا تھا اس سے جہاز کے پانچ ٹکٹ خریدے گئے۔ بابا۔ پشی ماں، میں، شُوشو، ٹونو۔ بہت لمبا بحری سفر کر کے ہم لوگ یہاں پہنچے۔ کُوکُو آنے پر راضی نہ ہوا۔ وہ مہاسبھائی لیڈر بنتا جا رہا تھا۔ اور آر۔ ایس۔ ایس میں شامل ہو چکا تھا۔

" ازدواجی زندگی کا آرام جو پندرہ برس بعد ان کو دوبارہ حاصل ہو سکتا تھا شاید بابا نے میری وجہ سے اس کی قربانی دی۔ پتہ نہیں۔ پشی ماں مجھ سے بہت خفا تھیں کہ گھر آئی لکشمی کو واپس کر دیا۔"

" ارے وہ لکشمی تھی کہ وبالِ جان ــــ" یاسمین بولی۔ "آپ سب کی زندگی اجیرن کر دیتیں۔"

" یہاں پہنچ کر میں نے پشی ماں کو سمجھایا کہ اشنان کریبین میں بھی ہو سکتا ہے۔ مہا کالی ہر جگہ ہے۔ مندروں کی یہاں کمی نہیں۔"

"یہاں سوشل رسوم انیسویں صدی کے ہندوستان کی رائج ہیں۔ ہنومان جی کے مندروں میں پوجا کے بعد لوگ باگ چوراہوں پر آکر فیسٹا کرتے ہیں اور کلپسو ڈانس۔ شونو کو سان فرنینڈو میں نوکری مل گئی ہے۔ ٹونو وینیزولا چلا گیا ہے۔"

"للت سین سے میری شادی یہاں پہنچنے کے دوسرے برس مُکل چاچا نے طے کروادی۔ اور میں بڑے اطمینان سے مسز سین بن گئی۔ للت یہاں کے کامیاب ترین بیرسٹر ہیں۔ پہلی بیوی اسپینش نژاد اور لاولد تھی اسے عرصہ ہوا طلاق دے دی۔ شریف آدمی ہیں۔ میں کافی خوش ہوں۔ بابا اور پشی ماں ہمارے ساتھ بطور P. G. رہتے ہیں۔ بابا کے مطب کے لئے دیکھو للت نے کیسا خوبصورت ٹری ٹاپ ہاؤس بنوا دیا ہے۔"

یاسمین نے ذرا تعجب سے دیپالی کو دیکھا۔ کچھ لمحے خاموش رہی اور بولی۔ "اس کا مطلب ہے جہاں آرا آپا بھی اپنے دیناج پور کے رئیس کے ساتھ خوش ہوں گی؟"

"شاید۔"

"یہ مجبوریوں سے سمجھوتہ ہے یا سچی خوشی؟"

"معلوم نہیں۔"

ایک طویل امریکن کار پھاٹک میں داخل ہوئی۔ اسے وردی پوش نیگرو شوفر ڈرائیو کر رہا تھا بھاری بھرکم اور کم رُو للت سین بریف کیس سنبھالے کار سے برآمد ہوئے۔ رین بڑی کی سمت آئے۔

ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار ٹری ٹاپ ہاؤس کی سیڑھیاں اترے۔ وہ چاروں باتیں کرتے اسپینش کولونیل بنگلے کی طرف چلے گئے۔ اندر ڈائننگ روم میں نیگرو بٹلر لنچ کے انتظار میں مصروف تھا۔ یاسمین طویل برآمدے میں سے گذرتی ڈرائینگ روم میں چلی گئی۔ اس نے دریچے سے باہر جھانکا۔ بھوتارنی دیبی ایک درخت کے نیچے آنکھیں بند کئے بیٹھی ہل ہل کر مالا جپ رہی تھیں۔ سامنے پالتو خرگوش اور اعلیٰ نسل کتے دوڑتے پھر رہے تھے۔ نہایت پُرسکون منظر تھا۔ یاسمین دریچے میں سے ہٹ کر وسیع ڈرائینگ روم میں ادھر سے ادھر بیش قیمت سامان آرائش دیکھتی پھری۔ ایک بڑے اونچے گراموفون کے نزدیک دیپالی سرکار کے پرانے ریکارڈ رکھے تھے۔ یاسمین نے کوک بھرکے سفید کتے اور بھونپو والا ایک ریکارڈ گراموفون پر لگایا سوئی کہیں بیچ میں پڑ گئی۔ اچانک دیپالی کی آواز بلند ہوئی ـــــ کوئی کہے کالو ـــــ کوئی کہے گورو ـــــ لیو ہے ـــــ لیو ہے بجنتا ڈھول۔

یاسمین پر پھر بیزاری کا دورہ پڑا۔ اس نے سوئی اٹھائی۔ ریکارڈ پلٹا۔ کماری دیپالی سرکار کا دوسرا بھجن۔ سوئی پھر وسط پر پڑی۔ جو پہرادے سو ہی پہنوں ـــــ جو کھلادے سو ہی کھاؤں ـــــ جہاں بٹھاوے تاہیں بیٹھوں ـــــ میرا کے پربھو ـــــ

واہ ری عورت کی اوقات۔ یاسمین نے دل میں کہا۔

نیگرو بٹلر کمرے میں آکر بولا ــــ "مِس! لنچ اِز سرو ڈ"۔

گراموفون بند کر کے وہ ایوانِ طعام کی طرف بڑھی۔ سامنے آتش دان پر روزی کی دستخط شدہ تصویر پر نظر پڑی۔ رادھیکا سانیال۔ نئی دہلی۔ ۱۶ر مارچ ۴۹ء۔

## (۳۴)

# ایستھر گری بالا بنرجی

ڈھاکہ۔ مشرقی پاکستان۔ دسمبر ۴۹ء

مشن کمپاؤنڈ کے ایک کوارٹر کے سیٹنگ روم میں کروشیا کے میز پوش سے ڈھکی بڑی میز پر تین تصویریں رکھی ہیں۔ کمل، نیرا، ایلا، نئی دہلی، روزی کے بچے۔ پادری بنرجی آرام کرسی پر آنکھیں بند کئے لیٹے ہیں۔ ڈاکیہ سامنے سے گذر جاتا ہے۔ وہ اس کے قدموں کی آہٹ پہچانتے ہیں۔

"روزی کا خط آیا؟"

"نہیں"۔ ایستھر گری بالا اسٹوو پر بھات اُبالتے ہوئے جواب دیتی ہیں۔

"اتنے برسوں سے وہ آئی بھی نہیں۔ کب آئے گی؟ ہر سال انتظار کرتا ہوں کہ شاید اس کرسمس پر آجائے"۔

"پال۔ اس کے لئے یہاں آنا اتنا آسان نہیں ہے۔ ویزا بڑی مشکل سے ملتا ہے"۔

"جب پارٹیشن نہیں ہوا تھا تب کون سا آتی تھی۔ اسے اب بھی ہم سے شرم آتی ہے۔ وہ ہم سے ہمیشہ سے چڑتی تھی۔ وہ بڑے آدمی کی بیوی ہے۔ ہم دیسی کرسچین غریب لوگ ہیں۔ مگر ہمارے بعد اسے شاید ہماری قدر آئے۔ ہم اس کے ماں باپ تھے"۔

چرچ سے ریٹائر ہونے کے بعد ان کو دو کمروں کا کوارٹر مل گیا ہے۔ عسرت سے گذر ہوتی ہے گری بالا اچار چٹنی بنا کر بیچتی ہیں۔ دونوں کا باری باری موتیا بند کا آپریشن ہو چکا ہے۔ پادری صاحب کا آپریشن ٹھیک سے نہیں ہوا۔ ان کی بصارت زائل ہو چکی ہے۔ یسوع ــــ یسوع ــــ وہ جو آسمانوں سے گذر گیا ــــ یسوع ــــ شام کو گری بالا پادری صاحب کا ہاتھ تھام کر ان کو ٹہلانے لے جاتی ہیں۔ سفید داڑھی۔ نابینا۔ پُر نور چہرے والے پادری بنرجی سنسان سڑک پر آہستہ آہستہ

چلتے یسوع کا ایک حواری معلوم ہوتے ہیں۔ آئے لُویاہ۔ آئے لُویاہ۔

کل رات پادری بنرجی اپنے منجی سے جا ملے۔ آخری وقت میں وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو نہ دیکھ سکے۔ گری بالا نے روزی کو موت کی اطلاع کا تار بھیجا۔ اس کا خط آیا۔ ماما تم فوراً میرے پاس چلی آؤ۔

لیکن برہمن نژاد گری بالا بنرجی اپنے داماد کے ٹکڑوں پر پلنے نئی دہلی نہیں جائیں گی۔ اور نہ اپنے امیرزادے نواسوں کی آیا گیری کریں گی۔ مشن والے ان کی مدد کر رہے ہیں۔ مشن اسکول میں ہوسٹل وارڈن کا کام دلوا دیا ہے۔ مگر پرنسپل سے اُن کی نہیں بنتی۔

ایک روز وہ رکشا پر بیٹھ کر ارجمند منزل پہنچتی ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں ایک بال ودھوا برہمن ہندو پندرہ سالہ بچی سسرال والوں کے مظالم سے بچنے کے لئے کشتی پر بیٹھ کر فریدپور کے گاؤں سے بھاگ کر اپنے زمیندار آقا کے ہاں پناہ لینے ارجمند منزل ڈھاکہ آئی تھی۔ ایک بوڑھی عیسائی غریب بیوہ نے ارجمند منزل پہنچ کر نواب قمرالزماں کے دفتر کے دروازے پر دستک دی۔

پینتالیس سال قبل، نوعمر نواب قمرالزماں اپنی بنت عم ملیحہ بی بی پر دم دے رہے تھے۔ مگر اپنی رعیت کی اس دلکش ہندو بال ودھوا کے تیر نظر کے بھی گھائل ہو گئے تھے۔ بوڑھے نواب قمرالزماں نے خود اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ایک پوپلے منہ والی پریشان حال ضعیفہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔

اسکول پرنسپل کے خلاف اس کی شکایات سن کر نواب نے کہا "ایستھر! ارجمند منزل تمہارا گھر ہے۔ یہیں رہو۔ تم کو اس عمر میں ہم محنت مزدوری نہیں کرنے دیں گے۔"

"نواب صاحب! پال بڑے خوددار آدمی تھے۔ میں کسی بھی جگہ مفت خوری کر کے ان کی روح کو تکلیف نہیں پہنچاؤں گی۔ میری صحت بہت اچھی ہے۔ مجھے کہیں کام دلوا دیجئے۔"

گری بالا دیبی کے اصرار پر نواب صاحب ان کو یونی ورسٹی کے گرلز ہوسٹل میں کچن سپروائزر کی ملازمت دلوا دیتے ہیں۔ دو سال بعد وہ بعارضہ نمونیہ مر جاتی ہیں۔ چرچ یارڈ میں پال کے پہلو میں دفن کی گئیں۔ کسی کو علم نہیں کہ نئی دہلی کی مشہور دولت مند سوشل ورکر رادھیکا سانیال ان کی بیٹی ہے۔

نئی دہلی میں جس وقت روزی کو منسٹر بنرجی کی وفات کا تار ملا۔ جو نواب قمرالزماں نے بھجوایا تھا وہ اپنی عالیشان نئی کوٹھی میں ڈنر کے انتظام میں مصروف تھی۔

مہمان آ چکے تھے۔ تار بسنت کمار سانیال نے لیا۔ وہ روزی کے پاس گیا جو چند غیر ملکی مہمانوں کا سواگت کر رہی تھی۔ ایک امریکن اسکالر ۴۲ء کی تحریک کے بارے میں ایک امریکن فاؤنڈیشن کی طرف سے کتاب لکھ رہا تھا۔ اس سلسلے میں روزی سے ملنے آیا تھا۔ اس نے بسنت کمار سانیال سے کہا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی بیوی ۴۲ء کے موومنٹ کی ایک ہیروئن تھیں"! بسنت کمار سانیال دھیرے سے مسکرایا۔

پھر اس نے روزی کے ہاتھ میں وہ تار دیا جو ڈھاکے سے آیا تھا۔ اور آہستہ سے کہا۔ "روزی۔ تم ہیروئین نہیں تھیں۔ تمہاری ماں ہیروئین تھیں"۔

جہاں آرا دیناج پور سے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ سب ارجمند منزل کے پچھلے دالان میں جمع تھے۔ اس کا بچہ اکمل۔ والدہ۔ بھاوج۔ دونوں چھوٹی بہنیں۔ نیّر الزماں نے اندر آکر کہا۔

" ذرا اپنی چہیتی یاسمین مجید کی حرکتیں دیکھو۔ یہ دیکھو لندن کے ایک اخبار میں اس کی تصویر کسی انگریز سے شادی کرلی"۔

جہاں آرا نے عینک لگا کر اخبار دیکھا۔ "بلیک بیوٹی ویڈز۔ ڈارک ڈانسر یاسمین مجید ورد ہرولڈ پرنس چارمنگ"۔ "ننگے پاؤں والی کالی رقاصہ کی شادی"۔

" معقول۔ اور یاسمین کیا ریس کا گھوڑا ہے۔ بلیک بیوٹی۔ ڈارک ڈانسر۔ حد ہوگئی"۔ نیّر الزماں نے سر ہلا کر کہا۔ "جل پائے گوری کے مولویوں کا خاندان۔ اور یہ انجام۔ ننگے پاؤں والی رقاصہ ——"

" اور وہ نگوڑا انگریز کیا کرتا ہے؟" بیگم قمر الزماں نے پوچھا۔

" ہوگا کوئی بھڑ بھونجا"۔ نیّر الزماں نے کہا۔

" فیشن ڈیزائنر ہے"۔ جہاں آرا نے اخبار پڑھ کر کہا۔ "مگر جب دیپالی کاٹری نیڈاڈ سے خط آیا تھا اس نے لکھا تھا کہ یاسمین ڈانس کرنے پورٹ آف اسپین گئی تھی۔ اس خط میں تو کسی انگریز ونگریز کا ذکر نہیں تھا۔ جیرلڈ ایڈرین بلمونٹ۔ بہت خوب!"

## (۳۵)

# یاسمین بلمونٹ "ڈارک ڈانسر"

دیپالی دیدی۔ آپ کا خط ملا۔ اب آپ کو ساری بات بتاتی ہوں۔ بہت عرصے بعد آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ جیرلڈ سے میں نے کہا تھا کہ شادی اسلامی طریقے سے ہو۔ وہ مان گیا۔ نکاح کے لئے ہم نے ایک دوست کو بلایا جو پہلے باقاعدہ مولوی رہ چکے تھے۔ اب بے دین تھے۔ ہم سب پب سے نکل کر رات کے بارہ بجے ان کے گھر پہنچے۔ وہاں مزید مے نوشی ہوئی۔ پھر مولوی صاحب نے نکاح

پڑھا۔ دولہا دلہن مولوی گواہ سب نشے میں آؤٹ تھے۔

شادی کے بعد ہم دونوں نے چیلسی میں ایک تیموز کرائے پر لے لی۔ جیرلڈ کی آمدنی بہت اچھی تھی میں نے رقص ترک کر دیا۔ سگھڑ ہاؤس وائف بنی۔ بچی پیدا ہوئی۔ اس کا نام شہرزاد رکھا۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئی میں نے پھر اپنا ڈانس ٹروپ تیار کیا۔

ایک روز اچانک اور بالکل غیر متوقع جیرلڈ میرے ٹروپ کے ایک بنگالی رقاص کے ساتھ بھاگ گیا۔ معلوم ہوا دونوں پیرس میں ہیں۔ میں پتہ چلا کر پیرس پہنچی۔ ان کو ڈھونڈ نکالا۔ صبح کو میں ان کے فلیٹ پر پہنچی۔ بنگالی چھوکرا ایپرن باندھے گھریلو عورتوں کے سے انداز میں اسٹوو کے سامنے کھڑا ناشتہ تیار کر رہا تھا۔ جیرلڈ ڈریسنگ گاؤن پہنے بیٹھا اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ گرہستی کا یہ نظارہ دیکھ کر مجھے ابکائی سی آئی۔ اور میں بغیر کچھ کہے سنے الٹے پاؤں لندن واپس آگئی۔ پھر میں نے جیرلڈ کو لکھا کہ طلاق دے دے اور مہر ادا کرے۔ اس کا جواب آیا کہ شادی ہی کب ہوئی تھی۔ مولوی اور گواہ سب نشے میں دھت تھے۔ وہ نکاح نہیں تھا مذاق تھا۔ علاوہ ازیں ہم نے بہ لحاظ برطانوی قانون سول میرج نہیں کی۔ لہذا بچی کی پرورش کی ذمے داری بھی مجھ پر عاید نہیں ہوتی۔ مجھے صنف نازک میں کبھی دلچسپی نہیں تھی۔ تم لندن میں اپنا ڈانس اسکول اور یوگا کلاسیں چلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ اور ڈاؤن اینڈ آؤٹ تھیں۔ اور وطن واپس جانے کے لئے کرایہ تک پاس نہ تھا۔ میں تمھارے ساتھ رہ کر تمھاری کفالت کرنے لگا تھا۔ محض زراہِ ہمدردی۔ لیکن میں امید کرتا ہوں ہم اچھے دوست رہیں گے۔

جیرلڈ کی والدہ جو ایک متمول اور نہایت کنجوس ریٹائرڈ اسٹیج ایکٹرس ہیں وہ شہرزاد کو اپنے ساتھ اپنے گاؤں لے گئی ہیں۔ اور اس شرط پر اس کی ذمے داری لینے کو تیار ہیں کہ وہ اسے رومن کیتھولک اٹھائیں گی۔ میں نے کہا رومن کیتھولک کیا ہوٹن ٹوٹ، شنتو، بدھسٹ کچھ بھی بنا دیجئے۔ اسے میری طرح دھکے تو نہ کھانے پڑیں۔ میں اب ایک دفتر میں کلرکی کر رہی ہوں۔ ڈانس ٹروپ چلانا بہت مشکل تھا۔ انڈیا سے آنے والے نامور ڈانسرز کا کمپی ٹیشن بہت سخت ہے۔ پچھلے مہینے امید کی کرن نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ ریحان الدین احمد آئے ہوئے ہیں۔ پچھلی مرتبہ پورٹ آف اسپین میں آپ کو میں نے بتایا تھا کس طرح یہ حضرت ایک زمانے میں میرا تعاقب کرتے رہے تھے۔ اب وہ منسٹر تھے اور یہاں ایک وفد کے ساتھ آئے تھے۔ اور ڈورچسٹر میں ٹھہرے تھے۔ میں نے فون کیا۔ ملنے کی کوشش کی۔ انھوں نے صاف ٹال دیا کہ بہت مصروف ہیں پھر میں نے سنا، انھوں نے کہا "پرانے شناسا اب سب قریبی دوست ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مجھے تنگ کرتے کرتے ہیں۔ یہ کام کروا دو۔ وہ کام کروا دو۔ میں کس کس سے ملتا پھروں۔" جس ہم وطن سے انھوں نے یہ کہا۔ اتفاق سے وہ مجھے بھی جانتا تھا۔ اس نے آکر مجھے بتایا۔

جہاں آرا آپا سے آپ کی خط و کتابت ہے ؟ میں نے ان کو کئی خط لکھے۔ جواب نہیں آیا۔ غالباً ارجمند منزل والے بھی میرے طرز زندگی سے سخت متنفر اور بیزار ہیں۔ مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔ زمین اور آسمان میرے سامنے سے بھاگ گئے۔ مجھے کہیں پناہ نہ ملی۔

آپ کی یاسمین بلمونٹ

## (۳۶)

# پائلٹ آفیسر اکمل مرشد زادہ

لاؤڈ اسپیکر پر دہرایا جا رہا تھا۔ مسز دیپالی سین۔ وی۔ آئی۔ پی لاؤنج میں میں آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ مسز دیپالی سین ٹی۔ ڈبلیو۔ اے کی مسافر ــــ پورٹ آف اسپین کی مسز دیپالی سین ــــ

ششدر اور مضطرب وہ مسافروں کی بھیڑ سے نکلی۔ پاکستان ایر فورس کے یونیفارم میں ملبوس ایک سانولا نوجوان اس کی طرف آیا۔ "دیپالی آنٹی ــــ ؟" اس نے ذرا جھجک کر پوچھا۔ "میں اکمل ہوں۔ امی لاؤنج میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ آپ کی فلائیٹ بہت لیٹ تھی"۔

وہ پائلیٹ آفیسر اکمل حسین مرشد زادہ کے ساتھ وی۔ آئی۔ پی لاؤنج کی طرف بڑھی۔ کمرے کے اندر ڈھکی ململ کی سفید ساری میں ملبوس ایک غمگین آنکھوں والی دبلی پتلی عورت، کھچڑی بال، خیر مقدم کے لئے صوفے سے اٹھی۔ دیپالی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"یہ امی ہیں"۔ نوجوان اکمل نے ذرا گھبرا کر کہا۔

"میں تمہاری شادی میں شریک نہ ہو سکی تھی دیکھو اتنی دور سے تمہارے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لئے آ گئی !" دیپالی نے مصنوعی بشاشت سے کہا۔ جہاں آرا کو اس حالت میں دیکھنے کی ذمہ دار میں خود ہوں۔ میں ریحان کو آسانی سے بھلا سکی۔ لیکن ریحان کی وجہ سے ان کی زندگی ہمیشہ کے لئے غارت ہو گئی۔ زندگی کی بربادیوں کا یہ کیسا لامتناہی سلسلہ ہے۔ اس نے اُداس آنکھوں والی جہاں آرا پر پھر نظر ڈالی۔ دو سال قبل وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ اکمل اس کا اکلوتا لڑکا تھا۔

دیپالی نے اتنی شان و شوکت پہلے ارجمند منزل میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ اُدمارائے کے وودڈ لینڈز

میں بھی نہیں۔ پاکستان کا نیا اوپری طبقہ واقعی بیحد متمول ہو چکا تھا۔ دلہن بھی ایک ملک التجار کی لڑکی تھی۔

جب اکمل کے سہرا باندھا جانے لگا۔ جہاں آرا وہاں سے ہٹ گئی۔ وہ کونے میں جا کر اپنے مرحوم شوہر کو یاد کر کے رو رہی تھی۔ دیپالی نے ایک بار پھر اسے حیرت سے دیکھا۔ ہندوستانی ــــ خیر ــــ پاکستانی ــــ عورت! خلاف مرضی اسے ایک ایسے عیاش بدقوارہ بدہیئت شخص سے بیاہا گیا جس نے ساری عمر اسے جلایا۔ مگر اس نے دوسروں کے سامنے ہمیشہ اپنے شوہر کی حمایت کی اور اس کی خدمت گذار رہی۔ اور اب اسے یاد کر کے رو رہی تھی۔

چند سال قبل جہاں آرا کی چھوٹی کنواری بہنیں انجم آرا اور اختر آرا اپنے بھتیجے منور الزماں سے ملنے لندن جا رہی تھیں جو وہاں اسکول میں پڑھتا تھا۔ طیارہ الپس پر گر کر پاش پاش ہو گیا۔ سارے مسافر ہلاک ہوئے۔ برف میں لاشیں بھی نہ ملیں۔ اس دہشت ناک جوانمرگی کے صدمے نے ان کی ماں بیگم قمر الزماں کی جان لی۔ نواب قمر الزماں اس کے بعد سے بہت کم بولتے تھے۔ اس وقت یتیم نواسے کی شادی کے عصرانے میں شامیانے کے نیچے ترکی ٹوپی اوڑھے (اگلے وقتوں کے لوگ ننگے سر رہنا خلافِ تہذیب گردانتے تھے) گورنر وزرا اور اعلیٰ افسروں سے ایک آدھ بات کر لینے کے بعد پھر خاموش ہو گئے۔ صوفے پر گم صم بیٹھے رہے۔ ان کی نظر دیپالی پر پڑی جو ایک طرف کھڑی جہاں آرا کی پرانی خادمہ مالا سے باتیں کر رہی تھی۔ انھوں نے اشارہ کر کے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ ان کے قریب جا بیٹھی۔ وہ دونوں چپ چاپ سامنے کی چہل پہل کا نظارہ کیا کئے۔

دیپالی کی آنکھ بھر آئی۔ اس نے چپکے سے آنسو پونچھے۔ نواب صاحب نے دیکھ لیا۔ آہستہ سے بولے "رونا نہیں چاہئے بیٹی۔ بُری بات ہے۔ صبر بڑی چیز ہے۔"

کچھ دیر بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کے بھانجے ریحان الدین احمد ــــ میں ابھی ان سے کلکتہ میں مل کر آ رہی ہوں۔"

نواب صاحب نے چاندی کی موٹھ والی چھڑی کو آہستہ سے قالین پر کھٹکھٹایا اور ذرا توقف کے بعد بولے۔ "ریحان اب وہاں بڑا آدمی ہے۔ اپنی پرانی سیاست چھوڑ کر کانگریس میں شامل ہو گیا۔ پروونشل منسٹر رہ چکا ہے۔ اب کیا کر رہا ہے؟"

"اُدمارائے کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے بھائی کی کوئی بہت بڑی بزنس ہے۔ رونو اس کی ایک فرم کے جنرل منیجر ہو گئے ہیں۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کو کھو کے ہاں ٹھہری تھی۔ اس نے ان کو فون کر کے میرے آنے کی خبر دی۔ خود ملنے نہیں آئے۔ اپنی کار بھیج دی۔ میں، کھو کھو اور اس کی بیوی اُدمارائے کے ہاں علی پور روڈ گئے۔ کوٹھی کی دوسری منزل پر اُدمارائے خود رہتی ہیں۔ نیچے ایک

دِنگ میں ریحان اور ان کی بیوی اور لڑکا۔ چند روز ہوئے لڑکا گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اُدا دیبی کے بھائی نریلندر رائے نے اب تک شادی نہیں کی۔ چوبیس گھنٹے شراب میں غرق۔ بنگال کلب میں بیٹھا رہتا ہے۔ سارا کاروبار ریحان کے ہاتھ میں ہے۔ سنا ہے چند ماہ کے لئے منسٹر بنے تھے نریلندر اور اُدا رائے کے اس کاروبار کو بہت فائدہ پہنچایا تھا۔ اس وجہ سے وہ لوگ ان کے اور زیادہ احسان مند ہیں۔ ریحان صاحب اپنے اکلوتے لڑکے کے متعلق بہت پریشان تھے۔ مجھ سے کہنے لگے باغی ہو کر گھر سے نکل گیا۔ تیرہ سال کی عمر میں۔ ابھی سے شاعری کرتا ہے۔ بھوکی پیڑھی کا ہمدرد شاعر۔"

نواب قمر الزماں نے جو سر آگے بڑھائے بغور سن رہے تھے۔ یک لخت ایک تلخ قہقہہ بلند کیا۔ لوگوں نے اچنبھے سے انھیں دیکھا۔ انجم آرا اور اختر آرا کی موت کے بعد آج وہ پہلی بار ہنسے تھے۔

بنگال کے ایک قدیم کوی ابھی نند نے کہا تھا۔ "تالاب کنول سے بھر گئے بہار میں مکھیاں آم کے بور پر جمع ہیں۔ مسافت چھوٹی ہو تب بھی، ہوا جب گاڑی کے راستے میں رقص کرتی ہے۔ غریب الوطن کا دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔" اور ڈھاکہ سے پورٹ آف اسپین کا راستہ بہت طویل تھا۔ واپس جانے سے قبل اس آخری شام وہ سنگ سرخ کے تالاب کے کنارے پرانے "راج سنگھاسن" پر بیٹھی جہاں آرا سے باتیں کرتی رہی۔ اس نقلی شاہی تخت پر لڑکپن میں یہ لوگ اسی طرح بیٹھا کرتی تھیں۔

معاً جہاں آرا نے پوچھا۔ "ریحان بھائی کی دلہن کیسی ہیں؟ کون لوگ ہیں؟"

"عام سی گھریلو بی بی ہیں"۔ دیپالی نے جواب دیا۔ "غریب شریف گھرانے کی لڑکی۔ بتا رہی تھیں اُدا رائے کے بھائی نریلندر رائے نشے میں غین کار چلا رہے تھے۔ گارڈن ریچ میں۔ ان زہرہ بی بی کے باپ اُن کی کار کے نیچے دب کر مر گئے۔ وہ ایک غریب کاریگر تھے۔ زردوز۔ جن کے دادا لکھنؤ سے کلکتے آ گئے تھے۔ اُدا دیدی نے تگڑم کر کے بھائی کو پولس کچہری سے بچا لیا۔ متوفی کی ایک ہی لڑکی تھی۔ ماں مر چکی تھی بھائی آوارہ نکل گئے تھے۔ اُدا رائے بطور تلافی اس یتیم بے سہارا لڑکی کو اپنے ہاں اپنی نئی کوٹھی میں لے آئیں۔ اپنے وارڈ روب کی دیکھ بھال اس کے سپرد کر دی۔ رہنے کے لئے ایک کوٹھری دے دی۔ زردوز کی لڑکی سینے پرونے میں طاق۔ سلیقہ مند۔ احساس کمتری کی شکار۔ ریحان صاحب جو حسب معمول اُدا کے ہاں آتے رہتے تھے انھیں یہ لڑکی بھا گئی۔ یہ پارٹیشن کے ڈھائی تین سال بعد کی بات ہے۔ ریحان صاحب کے دل میں جانے کیا نیکی آئی ایک دن اس بے چاری مظلوم لڑکی سے نکاح پڑھوا لیا۔ اُدا اس کے ساتھ بُری ساس نند کا برتاؤ کرتی ہیں۔ وہ خاموش رہتی ہے۔ ریحان بھی اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیتے۔

"اُدا رائے کا ایک دلچسپ مشغلہ زہرہ نے بتایا۔ دائم المریض ہیں۔ سیاست سے کب کی کنارہ کش ہو چکی ہیں۔ صبح سویرے اٹھ کر نزدیک بیلویڈیر چلی جاتی ہیں۔ ایک ملازم چھچھوندروں اور ہڈیوں کا

برتن لے کر پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ سڑک اور باغ کے سارے آوارہ بلیوں اور کتوں کو ناشتہ کراتی پھرتی ہیں۔ پھر کوؤں کو دانہ ڈالتی ہیں۔ گھر واپس آکر ریحان کی بیوی سے جھائیں جھائیں کرتی ہیں۔ ریحان عموماً گھر سے باہر رہتے ہیں۔ واٹ اے لائف"۔

جہاں آرا نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور اٹھ کر مغرب کی نماز کے لئے اندر چلی گئی۔ باورچی خانے کی طرف سے رابعہ آتی نظر آئی۔ ریحان کی چھوٹی بہن رابعہ جو اکمل کی شادی کے لئے اپنے گھر عظیم پور سے چند روز کے لئے ارجمند منزل آئی ہوئی تھی۔ وہ راج سنگھاسن کے پاس آکر کھڑی ہوئی۔ شفق رنگ آسمان پر نظر ڈالی اور کہا۔ "میں بھی نماز پڑھ آؤں۔ ناصرہ کو تمہارے پاس بھیجتی ہوں"۔

"ناصرہ نماز نہیں پڑھتی ـــــ؟" دیپالی نے پوچھا۔

"نماز ـــــ؟ وہ خدا ہی کو نہیں مانتی۔ وہ اپنے ماموں پر پڑی ہے۔ اللہ کی شان ہے۔ مولانا برہان الدین احمد کا بیٹا اور نواسی دونوں ملحد"۔ رابعہ نے جواب دیا اور تیز تیز چلتی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئی۔

چند منٹ بعد اس کی لڑکی ناصرہ نجم السحر ارجمند منزل سے باہر آکر "راج سنگھاسن" پر ٹک گئی وہ ایک حساس، ذہین چہرے والی بیس سالہ لڑکی تھی۔ اور ایک جوشیلی اسٹوڈنٹ لیڈر۔ لگ بھگ اسی عمر میں میں نے انقلابی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ دیپالی نے سوچا۔ پچھلے ایک ہفتے میں دیپالی کی ناصرہ سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔ ناصرہ اسے ایسٹ پاکستان کی پیچیدہ سیاست کے قصے سناتی رہی تھی۔ مولانا بھاشانی کی عوامی لیگ۔ باریسال اور کھلنا کے قحط۔ جیسور کی زرعی تبھاگا تحریک۔ پولس فائرنگ۔ زبان کا ایجی ٹیشن۔ پولس فائرنگ۔ مظاہرے۔ آدم جی جوٹ مل کا فساد۔ عوامی محاذ۔ جیل یاترائیں بنگال کی سیاست کا پرانا نقشہ۔ ادھر مغربی بنگال میں بھی تقریباً یہی سب ہو رہا تھا۔

"میں تمہارے ماموں کے متعلق تمہاری جہاں آرا خالہ کو بتا رہی تھی"۔ دیپالی نے کہا۔

"مجھے ان کے متعلق سب معلوم ہے"۔ ناصرہ نے ناگواری سے جواب دیا۔ "امی اپنے بھائی کو ہمیشہ سے آئیڈیلائیز کرتی رہی ہیں۔ اور جہاں آرا خالہ بھی۔ اور شاید ـــــ اور شاید ـــــ آپ بھی۔ مگر ہم لوگ آپ لوگوں سے زیادہ تیز فہم ہیں۔ ہم کھرا کھوٹا پہچان لیتے ہیں۔ ماموں جان ـــــ کیا خوب چیز ہیں۔ مکمل آدرش دادی۔ مجسم انٹرنیشنل گڈوِل۔ آج پراگ میں ہیں۔ کل قاہرہ۔ پرسوں نیویارک۔ آج اس پولیٹکل پارٹی میں ہیں کل اس میں۔ جہاں منسٹر بننے کے مواقع زیادہ نظر آئیں۔ ادھر کو لڑھک گئے۔ ماسکو اور واشنگٹن دونوں کے خیر خواہ مکمل غیر جانبداری اسے کہتے ہیں"۔

"ناصرہ ـــــ" دیپالی نے رسانیت سے کہا۔ "کل کے باغی آج کے اسٹیبلش منٹ میں شامل ہو چکے ہیں۔ تم آج کی باغی ہو۔ ممکن ہے تم کل کے اسٹیبلش منٹ میں شامل ہو جاؤ"۔

ناصرہ نجم السحر استہزا کے ساتھ ہنسی۔

" دیپالی آنٹی ـــــ معاف کیجئے گا آپ عمر کی اس اسٹیج پر پہنچ چکی ہیں جہاں انسان CYNICISM کو ایک دفاعی ہتھیار۔ ایک زرہ بکتر کی طرح استعمال کرتا ہے۔ اس کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔"

دیپالی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے کہا۔" ناصرہ ڈیر۔ تم نے ایلس ان ونڈرلینڈ پڑھی ہے؟ اُس کی وہ نظم یاد ہے ـــــ

YOU ARE OLD FATHER

WILLIAM, THE

YOUNG MAN SAID

AND YOUR HAIR HAS

BECOME VERY

WHITE

AND YET YOU INCESSANTLY

STAND ON YOUR

HEAD ـــــ

DO YOU THINK AT

YOUR AGE

IT IS RIGHT ?

ناصرہ بھی ہنسنے لگی۔ اور بولی ـــــ" یہ بات تو آپ کے پنڈت نہرو سے کہنی چاہئے۔"

مالا اندر سے تھوے کی ٹرے لے کر آئی۔ اور اسے تخت پر رکھ دیا۔ اس کے واپس جانے کے بعد دیپالی نے کہا۔" ناصرہ۔ تم جہاں آرا سے ملتی رہا کرو۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ وہ بے حد تنہا ہے۔ نیّر الزماں کی بیوی سے اس کی نہیں بنتی۔ دیناج پور اپنی سسرال میں اب وہ رہنا نہیں چاہتی۔ ماں مر گئیں۔ دو جوان بہنوں کی خوفناک موت کا غم سہہ چکی ہے۔ باپ چراغ سحری ہیں۔ وہ ان سے ہمیشہ سے خائف رہی ہے۔ شوہر مر گیا ـــــ جیسا کچھ بھی تھا۔ اب لڑکے نے اپنا گھر بسا لیا۔ وہ کتنی اکیلی ہے۔"

" ہوں گی۔ مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اکمل مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا؟ مجھے بھی وہ بے حد پسند تھا۔ مگر میرے باپ معمولی آدمی ہیں۔ کلاس ٹو افسر۔ ہم لوگ عظیم پورے کے ایک بہت معمولی سرکاری فلیٹ میں رہتے ہیں۔ ہماری کوئی سماجی حیثیت نہیں۔ جہاں آرا خالہ اپنے اکلوتے بیٹے کی خواہش رد کر کے ایک کروڑ پتی انڈسٹریلسٹ کی لڑکی بیاہ لائیں۔ یہ طبقہ ناقابل

معافی ہے ـــــ جب میں پیدا ہوئی تھی جہاں آرا خالہ نے میرے بڑے چاؤ چونچلے کئے تھے۔ میرا نام نجم السحر انھوں نے ہی رکھا تھا۔ امی کو کپڑے بنا کر دیتی تھیں۔ گویا ہماری سرپرستی کرتی تھیں۔ ہم لوگ ان کے POOR RELATIONS تھے۔" غصے میں بپھر کر اس نے ایک کنکر اٹھایا اسے زور سے تالاب میں پھینکا۔ اور بات جاری رکھی ـــــ "اور یہ نواب قمر الزماں۔ ہمارے نانا ـــــ یہ اب تک اس تگڑم میں رہے ہیں کہ ان کو مرکزی کابینہ میں لے لیا جائے۔ ناکام رہے۔ ساری زندگی ان کی سیاسی داؤ پیچ میں گذری۔ اولڈ گارڈ مسلم لیگی۔ جب یہاں زبان کا ایجی ٹیشن ہوا انھوں نے اردو کی موافقت میں آواز اٹھائی جلوس نعرے لگاتا یہاں ارجمند منزل کے پھاٹک پر آیا ـــــ اردو بھاشا چولے نا ـــــ اردو بھاشا چولے نا ـــــ یہ اپنی چھڑی ہاتھ میں لئے ترکی ٹوپی اوڑھے برآمدے میں جا کر چلائے۔ ضرور چولے ـــــ ضرور چولے ـــــ جلوس اتنا مشتعل ہوا کہ پتھراؤ کر دیتا۔ بچ گئے۔ اب یہ ایک پولیٹکل بیک نمبر ہیں اور فرسٹریٹیڈ ـــــ لیکن یاد رکھئے ـــــ" اس نے سنگھاسن پر سے اٹھ کر خطیبانہ انداز میں کہا۔ "یہ نہ سمجھئے کہ چونکہ ہم لوگ اردو امپیریلزم کے خلاف ہیں یا مغربی پاکستان جو ہمارا استحصال کر رہا ہے۔ اس سے متنفر ہیں تو اس وجہ سے ہم انڈیا سے جا ملیں گے۔ ہرگز نہیں۔ جہاں انڈیا سے مقابلے کا سوال پیدا ہوا ہم پاکستان کی حفاظت اور سالمیت کے لئے کٹ مریں گے۔ ہم پکے پاکستانی ہیں ـــــ اچھا دیپالی آنٹی ـــــ اب میں چلوں کل آپ کو ایرپورٹ پہنچانے آجاؤں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اس وقت کہاں جا رہی ہو ـــــ؟"

"گھر ـــــ عظیم پورہ۔"

"تم شادی کے لئے یہاں ارجمند منزل میں نہیں ٹھہری ہو ـــــ؟"

"ہرگز نہیں۔ امی آگئی ہیں۔ وہی ان لوگوں کی محبت میں گھلی جا رہی ہیں۔ میں روزانہ آپ سے ملنے یہاں آجاتی تھی۔ اچھا خدا حافظ۔"

دیپالی اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ روش پر سے گذر کر بہ سرعت پھاٹک کی طرف چلی گئی۔

دیپالی نے رات کی تاریکی میں ڈوبی کائی آلود ارجمند منزل پر نظر ڈالی۔ اندر کمروں میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ چہل پہل گہما گہمی۔ مہمانوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ دو دن بعد اکمل اپنی دلہن کے ساتھ مغربی پاکستان واپس جانے والا تھا۔ وہ پشاور ایرفورس اسٹیشن پر تعینات تھا۔ اپنی کزن ناصرہ کی طرح وہ بھی بڑا شدید قوم پرست پاکستانی تھا۔ پاکستان کی دفاعی سروسیز کا ایک فرض شناس جوشیلا، محب وطن ہوا باز۔

# (۳۷)

# شنکری کا ناچ

نئی دہلی۔
۳ر اکتوبر ۱۹۶۵ء

مائی ڈیئر دیپالی!

تمھارا خط آیا تھا۔ جلد جواب نہ دے سکی۔ اپنی شدید پریشانیوں اور فکروں میں مبتلا تھی۔ میرا بڑا لڑکا کمل اب فوج میں لفٹننٹ ہے۔ وہ محاذ پر لڑ رہا تھا۔ خدا باپ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خیریت سے گھر واپس آگیا۔ مگر ایک بُری خبر سناتی ہوں۔ جہاں آرا کا بیٹا اکمل جموں پر بمباری کرتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر مجھے بالکل اتفاقیہ معلوم ہوئی۔ میں سوچ سکتی ہوں کہ جہاں آرا بے چاری کا کیا حال ہوگا۔ تم تو اس بے چاری کی شادی میں شرکت کے لئے پچھلے سال ہی وطن آئی تھیں۔

جب کمل اور اکمل پیدا ہوئے ہیں تو یاد نہیں کس نے یا تم نے یا میرے شوہر نے کہا تھا کہ کسی لفظ کے پہلے ا (अ) لگانے سے اس لفظ کی ضد بن جاتی ہے۔ سچ یہ نام ہی منحوس نکلا۔

موجودہ صورتِ حال میں جہاں آرا کو تعزیت کا خط لکھنا بھی ممکن نہیں۔ کیا قیامت ہے۔ تم اور جہاں آرا ٹیگور کا "شنکری ناچ۔ اتی گمبھیر نیل اومبرے ڈمرو باجے" بہت گایا کرتی تھیں ـــــ سو بچارہ اکمل مرشد زادہ نیل اومبر میں ڈمرو بجانے گیا اور اس کے اپنے پرخچے اڑ گئے۔ ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر تمھاری شنکری زوروں میں ناچ گئی۔ تم وہاں آرام سے بیٹھی ہو۔ خوش قسمت ہو۔ بچ دوڑ۔

بیرسٹر صاحب کو سلام

تمھاری
روزی

## ۳۸

# گڈلک ڈائری

یکم جنوری ۱۹۶۷ء — ۱۶ پوش ۱۳۷۳ — ۱۹ رمضان ۱۳۸۶ھ — ۱۸ پوہ ۲۰۲۳

نام : یاسمین بلمونٹ

دفتر کا پتہ :-

گھر کا پتہ :-

ٹیلیفون نمبر :-

کار نمبر :-

ڈرائیونگ لائسنس نمبر :-

ٹی۔ وی۔ لائسنس نمبر :-

بینک اکاؤنٹ نمبر :-

پاسپورٹ نمبر :-

لائف انشورنس پالیسی :-

بلڈ گروپ :- عینک نمبر :-

آج سالِ نو ہے۔ اللہ کا نام لے کر اس نئی نویلی ڈائری کو شروع کرتی ہوں۔ جو ڈھاکہ سے کوئی آنے والا مجھے دے گیا ہے۔ نام ہے "گڈلک ڈائری" اس میں میں لکھ رہی ہوں۔ لہٰذا اس کا نام بیڈلک ڈائری ہونا چاہئے۔ توبہ۔ توبہ۔ یا اللہ میں تیری ناشکری نہیں کرتی۔ ہزاروں سے اچھی ہوں۔ توبہ۔ توبہ۔ اللہ معاف کرنا۔ اللہ تجھ پر میرا سارا حال روشن ہے۔ میرے گناہوں کو معاف کرنا۔ تو غفور و رحیم ہے۔ میں نے بہت نافرمانیاں کیں۔ اپنے حافظ قرآن مولوی باپ کو صدمہ پہنچایا۔ اسٹیج پر ناچی گائی مشرک سے بیاہ کیا۔ وہ بھی جائز نکاح ہی نہ تھا۔ بیٹی کو عیسائی بنوا دیا۔ اللہ میں تیرے غضب کے خوف سے تھر تھر کانپتی ہوں مجھے عذاب قبر سے بچائیو۔ اللہ تجھے اپنے حبیبؐ کا واسطہ۔

آج سالِ نو ہے۔ میں نے سینئر مسز بلمونٹ کو ٹرنک کال کی تھی کہ نئے سال کی مبارک باد اپنی بیٹی

کو دوں۔ معلوم ہوا دادی پوتی دونوں ماس کے لئے چرچ گئی ہوئی ہیں۔ اللہ مجھے معاف کرنا۔ اللہ میں اپنے حالات اپنی مجبوریوں کا شکار تھی۔ اللہ تو تو میرے سب مصائب اور مجبوریوں سے واقف ہے۔ پھر بھی مجھے سزا دے گا؟

ڈیر ڈائری۔ اس ملک کی عورتوں کے بھی خون سفید ہیں۔ شہزاد بیمار پڑی ہے۔ بڑھیا مسز بلمونٹ نے اسے ہسپتال میں ڈال دیا۔ اسے دیکھنے بھی نہیں جاتی۔ وہ گاؤں یہاں سے اتنی دور ہے۔ صبح کو ٹرین سے جاؤ رات کو تھکن سے چور ٹرین سے لوٹو۔ صبح سویرے پھر فیکٹری وقت پر پہنچو۔ یہ بے کیفی مسلسل محنت، جدوجہد کی زندگی کب تک چلے گی۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے تمہارا دل کمزور ہے۔ ڈانس کرنا بالکل چھوڑ دو۔ میری بیٹی شہزاد جس کا اب پورا نام شہزاد کرسٹینا جوزفین بلمونٹ ہے۔ مجھ سے کہتی ہے۔ اس کے دین میں احساسِ جرم اور احساسِ گناہ کی شدت ہی بخشش کا باعث بنتی ہے۔ بہت سے راہب اپنی پیٹھ پر خود کوڑے لگاتے ہیں۔ تو کوڑے تو مجھے زندگی ہی لگا رہی ہے۔ اللہ میرے عیوب سے چشم پوشی کرے۔

---

ڈیر گڈ لک ڈائری۔ پرسوں شام میں شیری کو دیکھ کر ہسپتال سے باہر آئی۔ گاؤں کی خاموش سڑک شدید بارش میں نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں بس اسٹاپ پر کھڑی ہو گئی۔ شیری مجھ سے بہت رکھائی سے پیش آئی تھی۔ شاید اس کی دادی نہیں چاہتی کہ میں اس سے زیادہ ملوں جلوں۔ شہزاد ابھی ٹانگ برابر چھوکری ہے مگر اپنے باپ کی طرح بے رحم اور کائیاں۔ اور دادی کی طرح سرد مزاج۔ وہ شاید یہ بھی نہیں چاہتی کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس کی ماں ایک کالی عورت ہے۔ اس کا اپنا رنگ سفید ہے۔ سبز آنکھیں چوکلیٹ بال۔ اپنے حسین و جمیل باپ پر گئی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دوغلا ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔ آج وہ مجھ سے صاف صاف کہہ رہی تھی۔ "ممی تم بار بار ہر ہفتے مجھے دیکھنے اتنی دور سے کیوں آتی ہو۔ مت آیا کرو۔ میں اچھی ہوں"۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں باہر آ کر سنسان بس اسٹاپ پر کوچ کا انتظار کر رہی تھی۔ مینہ زیادہ تیزی سے برسنے لگا۔ بارش کے قطروں اور میرے آنسوؤں نے میرا چہرہ بھگو دیا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ اللہ اللہ کہتے ہوئے میں چہرے پر اوٹ کر کے ذرا پیچھے ہٹی۔ اس اجنبی نے مجھے اللہ اللہ کہتے سن لیا۔ اردو میں بڑے ہمدردی کے ساتھ دریافت کیا۔ "کیا آپ کا کوئی عزیز اس ہسپتال میں ہے؟"

میں نے جھجک کر اس کی صورت پر نظر ڈالی گورا چٹا، لمبا تڑنگا۔ پنجابی یا پٹھان۔ خاصا خوش شکل۔ برساتی اوڑھے۔ وہ بھی اسی کوچ کا منتظر تھا۔ اس کے دردمند لہجے کے یہ دو بول سن کر میں جو اس وقت

اس لمحے اس اتنی بڑی دنیا میں خود کو بالکل تنہا اور بے سہارا اور بے یار و مددگار محسوس کر رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے تاریک طوفانی برہمپتر کی لہروں پر ایک روشن محفوظ نو کا اچانک نمودار ہو گئی۔ میں نے ممنونیت کے ساتھ اسے جواب دیا۔ میری لڑکی ہسپتال میں ہے۔ اچھی ہے۔ اگلے ہفتے اُسے ڈسچارج کر کر دیں گے۔

تو پھر میں اس بُری طرح بلک بلک رو کیوں رہی تھی۔ اس نے وجہ نہ پوچھی۔ روشن کوچ سلیٹی پھواروں میں سے نمودار ہوئی۔ وہ میرے ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ راستے میں اس نے بتایا بیڈفرڈ سے آ رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس کی کار خراب ہو گئی۔ اسے ایک گیراج میں چھوڑا اب بس پکڑ کر شہر جا رہا ہے۔ آبائی وطن رامپور۔ یہاں لاہور سے آیا ہے۔ بزنس کرتا ہے۔ باتوں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا آپ بنگالی ہیں۔ مگر اردو اتنی صاف کیسے بولتی ہیں اور وہ بھی پنجابی لہجے میں۔ میں نے بتایا میں برسوں سے لندن کی ایک ایسی گارمنٹ فیکٹری میں مزدوری کر رہی ہوں جہاں میری ساتھ والیاں سب پنجابی عورتیں ہیں۔ جی ہاں۔ میں ڈانسر ہوں لیکن ہول سیل نمیص سیتی ہوں۔ ناکام ڈانسر۔

---

ڈیر گڈلک ڈائری۔ آج شام میں اور مقبول دیر تک ہیمپٹن کورٹ کے باغات میں ٹہلتے رہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ عنقریب بارنز میں ایک بہت بڑا مکان خریدنے والا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا مگر عقل مند کو اشارہ کافی ہے۔

---

مقبول کہتا ہے میں فیکٹری میں مزدوری کرنا چھوڑ دوں اور اس کی فرم میں کام کروں۔ چار گنی زیادہ تنخواہ مگر نہ جانے کیوں دل گوارا نہیں کرتا۔ میں اس کی احسان مند نہیں ہونا چاہتی۔ ابھی وہ میری بہت عزت کرتا ہے بہت رکھ رکھاؤ سے ملتا ہے۔ پھر میں اس کی ملازم ہو جاؤں گی اور وہ میرا آقا ــــ نہیں۔ یہ بات غلط ہو گی۔ ہے نا اللہ ؟ تو مجھے صراط مستقیم پر چلائے جائیو۔ آمین۔

---

جب شہزاد چھوٹی سی تھی۔ میں اور جیرلڈ چیلسی کی ایک میوز میں رہتے تھے۔ ٹیلی ویژن پر ایک پلے دیکھا تھا۔ AUTUMN CROCUS ایک غریب اسکول ٹیچر جس کی زندگی میں کوئی رنگ نہیں۔ اسپنسٹر۔ کم مایہ۔ وہ پیسہ جوڑ کر چھٹی گزارنے سوئیٹزرلینڈ جاتی ہے۔ وہاں اسے ایک بڑا دلآویز سا شخص ملتا ہے۔ نہایت اداس۔ ہلکا پھلکا غمناک سا رومانس۔ چھٹیاں ختم ہوتی ہیں۔ وہ آدمی اپنے ملک چلا جاتا ہے۔ اسکول ٹیچر اپنی اجاڑ زندگی میں واپس انگلستان آ جاتی ہے۔

---

بڑھیا مسز بلمونٹ نے آج تک مجھے اپنے گھر نہیں بلایا۔ حرام زادی۔

شہزاد کہتی ہے بہت خوبصورت دو منزلہ مکان ہے۔ بہت بڑا باغ۔ بڑھیا اپنی جوانی میں ونڈمل تھیٹر میں بھی ناچ چکی ہے۔ بہت دولت مند ہے۔ شیری اسی لئے اس کی خوشامد میں لگی رہتی ہے۔ اور کوئی رشتہ دار ہے نہیں۔ بڑھیا اپنے اکلوتے لڑکے جیرلڈ کو عاق کر چکی ہے۔ شہزاد نے آج تک مجھے کوئی معمولی سا تحفہ تک خرید کر نہیں دیا۔ ہاں پچھلی کرسمس پر ایک ہینڈ بیگ لے آئی تھی۔ سال میں دو ایک بار مجھ سے مل لیتی ہے۔ خیر۔ خدا اسے خوش رکھے۔ ابا مجھے عاق کر چکے ہیں۔ دوسرے رشتہ داروں نے مجھے بھلا دیا۔ شاید وہ لوگ میرا ذکر بھی کرتے ہوں گے تو اس طرح کہ جل پائے گوری کے مولویوں کے خاندان کی لڑکی اور آوارہ نکل گئی۔ خاندان کی ناک کٹا دی۔ خیر میرا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ میرے ہم وطن جب کبھی یہاں ملتے ہیں خصوصاً ڈھاکے والے بڑے جوش سے کہتے ہیں۔ کراچی آجائیے۔ آپ کے لئے حکومت ڈانس اکیڈیمی بنا دے گی۔ جب میں نے اس کے لئے خط و کتابت شروع کی۔ وہاں سے کوئی جواب ہی نہ آیا۔ میں بہت کمزور، بہت غیر اہم بہت معمولی ہستی ہوں۔ کون میری سنے گا۔ وہ تو بالکل شروع شروع کی بات تھی۔ ایک بنگالی منسٹر کو خوش کرنا تھا جس کی سفارش پر حکومت نے میرے فارن ٹور کا بندوبست کر دیا تھا۔ اس کے بعد ٹائیں ٹائیں فش۔

ڈیر ڈائری۔ دنیا بہت ہی ذلیل کمینی جگہ ہے۔ منسٹر ریحان الدین احمد کا رویہ دیکھا؟

---

فیکٹری میں میرے ساتھ کی دو پنجابی لڑکیاں بہت اچھی سنگرز ہیں۔ ان میں سے ایک نے مجھے بابا فریدؒ کی ایک چیز سکھائی ——

مرنے تے مینوں ہٹک نہ ملاں
مینوں مرن دا شوق مٹاون دے
کنجری بیناں میری عزت نہ گھٹدی
مینوں نچ کے یار مناواں دے

---

کراچی میں بندر روڈ کے جگمگاتے اونچے فلیٹوں کے نیچے رات کے وقت ایک اندھا فقیر۔ سر پر گول ٹوپی —— ایک بچے کی انگلی تھامے آنکلتا۔ اور منہ اٹھا کر چلاتا —— اے گم کے مارو —— خدا تمہارا گم دور کرے۔ اور دفعتاً بڑے سریلی دلدوز آواز میں گانے لگتا —— نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر۔ رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر پڑی اپنی برائیوں پہ جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا ——

اتوار ۳۰ر جولائی ۱۹۶۷ء ـــ ۲۱ر ربیع الثانی ۱۳۸۷ء ـــ ۱۵ر ساون ۲۰۲۴ ـــ ۱۴ر شرابون ۱۳۷۴ء

گڈ لک ڈائری۔ اس برس کے بھی سات مہینے نکل گئے۔ اور ایک اکیلا تنہا انسان اور اتنے سارے کیلنڈروں میں گھرا ہوا ہے۔ کیوں؟ مسیحی۔ اسلامی۔ بنگالی۔ بکرمی۔ اور شاید ایرانیوں کا ایک اور کیلنڈر ہے۔ نہ جانے اس ڈائری کے چھاپنے والوں نے ایرانی کیلنڈر بھی کیوں نہ شامل کر دیا۔ ذرا وقت کا کنفیوژن اور بڑھتا۔

---

او مانجھی رے۔ اور نگین کشتی والے ملاح۔ کشتی موڑ لے۔ اس گھاٹ سے لگا دے۔ یہ ندی کب تک اس طرح بہے گی۔ اس ناؤ کو کب تک کھینا ہے۔ کس دھن میں شام سویرے کس دھن میں چلا جاتا ہے۔ تیرے دل میں کیا راز چھپے ہیں۔ بھائی مانجھی۔ کیا اس دریا کا کوئی انت نہیں۔ اس کا کوئی سرا نہیں۔ او مانجھی رے۔

---

او ـــ مانجھی رے بھائی۔ اب ہاتھ تھک گئے۔ کشتی کھینے کی اب سکت نہیں۔ میں نے دریا کے مخالف سمت بھی چپو چلائے۔ پر اب ہمت نہیں۔ او مانجھی رے۔

---

یہ سارے بھٹیالی گیت بار بار یاد آتے ہیں۔ میرے دکھی مظلوم خوبصورت دیس کے ملاحوں کے دل نواز دل دوز گیت۔ کیا میں کبھی واپس جا سکوں گی؟

---

آج میں نے دیپالی کو خط لکھا۔

---

روزی اپنے میاں اور چاروں بچوں کے ساتھ مغرب کی سیاحت پر نکلی ہے۔ کیا ٹھاٹھ ہیں۔ میں نے اسے نہیں بتایا کہاں رہتی ہوں۔ کیا کرتی ہوں۔ شام کو ان کے ساتھ جا کر پکیڈلی میں کھانا کھایا ـــ لامحالہ پرانے دنوں کا ذکر نکلا۔ جب روزی اور دیپالی انڈر گراؤنڈ انقلابی ورکرز تھیں۔ روزی کے بچوں کے ساتھ ان کے ہندوستانی میزبان کے لڑکے لڑکیاں بھی تھے۔ میں نے ذکر کیا اسکول میں ہم لوگوں کی آرزو تھی کہ پرتی لتا۔ کلپنا دت اور کنک لتا برو اکی طرح کی ہیروئن بنیں تو روزی کے میزبان کی لڑکی نے پوچھا آنٹی کیا یہ لوگ آپ کے زمانے کی فلم اسٹار تھیں؟

---

"کافکا کہتا ہے کہ بعض الفاظ کا مطلب محض اپنے زخموں کے ذریعے ہی سمجھ میں آتا ہے۔ اور ٹیگور نے بھی ایسا ہی بولا"۔

"اوہ گوڈ۔ کیپ کوائٹ یا سمین یو آر کریزی۔ ڈونٹ ڈسٹرب می۔ میں اپنی کمپنی کے کاغذات دیکھ رہا ہوں"۔

"چھُن چھُن چھُن ـــــ اچھا۔ سنو۔ ایک پولش رائیٹر نے کہا ـــــ"

"ہیں۔ تم نے پھر ناچ شروع کر دیا۔ ڈاکٹر نے تم کو منع کیا ہے"۔

"مینوں نچ کے یار مناواں دے ـــــ ہاہاہا"۔

"فور گوڈز سیک۔ گھنگرو اتارو۔ ڈاکٹر کا حکم مانو ـــــ"

"سنو پولش رائیٹر نے کہا ہے۔ انسان کی روح جو سات تالوں میں بند ہے اس میں ایک پوشیدہ گوشہ ـــــ بتاؤں۔ سُن رہے ہو ـــــ"

"بکو ـــــ"

"ایک پوشیدہ گوشہ ہے۔ جس کو صرف مصائب کی کنجی ہی کھول سکتی ہے۔ اور اس گوشہ میں کامل مسرت اور افضل ترین فہم اور ادراک چھپا ہوا ہے ـــــ اور مقبول ایک جگہ میں نے لکھا دیکھا ہے کہ جب میں مریم تھی میں نے خدا کو دیکھا"۔

"اور بکو"۔

"اور جب ہم اپنی مسرت کے بارے میں سوچتے ہیں اس وقت ہمارا تخئیل بچّے کے تخئیل کی طرح بھولا اور معصوم ہوتا ہے ـــــ اور یہ بھی کہ ہم جس دریچے میں کھڑے ہوتے اس کے سامنے کا منظر ہماری ملکیت ہوتا ـــــ

"اور ٹیگور ایسا بول گیا ہے کہ یاد مندر کی وہ پجارن ہے جو حال کو مار کر اس کا دل مردہ ماضی کے سامنے پیش کرتی ہے"۔

"اور کیا کیا بول گیا ہے؟ تمھارے ٹیگور نے ناک میں دم کر رکھا ہے"۔

"چھُن چھُن چھُن

جو پہرا دے سو ہی پہنوں

جو دے سو ہی کھاؤں ـــــ

جہاں بٹھا دے تاں ہی بیٹھوں ـــــ

"سے یو لو می"۔ میں نے التجا کی۔

"آئی لو یو"۔ اس نے جواب دیا۔

مقبول اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گھڑی دیکھی اور کہا اسے ضروری کام سے جانا ہے۔ خدا حافظ کہہ کر باہر گیا کار میں بیٹھا اور چلا گیا۔ مقبول ایک سیلف میڈ بے حد دولت مند کاروباری ہے اور عموماً سیلف میڈ کامیاب لوگ خود غرض ایگو سنٹرک اور خود پسند اور مغرور ہوتے ہیں۔ وہ بھی ایگو سنٹرک خود پسند اور مغرور ہے۔ مگر بہت سی چیزوں میں اصول پرست ! اور راست باز۔

وہ اپنی ایک کتاب میرے کمرے میں بھول گیا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا کہ سنبھال کر رکھ دوں جب دوبارہ آیا دے دوں گی۔ کتاب میں سے ایک کھلا خط سرک کر نیچے گر گیا۔ زنانہ کچی اردو تحریر۔

ڈیر بیڈ لک ڈائری۔ میں نے وہ خط پڑھا:۔

میرے پیارے خاوند عالی جناب خان مقبول احمد خان صاحب۔ کنیز دست بستہ آداب بجا لاتی ہے اور عرض کرتی ہے کہ واضح ہو کہ منی آرڈر موصول ہوا۔ میں خیریت سے ہوں بچے بھی خیریت سے ہیں گے اور آپ کو یاد کرتے ہیں گے۔ دیگر یہ کہ آپ کو ولایت گئے بہت برس ہو گئے۔ اب آ کر اپنی پیاری صورت دکھا جائیے یا ہم لوگوں کو وہاں جلد از جلد کر کے بلا لیجئے۔ اپنی ہیلتھ کا خیال رکھیں۔ مکرمہ ساس صاحبہ مکرم سسر صاحب آپ کو دعا لکھواتے ہیں۔ پیاری نند شاہدہ خاتون سلام عرض کرتی ہے۔ باقی ہر دم آپ کو یاد کرنے والی

آپ کی

ناچیز زوجہ میمونہ سلطان

آج بتاریخ ۹ ستمبر بمقام لاہور سے پوسٹ کیا۔

---

اصول پرست راست باز خان مقبول احمد خاں صاحب۔ عالی جناب خان صاحب۔ تم بھی

---

۳ اکتوبر۔ گہری رات۔ اُلو کی آنکھ۔ بلی کی آنکھ۔ چیتے کی آنکھ۔ برہن کی آنکھ۔ خاموشی سو رہی ہے۔ زرد خزاں ایک ایسی کمزور بے بس عورت ہے جس کا آدمی اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہو۔ میمونہ سلطان خزاں۔

ہری متی کا یا جانے کس کا دلاری کا ایک بہت پرانا گھسا پٹا ریکارڈ ارجمند منزل میں موجود تھا۔ اور جہاں آرا آپا اسے اکثر بجایا کرتی تھیں ـــ جل جانے دو۔ جل جانے دو اس دنیا کو ـــ یاں کوئی کسی کا یار نہیں۔

تم بھی غم مت کرو میمونہ سلطان۔ اے گم کے مارو۔ گم مت کرو۔

ڈیر ڈائری۔ میں نے ابھی ابھی طے کیا ہے۔ کل گارمنٹ فیکٹری کے سالانہ جلسے میں خوب ناچوں گی۔ WHAT THE BLOODY HELL

---

ڈیر ڈائری۔ تم تو وہی سنہ ستر سٹھ کی پرانی ڈائری ہو۔ آج میں نے اتنے برسوں بعد الماری کے نچلے خانے میں تم کو پڑا پایا۔ ۳ر اکتوبر کے بعد سارے ورق سادے۔ کیا ہوا تھا؟ ہارٹ اٹیک۔ طویل بیماری پھر DOLE پر جینا۔ شہزاد موڈلنگ کر رہی ہے۔ کبھی دیکھنے بھی نہیں آتی۔ روزی دیپالی کسی کو میں خط نہیں لکھتی کیا لکھوں اپنی ساس کا سر؟ مقبول نے اچانک ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ ایک دائم المرض عورت کے ساتھ کون اپنا وقت خراب کرے۔ سنا ہے ایک حسین انگریز لڑکی اس کے ساتھ رہتی ہے۔

اور جب تم گئے تو میں نے دیکھا کہ خدا کے پاؤں کے نشان فرش پر بنے تھے۔ ٹیگور نے کہا تھا۔ ہاہاہا ویری فنی ــــ

BUT WHEN THE NIGHT IS

ON THE HILLS, AND THE

GREAT VOICES

ROLL IN FROM THE SEA,

BY STARLIGHT AND BY

CANDLELIGT HE COMES

BACK TO ME

دُھت ــــ

نادر دام تانا دی رے نا۔ نادر دام تانا دی رے نا ــــ

شیری کا باپ جیرلڈ بلمونٹ ایک GAYLIB رسالے کا اسسٹنٹ اڈیٹر ہو گیا ہے۔ سنا ہے اب ایک جرمن لڑکا اس کے ساتھ رہتا ہے۔ زندگی بڑی ڈراؤنی چیز ہے۔ بھیانک۔

---

ڈیر گڈ لک ڈائری۔ آج صبح برسوں بعد مقبول نے فون کیا۔ بڑی دردمندی سے کہا اگر مجھے ملازمت کی ضرورت ہو۔ ہیمبرگ میں اپنی برانچ میں ہلکا پھلکا ریسپشنسٹ کا کام دے دے گا۔ جس میں مجھے محنت نہ کرنی پڑے۔ میں نے یہ پیش کش قبول کرنے سے انکار کیا۔

---

ڈیر بیڈلک ڈائری۔ آج میں خود مقبول کے دفتر گئی تھی۔ وقت مغرور انسانوں کو بھکاری بنا دیتا ہے۔ میں نے اس سے کہا مجھے وہ جرمنی والی نوکری دیدے۔ بڑے اخلاق سے ملا۔ میرے متعلق خاصا متفکر نظر آتا تھا۔ اگلے مہینے سے انشاء اللہ میں ہیمبرگ میں کام شروع کر دوں گی۔ شہزاد لاپتہ ہے۔ شاید امریکہ چلی گئی۔ باہر برف موسیقی کی طرح گر رہی ہے۔ پرسوں کرسمس ہے۔ میرے ساتھ کرسمس منانے والا کون ہے۔ چچا سارتر نے سچ کہا ہے۔ جہنم دوسرے لوگ ہیں۔ HELL IS OTHER PEOPLE

کرشن چتر دشی میں ــــ اندھیری رات میں ایک بار میں دیپالی کے ساتھ پدما پر گئی تھی۔ وہاں دیپالی نے ہم سب کے نام کے چراغ جلا کر پتوں کی کشتیاں بنا کر ان میں رکھے تھے اور ان کو پانی میں چھوڑ دیا تھا۔ وہ چراغ پانی پر بہتے کچھ دور جا کر گھپ اندھیرے میں کھو گئے تھے۔

---

ریحان الدین احمد سنا ہے۔ کلکتہ سے ڈھاکے واپس چلے گئے۔ انڈیا میں دال زیادہ نہیں گلی۔ اب واپس ڈھاکہ میں بھی منسٹر نہ ہو جائیں تو میرا نام بدل دینا۔ لوگ پرسنلٹی چینج کی بات کرتے ہیں۔

---

"اور میں تو ایسی رحم دل تھی کہ کتوں بلیوں بے عقل چڑیوں تک کی دلآزاری نہ کرتی تھی لوگوں نے مجھے اتنے دکھ کیوں دیئے؟"

---

"MUSIC IN WHERE YOU HEAR IT"

گارمنٹ فیکٹری میں میری سکھ رفیقِ کار منجیت کور بڑے جذبے سے گایا کرتی تھی ــــ اِک بار جو ترے در آوے۔ وہ بھوسا گرتوں ترجاوے۔ ہُن آجا عرشاں والیا ــــ

جانے وہ ہے بھی کہ نہیں۔ اب ذرا ذرا شبہ ہو چلا ہے۔

---

"LOVE IS THE STATE

OF TOTAL SECURITY

NON-LOVE IS THE

STATE OF TOTAL ABSENCE"

---

ڈیر گڈلک ڈائری۔ کل مقبول آیا تھا۔ بہت دیر بیٹھا رہا۔ کہنے لگا۔ میمونہ سلطان پیدائشی IMBECILE ہے۔ چچا کی لڑکی تھی اس لئے نوعمری میں اس سے شادی کر دی گئی تھی۔ اسی وجہ سے

وہ اس کے ساتھ کبھی زیادہ نہیں رہا۔ اب تک وہ اپنی بزنس پھیلانے میں مصروف تھا۔ اسلام میں چار جائز ہیں۔ کیا میں ــــ؟

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

"میں جلد سب معاملات طے کرتا ہوں"۔

"وہ بارنز والا مکان ــــ؟"

"اس سے زیادہ بڑا اور زیادہ شاندار گرد ونر اسکوائر میں"۔

اس کے بعد سے وہ پھر غائب ہے ــــ ادما نجھی رے۔ افسوس کہ یہ ناؤ بھی۔

---

ہیمبرگ برانچ کا منیجر پنجابی ہے۔ جب سے بنگلہ دیش وار چھڑی ہے مجھے طعنے دیتا رہتا ہے۔ میں چپ رہتی ہوں۔ جواب دے کر کہاں جاؤں گی۔ زمانہ انسان کو بزدل اور مصلحت پسند بھی بنا دیتا ہے۔ کل معلوم ہوا مقبول کی بہن بہنوئی اور دو بھائی سب کے سب دوسرے "بہاریوں" کے ساتھ چٹاگانگ میں مارے گئے۔ سنا ہے مقبول کا صدمے کی وجہ سے نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ مجھے اپنے گھر والوں کی خیریت معلوم نہیں اس کالی آندھی میں کس سے معلوم کرواؤں۔ آج صبح یہاں کے سابق مشرقی پاکستانی حال بنگلہ دیشیوں کا ایک گروہ میرے پاس آیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں فوراً اس دفتر میں کام کرنا چھوڑ دوں۔ کیونکہ مقبول پاکستانی ہے۔ میں نے کہا پہلے ہم ہندوؤں کے خلاف تھے۔ اس لئے پاکستان بنایا۔ کیا مقبول مسلمان نہیں ہے؟ مگر وہ پاکستانی ہے۔ اور اگر میں یہاں کام کروں تو غدار ــــ پھر کہاں جاؤں۔ دوسری ملازمت مجھے آسانی سے نہیں ملے گی۔ میرے پاس کوئی اکیڈیمک کوالی فیکیشن نہیں ہے۔ میں نے محض رقص میں مہارت حاصل کی تھی۔ میرے ہم وطن لڑ جھگڑ کر چلے گئے۔

---

آج صبح پنجابی منیجر نے مجھے خود ہی نوٹس دے دیا۔ میں نے مقبول کو ٹرنک کال کیا۔ وہ کراچی گیا ہوا ہے۔

اب میں پھر ڈول پر جاتی ہوں۔

---

ہندو بنگالیوں کے ہاں کالی اور مہادیو کا تصور لرزہ خیز ہے۔ تخریب۔ سنسنی۔ قہر۔ بلا خیز ہلاکت۔ بھینکر اندھکار۔ خون۔ قیامت۔ دیپالی کی پھوپھی بھوتارنی دیبی چندر کنج میں بڑی عقیدت سے جھوم جھوم کر ایک ہندی کیرتن گاتی تھیں۔

اگر ڈم بگڑ ڈم باجے ڈمرو۔ ناچے سدا شو جگت گرو
برہما ناچے وشنو ناچے: ناچے مہادیو
کھپڑے کے کالی ناچے۔ ناچے چاروں دیو
کھپڑے کے کالی ناچے ___ کھپڑے کے کالی ناچے ___

نذرالاسلام کو کالی کے اس تصور نے کتنا فیسی نیٹ کیا تھا۔ کھپڑے کے ___
آتش نوا نذرل کا بنگال اس وقت آگ اور خون میں ڈوب گیا۔ یہ جملہ بھی ڈیر ڈائری ایک کلیشے بن چکا ہے۔ اور کلیشے میں تبدیل ہو کر الفاظ اپنی معنویت اور اہمیت کھو دیتے ہیں۔

---

چار سال گذر گئے۔ چار سال سے میں منتظر ہوں۔ شاید ایک دفعہ مقبول کے دل میں پھر نیکی آجائے اور وہ یاد کرے۔ لیکن اب ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ وہ خود گروونز اسکوائر میں منتقل ہو چکا ہے۔ میں یہاں اس ملک میں شہر بہ شہر ادنیٰ ترین نوکریاں کرتی پھر رہی ہوں۔ مزدور طبقہ کے ترکوں اور ایشیائیوں کی بھیڑ میں شامل۔ ہم وطن اعلیٰ مرتبت بنگلہ دیشی یہاں ملتے ہیں کنی کترا کے نکل جاتے ہیں کہ شاید میں ان سے امداد کے لئے کہوں گی۔ زیادہ تر نئی جنریشن والے تو مجھے پہچانتے ہی نہیں۔ انھوں نے میرا نام تک نہیں سُنا۔ پرانی نسل والوں کے لئے میں اب ایک EMBARRASSMANT ہوں۔ چند ایک نے مجھے سِٹرن مشہور کر دیا ہے۔ کیا واقعی میرا کریک اپ ہوتا جا رہا ہے؟ برتن دھو چکنے کے بعد رات گئے تک، جب تک ریسٹوران خالی نہیں ہو جاتا ایک کونے میں تنہا بیٹھی سڑک کو تکتی، لگاتار سگریٹ پیتی مغربی پوشاک میں ملبوس سانولی عورت۔ خالص انتظار۔ کچھ نہ ہونے کا انتظار۔ کیا مقبول اب بھی سامنے سڑک کے دھندلکے میں سے نمودار ہو سکتا ہے؟ ناممکن۔ اب یہ کیسے ممکن ہے۔

اسی طرح میں ایک روز ایک گوشہ میں بیٹھی سیاہ قہوہ پی رہی تھی۔ ایک خوفناک بوڑھے گلف عرب نے دور سے مجھے نوٹوں کی گڈی دکھائی۔ اس رات سے میں نے طعام خانے میں بیٹھ کر سڑک کو تکنا بھی چھوڑ دیا۔

---

رات آئینے میں مجھے اپنا عکس نظر نہیں آیا۔

---

کل میں فرینک فُرٹ جا رہی ہوں۔

---

---

فرینک فرٹ۔ ۴ر جنوری۔ آج میں نے بنگلہ میں ایک ایسا سیاہ پوش FUGUE لکھا ہے کہ مارتھا گر ہم دیکھ لے تو چلو بھر پانی۔ INDIAN MODE PURAVI-SAD EVENING MELODY

OVERTURE ___ وہ دیکھو دریا سے کہرہ اٹھا۔ غبار تاروں کا اڑ رہا ہے۔

BASS ___ اُداس کھنڈروں کے دھندلکوں میں الم کے مغنی پکارتے ہیں کہ وقت نے صرف غم دیا ہے کہ وقت نے۔ صرف غم

POINT ___ ہمیں یقیں تھا کہ روز فردا کرن کرن دل میں آبسے گا۔ کیا کرے گا جہاں کو روشن۔

COUNTERPOINT ___ الم کے ساتھی سیاہ کپڑوں میں بے دلی کا علم اٹھائے یوں نوحہ زن ہیں۔ یہ وقت کرب و بلا ہے آؤ۔ جھکاؤ سر، آنسوؤں کے دریا بہاؤ یہ وادیٔ محن ہے۔

BASS ___ جنازے واپس گھر کو آئے۔ جنازے واپس۔ جنازے واپس۔

---

بکواس۔ مور بڈ بکواس۔ او۔ کے۔ میں MODE بسنت میں موسم بہار کا بیلے کریوگراف کرتی ہوں۔ دل سخت کرو۔ دل سخت کرو۔ اسی طرح زندہ رہنا ممکن۔

یہ جتنے لوگ سامنے ہم بولت استراسہ پر اس وقت چل رہے ہیں، یہ دراصل کسی قبرستان کسی کریمٹوریم کی سمت قدم بڑھا رہے ہیں۔ جتنے لوگ زندہ ہیں سب POTENTIAL لاشیں ہیں۔ میرے اس میٹے ہاؤس میں جتنے لوگ مقیم ہیں سب فانی۔

۲۴ر جنوری۔ فرینک فرٹ میں کام نہیں بنا۔ واپس، ہیمبرگ۔

اب دریا اور سمندر برف سے ملتے ہیں۔

اللہ۔ میں ترے اسرار سمجھنے سے انکار کرتی ہوں۔ میں تیرے قہر اور ترے جلال اور تیرے غضب کے آگے ایک ذلیل کتیا کی طرح لرزاں ہوں۔ سزائے موت کے قیدی کے مانند جو جلاد کی دستک کا منتظر ہو۔ خداوندا میں تیرے سامنے حاضر ہوں۔

میرا دل ___ جو کالی کا مندر ہے جس میں خلقت اٹا ٹوٹ گھسی ہوئی ہے۔ جس کے تنگ صحن میں بکری کے بچوں کا سر کلہاڑی سے جدا کیا جا رہا ہے۔ کالی کی تین سُرخ آنکھیں سامنے دیکھ رہی ہیں جدھر جہنم ہے۔ کالی کی مورتی کلکتہ کی کالی باڑی میں سولہ سو سال سے زمین میں آدھی دھنسی ہوئی ہے۔ آدھی دفن ہے۔ ہر عورت کی طرح جو ہمیشہ آدھی دفن رہتی ہے۔ اور کالی کے مندر کے فرش پر کتوں کے پلّے لوٹتے پھر رہے ہیں۔ عورتیں بکروں کا سُرخ سُرخ گوشت کاٹ رہی ہیں۔ میرا دل سونا گاچی کی تاریک گلی ہے۔ جس میں میری آرزوئیں میری پشیمانیاں میری حیرتیں پاؤڈر سے لپی پُتی سستی ساڑیوں میں، کونوں کھدروں میں، غلیظ دیواروں سے لگی کھڑی ہیں اور آنے والوں کو تک رہی ہیں۔

ہر آرزو یہ سوچتی ہے۔ اب کا آنے والا مکتی لائے گا۔ اور اس گلی سے نکال لے جائے گا۔

اب سارے دروازے مقفل ہیں۔

گلی تو چاروں بند ہوئی۔ میں ہری ملن کیسے جاؤں۔

جب فون کی گھنٹی بجتی ہے دل لرزتا ہے۔ شاید مقبول نے فون کیا ہو۔ شاید شہزاد نے فون کیا ہو۔ اس لمحے سے میری عقوبتوں میں اضافہ ہوگا۔ میرا ان دیکھا عقوبت رساں مجھے مرتے دم تک کوڑے مارتا رہے گا۔ خداوندا تو جو رحیم و کریم ہے تو نے مجھے اس لئے پیدا کیا کہ میں اس طرح زندہ رہوں اور جانے کس طرح مروں گی ــــ؟ میری زندگی میں او خدائے ذوالجلال تو خوب جانتا ہے کہ بیشتر وقت ایسے آئے ہیں جب میں نے کہا ہے یہ میری زندگی کا بدترین خوفناک ترین لمحہ ہے۔ اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ ابھی اس سے کہیں زیادہ بُرے وقت آنے باقی ہیں۔ میرا خدا میرے دشمنوں کے سامنے میرا سر جھکاتا ہے۔

ڈیر بیڈلک ڈائری۔ میرا کریک اپ ہوتا جا رہا ہے۔ کیا مجھے پرسیکوشن کومپلیکس ہو گیا ہے؟ مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں ــــ

او ماجھی رے۔ اپنی پتوار الگ رکھ دو۔ تمھاری ناؤ ٹوٹ چکی۔ جانے کا وقت آگیا۔

---

"آخری نقطۂ نظر کے آگے اور کوئی منظر نہیں ہے۔"

---

دوسرا ہارٹ اٹیک۔ میں نے ریحان الدین احمد کی بہن رابعہ آپا کو ان کے ڈھاکے کے پرانے پتے پر خط لکھا ہے۔ کہ اگر میں یہاں مر جاؤں تو میری غائبانہ نماز جنازہ ڈھاکے کی کسی مسجد میں ادا کروا دیں۔

کیا یہاں سب بدباطن ہیں بھرتری ہری نے لکھا تھا معصوم انسانوں کے لئے ہر جگہ بدباطن انسان موجود ہیں۔ سانپ کی طرح ایک آدمی کا کان چاٹنے کے لئے دوسرے کو ختم کر دیتا ہے۔ بُرے انسان پستی سے بلندی کی طرف ترقی کرتے ہیں۔ جس طرح شفاف پانی سانپ کے منہ میں پہنچ کر زہر بن جاتا ہے۔ اسی طرح معصوم آدمی کے الفاظ بدمعاش کے منہ میں پہنچ کر زہر بن جاتے ہیں۔ میں بدمعاشوں کے نشتروں کو ضبط کر کے ہنسا ہوں۔ کب تک؟ کب تک بھرتری ہری؟

کہیں میں نے یہ بھی پڑھا کہ دنیا THERMODYNAMICS کے دوسرے اصول پر عمل کر رہی ہے۔ کنفیوژن بڑھ رہا ہے۔ نظام عالم ختم ہو رہا ہے۔ دنیا اسی طرح بہت جلد نیست و نابود ہو جائے گی۔ سورج سرد پڑ جائے گا۔ مذہب کہتا ہے قیامت آئے گی۔ شاعر کہتا ہے۔ نہیں سب کچھ باقی رہے گا۔

انسانیت زندہ رہے گی۔ اللہ جانے۔

---

میں بہت وقار سے مرنا چاہتی ہوں۔

---

دکھ سکھ۔ جنون اور صحیح الدماغی۔ محبت اور نفرت۔ جنگ اور امن۔ غربت اور امارت شکست اور فتح۔ شرافت اور رذالت۔ گناہ اور معصومیت۔ زندگی اور موت سب میں فقط بال برابر کا فرق ہے۔ پل کی پل میں انسان ادھر سے اُدھر ہو سکتا ہے۔

ڈیر گڈلک ڈائری۔ کل رات میری بیٹی شہزاد کی شکاگو سے ٹرنک کال آئی میں گھر پہ نہ تھی۔ آج وہ پھر فون کرے گی۔ بہت دنوں بعد اس کی آواز سنوں گی۔ میں بے انتہا مسرور

(ناتمام)

## ۳۹

# شہزاد کرسٹینا بلمونٹ

ہیمبرگ۔ ۱۶ر جون

ڈیر مسز سین۔ آپ مجھے نہیں جانتیں لیکن میں نے اپنی ممّی سے آپ کا ذکر بہت سنا ہے۔ آپ کو شاید اخباروں سے معلوم ہوا ہو۔ میری والدہ مادام یاسمین بلمونٹ ایک حادثے کا شکار ہو گئیں۔ ایلب کے کنارے کنارے جا رہی تھیں پاؤں پھسل گیا۔ میرا ذاتی خیال ہے وہ خود دریا کے اندر چلی گئیں۔ میں آپ سے واقف نہیں۔ ممّی سے خاصی واقف تھی۔ میرا ذاتی خیال ہے آپ ٹیگور، گاندھی، سروجنی نائیڈو، نہرو وغیرہ کے پرستار لوگ خاصے کنفیوزڈ اور بھولے تھے۔ آپ لوگ اب COPE نہیں کر سکتے۔ COPE تو میں بھی نہیں کر رہی ہوں لیکن مجھے کوئی دعوے نہیں ہیں۔ آپ لوگوں کو (ممّی سمیت) بہت دعوے تھے۔ میں جانتی ہوں میں ایک تیرتا ہوا تنکا ہوا میں اڑتا ٹوٹا پر چیونٹی یا کیچوے کی طرح بے بضاعت جاندار ہوں۔ زمان و مکان میں میری کوئی حیثیت نہیں۔ حیات انسانی بالکل مہمل اور لایعنی ہے۔ یقیناً آپ کہیں گی میرے منفی، بیمار خیالات مغربی یوروپین ڈیکیڈنس کا نتیجہ ہیں۔ یوں ہی سہی۔ آپ لوگوں کے مثبت، صحت مند، اعلیٰ روحانی خیالات کا کیا نتیجہ نکلا۔ بات یہ ہے

مسز سین کہ میں چوبیس سال کی عمر میں آپ سے اور اپنی بے چاری رومینٹک غم زدہ آئیڈیلسٹ دکھی ممی سے کہیں زیادہ ہوش مند، تجربہ کار بلکہ خرانٹ ہوں۔ دنیا کا کوئی تجربہ پوچھئے ـــــ ذہنی، روحانی، جسمانی۔ وہ میں کر چکی ہوں۔ کسی سوامی، گرو سرکٹ کا ذکر کیجئے میں وہاں جا چکی ہوں۔ کسی خطرناک سے خطرناک منشیات کا نام لیجئے۔ خاکسار اس سے بہرہ ور ہو چکی ہے۔ اخلاقیات کا آپ لوگوں کا نسخہ بیکار ثابت ہوا۔ ممی کے ساتھ ٹریجڈی یہ ہوئی کہ وہ دوراہے کی تہذیب سے آئی تھیں۔ بنگالی، مسلمان، پاکستانی ہوتے ہوئے انھوں نے مغربی رویے اپنانا چاہے۔ اندرونی روحانی تصادم شدید تھا۔ اس کی تاب نہ لا سکیں اور ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ اب میں آپ کو اصل وجہ بتاتی ہوں وہ کیوں مریں۔ وہ پچھلے بیس بائیس سال سے مغرب میں کافی تنگی ترشی سے گذر رہی تھیں۔ مختلف کارخانوں میں مزدوری کی۔ رقص کا انٹرنیشنل کیریئر بنانے میں ناکام رہیں۔ کیونکہ ڈانسر کی عمر دس سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اور مصائب اور مایوسیوں نے ممی کو قبل از وقت کمزور اور بوڑھا کر دیا۔ دل کا عارضہ لگ گیا لیکن غالباً وہ اس وجہ سے مریں کہ پچھلے دنوں میں نے ان کو شکاگو سے فون پر مطلع کیا کہ میری تصویر پلے بوائے کے سنٹر اسپریڈ پر چھپنے والی ہے۔ میرے لئے یہ بڑے فخر کی بات تھی۔ بہت کم لڑکیاں اتنی خوش نصیب ہیں جن کو یہ اعزاز میسر ہو۔ میں نے ان کو بڑی مسرت کے ساتھ شکاگو سے یہی بتانے کے لئے ٹرنک کال کیا۔ جواباً وہ خوب چیخیں چلائیں اور ریسیور پٹخ دیا۔ چند روز بعد مجھے ان کے حادثے کی خبر ملی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کپڑے پہننے اور اتارنے اور جسم کی اناٹومی کو آپ لوگوں نے اتنی شدید اہمیت کیوں دے رکھی ہے۔ جنس کے بارے میں یہ سارے بے معنی اور لغو رویے میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ بہرحال میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں اب اچھی خاصی کامیاب موڈل ہوں۔ اور اب تک ہر نسل اور قوم کے اتنے آدمیوں کے ساتھ سو چکی ہوں کہ ان کی گنتی بھی مجھے یاد نہیں۔ اور ممی بے چاری محض ایک عدد جیرلڈ ایڈرین بلمونٹ سے شادی کر کے بقیہ عمر اس احساسِ جرم میں مبتلا رہیں کہ جس شخص سے ان کا "نکاح" غلط سلط پڑھا دیا گیا تھا۔ وہ تین سال تک اس کے ساتھ رہیں۔ میرے والد سے علیحدگی کے بعد مجھے یقین ہے مرحومہ نے نہایت پاک دامنی کی زندگی گذاری ہوگی۔ بے مصرف، بے کار، بے معنی زندگی۔ کتنا انمول وقت ضایع کیا بے چاری نے۔ گئی جوانی واپس نہیں آتی۔ انسان دنیا میں صرف ایک بار ہی آتا ہے۔

دوسرا "احساس جرم" ممی کو یہ تھا کہ انھوں نے اپنی اجازت سے مجھے رومن کیتھولک بنوا دیا۔ یہ سب میں آپ کو اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میں پرسوں شکاگو سے یہاں آئی۔ ان کے کمرے میں ان کے سرہانے سے ایک ڈائری برآمد ہوئی۔ کئی سال پرانی ڈائری ہے۔ جس میں وہ وقتاً فوقتاً لکھتی رہیں تھیں اردو بنگلہ۔ کہیں کہیں انگریزی۔ اس میں آپ کا نام اور پتہ بھی درج ہے۔ نہ مجھے بنگلہ آتی ہے نہ اردو۔ آپ کی

پرانی دوست تھیں لہٰذا یہ بے چاری المناک ڈائری میں آپ کو بھیج رہی ہوں۔ میں امید کرتی ہوں آپ اسے ممی کی یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھنا پسند کریں گی۔

میں ہوں آپ کی مخلص
شہزاد کرسٹینا بلمونٹ

P. S. نہ معلوم میرے والد کہاں ہیں۔ سنا ہے لندن میں GAY LIB تحریک کے آرگنائزر میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان سے آج تک ملاقات نہیں ہوئی۔ میری دادی کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ مقبول احمد خاں کون صاحب ہیں۔ ان کو گولی مار دینی چاہئے۔

P. P. S. آپ کی نسل کا دوغلا پن اور اخلاق کے دوہرے معیار حیرت انگیز ہیں۔ آپ لوگ لندن آکر جوق در جوق HAIR اور OH! CALCUTTA دیکھتے ہیں۔ اور پھر ہمیں گالیاں دیتے ہیں۔ ہم نے خود کو پرانی زنجیروں سے آزاد کر لیا ہے۔ شاید اس وجہ سے آپ ہم سے جلتے ہیں۔ معاف کیجئے۔ میں یہ سب آپ کو اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میرے بچپن میں ممی اکثر آپ کی روشن مثال دے کر مجھے لیکچر پلایا کرتی تھیں۔ آپ کیسی بڑی انقلابی تھیں۔ جان پر کھیل کر حصول آزادی کی جدوجہد کی۔ کتنا اعلیٰ کردار تھا آپ کا۔ ہاہاہا۔ آپ کی حاصل کی ہوئی آزادی ایسی آئی کہ خود آپ ہی کو تاریک الوطن ہونا پڑا۔ اور آپ کے انقلابی بلند کردار ہیرو ریحان الدین احمد کو بھی دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ لندن میں پے بوائے کلب میں نظر آئے تھے۔ مخالف ملک کے دو منسٹر ساتھ تھے۔ سب بیٹھے ایک ساتھ شراب پی رہے تھے۔ صبح کو کانفرنس ہال میں ایک دوسرے کے خلاف کڑے بیان دیئے۔ جن کے اثر سے دونوں ملکوں میں مزید خون خرابہ ہوا۔ معصوم غریبوں کی جانیں گئیں۔ اس سے پہلے آئے تھے ممی نے ملنا چاہا صاف ٹال گئے کہ وقت نہیں ہے۔ اگر ممی کوئی اہم ہستی ہوتیں دوڑ کر ملتے۔ سِک۔ سِک۔ سِک۔ یہ آپ لوگوں کے دوہرے معیار تھے۔ مجھے آپ کی نسل نے بہت ڈِزالوژن کیا ہے۔ مسز سین۔ اور اگر ہم لوگ آپ لوگوں سے بغاوت کر کے DRUGS اور سوامیوں کے ریکٹ میں پناہ ڈھونڈتے ہیں تو آپ کیوں متعجب ہیں؟ آپ نے امن کے لئے کام کیا تھا؟ اصل عالمی امن تو ہم چاہتے ہیں۔ مسز سین ـــــ اگر نوجوان لوگ فلاور چلڈرن بن گئے آپ کی بنائی ہوئی دنیا بہت بھیانک معلوم ہوئی۔ وہ اس سے علیحدہ ہو گئے۔ امید ہے آپ میری اس صاف گوئی کو معاف کریں گی۔ اوم شانتی شانتی شانتی۔

شہزاد

## ۴۰

# سوامی آتم آنند شنکر پریمی

روم ایرپورٹ پر ایک نوجوان سفید فام سوامی جی ترشول اور جھولا سنبھالے ساتھ ساتھ چلتے طیارے پر سوار ہوئے۔ اور سیٹ پر مسز سین کے برابر بیٹھ گئے۔ شوا شوا۔ انھوں نے لمبا سانس لے کر کہا۔ اور پھر مالا جپنے لگے۔ مسز سین نے تعجب سے ان کی سنجیدہ صورت کو دیکھا۔ ایسا نوعمر لڑکا اور مسکرانا نہیں جانتا۔

مسز سین نے دوبارہ اس کی شکل پر نظر ڈالی۔ ذرا مانوس معلوم ہوئی۔ مسز سین کو اپنی طرف بغور دیکھتا پاکر سوامی جی نے جھولے سے اپنا تبلیغی لٹریچر نکال کر ذرا درشتی سے ان کی گود میں سرکا دیا۔

"معاف کرنا بیٹے تمھارا نام کیا ہے؟"

"سوامی آتم آنند شنکر پریمی ——" لڑکے نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

"نہیں بیٹے۔ اس سے پہلے کا نام"۔

"مجھے پہلے کا نام یاد نہیں۔ میں اپنی پہلی زندگی بھول چکا ہوں"۔

"او۔ آئی سی"۔ انھوں نے گورے چھوکرے کو نظر بھر کے دیکھا۔ یہ شکل کس کی تھی —— کس کی تھی —— چارلس بارلو۔ آئی سی ایس۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ڈھاکہ —— شاید اس کا بیٹا ہو۔ مسز سین خاموش رہیں۔ کچھ توقف کے بعد انھوں نے گھڑی دیکھی اور بولی۔ ہم لوگ کتنی جلدی ایتھنز پہنچ جائیں گے۔ سائنس کی ترقی کمال ہے"۔

"سائنس ——؟ پراچین کال میں ویمان اڑتے تھے۔ اور مہا بھارت کے زمانے میں ٹیلی ویژن ایجاد ہو گیا تھا۔ انگریز ہندوؤں کی قدیم کتابیں چرا کر لے گئے اور ان کی بنا پر اتنی ترقی کر لی۔ اب امریکن روسی کہتے ہیں چاند پر پہنچ گئے۔ یہ جھوٹ ہے۔ چاند پر کوئی نہیں پہنچ سکتا"۔ سوامی جی نے کہا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"ایتھنز۔ وہاں آشرم قایم کروں گا۔ پھر انڈیا۔ ہردوار۔ لارڈ شوا کا شہر"۔

"انڈیا جا رہے ہو تو قحط زدگان میں کام کرو۔ آج کل وہاں خشک سالی ہے"۔

"قحط زدہ لوگوں کو چاہئے کہ رین گوڈ کی پوجا کریں۔ تاکہ وہ پانی برسائے۔ ہر ہر مہادیو!"

"تم کو چاہئے بیٹے کہ تم رام کرشنا مشن والوں کی طرح خدمت خلق کرو۔ ہندوستان میں بڑی غربت ہے۔"

"غریب لوگ ہمارے شنکر پریم فاؤنڈیشن کے قایم کئے ہوئے مندروں میں آکر پرسادم کھا سکتے ہیں۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"دیکھو بیٹے۔ میں بھی شکتی ـــــ مہاکالی کی پجارن ہوں شاید شنکر بھگوان کی مرضی تھی کہ تم مجھے اس طرح ملو۔ اس لئے میری بات دھیان سے سنو۔ شاید میں تمھارے والد سے واقف ہوں۔ کیا تم انڈین سول سروس کے مسٹر چارلس بارلو کے لڑکے ہو؟"

گوراسنیاسی چونک پڑا۔ پھر اس نے زیادہ مضبوطی سے آنکھیں میچ لیں۔ چہرہ سخت کر کے جواب دیا۔ "او کے۔ چارلس بارلو۔ لیکن میرے لئے وہ ایک اجنبی نام ہے۔ میں ان سے دس سال سے نہیں ملا۔ وہ میرے والد نہیں دادا ہیں۔ میں ان کے بڑے بیٹے ٹامس بارلو کا لڑکا ہوں۔"

وقت اتنی تیزی سے گزر گیا؟ ڈھاکے کے جواں سال حاکم اعلیٰ چارلس بارلو۔ اور اس کی لیجنڈری طور پر حسین بیوی وائلیٹ بارلو کا پوتا اتنا بڑا ہے کہ سوامی بن چکا ہے۔

"بیٹے اگر تم ـــــ"

"شوا ـــــ شوا ـــــ میم آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔ آپ کو کیا دلچسپی ہے؟" سوامی شنکر پریمی نے درشتی سے کہا۔ "میرے گرینڈ پا چارلس بارلو آسٹریلیا میں ہیں۔ ان کی بیوی میری دادی لندن میں جرمن بمباری کا نشانہ بن گئی تھیں۔ اب تک دوبارہ جنم لے کر بھی دوبارہ مر چکی ہوں گی۔ کیا معلوم میرے والد ٹام بارلو بھی مر چکے ہیں۔ میری پھوپھی کیرل بارلو شاید زندہ ہیں۔ مجھے پتہ نہیں۔ میں اور میری بہن بچے تھے جب ڈیڈ اور ممی کی طلاق ہو گئی تھی۔ ممی ایک غیر اخلاقی زندگی گذارتی ہیں۔ انھوں نے ہماری کبھی پرواہ نہیں کی۔ گرینڈ پا چارلس بارلو نے آسٹریلیا میں دوسری شادی کر لی تھی۔ ان کا ایک لڑکا ہے۔ میرا سوتیلا چچا رچرڈ۔ اس کا نام گرینڈ پا نے اپنے مرحوم بھائی ونگ کمانڈر رچرڈ بارلو کے نام پر رکھا تھا۔ جو سیکنڈ ورلڈ وار میں جرمنی پر بمباری کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔ یہ رچرڈ سڈنی میں انٹیریر ڈیکوریٹر ہے۔ اور آدھا GAY۔ میری بہن سوہو لندن میں ایک لزبین کلب چلاتی ہے۔ میری والدہ ایک رئیس زادی ہیں۔ ایک فرنچ جگ لو کے ساتھ ساؤتھ آف فرانس میں رہتی ہیں۔"

شکر ہے وہ تو نارمل ہیں۔ مسز سین نے دل میں کہا۔

"مجھے اس دولت عیش و عشرت، کامیابی، گناہ آلود دنیا سے، چوہوں کی دوڑ سے نفرت ہو گئی۔ سب مایا ہے۔ میں سنیاس لے چکا ہوں۔ ممی آپ کو کہاں ملیں؟"

"تمھاری ممّی مجھے نہیں ملیں۔ میں پورٹ آف اسپین میں رہتی ہوں۔ میرے شوہر بیرسٹر ہیں۔ پچھلے سال وہ ایک سرکاری مقدمے کے سلسلے میں پرتھ گئے تھے۔ میں بھی ساتھ گئی تھی۔ بحیثیت انڈین سنگر ٹیلی ویژن پر انٹرویو لیا گیا تھا۔ تمھارے دادا نے وہ پروگرام دیکھا اور پتہ لگا کر ہمارے ہوٹل ہم سے ملنے آئے۔ ہمیں اپنے شیپ اسٹیشن پر لے گئے۔ وہ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوئے جیسے میں ان کی مدتوں کی بچھڑی ہوئی رشتہ دار ہوں۔ حالانکہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے زمانے میں وہ مجھے اپنا خطرناک دشمن سمجھتے تھے۔ اب وہ اتنے اکیلے تھے۔ تن تنہا اور ضعیف۔ ہاں انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ بنگال سے آسٹریلیا آکر انھوں نے ایک امریکن لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اس سے طلاق ہو گئی۔ اس امریکن بیوی سے ان کا لڑکا سڈنی میں رہتا ہے مگر ان سے نہیں ملتا۔ مسٹر بارلو تم سب کو بہت یاد کرتے ہیں۔ صحت گر چکی ہے۔ تم لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم سب ان سے ایک بار ہی مل آؤ ــــ؟ ان کا پتہ لکھ لو ــــ"

لڑکا رد راکش کی مالا جپتا رہا۔ "ان کو اپنا کرما بھگتنا ہے"۔ اس نے سرد مہری سے کہا۔ "ایک سنیاسی کے لئے خون کے رشتے بے معنی ہیں"۔

مسز سین نے جھنجھلا کر منھ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور ایتھنز تک اس سے بات نہیں کی۔

جب طیارے نے ایرپورٹ پر اترنے کے لئے نیچا ہونا شروع کیا سوامی آتم آنند شنکر پریمی نے اچانک دیپا کی سین کو مخاطب کیا۔ "میرا سوتیلا چچا چرڈ بارلو جو سڈنی میں انٹیریر ڈیکوریٹر ہے مجھے ابھی چند ہفتے قبل پیرس میں ملا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ایک نیا ہوٹل سجانے کے لئے اسے بنگلہ دیش ڈھاکہ بلایا گیا ہے۔ اگر اتفاق سے آپ کی وہاں اس سے ملاقات ہو تو اس سے کہئے گا کہ میں اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ کے بعد ہردوار میں ہوں گا۔ یہ رشی کیش میں میرے آشرم کا پتہ ہے"۔ اس نے اپنا کارڈ سرکایا۔ "اس سے کہئے گا مجھ سے وہاں آن کر مل لے۔ میں اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کروں گا۔ وہ مایا جال میں بُری طرح پھنسا ہوا ہے اور آپ بھی کبھی رشی کیش آئیے۔ شوا ــــ شوا"۔

طیارے نے لینڈ کیا۔ سوامی جی مسافروں کی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ایرپورٹ پر اتر کر ہجوم میں ان کا جھنڈا اور ترشول کچھ دیر تک نظر آتا رہا۔

# ۴۱

# جلسہ گھر

ڈھاکہ ایرپورٹ پر یاسمین مجید یادگار کمیٹی کے اراکین ہار پھول لئے منتظر تھے۔ شریمتی دیپالی سین بنگلہ دیش کی ایک قابلِ فخر بیٹی، مشہور مغنیہ، بنگلہ دیش کی دوسری قابلِ فخر بیٹی، نامور رقاصہ اور شاعرہ مرحومہ یاسمین بلمونٹ کی یاد میں منائے جانے والے تہذیبی جشن کے لئے اتنی دور جنوبی امریکہ سے مدعو کی گئی تھیں۔ مرنے کے بعد یاسمین بلمونٹ "عظیم شاعرہ" بھی قرار دیدی گئی تھی۔ واہ۔ جب وہ زندہ تھی پچیس برس پردیس کی فیکٹریوں میں مزدوری کر کے، فاقے کر کے، ریسٹورانوں میں برتن دھو کے رشتے داروں اور ہم وطنوں کی گالیاں کھا کے، ایڑیاں رگڑ رگڑ کے، سرد بے رحم دریا میں ڈوب کر مر گئی۔ اب اس کے نام پر بین الاقوامی تہذیبی جشن منایا جا رہا ہے۔ جس پر لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ ہو جائے گا۔ یادگار کمیٹی نے مسز سین کو آمد و رفت کا ایر ٹکٹ پیش کیا تھا۔ جسے لینے سے انھوں نے انکار کیا۔ یہ ایک بڑا GHOULISH آسیبی سفر تھا۔ وہ اپنے سورگیہ پتا ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار اور سورگیہ پھوپھی شریمتی بھوتارنی دیبی کی راکھ ساتھ لائی تھیں کہ ان کی وصیت کے مطابق اسے ہردوار لے جا کر گنگا میں ڈال دیں۔ یہ شاید خود دیپالی سین کی وطن کی آخری وزٹ ہو۔ جلد شاید خود ان کا بلاوا سفرِ آخرت کا آجائے۔ سنسار میں کافی تو رہ لیں۔

"آپ کے لئے انٹر کونٹینل میں انتظام کیا گیا ہے"۔ استقبالیہ کمیٹی کے سکریٹری نے کہا۔ "انڈیا سے آئے ہوئے فن کار بھی وہیں ٹھہرے ہیں۔ یا آپ کسی دوست کے ہاں قیام پسند کریں گی؟"

اب ایک وردی پوش شوفر آگے بڑھا۔ "میم صاحب" وہ دانت نکوس کر بولا۔ "نواب صاحب نے ارجمند منزل سے گاڑی بھجوائی ہے۔ خود تشریف نہیں لا سکے۔ آج صبح اخبار میں آپ کا نام دیکھا۔ حکم دیا ترنت تیج گاؤں جا کر آپ کو لے آؤں۔ چلئے"۔ دیپالی نے استقبالیہ کمیٹی سے معذرت چاہی۔ شوفر کے ساتھ تیز تیز چلتی باہر آئی۔ شوفر نے ایک سفید مرسیڈیز کا دروازہ کھولا۔

نواب صاحب بے چارے اب کتنے ضعیف ہو گئے ہوں گے۔ مدتوں سے اس خاندان کی خیر خبر معلوم نہیں۔ ڈھاکہ اور پورٹ آف اسپین میں بہت بڑا فاصلہ ہے۔ جو محض ایر لیٹرز کے ذریعے نہیں پاٹا جا سکتا۔ ۱۹۶۴ء میں وہ پچھلی مرتبہ یہاں آئی تھی۔ اگلے سال اکمل کے مرنے کی خبر معلوم کر کے

بھی جہاں آرا کو خط لکھنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ اب اتنے برسوں بعد ان سب سے ملنے کی خوشی اور اضطراب سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔

مرسیڈیز ڈھاکہ کی سمت رواں تھی۔

"سب لوگ کیسے ہیں؟" اس نے شوفر سے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں۔" اس نے جواب دیا اور انہماک سے کار چلاتا رہا۔ وہ لڑکا سا تھا۔ شاید ارجمند منزل میں نیا نیا ملازم ہوا تھا۔ اس وجہ سے اسے اپنی اہمیت کا بہت احساس معلوم ہوتا تھا۔ اس کی گردن کے پچھلے حصے پر زخم کا گہرا نشان تھا۔

دیپالی نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچتی رہی۔ جہاں آرا کا سامنا کس طرح کروں۔ اکمل کی تعزیت کن الفاظ میں کروں۔ اکمل کو مرے بھی اتنے برس گزر گئے۔ جہاں آرا اب اپنے پوتے کے سہارے ہی جی رہی ہوگی۔ ممکن ہے بہو نے دوسری شادی کر لی ہو۔ اس نے دل ہی دل میں تعزیت کے جملوں کی ریہرسل شروع کی۔ پھر دل کڑا کر کے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف شہر تھا اور یادیں بندوق کی گولیوں کی طرح بوچھار کر رہی تھیں۔ یادیں LAND MINES کی طرح دفن تھیں۔

"میم صاحب گانا سنئے گا ___؟ بنگلہ دیش ریڈیو۔" ڈرائیور نے کہا۔ اور ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔ گنگا کی بھاٹا کا گیت ___ بھٹیالی ختم ہو رہی تھی۔ اب نذرل گیتی شروع ہوئی۔ بدروہی ___ "کہہ دے اے جوان میں سر بلند ہوں۔ اتنا بلند کہ ہمالیہ کی چوٹی بھی میرے آگے سرنگوں۔ کہہ دے اے بہادر کہ اس وسیع آسمان کو چیر کر چاند سورج ستاروں کو توڑ کر جنت دوزخ دہلا کر آسمان سے ٹکرا کر میں سارے عالم کے لئے مجسمہ حیرت بن گیا ہوں۔" نوجوان ڈرائیور نے مڑ کر اطلاع دی:۔ "میم صاحب ہم بھی بہت لڑا۔"

گانا جاری رہا: میں سرکش۔ سنگ دل آتش نوا۔ قیامت کا دوست طوفان تباہی دہشت ہوں۔ دنیا کے لئے سراپا ہلاکت ___ میں ہر چیز کو چکنا چور کر دیتا ہوں ___ اصول شکن۔ بربادی کا دیوتا۔

وہ بے اختیار خود بھی اس کے ساتھ ساتھ گانے لگی۔ اور پل کی پل میں اپنے کالج کے زمانے میں واپس پہنچ گئی۔ جب وہ اور روزی بنرجی اور محمود الحق اور جیوتی سب مل کر جوش و خروش سے یہ گیت گاتے تھے۔

اسے پتہ بھی نہ چلا مرسیڈیز ارجمند منزل کی برساتی میں کب پہنچی۔

ایک پاگل سی عورت جھبڑے سفید بال بکھرائے برآمدے کے ایک در میں بت بنی کھڑی تھی۔ دیپالی کو کار سے اترتا دیکھ کر فوراً اندر بھاگ گئی۔

ایک ملازم نے اس کا سامان کار سے اتارا۔ دیپالی اندر گئی۔ ارجمند منزل سنسان پڑی تھی۔ جہاں آرا

— جہاں آرا — پکارتی وہ زنانخانے میں پہنچی۔ وسطی تالاب بھی خالی پڑا تھا۔ دیپالی اوپر جانے کے لئے منقش چوبی زینے کی طرف مڑی ہی تھی کہ وہ دیوانی عورت بھاگتی ہوئی اندر آئی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر آ — آ — آ — کرنے لگی۔

"مالا۔ میم صاحب کو تنگ مت کر —" ملازم نے جو اسباب اٹھائے پیچھے پیچھے آرہا تھا جھڑک کر کہا۔ پھر مہمان کو مخاطب کیا۔ "میم صاحب — جب سے سب لوگ مارا گیا مالا پاگل ہو گیا ہے۔ اور گونگا بھی ہو گیا ہے۔"

"کون — مارا گیا — ؟"

"سب جنے۔ میم صاحب۔ بڑے نواب صاحب۔ نیّر میاں۔ ان کا بی بی بچے۔ جہاں آرا بی بی۔ ان کا بہو اور پوتا۔ سب مارا گیا۔ آدھی رات کے ٹائم۔ سب بندوق کا نشانہ بنا۔ یہی کوٹھی کے اندر۔ مالا نے سب کو مرتے دیکھا۔ جب سے یہ گونگا ہو گیا —"

دیپالی کی آنکھوں کے سامنے کوندا سا لپکا۔ وہ اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ پھر کھڑے کھڑے زور سے لرزی۔ پھر اس کی ٹانگوں نے جواب دیا۔ دماغ سنسنایا۔ سارے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ آنکھوں کے سامنے سرخ اندھیرا تیرا۔ وہ دھم سے فرش پر بیٹھ گئی — کہہ دے اے نوجوان — جو انمردیں جنت دوزخ دہلا کر۔ عرش سے ٹکرا کر سارے عالم کے لئے مجسمہ حیرت۔ اس نے وحشیوں کی طرح چاروں طرف دیکھا۔ چند لحظے چپ رہی۔ پھر دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کیا۔ اس کے بال بکھر گئے روتے روتے اس نے محسوس کیا کہ وہ انسان ہے۔ وہ درندوں سے بھرے جنگل کا ایک جانور ہے جس کے بھٹ کے باقی جانوروں کو دوسرے زیادہ خونخوار حیوان آکر چیر پھاڑ گئے ہیں۔ اور ان کی لاشیں گدھ کھا چکے ہیں۔ اور سنسان صحرا کی ریت نے ان کے ڈھانچے بھی غائب کر دیئے ہیں اور وہ گیدڑ کی طرح پنجوں سے زمین کھرچتی ان کو یاد کر کے رو رہی ہے۔ پھر اس نے جنگلی بلّی کی طرح رونا شروع کیا۔ اس کی آواز سن کر اجنبی شکلوں والے نوکر چاکر دروازوں میں نمودار ہوئے۔ مالا اور زور سے آ — آ — آ — کرنے لگی۔ جس طرح ایک ناسمجھ بچہ دوسرے بچے کو روتا دیکھ کر ہمدردی میں خود بھی رونے لگتا ہے۔ مالا نے دیپالی کو آنسو بہاتے دیکھ کر آنسوؤں کی جھڑی لگا دی۔

دفعتاً دیپالی چپ ہو گئی۔ آنکھیں خشک کیں۔ اور سپاٹ آواز میں کہا۔ "مجھے بڑے نواب صاحب کے پاس لے چلو۔ ان کو اطلاع کر دو۔ میں آگئی ہوں۔"

"وہ بھی مارا گیا میم صاحب۔" ملازم نے جواب دیا۔ دیپالی نے فرش پر مکّہ مارا۔ "اس بدمعاش جھوٹے کمینے ڈرائیور نے کہا نواب صاحب نے ایرپورٹ کار بھجوائی ہے۔ نواب صاحب نے۔"

"چھوٹے نواب صاحب نے — میں ان کو بلا کر لاتا ہوں۔ وہ ابھی آتے ہوں گے۔ باہر گئے

تھے۔ ابھی آتے ہوں گے۔ میں ان کو خبر کرتا ہوں۔ دھیرج رکھئے میم صاحب۔ نیاز میاں میم صاحب کے لئے ایک گلاس ٹھنڈا پانی ــــ جلدی ــــ" دوسرے خدمت گار نے گھبرا کر کہا اور لپکا ہوا باہر گیا۔

دیپالی اب ایک نیم جان کوکرا سپنیل کی طرح فرش پر سرنگوں بیٹھی تھی۔ اس کے آنسو بوڑھی گنگا کے مانند پھر رواں ہو گئے۔ مالا اس کے نزدیک آکر اکڑوں بیٹھ گئی۔ دیپالی نے آنسوؤں کی چلمن میں سے اسے دیکھا۔ اور پہچانا۔ جہاں آرا کی پرانی وفادار خادمہ مالا۔ وہ اب اپنی دیوانگی میں لکڑ بگے کی طرح ہنس رہی تھی۔ ان دونوں عورتوں نے زندگی کا، دنیا کا انجام دیکھ لیا تھا۔

چند منٹ بعد دیپالی نے سر اٹھایا۔ صدر دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ہاتھ میں "فائیو فائیو فائیو" کا ٹن سنبھالے بڑھیا سوٹ پہنے ریحان الدین احمد دہلیز پر کھڑے تھے۔

نواب قمر الزماں چودھری کے بھانجے۔ ارجمند منزل کے نئے مالک۔ شہید نواب کے واحد قانونی وارث جو قتل عام میں زندہ بچے تھے۔ ارجمند منزل کے موجودہ نواب۔

دیپالی نے سر زور سے جھٹکا۔ اور آنکھیں ملیں کالی جگت کے چوراہے پر بیٹھی پتنگیں بناتی ہے۔ پتنگیں کاٹتی ہے۔ پتنگیں اڑاتی ہے[1]۔

لنچ کے بعد ریحان کار لے کر پاٹ کی فیکٹری چلے گئے جو نواب قمر الزماں اور ان کے فرزند نیر الزماں مرحومین کی فیکٹری تھی۔ جس کے اب وہ مالک تھے۔ زہرہ دیپالی کو آرام کرانے اوپر بیڈ روم میں لے آئیں۔ یہ جہاں آرا مرحومہ کا بیڈ روم تھا۔ دیوار پر ایر فورس یونیفارم میں ملبوس متبسم اکمل مرشد زادہ اور اس کی دلہن کی تصویر لگی تھی۔ یہ پائلٹ آفیسر اکمل مرشد زادہ ستمبر ۶۵ء میں پاکستان کی خاطر لڑتے ہوئے مرا تھا۔ دیپالی کا سر گھومنے لگا۔ وہ دریچے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ جس کے نیچے تالاب اور "دکرم آدتیہ کا راج سنگھاسن" نظر آرہا تھا اور گلاب خاص کا درخت۔

دوسری مسہری پر بیٹھی زہرہ اُدما رائے کی شکایتیں کر رہی تھی۔

"اُدما دیدی نے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔" پان بناتے ہوئے اس نے کہا۔ "وہ بالکل سٹھیا گئی ہیں۔ جس طرح وہ بلیڈیر جا کر لاوارث بلیوں کتوں کو کھلاتی تھیں ان کا خیال تھا ریحان صاحب اور میں بھی ان کے پالتو جانور تھے۔"

"ریحان کے متعلق ساری عمر ان کا یہ رویہ رہا۔" دیپالی نے غیر شخصی انداز سے کہا۔ اب اس لمحے وہ محض ایک دور کی تماشائی تھی۔

"جی ہاں۔ ہمارے لڑکے فرقان کو بھی انھوں نے ہی میرے خلاف بھڑکایا۔ وہ DRUGS

[1] اٹھارویں صدی کے بنگالی شاعر رام پرشاد سین کا ایک گیت۔

کھانے لگا۔ گھر سے نکل گیا۔ ہپّی بن گیا۔ پھر ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ڈھاکہ آ گیا ہے۔ ریحان صاحب بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا چلو ہم بھی کلکتہ کو خیرباد کہتے ہیں۔ ڈھاکہ واپس جا کر نئی زندگی شروع کریں گے۔ ساری عمر گزارنے کے بعد شاید ادھار لئے ان کی سمجھ میں بھی آ گئی تھیں۔ ۶۸ء میں ہم لوگ ایسٹ پاکستان آ گئے۔ ریحان نے کھلنا میں بزنس شروع کر دی۔ وہ بنیادی طور پر سیاسی آدمی ہیں۔ پھر پولیٹکس میں کود پڑے۔ عوامی لیگ۔ شیخ مجیب الرحمٰن۔ وہ سب چکر۔ لڑکا یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ سدھر گیا۔ پھر ریحان صاحب نے اسے آگے پڑھنے کے لئے لندن بھیج دیا۔ ہم لوگ اپنا سارا روپیہ کلکتہ سے کسی ترکیب سے یہاں لے آئے تھے۔

" اس کے بعد جو ہوا وہ آپ کو معلوم ہے فرقان لندن میں تھا۔ زندہ بچ گیا۔ اب باپ کے ساتھ بزنس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

" جب ارجمند منزل پر حملہ ہوا ہم لوگ کھلنا کے ایک گاؤں میں چھپے ہوئے تھے۔ ارجمند منزل کا یہ سارا گھرانا شیخ مجیب کا حامی بن چکا تھا اور جو کچھ ہوا کیوں اور کس طرح یہ لوگ مارے گئے۔ وہ ریحان لنچ کے وقت آپ کو بتا چکے ہیں"۔

" ہاں۔ میں اس کی تفصیل نہیں سننا چاہتی"۔ دیپالی نے مضبوطی سے جواب دیا۔ ریحان نے کس سپاٹ طریقے سے اس قتل عام کا تذکرہ کیا تھا۔ پھر اس نے خود کہا تھا " جب لاکھوں اکٹھے مارے جائیں دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ افراد کی موت کا اتنا شدید صدمہ ذہن پر نہیں رہتا۔ مرگ انبوہ واقعی ایک جشن ہے۔ یہ کسی بھی قتل عام کے پسماندگان کی نفسیات ہو سکتی ہے۔" لیکن اتنا کہنے کے بعد ریحان خود پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔

ریحان کی بہن رابعہ اور اس کا شوہر اور چھوٹے بچے ریفیوجی بن کر کلکتہ چلے گئے تھے اور واپس آ چکے تھے۔ رابعہ کی بڑی لڑکی ناصرہ نجم السحر کلکتہ جانے کے بجائے ایک گوریلا دستے میں شامل ہو گئی تھی اور بہت دنوں تک غائب رہی تھی۔ آزادی کے بعد بھی ہتھیار ڈالنے پر راضی نہیں تھی۔

" میں نے اس لڑکی کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ انتہا پسندوں سے جا ملی تھی بڑی آفت میں پھنستی۔ انتہا پسندوں کے گروہ سے الگ کروا دیا۔ اسکالرشپ دلوا کر اعلیٰ تعلیم کے لئے ماسکو بھجوایا۔ فرینڈشپ یونیورسٹی میں پڑھ کر آئی۔ مگر ماؤسٹ بن گئی۔ یہاں کالج میں لیکچرر ہو گئی۔ اب وہ مجھ سے نہیں ملتی۔ میرے خلاف بکتی پھرتی ہے۔ نہ جانے یہ نوجوان کیا چاہتے ہیں۔ یہ بڑی احسان فراموش نئی نسل ہے"۔ ریحان نے نواب قمرالزماں کی آواز میں دیپالی سے کہا تھا۔ اسے ناصرہ نجم السحر کی تلخ گفتگو یاد تھی جب وہ آٹھ نو سال قبل اس سے یہیں ملی تھی۔ اب ریحان اپنی مرسیڈیز میں بیٹھ کر نرائن گنج جا چکے تھے۔ ان کا اسٹائلش موڈ شاعر بیٹا فرقان اپنا پروگرام تیار کرنے ٹیلی ویژن سنٹر

چلا گیا تھا۔ نوکر چاکر شاگرد پیشے میں تھے۔ دوپہر قیلولے کا۔ سیٹا کا وقت۔

دیپالی دریچے سے ہٹ آئی۔ اور جہاں آرا کے چھپر کھٹ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ریحان کی بیوی زہرہ بہت باتونی تھی۔ متواتر بولتی تھی اور مسلسل پان کھاتی تھی۔ دیپالی نے ترشی سے کہا۔ "زہرہ اب چپ ہو جاؤ مجھے سونے دو۔" کروٹ بدل کر اس نے زہرہ کے متعلق سوچا ـــــ یہ بورژوا سی ان پڑھ کم رُو کم حیثیت زہرہ ریحان کی بیوی ہے اس وجہ سے میں اس سے جلتی ہوں۔ مگر اب کیا جلنا اور کیا بھننا۔ نون سنس۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ مالا پھر آکر بھوتنی کی طرح دروازے میں کھڑی ہو گئی۔

"اری منھ جلی دفان کیوں نہیں ہوتی۔" زہرہ نے غصے سے کہا۔

"رہنے دو زہرہ۔" دیپالی نے التجا کی۔

"دیدی یہ پاگل عورت حرام خور ہر وقت سر پر سوار رہتی ہے۔"

"بیٹھ جاؤ۔ مالا۔" دیپالی نے اس سے کہا۔ وہ چوکھٹ پر بیٹھ کر آ ـــ آ ـــ کرنے لگی۔ جانے وہ دیپالی کو کیا بتانا چاہتی تھی مگر اپنا مطلب سمجھانے سے قاصر تھی۔

زہرہ پاندان بند کر کے بولی ـــ "آپ ـــ آپ تو ریحان کی پرانی گرل فرینڈ ہیں۔ اُوما دیدی نے مجھے بتایا۔ آپ ہی کی وجہ سے ریحان نے جہاں آرا آپا کو چھوڑا۔ مجھے اُوما دیدی سب بتا چکی ہیں۔"

"تم جو بھی کہہ لو زہرہ اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" دیپالی نے سکون سے جواب دیا۔ "گو ریحان نے جہاں آرا کو میری وجہ سے نہیں چھوڑا۔ میں ان کی زندگی میں بعد میں آئی۔"

"آپ بُرا نہ مانئے گا میں نے یوں ہی کہہ دیا۔ میں بہت صاف دل عورت ہوں۔ دیکھئے مجھے خود یقین نہیں آتا۔ میں اٹھائیس سال سے ریحان کی بیوی ہوں۔ پر یقین نہیں آتا۔ میں ایک غریب زردوز کی لڑکی۔ کم علم اور کم عقل۔ اور ریحان الدین احمد جیسے آدمی کی شریک حیات۔ مگر ان کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اور ـــ میں ایک دفعہ منسٹر کی بیوی بھی رہ چکی ہوں۔ اور اب ارجمند منزل کی بیگم ـــ اللہ کی قدرت ہے۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ اللہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے ذلت ـــ"

"آ ـــ آ ـــ آ ـــ" مالا بولی۔

"ریحان بھی تو ایک غریب کسان کے بیٹے تھے۔" دیپالی نے کہا۔

"ہاں مگر نواب کے نواسے تو تھے ـــ میری قسمت اچھی تھی جو اُن سے شادی ہوئی۔"

"ایک بات سنو زہرہ ـــ گویا تمھاری خوش قسمتی تھی کہ تمھارے مفلس باپ نرملیندو رائے کی موٹر کے نیچے آکر مرے اور بطور تلافی اُوما رائے تم کو اپنے ہاں لے گئی اور تم سے ریحان نے بیاہ کیا۔

اور یہاں قتل عام ہوا اور تم ارجمند منزل کی مالکن بنیں ـــ زہرہ خدا کے لئے چُپ ہو جاؤ۔ اور مجھے سونے دو ـــ"

"آ ـــ آ ـــ آ ـــ" مالا نے دہرایا۔

یہ ارجمند منزل ایک بھوت گھر ہے۔ کہتے ہیں جو لوگ اچانک اور بھیانک طریقے سے قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ ان کی آتمائیں ان ہی جگہوں پر منڈلاتی رہتی ہیں۔ کیا ان سب کی آتمائیں مجھے دیکھ رہی ہوں گی۔ ایک روز شام کے وقت وہ سیڑھیاں اتر کر پائیں باغ میں آ گئی۔ اوپر جہاں آرار مرحومہ کے کمرے کا دریچہ روشن تھا۔ جس میں اب زہرہ موجود تھی۔ اور اسی تخت پر بیٹھی مغرب کی نماز پڑھ رہی تھی۔

جہاں آرار تم تو بھوساگر سے پار اتر گئیں۔ مگر میں تم سے کتنی شرمندہ ہوں۔ اس فیکٹری کا مالک اور اس کا گھر کا خانہ داماد نہ بننے کی خاطر ریحان نے تم کو ٹھکرا دیا تھا۔ تم نے ایک غلط آدمی کے ساتھ زندگی جہنم میں گذاری۔ اپنے بیٹے کی موت کا غم اٹھایا۔ پھر خود بیدردی سے بے قصور قتل کر دی گئیں۔ اور آج اسی گھر میں وہی ریحان اور ان کی بیوی نئے نواب اور بیگم کی حیثیت سے براجمان ہیں۔

مایا تیرے کھیل۔

وہ ٹہلتی ہوئی جلسہ گھر کی طرف چلی گئی۔ جس کا دروازہ باغ میں کھلتا تھا۔ کواڑ چوپٹ کھلے پڑے تھے۔ وہ اندر گئی۔ بتی جلائی۔ سامنے دیوار پر ایک بڑی سی تصویر روشن ہو گئی۔ پارسی تھیٹر۔ دھرم تلہ اسٹریٹ۔ کلکتہ۔ چند اور مدھم فوٹوگراف۔ ماسٹر مصطفےٰ۔ سراج الدولہ ناٹک کا ہیرو ـــ مس تنکوری داس دی ینگر۔ مس تارا داس۔ سرلا ناٹک کی ہیروئن ـــ ایک بڑی روغنی پورٹریٹ ـــ نواب زادہ فخر الزماں چودھری۔ اسے یاد آیا۔ یہ ریحان کے نانا تھے۔ نواب قمر الزماں کے جوانمرگ چچا۔ جنھوں نے تھیٹر کے شوق میں اپنے حصّے کی جائداد اڑا دی تھی۔ یہ ان کا جلسہ گھر تھا۔ اس میں نواب زادہ صاحب کے دوست دیپالی کے ٹھاکر دادا بھی سنا ہے آ کر گایا بجایا کرتے تھے۔ پرانے ارسٹوکریٹک بنگال کے تھیٹر پرست رؤسار! ارجمند منزل کے اس جلسہ گھر میں سارا ساز و سامان اسی طرح موجود تھا۔ الماری میں "شاہجہاں" اور "سراج الدولہ" کے کرم خوردہ چوغے۔ نقلی تاج، تلواریں، بانسریاں، سینیریوں کے پردے لپٹے ہوئے ایک طرف رکھے تھے۔ ہال کے چوبی فرش پر گرد جمی ہوئی تھی۔ کونے میں جالے۔ سُرخ اور سفید کٹاؤ کے کام کا جھالردار پنکھا۔ چھت گیریاں نواب زادہ نیّر الزماں کی شادی کے دنوں میں اسی کمرے سے

بکال کر نواب زادہ فخرالزماں مرحوم کے تصنیف کردہ اوپیرا "راجہ بھوج" کا سنگھاسن تالاب کے کنارے رکھ دیا گیا تھا۔ جس پر ارجمند منزل کی بیگمات اور صاحبزادیاں بیٹھ کر خوش گپیاں کرتی تھیں۔

دیپالی جلسہ گھر سے باہر آ گئی۔ اندر بہت حبس تھا۔ اور وحشت۔ باہر پر فضا باغ میں "وکرم آدتیہ کا سنگھاسن" اب بھی موجود تھا۔ گو پینتیس ۳۵ برساتوں کی وجہ سے گل چکا تھا۔ اس کی مورتیوں کے رنگ اڑ گئے تھے۔ اس کے جنگلوں میں اٹھائیس چھوٹی چھوٹی چوبی مورتیاں لگی تھیں چار بڑی چوبی مورتیوں کے سروں پر تخت کھڑا تھا۔ زیادہ تر مورتیاں بالکل شکستہ ہو چکی تھیں سنگھاسن بتیسی کی دیولوک سے جلاوطن اپسرائیں!

گلاب خاص کے نیچے پہنچ کر وہ تخت کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

ایک مرتبہ، گرمیوں کی ایک معطر شام جہاں آرا نے ذکر کیا تھا۔ "دیپالی۔ ہمارے چھوٹے دادا جان نواب زادہ فخرالزماں چودھری اللہ جنت نصیب کرے۔ انھوں نے "راجہ بھوج" کا اوپیرا خود کمپوز کیا تھا۔ راجہ بھوج کا پارٹ بھی خود ادا کرتے تھے۔ تمھارے ٹھاکر دادا راجہ اندر بنتے تھے ــــ کلکتے کی ایکٹرسیں آ کر رمبھا اور اُروشی کے پارٹ گاتی تھیں۔"

اُس شام منہ چڑھی خادمہ۔ مالا حسب معمول تخت کے پاس گھاس پر بیٹھی تھی۔ یاسمین اور روزی بھی آئی ہوئی تھیں۔ جہاں آرا نے حکم دیا ــــ مالا ــــ راجہ بھوج کا قصہ کر ــــ"

"ارے بی بی ــــ ہندو لوگ بولتا ہے کہ دیولوک میں بتیس ٹھو اپسرائیں تھیں۔ ایک روز انھوں نے شیوجی پر بُری نظر ڈالی۔"

"گڈ گوڈ ــــ!" دیپالی اور سب لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسیں۔

"ماؤنٹ کیلاش اور ماؤنٹ اولمپس واقعی بہت دلچسپ جگہیں رہی ہوں گی۔" یاسمین نے کہا۔

"تو بی بی! پاروتی دیبی جل گئیں۔ انھوں نے شراپ دیا کہ اپسرائیں بے جان مورتیاں بن کر راجہ اندر کے تخت میں لگ جائیں۔"

"تو وہ جادو کے سیب کا کیا معاملہ تھا۔؟" اختر آرا نے پوچھا تھا۔

"عورت مرد کی بے وپھائی۔ بی بی۔" مالا نے پان چباتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا تھا "اجین کا راجہ بھرتری ہری اپنی بیوی پر عاشق تھا۔ اسے ایک جوگی نے امر جیون پانے کا سیب دیا۔ اسے کھاؤ تو امر ہو جاؤ۔ وہ راجہ نے اپنی بی بی انگ سینا کو دیا۔ انگ سینا نے اسے اپنے عاشق سائیس کو دے دیا۔ سائیس مہارانی کو جُل دیتا تھا۔ اور اپنی پریمکا الگ رکھتا تھا۔ جو محل کی داسی تھی۔

وہ داسی بھی سائیس کو دھوکا دیتی تھی اس کا معسوک ایک گوالا تھا۔ داسی نے وہ سیب گوالے کو دیا۔ گوالا بھی داسی کو دھوکے میں رکھتا تھا۔ اس نے اپنی معسوک کو وہ سیب دیا جو اُپلے بیچتی تھی وہ سنہرا سیب ٹوکرے میں اُپلوں کے اوپر رکھے چلی جاتی تھی۔ راجہ بھرتری ہری جنگل میں شکار کھیلنے آیا اس نے اسے دیکھ لیا۔ اپنی رانی اننگ سینا کی بے وفائی سے اس کا دل ٹوٹ گیا۔ تو وہ اپنے بھائی بکرم جیت کو راج پاٹ سونپ کر سنیاس لے لیا۔"

لڑکیاں مبہوت ہو کر یہ اسطوری داستان سن رہی تھیں۔ مالا کہے گئی ــــ "پھر راجہ بکرم جیت کو ایک تنترک جوگی شمشان گھاٹ لے گیا۔ وہاں بیتال درختوں سے الٹے لٹکے ہوئے تھے۔ اور ایک بیتال راجہ کے کندھے پر بیٹھ کر اسے کہانی سناتا تھا ــــ پھر بکرم جیت جو تھے رمبھا اور اروشی کے ناچ کے مقابلے میں جج بنے۔ جج بنے ان کے پھیصلے سے خوش ہو کر راجہ اندر نے اپنا تخت ان کو بخش دیا جس میں وہی بتیس مورتیاں لگی تھیں۔"

لڑکیوں نے غیر شعوری طور پر اس نقلی اسطوری تخت پر نظر ڈالی اور انھیں محسوس ہوا جیسے وہ خود اس دیو مالائی راج سنگھاسن پر موجود تھیں۔

" اور بکرم جیت کے مرنے کے بعد اس جیسا لائق راجہ کوئی نہ ہوا۔ تو اس سنگھاسن کو دفن کر دیا گیا۔ اور صدیوں بعد راجہ بھوج نے اسے کھیت میں سے کھود کر نکلوایا ــــ" جہاں آرا بولی۔ " اور جب وہ راجہ اس تخت پر بیٹھنے کے لئے بڑھا تو ایک مورتی نے آواز دی۔ اس تخت پر وہی بیٹھ سکتا ہے جو راجہ وکرم آدتیہ جیسا سخی اور فیاض ہو ــــ اس طرح راجہ بھوج بتیس مرتبہ تخت کی طرف بڑھے اور ہر مرتبہ ایک ایک مورتی نے للکار کر ان کو وکرم آدتیہ کے اوصاف کے متعلق کوئی قصہ سنایا۔ وفا کیش۔ اصول پرست۔ راست باز۔ بہادر۔ رحم دل۔ یہ۔ وہ ــــ"

تب یاسمین نے کہا تھا ــــ "آئیڈیا ــــ! آپ کے چھوٹے دادا نے اوپیرا بنایا تھا۔ میں اس کا بیلے بناؤں گی۔ اور پتہ ہے اس راج سنگھاسن کی اصل معنویت کیا پیش کروں گی۔؟" پھر اس نے بڑی ڈرامائی انداز میں کہا تھا۔ "یہ راج سنگھاسن دراصل ہے۔ عاؤرت کا دل ــــ!! اور آپا اس وقت یہ فرض کیجئے کہ ہم چاروں آپ، روزی آپا، دیپالی دی اور میں اس کی چاروں بڑی مورتیاں ہیں۔ اور کوئی راجہ بھوج اس تخت پر بیٹھنے کے لئے آئے تو ہم اسے للکار سکتے ہیں ــــ ٹھہرو ــــ تمھارے اندر یہ ــــ یہ ــــ اوصاف ہیں ــــ؟"

دیپالی نے آنکھیں ملیں ــــ جہاں آرا اور یاسمین کے بھوت غائب ہو گئے۔ سامنے تالاب کی منڈیر پر گونگی مالا چپ چاپ بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکے جا رہی تھی۔ دیپالی نے غیر ارادی طور

پر نظریں اوپر اٹھائیں۔ گلاب خاص کی شاخوں سے کیا بیتال الٹے لٹکے ہوئے تھے؟
دور ڈرائیو پر کار آکر رکی۔ ریحان کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی ملازم سے پوچھ رہے تھے۔ "امریکہ والی سین میم صاحب کہاں ہیں؟"
کسی نے جواب دیا۔ "باگ میں۔"

نور گشن باگ میں بہار کی آگ میں
بھرے دل داگ سے درد دل زور رنگیلا کو ثور
— آؤ — آؤ — پیارے —

گلاب خاص کے نیچے لڑکیاں نذرل کا گیت گا رہی ہیں۔ یاسمین کٹھ پتلی کی طرح گردن ہلا ہلا کر منی پوری رقص میں مصروف ہے۔ جہاں آرا اور دیپالی نواب زادہ نیر الزماں کی بری کے جوڑے بیونت رہی ہیں۔

وہ گھاس کو قدموں سے روندتا آکر ایک فضول خیال کی طرح اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بن مالی۔ بن مالی۔ سندھیا کال آج تم کہاں سے آتے ہو۔
"بیٹھ جاؤ ریحان۔"
وہ اپنے نانا نواب زادہ فخر الزماں کے بنوائے ہوئے فرضی راجہ اندر کے نقلی تخت پر بیٹھ گیا۔
اچانک دیپالی کا جی چاہا اسے للکارے۔ ٹھہرو تم اس پر نہیں بیٹھ سکتے۔ ریحان نے ایک سگریٹ سلگایا
"معاف کرنا آج فیکٹری میں بہت دیر ہو گئی۔"
"بنگلہ دیش کی تعمیر نو میں مصروف ہو؟"
وہ چیں بہ جبیں ہو کر دوسری جانب دیکھنے لگا۔
دفعتاً دیپالی کو محسوس ہوا اوپر دریچے میں سے جہاں آرا جھانک رہی ہے۔ اس نے غور سے دیکھا وہ زہرہ تھی۔ بیگم زہرہ ریحان الدین احمد۔ مجھے ہیلوسی نیشن نظر آنے لگے ہیں۔ مجھے اس چھایا لوک سے جلد از جلد بھاگنا چاہئے۔ محفوظ دور افتادہ پورٹ آف اسپین، پُرسکون، غیر گنجلک شوہر بیرسٹر للت موہن سین، خوش باس برازیلین بھاوج ماریا روزینا۔ ایسٹ انڈین ملازمہ مسٹریس سرسوتی، نیگرو بٹلر ایلیاس، وہی میری اصل، راحت بخش آرام دہ دنیا ہے۔ بیتالوں کے اس مرگھٹ سے اتنی مختلف۔ یہاں ہر ہر قدم پر ایک بیتال ایک ایک پرانا قصہ دہرایا جا رہا ہے اور جنات کانوں میں مسلسل پوچھ رہے ہیں۔ اور سناؤں؟ اور سناؤں —؟ اور سناؤں —؟
ریحان نے بھی نظریں اٹھا کر جہاں آرا کے کمرے کے دریچے کو دیکھا۔ دیپالی پر نظر ڈالی اور

آنکھیں جھکا لیں۔

" مالا ــــ مالا برابر آ ــــ آ ــــ آ کر کے مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کی بات سمجھے بغیر یہاں سے چلی جاؤں گی"۔

" ہاں۔ کاش میں بھی اس کی بات سمجھ سکتا۔ کاش ہم سب ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے"۔

دیپالی۔ جہاں آرا۔ یاسمین مجید ــــ تین مورتیوں میں سے دو بڑی بُری طرح ٹوٹیں۔

دیپالی نے "وکرم آدتیہ کے سنگھاسن" کی ایک مورتی پر ہاتھ رکھ کر دل میں کہا۔

پالکی چلے ــــ پالکی چلے ہو ہو ــــ وہ آہستہ سے گنگنانے لگی۔

" دیپالی۔ میں نے آج سے پینتیس سال قبل تم سے آخری بار گانا سنا تھا۔ چندر کنج کے پھاٹک پر ــــ اسی طرح گودھولے کے وقت ــــ"

" سنا ہوگا۔ مجھے یاد نہیں۔ ریحان تم نے۔ تم نے اتنے شرم ناک سمجھوتے کیسے کر لئے ــــ کلکتے میں بھی اور یہاں بھی"۔ وہ غم و غصّے سے جھنجھلا کر رہ گئی۔

" سمجھوتہ! کیا تم نے نہیں کیا؟ کیا تم نے پورٹ آف اسپین میں سمجھوتہ نہیں کیا؟"

" میں نے اپنا ضمیر نہیں بیچا"۔

" یہ بات تم کہہ سکتی ہو"۔ وہ بھی جھنجھلا گیا۔ عمر رسیدہ لوگوں میں قوت برداشت کم ہو جاتی ہے۔

" اچھا۔ چلاؤ نہیں۔ لوگ سنیں گے تو کہیں گے وہ جھکّی بڈھے بُڑھیا کیوں لڑ رہے ہیں"۔

ریحان نے تلملا کر سگریٹ اپنے بوٹ کے نیچے کچلا۔

" یہاں اتنی خونریزی ہوئی اور نتیجہ کیا نکلا؟ مغربی پاکستان سے آئی ہوئی بورژوازی کو نکال کر ایک نئی مقامی بورژوازی نے اس کی جگہ لے لی"۔

" شٹ اپ۔ یو آر اے سِلی اولڈ وومن۔ یہاں کے حالات سے واقف نہیں۔ آجاتی ہیں امریکہ سے یہاں نصیحتیں کرنے"۔ ریحان نے جھلا کر جواب دیا۔

" تم کسی پاگل خانے گئے ہو؟" اس نے ذرا تیز آواز میں کہا۔ "میں ایک مرتبہ اپنے شوہر للت کے ساتھ ایک پاگل خانے گئی تھی۔ برازیل کے ایک شہر میں۔ وہاں ایک آدمی خود کو چار دانی سمجھتا تھا۔ دوسرا کہہ رہا تھا میں جیزس کرائسٹ ہوں۔ ایک عورت کا خیال تھا وہ مگرمچھ ہے۔ ایک عورت کو یقین تھا کہ وہ گرینڈ فادر کلاک نگل چکی ہے۔ وہ مستقل ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک کر رہی تھی۔ اسی طرح ــــ رونو ــــ ہم سب اپنے آپ کو وہ سمجھتے ہیں جو ہم نہیں ہیں"۔

" معلوم ہے۔ اب آپ بہت عقل مند ہو گئی ہیں۔ مجھے درس دے رہی ہیں"۔

"رونو ــــ ایک قصہ سناؤں؟" دیپالی نے غیر ارادی طور پر سنگھاسن کے پایوں کی باقیماندہ سالم مورتی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "جب ہم لوگ نئے نئے پورٹ آف اسپین پہنچے۔ چھوٹا سا ایک مکان کرائے پر لیا۔ گلی کے سرے پر ہمارے سامنے ایک خوبصورت دو منزلہ مورش وضع کا مکان تھا۔ اس کے نچلے برآمدے میں لب سڑک دو نورانی صورت بڑھیاں برف جیسے سفید بال، روکنگ چیئرز پر بیٹھی نٹنگ کیا کرتی تھیں۔ محلے کے پادری اور ننز ان کے ہاں آتی جاتی رہتیں۔ وہ پابندی سے چرچ جاتیں۔ پاس پڑوس کے غریبوں کی امداد کرتی رہتیں۔ بڑی دھرماتما سادھوی عورتیں تھیں۔

"دونوں بڑھیاں روز صبح دس بجے ٹیکسی پر بیٹھ کر بازار جاتیں۔ ان کا نیگرو باورچی ایک بڑا سا تھیلا لے کر ساتھ جاتا۔ واپسی پر اس کا تھیلا سامان سے بھرا ہوتا۔ ایک روز میں نے سوچا میں اس جگہ اجنبی ہوں۔ میں بھی ان کے ساتھ سبزی ترکاری کی ان دوکانوں پر جاؤں گی جہاں سے اچھی چیزیں مل سکیں۔ کئی دن نکل گئے۔ میں ان فرشتہ صفت بڑھیوں سے نہ مل سکی نہ ان کے ساتھ بازار جانے کے لئے طے کر پائی۔ ایک صبح جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوئی ہی تھیں۔ میں نے سوچا دوسری ٹیکسی لے کر میں بھی ان کے پیچھے چلی چلوں۔ بازار میں پہنچ کر ان کے ساتھ ہی خریداری کر لوں۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا اس دوسری گاڑی کے پیچھے پیچھے چلے۔

"میری ٹیکسی مارکیٹ سے گذر کر واٹر فرنٹ کی طرف چلی۔ اگلی ٹیکسی ایک ہوٹل کے سامنے جا رکی جس کے اندر سے جہازی ملاح نکل رہے تھے۔ ڈرائیور نے ذرا حیرت سے مجھے دیکھا۔ وہ دونوں بڑھیاں اپنی گاڑی سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہوئیں۔ برآمدے میں دس بارہ ملاٹو لڑکیاں صوفوں پر ایک قطار میں بیٹھی سگریٹ پی رہی تھیں۔ میں تعجب سے ٹیکسی میں بیٹھی دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ بڑھیاں باہر آئیں۔ نیگرو باورچی تھیلا اٹھائے ساتھ ساتھ۔ دونوں اپنی ٹیکسی میں بیٹھیں۔ اور واپس چلی گئیں۔ ڈرائیور نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ مس آپ ابھی شاید یہاں نئی نئی آئی ہیں۔ آپ نہیں جانتیں۔ یہ دونوں بڑھیاں پچاس سال پہلے یہاں کی مشہور طوائفیں تھیں۔ یہ دونوں نیو آرلینز سے یہاں آئی تھیں۔ اب اس ہوٹل کی مالک ہیں۔ روز صبح آکر منیجر سے قحبہ خانہ کی آمدنی کا حساب کتاب کرتی ہیں اور رات کی آمدنی کے نوٹ اس تھیلے میں بھر کر لے جاتی ہیں۔ اور آمدنی کا زیادہ حصہ خدمت خلق پر خرچ کرتی ہیں۔ بڑا بڑا پادری لوگ جب یہاں آتا ہے ان کے یہاں ہی ٹھہرتا ہے۔

"جب میں گھر واپس پہنچی۔ وہ دونوں اطمینان سے روکنگ چیئرز پر بیٹھی بائبل پڑھ رہی تھیں۔

"تو رونو ــــ اکثر لوگ دوغلی زندگیاں گذارتے ہیں۔ تم مادموزیل مارسیل اور مادموزیل ماری نہیں ہو۔ تم وہ نیگرو باورچی ہو جو وہ تھیلا اٹھا کر ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ تم بھی شامل ہو۔"

"کیا تم شامل نہیں ہو ــــ؟ کیا تم کو ویسٹ انڈیز، ہجرت کے بعد ایک دولت مند بیرسٹر سے شادی کر کے برطانوی گورنر جنرل کے ڈنرز میں جانے کے بجائے پلانٹیشنز کے مزدوروں میں انقلابی تحریک کی تنظیم نہیں کرنی چاہیئے تھی؟ تم نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ تم تھک چکی تھیں یا ڈزالوژن ہو چکی تھیں یا اب تم بھی آرام اور آسائش کی خواہاں تھیں۔ چراغ مسلسل جلائے رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اب تم محض زبانی یا تخیلی ہمدردی کرتی ہو، لوگوں کی بے انصافی اور بے ایمانی پر خفا ہوتی ہو۔ مگر تم بھی شامل ہو چکی ہو۔ مسلسل علیحدہ رہنا بہت مشکل ہے۔ جو علیحدہ رہتے ہیں ان کو سنکی یا خبطی یا بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔

"میں نے اخباروں میں تمھارے شوہر کا نام ایک دو بار دیکھا ہے۔ وہ اس جزیرے کی سیاست میں حصّہ لے رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ ایک دن وہاں کے وزیر اعظم ہو جائیں۔ اور تم پرائم منسٹرز لیڈی۔ اس وقت دیپالی سین میں تم سے ملنے آؤں گا۔ اور تم سے پوچھوں گا تم کتنی آزاد ہو ــــ تم اور میں لیبوریٹری کی میز پر رکھے ہوئے مینڈک ہیں جن پر زندگی نے اپنے تجربے کیے۔"

"لیکن ہماری طرح سب ہی تو بودے نہیں نکلے" ــــ دیپالی نے دفعتاً بڑی کمزور آواز میں کہا۔ "بہت سے ہیں جنھوں نے اب تک چراغ جلائے رکھا ہے ــــ"

"آل لک ٹو دیم ــــ" ریحان نے سگریٹ تالاب میں پھینکتے ہوئے جواب دیا۔

## (۴۲)

# ناصرہ نجم السحر قادری

روش پر سے گذرتی ایک اداس صورت لڑکی آہستہ آہستہ چلتی آکر تالاب کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔

"آداب ماموں جان"۔ اُس نے ریحان کو سلام کیا۔

"جیتی رہو"۔

"آداب دیپالی ماشی"۔

"جیتی رہو۔ آؤ۔ یہاں بیٹھو"۔ دیپالی نے تخت کی طرف اسے بلایا۔

ریحان نے ذرا رکھائی سے دیپالی کو مخاطب کیا۔ "یہ میری بہن رابعہ کی بیٹی ہیں۔ مس ناصرہ قادری۔ تم سے ان کا ذکر کر چکا ہوں"۔

"ماموں جان پورا نام بتائیے۔ جہاں آرا خالہ مرحومہ نے میرا نام ناصرہ نجم السحر رکھا تھا۔ اور میں دیپالی ماشی سے مل چکی ہوں۔ جب یہ پچھلی بار یہاں آئی تھیں ـــــ سن چونسٹھ میں ـــــ اکمل کی شادی ـــــ اکمل کی ـــــ" اس کی آواز ڈوب گئی۔

"مجھے خوب یاد ہے ـــــ کیسی ہو ناصرہ۔؟" دیپالی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آج مجھے معلوم ہوا کہ آپ ویسٹ انڈیز سے آئی ہوئی ہیں۔ سوچا مل آؤں۔"

"بہت اچھا کیا ـــــ مجھے بہت خوشی ـــــ بہت خوشی ـــــ آج کل کیا کرتی ہو؟"

"پہلے جنگ آزادی میں لڑ رہی تھی۔ اب ایک گرلز کالج میں پولیٹیکل سائنس پڑھاتی ہوں۔ اسی کالج میں جہاں آپ نے اور جہاں آرا خالہ نے پڑھا تھا ـــــ"

"تم جنگ آزادی میں لڑیں"۔ دیپالی نے گویا خود ایک اسٹیٹمنٹ دیا۔

"جی ہاں۔ جب پچھلی مرتبہ آپ یہاں آئی تھیں سنہ چونسٹھ میں۔ پاکستان ایر فورس کے پائلیٹ آفیسر اکمل مرشد زادہ کی شادی میں شرکت کے لئے ـــــ اسی تخت پر اسی طرح ایک شام میں نے آپ سے کہا تھا ـــــ گو ہم مغربی پاکستان کی زیادتیوں کے خلاف ہیں مگر ہم کٹر پاکستانی ہیں اور پاکستان کی حفاظت کے لئے کٹ مریں گے"۔ وہ تلخی سے ہنسی۔

"ناصرہ ـــــ تمہاری والدہ رابعہ کیسی ہیں؟" دیپالی نے تھکی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

"میرے والدین بخیریت ہیں۔ میرے ماموں جان بھی۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر سکتی ہیں۔ بہ خیر و عافیت ہیں"۔ اس نے ریحان پر ایک تحقیر آمیز نظر ڈالی۔

یہ لڑکی ریحان سے کس حد تک متنفر ہے۔ اور وہ خاموش بیٹھا رہا۔ شاید وہ اس منہ پھٹ، منہ زور، تلخ مزاج، بدزبان نئی پیڑھی سے ہار مان چکا تھا۔ ان سے خائف تھا۔ یا اس کا ضمیر مجرم تھا۔ دیپالی کو وہ وقت بڑا ہی وحشت انگیز معلوم ہوا۔ مجھے یہاں سے بھاگنا چاہئے۔ سیاسی گفتگو کو ٹال کر وہ کچھ دیر تک ناصرہ سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔

اسکوٹر کی گڑگڑاہٹ۔ فرقان نے اسکوٹر لا کر سنگھاسن کے بالکل قریب روک دیا۔ "کیا اڈا ہو رہا ہے؟" اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

"ہاں۔ تمہاری ہی کسر تھی۔ آؤ"۔ ناصرہ بولی۔

فرقان، دیپالی نے پہلی بار غور سے دیکھا اپنے انداز اور چال ڈھال میں باپ سے بہت مختلف تھا۔

"یہ پہلے بھوکی پیڑھی کے ہمدرد شاعر تھے اب پیٹ بھری پیڑھی کے لیڈر بننے والے ہیں"۔ ناصرہ نے کہا۔

فرقان نے اسکوٹر پر بیٹھے بیٹھے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے۔ "شانتی ! شانتی !!" اس نے ہنس کر کہا۔

" شٹ اپ بوگس فونی پیسی فسٹ ـــــ" ناصرہ نے تلخی سے جواب دیا۔ "معاف کیجئے گا دیپالی دی۔ ہم لوگ ایک بہت بڑی آگ اور طوفان سے ہو کر گزرے ہیں۔ جس کے مقابلے میں آپ لوگوں کی برطانیہ کے خلاف جدوجہد اور تقسیم ہند کی خونریزی ایک پکنک تھی"۔

" شاید یہ ہماری خوش فہمی تھی"۔ دیپالی نے عجز سے کہا۔ " ہم سمجھتے تھے نذرالاسلام کے دِدروہی ہم ہی لوگ تھے"۔

" ہم نے بڑی تباہی دیکھی۔ PACIFIST کے بھیس میں کیا لوگ خود سے سمجھوتے نہیں کرتے؟ امن پسند کا ضمیر کیا کہتا ہے؟" ناصرہ نے پوچھا۔ " انتخاب کیا ہونا چاہئے؟ امن پرستی یا فلسطینی مجاہد؟ امن یا آپ کے نکسلائیٹ؟"

" یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ تم شاید اب بھی ہتھیار نہیں ڈالنا چاہتیں۔ تم شاید ٹائیگر صدیقی کو آئیڈیلائیز کر رہی ہو ـــ تم مسلسل پیہم انقلاب کی بات کرتی ہو ـــ ناصرہ آپا تم بہت MIXED UP ہو"۔ فرقان نے اطمینان سے کہا۔

" یہ ایک بنیادی سوال ہے فرقان احمد ـــ" ناصرہ چمک کر بولی۔ "کسی دوسرے کو MIXED UP کہنا اوچھا ہتھیار ہے ـــ دیپالی ماشی ـــ یہ سارا خاندان ـــ" اس نے ارجمند منزل کی طرف اشارہ کیا۔ " اور ہزاروں لاکھوں مارے گئے۔ میں نے مرگ انبوہ دیکھا۔ میں نے مُلّا کے مذہب کا رول دیکھا۔ میں نے بنگالی پنجابی کی نفرت اور بنگالی بہاری کی نفرت کا سامنا کیا۔ سیاسی لیڈر کا رول دیکھا۔ فرقان احمد! جس وقت ہم یہاں مشین گنوں کا مقابلہ کر رہے تھے تم اپنے باپ کے پیسے کی بدولت لندن میں مصروف عیش تھے"۔ وہ ریحان کو اس طرح نظر انداز کر رہی تھی جیسے وہ اس جگہ موجود ہی نہ ہوں۔ چند منٹ بعد وہ اٹھ کر نزدیک روش پر ٹہلنے لگے۔ دیپالی نے ذرا بے آرامی سے پہلو بدلا۔ دیوانی مالا جو اس دوران میں کوٹھی کے اندر جا چکی تھی۔ دوبارہ کٹھ پتلی کی طرح سر ہلاتی آکر سنگھاسن کے قریب تالاب کی ایک سیڑھی پر بیٹھ گئی اور پھٹی پھٹی خالی خالی نظروں سے ان تینوں کو دیکھنے لگی۔

اب ناصرہ فرقان سے کہہ رہی تھی ـــ "ہیومنزم اور QUIETISM اور امن پرستی بڑے خوبصورت الفاظ ہیں۔ لیکن تمہارے ولیم پن اور سیس پیئر اور جرمی بینتھم آج تک ایک بندوق کی گولی نہ روک پائے۔ گاندھی نے جرمن یہودیوں سے کہا تھا ہٹلر کے مقابلے میں اہنسا استعمال کریں۔ ہاہاہا۔ جب یہاں ڈھاکہ گھِرا ہوا تھا اس وقت میں ولیم جیمز اور برٹرینڈ رسل کی دہائی دیتی؟ اور تمہارے جارج فاکس کی۔؟ اور تمہارے ٹالسٹائی کی؟"

" ایمرسن۔ جانتی ہو ناصرہ آپا ایمرسن نے کہا ہے کہ جنگ میں دلچسپی ایک کچے اور امیچیور ذہن

کی علامت ہے۔ ایک آدمی کے قتل کی سزا پھانسی ہے مگر ہزاروں لاکھوں قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ ان کے قاتل قومی ہیرو اور جانباز سپاہی اور مادرِ وطن کے سپوت کہلاتے ہیں اور پھر ایک اجتماعی قتل کو ناجائز قرار دینے کے لئے ایک اور اجتماعی قتل کیا جاتا ہے ـــــ ہم بنگالیوں کو ایک کمزور رومینٹک شعر پرست بودی قوم سمجھا جاتا ہے مگر ٹیٹو میسر سے لے کر ٹرسٹ مُوومنٹ تک اور جب سے مکتی باہنی اور نکسلائیٹ تحریک تک سب سے زیادہ تشدد یہیں ہوا ہے۔" فرقان نے کہا۔

"اچھا۔ تو میں تم سے ایک سوال کرتی ہوں ـــــ" ناصرہ نے جوش سے بات کی۔ "آئین اسٹائن بڑے امن پرست تھے کیا اگر وہ اس وقت زندہ ہوتے تو اسرائیلی EXPANSIONISM کے موافقت نہ کرتے؟ ضرور کرتے۔ مغرب کے جتنے یہودی جتنے زیادہ عالم فاضل اور ہیومنسٹ ہیں اتنے ہی زیادہ وہ فلسطینیوں کے مخالف ہیں۔"

"مغرب میں تھوڑے سے یہودی انٹلکچوئل اعتدال پسند بھی ہیں۔" دیپالی نے پہلی بار بحث میں حصہ لیا۔ وہ ایک مدت بعد اس مانوس خالص بنگالی "اڈے" میں شریک تھی۔ مگر اس زبردست جنریشن گیپ کا بھی اسے شدید احساس تھا جو اس وقت اس کے اور ان دونوں کے درمیان حائل تھا۔ وہ ان سے بحث کرتے ہوئے ذرا جھجکتی تھی۔ غالباً آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکی تھی۔ ماضی کے "اڈوں" کا پرانا ساتھی ریحان اپنے خیالات میں کھویا دُور روش پر ٹہلنے میں مصروف تھا۔ اور وہ بھی اب اس کا ساتھی نہ رہا تھا۔

"ہر ذہنی رویہ کلاس کی پیداوار ہے۔ امن پرستی سے بھی چند طبقوں کا فائدہ ہوگا۔ آپ پہلے فیکٹری اونر بن جائیے اور پھر امن کا پرچار کیجئے۔" ناصرہ نے اپنے ماموں اور ماموں زاد بھائی پر کھلی چوٹ کی۔ فرقان خوش دلی سے ہنستا رہا۔ "اور اب شاید تم مذہبی بھی ہوتے جا رہے ہو ـــــ" ناصرہ نے کہا۔

"مذہب میں امن کی اصل روح ہے۔" فرقان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یقیناً! دیپالی آنٹی۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے۔ سی۔ آئی۔ اے نے سوامیوں کے ذریعہ کتنا بڑا جال آدھی دنیا میں پھیلا دیا ہے؟"

"ناصرہ آپا۔ ڈونٹ بی ڈافٹ۔" فرقان نے برطانوی لہجے میں کہا۔ "کسی کو چھینک آئی۔ اور تم نے کہا یہ سی۔ آئی۔ اے کی کارستانی ہے۔"

"اور وہ کتنے کامیاب ہیں۔" ناصرہ کہتی رہی۔ "وہ ایک موٹا مسخرہ بال یوگی جو امریکہ میں ہے۔ ایک مشہور ویسٹرن نوجوان انقلابی، نیو لفٹ کا لیڈر اس کا چیلا بن گیا کیا نام اس کا میں نام بھول رہی ہوں اور چیلا بننے کے بعد اس نے پریس کو بیان دیا! "THE REVOLUTION IS OVER-BABY!"

"ناصرہ آپا۔ بات یہ ہے کہ اب یسوع بھی میرا ہیرو ہے اور حسینؑ بھی اور حسینؑ کی نسل کے

آٹھوں QUIETIST امام۔ وہ اصل QUIETIST تھے اور چشتی صوفیاء۔"

"افیم کا تم پر پوری طرح اثر ہو چکا ہے۔" ناصرہ نے بڑے دکھ سے کہا۔ "مذہب کی امن پرستی! مغرب میں دونوں طرف کی فوجوں کے ساتھ فوجی پادری جاتے ہیں۔ ایک ہی خدا سے فتح کی دعا مانگتے ہیں۔ جو دونوں طرف کے مرنے والوں کے لئے ایک ہی خدا اور اس کے بیٹے سے جنت طلب کرتے ہیں۔ انڈیا پاکستان کی جنگوں میں ایک طرف کے جوان درگا کی تصویریں ساتھ لے جاتے ہیں۔ ست سری اکال کے نعرے لگاتے ہیں۔ دوسری طرف نعرۂ تکبیر اور نعرۂ حیدریؓ۔ اور یہاں تو سن اکہتر میں دونوں طرف اسلام ہی اسلام تھا۔" ناصرہ چپ ہو گئی۔ پلاش کے نیچے گلہریاں دوڑ رہی تھیں۔ سامنے تالاب میں سرخ کنول کھلے تھے ـــــ دیپالی کو خیال آیا البیر کامیو نے کہا تھا۔ انسان کے مسلسل پیہم سوالات اور کائنات کی مکمل خاموشی ـــــ

ناصرہ پھر گرج کر بولی۔ "کبھی چرچ آف انگلینڈ نے یا یوروپ اور امریکہ کے قومی کلیساؤں نے ان جارحانہ لڑائیوں کو ڈناؤنس کیا جو ان کے لوگوں نے ساری دنیا میں لڑیں؟ پچھلی جنگ میں پوپ نے ناتسیوں فسطائیوں کو ڈناؤنس کیا ـــــ؟ اور یہاں تو ـــــ ہمارا یہ پورا دیس ہی مولویوں کا دیس ہے۔ پاکستان کے علماء نے اس جنگ کو ڈناؤنس کیا؟ دونوں طرف ایک سے ایک بڑے مولانا موجود تھے ـــــ یاسمین خالہ مرحومہ کی مثال پیش کروں ـــــ؟"

"کیا مثال ـــــ؟" فرقان نے اب ذرا دھیان سے پوچھا۔

"یاسمین خالہ، شاید تمہاری پیدائش سے بھی پہلے ولایت چلی گئی تھیں۔ سگن بگیچے کے مولانا مجید اللہ کی بیٹی۔ پہلے انھوں نے رقص اپنا کیریر بنایا۔ پھر انھوں نے ولایت میں ایک انگریز فیشن ڈزائنر سے شادی کر لی۔ مولانا مجید اللہ نے ان کو عاق کر دیا۔ حکم صادر کیا کہ کبھی ان کو اپنی شکل نہ دکھائیں۔ یاسمین خالہ کے اپنے لاشعور میں مولویت رچی ہوئی تھی ان کو معلوم تھا کہ انگریز فیشن ڈیزائنر جیرلڈ ایڈرین بلمونٹ سے ان کا نکاح قطعی بوگس تھا ایک FARCE ایک پاکستانی نقلی مولوی صاحب، جو دراصل ایک دوست تھے اور گواہ لوگ سب نشے میں آؤٹ۔ تو احساسِ جرم نے یاسمین خالہ کو ستانا شروع کیا۔ پھر اپنی لڑکی کو اپنی اجازت سے مجبوراً انھوں نے عیسائی بنوا دیا۔ پھر وہ لڑکی نیوڈ ماڈل بن گئی۔ یاسمین خالہ کو ان احساس جرم نے مار ڈالا۔ ان کا ضمیر ان کو کھا گیا۔ ٹھیک ـــــ؟ مجھ کو یہ سب اس طرح معلوم ہے کہ جب ان کو دوسری بار ویسٹ جرمنی میں ہارٹ اٹیک ہوا انھوں نے امی کو بڑا اندوہناک خط لکھا تھا۔ مفصل۔ اور آخر میں لکھا تھا کہ رابعہ آپا اگر میں پردیس میں مر جاؤں یہاں نہ جانے میری لاش کا کیا حشر ہو۔ میری موت کی اطلاع پر ڈھاکے کی کسی مسجد میں میری غائبانہ نماز جنازہ ادا کروا دیجئے گا۔ اچھا تو مولویوں نے یاسمین خالہ کو معاف نہ کیا۔ لیکن جب یہاں کی ہزارہا لڑکیاں ریپ ہوئیں۔

سینکڑوں کو مجبوراً طوائف بننا پڑا تو عالمِ اسلام کے کسی مولوی نے کچھ نہ کہا ــــ" ناصرہ چپ ہو گئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

یہ لڑکی اصل باغی ہے۔ بِدرُوہی۔ ہم لوگ شاید اس حد تک باغی نہیں تھے۔ دیپالی نے سوچا دِدرُوہی۔

" اور آپ کو معلوم ہے دیپالی ماشی۔ لوگوں کو کس طرح مارا گیا؟ ان کو اسپتال لے جاتے تھے وہاں کرسی سے باندھ کر ان کے جسم کا سارا خون نکال لیا جاتا تھا ــــ" دفعتاً وہ زار و قطار رونے لگی۔

AND WOMEN MUST WEEP

AND WOMEN MUST WEEP

دیپالی نے دل میں دہرایا اور خود اپنے آنسو پونچھے۔

" تو پھر کیا میں نہ مارتی۔؟ مَیں نے بھی کومیلا میں اپنے پستول سے ایک پنجابی فوجی سپاہی کو گولی ماردی ــــ اور اس کا جانکنی کا کرب، اس کا تڑپنا اور اس کا مرتا ہوا چہرہ ــــ مرتا ہوا چہرہ مجھے برابر خواب میں دکھائی دیتا ہے"۔ وہ روتی رہی۔ "کیا کرے۔ انسان کہاں جائے؟ کس طرف جائے۔؟" اس نے آنسو خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

" ناصرہ آپا ــــ" فرقان نے آہستہ سے کہا ــــ "میں نے لندن میں ایک بہت پرانی برطانوی فلم دیکھی تھی۔ لرزہ خیز لینٹی دار فلم PATHS OF GLORY پہلی جنگ عظیم کے متعلق ــــ اس جنگ کے زمانے کا ایک گیت لِلی مارلین دونوں طرف مقبول تھا تو دیپالی آنٹی۔ اتحادی سپاہی ایک جرمن لڑکی کو پکڑ لاتے ہیں اور اس سے لِلی مارلین گواتے ہیں۔ اور گاتے گاتے وہ رونے لگتی ہے۔ اور سپاہی خود بھی جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ــــ ایک ــــ شاید نوعمر برطانوی سپاہی ہے جو بہت خوف زدہ ہے۔ اور وہ مورچہ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ اور اُسے پکڑ کر واپس لاتے ہیں۔ بھگوڑے کی سزا موت ہے۔ وہ بیمار پڑتا ہے اسے فیلڈ ہسپتال میں داخل کرتے ہیں۔ اس کا علاج کرتے ہیں۔ جب وہ ذرا بہتر ہوتا ہے اسے اسٹریچر پر ڈال کر میدان میں لاتے ہیں۔ اسٹریچر سمیت نوجوان کو ایک کھمبے سے باندھ دیتے ہیں۔ اور پھر فوجی قانون کے مطابق اسے گولی مار دیتے ہیں ــــ"

ریحان واپس آچکے تھے اور گلاب خاص کے نیچے کھڑے یہ قصہ سن رہے تھے۔ انھوں نے آہستہ سے کہا۔ "شاید میں بھی بھگوڑا ہوں۔ ناصرہ۔ تم۔ اور دیپالی تم ــــ میرے لئے جو سزا چاہو تجویز کر لو"۔

بڑا دہشت ناک سناٹا چھا گیا۔ شام کی ہوا میں جھاؤ کی نازک ڈالیاں سرسراتی رہیں۔

ناصرہ نے سر اٹھا کر پہلی بار ذرا نرمی سے اپنے مضمحل ماموں پر نظر ڈالی اور دھیرے سے کہا۔ "لیکن ماموں جان۔ کیا روسی افواج اور یوروپ کے عوامی محاذ والوں کی سرفروشی کے بغیر فسطائیت کو دہرایا

جاسکتا تھا؟ کیا دفاعی جنگ بھی جرم ہے؟"

"یہ سلسلہ لامتناہی ہے"۔ باپ کے بجائے فرقان نے جواب دیا۔" البیر کامیو نے جنگ کے فوراً بعد لکھا تھا کہ میں کسی ایسی سچائی کو منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں جس کی رو سے بالواسطہ یا براہِ راست مجھے کسی کی زندگی کی قربانی کا مطالبہ کرنا پڑے ــــ کیونکہ اس وقت دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد دنیا نیوکلیر عہد میں داخل ہو چکی تھی ــــ"

اوپر جہاں آرا کے بیڈ روم کی کھڑکی کھلی۔ تیز روشنی کا راستہ سا تالاب تک بن گیا۔ زہرہ نے دریچے میں سے جھانکا۔ پھر اس نے آواز دی ــــ" اڈا ختم کرو۔ کلب سے یاسمین یادگار کمیٹی والے کا فون آیا ہے۔ وہاں ہم لوگوں کا ڈنر پر انتظار کیا جا رہا ہے"۔

" آ ــ آ ــ آ ــــ" تالاب کی سیڑھی پر بیٹھی گونگی مالا برائی۔

## (۴۳)

# رچرڈ بارلو

ڈنر کی طویل میز پر بہت بڑھیا ولایتی کھانا سرو کیا جا رہا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں پھولوں سے سجی یاسمین بلمونٹ مرحومہ کی تصویر رکھی تھی۔ شہر کے اہم انٹلکچوئیل، اخبار نویس، ادیب، چند وزراء اور باقی نئی دولت مند بنگلہ دیشی اپر کلاس کے مرد اور عورتیں چھری کانٹوں سے کھانے کھاتے ہوئے مصروف گفتگو تھے۔

" تاریخ کے اسباق سے انسان کی نصیحت حاصل نہ کرنے کا نام تاریخ ہے"۔ بحری عقاب مچھلیوں پر اب بھی جھپٹا مار رہے ہیں۔

کھانے کے بعد وہ سب جا کر ایوان نشست میں بیٹھ گئے۔ ریحان الدین احمد شارک اسکن کی سفید شیروانی۔ چوڑی دار پائجامہ سلیم شاہی جوتے، سلور گرے بال۔ پہلے سے زیادہ ہینڈسم نظر آ رہے تھے اور اس جگہ جگمگاتے مجمع میں اب بھی ہیرو بنے ہوئے تھے۔ اہم، کامیاب، دولت مند ــــ کل صبح ارجمند منزل میں بریکفاسٹ کی میز پر وہ صاف گوئی سے کہہ رہے تھے۔ میری مرحوم امی کی روح خوش ہوگی۔ جن کے ساتھ ان کے تایا نے بے انصافی کی تھی۔ ان کی جائداد ہڑپ کر کے ان کو ایک غریب کسان سے بیاہ دیا تھا۔ مگر قدرت نے اب ان کے ساتھ انصاف کیا۔ وہ یہ سن کر حیران رہ گئی۔ انسان

کا ذہن، انسان کا دل و دماغ قطعاً ناقابلِ فہم ہے۔ انھوں نے کہا تھا ــــ دیکھو میں نے مدتوں پہلے متحدہ بنگال میں جوتیاں چٹخائیں۔ جیل کاٹے۔ پھر مغربی بنگال میں۔ پھر جب وہاں اور یہاں چانس ملا میں اسے دونوں ہاتھوں سے قبول نہ کرتا؟

شام ناصرہ نے کہا تھا فرقان بھوکی پیڑھی کا شاعر بننے جا رہا تھا اب وہ اس پیٹ بھری پیڑھی کا لیڈر ہوگا۔

کھانا نہایت لذیذ تھا۔ کلب کے چیف شیف نے بہترین فرانسیسی ڈشیں تیار کی تھیں۔ دیپالی نے دوبارہ سوچا۔ اس "جشن یاسمین بلمونٹ" پر کتنا بے تحاشا روپیہ خرچ کیا گیا ہوگا۔ جبکہ خود یاسمین نے برسوں در در کی ٹھوکریں کھائیں اور کارخانوں میں مزدوری کی۔

سیاہ چاند پہاڑ کی چوٹی سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا۔ یاسمین تم کیتکی کا پھول تھیں جس نے سانپوں کو اپنی اور کھینچا۔ زندگی کے سانپ تمھیں ڈس گئے۔

اس کے قریب ایک گروپ پاکستان اور بنگلہ دیش کی سیاست پر تبادلۂ خیالات کر رہا تھا۔ "ہم نے یہ کیا۔ انھوں نے یہ کیا ــــ"

انگریز یا فرانسیسی یا جرمن کہتے ہیں۔ ہم نے یہ جنگ لڑی۔ ہم نے وہ فتح حاصل کی۔ ہم نے فلاں ایکٹ پاس کیا۔ اس سب کونٹینٹ کی ہسٹری میں "ہم" کہیں نمودار نہیں ہوتا ــــ مغلوں نے یہ کیا۔ ہندوؤں نے یہ کیا۔ پہلے انڈیا اور پاکستان الگ الگ "ہم" تھے۔ اب بنگلہ دیش اور پاکستان الگ الگ "ہم" ہیں۔

اچانک اس نے خود کو کہتے پایا:۔ "اگر جناح صاحب نے پاکستان نہ بنایا ہوتا تو آج بنگلہ دیش بھی نہ ہوتا۔" پھر وہ خاموش ہوگئی۔ اور وہ سوچنے لگی۔ "مدر انڈیا" کا تصور بھی باقی ہندوستان کے قوم پرستوں کو دہشت پسند ہندو بنگالیوں نے دیا تھا۔ جو تخریب پسند کالی کے روپ میں شکتی کی پوجا کرتے تھے اور دیبی ماں کے قدیم دراوڑی تصور کے پرستار تھے۔ اور ان اولین دہشت پسندوں میں۔ جن کو انگریزوں نے ٹرر سٹ کہا۔ اور ہندوستانیوں نے انقلابی ــــ کافی اینٹی مسلم بھی تھے۔ اور بنکم چندر کا آنند مٹھ ان کا آدرش تھا۔ اور "بھدر لوگ" کی سیاست اور "مسلم اشراف" کی سیاست کے CROSS-CURRENTS نے پاکستان بنایا۔ اور پاکستان کی سیاست نے بنگلہ دیش ــــ اور انفرادی طور پر مختلف لیڈروں کی شخصیتوں اور کرداروں اور مزاجوں اور اعمال و افعال کے CROSS-CURRENTS کے اثر سے افراد کی اور قوموں کی زندگیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔

وہ جھنجھلا کر سامنے دیکھنے لگی جہاں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ اور فلور پر ریحان الدین احمد کا کیمبرج پلٹ بیٹا فرقان برطانوی سفارت خانے کی ایک لڑکی کے ساتھ مصروف رقص تھا۔ اس لڑکے کی تازہ

ترین ذہنی تربیت جدید، عصری مغرب کی نوجوان نسل کے ذہنی رویّوں نے کی تھی۔ وہ برطانیہ اور فرانس کے "نیولفٹ" اور طارق علی کے دور کے بعد کی پروڈکٹ تھا۔ کیا اس امن پرست انٹلکچوئیل فرقان احمد کو معلوم ہے کہ ایک زمانہ میں انقلابی نظمیں لکھنے کی سزا کالا پانی تھی؟ کیا ہم پر تاریخ کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے؟ میرے چچا دینیش چندر سرکار پھانسی کے تختے پر کیوں لٹک گئے؟۔ ان کا نام اب کسے یاد ہے؟ یا اشفاق اللہ کا؟ اور اس باغی ناصرہ نجم السحر کا کیا ہوگا؟ کیا بہت جلد وہ خود بھی اپنے موجودہ خیالات کو ترک نہیں کر دے گی؟ کیا کسی ایسے رویّے کے BACKLASH کے طور پر پھر کوئی نیا رویّہ نمودار نہیں ہوگا؟ ناصرہ کب تک باغی رہ پائے گی؟ جب انقلابی مسلسل ایک دوسرے کو REVISIONIST کہہ رہے ہیں؟ جب خود انقلابی اعتدال پسندوں کو انتہا پسند ایک ESTABLISHMENT پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور جب لیڈروں کے ذاتی کرداروں اور ان تعصبات، کمزوریوں اور ان کے مزاجوں اور اعصابی کیفیتوں کا اثر ان کی رہبری پر پڑتا ہے؟ پائلیٹ جو مسافر بردار طیارہ اڑاتا ہے۔ اس کی صحت اور اعصاب کا برابر معائنہ کیا جاتا ہے۔ مگر لیڈر کی ذہنی اور اعصابی صحت کو بالکل نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ہم لوگوں نے، ہماری جنریشن نے کیا کیا ــــ؟ اب ایسا لگتا ہے کہ ہم لوگ ہیچ ہائیکر تھے راستے کے کنارے کھڑے انگوٹھے دکھا رہے تھے۔ ایک کار رکی اس نے لفٹ دے کر ماسکو پہنچا دیا دوسری کار رکی اس نے واشنگٹن۔ کچھ لوگ اونٹ پر بیٹھ کر مکہ مدینہ واپس چلے گئے۔ کچھ بیل گاڑی پر بیٹھ کر بنارس۔

میرے لئے جو کار رکی وہ ذرا آگے جا کر ہی فیل ہو گئی۔

بنگال کی ویشنو مت میں ہر مرد کرشن اور ہر عورت رادھا کی تصویر ہے۔ گو اس کو یہ بات معلوم نہیں۔ تو کیا ریحان کرشن تھا۔ اور میں رادھا ــــ؟ لڑکپن میں میں یہی سمجھا کرتی تھی ــــ ابھی گرمیاں آئیں گی اور یہاں میرے اس پیارے حسین دیس میں کدم کے دل کی شکل والے پتّوں میں زرد پھول کھلیں گے۔ لاکھ کے پیڑ پھولوں سے لد جائیں گے۔ سلطانہ چمپا مہکے گی۔ برسات آئے گی۔ ساگوان کے سفید پھول ــــ

"آپ، مجھے مسٹر ریحان الدین احمد نے بتایا کہ برطانوی راج کے خلاف بنگال کی انڈر گراؤنڈ انقلابی تحریک میں شامل رہ چکی ہیں۔" ایک صحافی نے قریب آکر بیٹھتے ہوئے اس کا سلسلۂ خیالات منقطع کر دیا۔ "کل صبح میں آپ کا انٹرویو لے سکتا ہوں۔ مع تصویر ــــ؟"

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں ــــ چلے جائیے میرے پاس سے۔" اس نے تقریباً چلا کر درشتی سے جواب دیا۔ لوگ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"آئی ایم سوری مسز سین ـــــ" صحافی نے نرمی سے کہا اور وہاں سے ٹل گیا۔

"عجیب بدمزاج بڑھیا ہے۔" اس نے باہر جا کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

اب گلپوش ڈائس پر تقریریں شروع ہو چکی تھیں۔ مادام یاسمین بلمونٹ مرحومہ کو خراجِ عقیدت ان کا موضوع تھا۔ ان کے فن کی عظمت پر روشنی ڈالی جا رہی تھی۔ ابھی اس سے بھی تقریر کرنے کے لئے کہا جائے گا۔ آخر اسی مقصد کے لئے اسے اتنی دور ویسٹ انڈیز سے مدعو کیا گیا ہے۔ عجیب بات تھی اس سے اتنے دنوں میں آج تک کسی نے گانے کے لئے نہیں کہا تھا۔ شاید لوگ یہاں کب کے بھول چکے تھے کہ وہ عباس الدین احمد کی شاگرد تھی۔ کہ ایک زمانے میں اس کے ریکارڈ گھر گھر بجتے تھے۔ کہ وہ آل انڈیا ریڈیو ڈھاکہ سے گاتی تھی۔ جو ریڈیو پاکستان ڈھاکہ بنا اور اب ریڈیو بنگلہ دیش ـــــ آواز کی لہریں۔

ریحان تک نے یادگار کمیٹی والوں سے نہیں کہا تھا کہ وہ تقریبات میں کسی روز اس کے گانے کا پروگرام رکھوا دیں۔ ہر طرف عجیب کنفیوژن تھا۔ ریحان اب ہائی فنانس کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ ناقابلِ یقین!

وہ ہال کے ایک کونے کی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ اب ایک اور نوجوان اس کی طرف آیا جھک کر کہا۔ "ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس مادام یاسمین بلمونٹ کی ڈائری ہے۔ کیا آپ اسے ہمیں عنایت کریں گی؟ ہم اسے بڑے شاندار طریقے سے کتابی صورت میں چھپوائیں گے۔ وہ ایک ادبی شاہکار ہوگا۔"

دیپالی کا چہرہ طیش سے سرخ ہو گیا۔ اس نے زہریلی نظروں سے نوجوان کو گھورا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی ـــــ اُسے کوئی جواب نہ دیا اور تیز تیز چلتی ایوان نشست سے باہر نکل آئی۔ اور باہر برآمدے کے آخری در میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ سامنے جامن کے درختوں پر پونم کا چاند نکل آیا تھا۔ وہ چاند بھی بہت پشیمان معلوم ہوتا تھا جس طرح وہ پشیمان تھی۔ اور اندر سے دل ہی دل میں ریحان نادم تھا۔ اور اور یاسمین تو اتنی پچھتائی تھی کہ اس دنیا ہی سے بھاگ نکلی تھی۔

در کے نزدیک بچھی چھوٹی میز پر ایک سفید فام نوجوان تنہا بیٹھا ڈنر کھا رہا تھا۔ ایک خاتون کو کھڑا دیکھ کر مغربی تہذیب کے مطابق تعظیماً وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

اندر اتنا ہجوم ہے کہ میں گھبرا کر باہر آ گئی۔" دیپالی نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ "اس عمر میں انسان زیادہ بھیڑ بھڑکا برداشت نہیں کر سکتا۔ میں بہت دور سے آئی ہوں۔ ویسٹ انڈیز سے ـــــ یہاں بیٹھ جاؤں؟"

"شیور۔ سیم ـــــ"

وہ مقابل کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں کرسٹفر ٹیگرٹ ہوں۔ یہاں سیر کے لئے آیا ہوں۔ اس وقت اپنے ایک دوست کا انتظا

کر رہا ہوں۔ اب تک نہیں آیا۔ اسے لیجئے وہ آرہا ہے۔"

ایک اور سفید فام سنہرے بالوں والا نوجوان لمبے لمبے ڈگ بھرتا آکر میز کے قریب کھڑا ہو گیا۔

"رچرڈ بارلو۔"

"مسز سین۔"

"ہاؤ ڈو یو ڈو۔"

"ہلو۔" مسز سین نے کان کھڑے کئے۔

"یہ واقعی بہت مختصر دنیا ہے۔ میں تمہارے والد کو جانتی ہوں اور تمہارے بھتیجے سے چند روز قبل ایتھنز کے راستے میں ملی۔ تمہارا سوتیلا بھتیجا سوامی آتما نند شنکر پریمی۔"

"اوہ۔ آتم آنند۔ کریزی گائے ـــ" ڈک بارلو نے شفقت سے مسکرا کر سر ہلایا۔

"وہ اگلے مہینے رشی کیش میں تمہارا انتظار کرے گا۔" مسز سین نے کہا۔

ڈک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ اٹھائیس سال کی عمر میں کامیاب انٹیریر ڈیکوریٹر بن چکا تھا۔ مگر زندگی سے مطمئن نہ تھا۔ اس کے دوست کرسٹفر نے اس کے لئے بیرے کو ڈرنکس کا آرڈر دیا۔ ڈک نے کہا۔ آرتھر کوئسلر نے کہیں پر لکھا ہے کہ اتفاقات کا سلسلہ عقل چکرا دیتا ہے۔ یہی دیکھئے مسز سین۔ آپ کی میرے بھتیجے سے اور مجھ سے ملاقات!"

"ساری زندگی اتفاقات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔" دوسرے انگریز نوجوان کرسٹفر ٹیگرٹ نے جو بہت زیادہ ذہین معلوم نہ ہوتا تھا۔ فلسفیانہ انداز میں اظہار خیال کیا۔

بیرے نے مچھلی کی ڈش لاکر رچرڈ بارلو کے سامنے رکھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں سبزی خور بن چکا ہوں۔ میرے لئے سلاد لے آؤ۔" یہ مچھلی ـــ اس نے دیپالی کو مخاطب کیا ـــ "کیا معلوم میری مرحومہ پھوپھی مس ایلس بارلو یہ مچھلی رہی ہوں۔ وہ گارو ہلز میں مشنری تھیں۔ اور ان کی بھی پھوپھی ـــ میری گریٹ گریٹ آنٹ مشنری تھیں۔ بیل بارلو سیتا پور میں ہیضے سے مریں۔ اور مس ماڈ بارلو چین میں مشن چلاتی تھیں۔ ان کو باکسر بغاوت کے دوران چینیوں نے مار ڈالا۔ آنٹ ایلس کو گارو ہلز میں نیو نسٹ قبائلیوں نے قتل کر دیا۔ ہاہاہا۔ تینوں اپنے خیال میں شہید ہوئیں۔ اس وقت رو پہلے پر اگائے نور کے ہالے پہنے یسوع مسیح کے سامنے کوائیر میں گا رہی ہوں گی ـــ میتھوڈسٹ حمد ـــ

THERE IS A HAPPY LAND

FAR FAR AWAY

WHERE THE SAINTS IN GLORY

STAND BRIGHT BRIGHT AS THE DAY

وہ گنگنانے لگا۔ وہ متواتر شراب پی رہا تھا۔ اور اس کا عرق آلود چہرہ سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔
"مسز سین بچپن میں آسٹریلیا میں مَیں بھی اسکول میں یہ حمد گایا کرتا تھا۔ لیکن ہیپی لینڈ کہیں نہیں ہے۔ یوروپ، امریکہ، انگلستان، بنگلہ دیش، انڈیا، پاکستان ـــ کہیں نہیں۔ اور میرا سوتیلا بھتیجا سوامی آتم آنند شنکر پریمی کہتا ہے ہم سب اپنی اپنی کرموں کا پھل کھا رہے ہیں ـــ اور اپنے سنسکاروں کے مطابق میری بے چاری سوکھی چھوارا خشک مزاج مجرّد مقدّس آنٹ ایلس دوسرا جنم لے چکی ہوں گی تو کیا پتہ وہ اس مچھلی کی جُون میں اسی بنگال کے ایک دریا میں پیدا ہوئی ہوں۔ اور وہ مچھلی اب اس پلیٹ میں میرے سامنے تلی ہوئی رکھی ہو ـــ تو میں بے چاری آنٹ ایلس بارلو کو کس طرح نوش کر سکتا ہوں۔ ہاہاہا۔"

اب اس نے کرسٹفر ٹیگرٹ کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ دیپالی دفعتاً شدید کراہیت کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ ڈِک بارلو کہتا رہا۔ "مسز سین۔ مَیم۔ گو میں BI ہوں مگر مجھے کرسٹفر سے اتنی محبت ہے کہ شاید ہم دونوں شادی بھی کر لیں۔ آپ کو پتہ ہے GAY شادیاں اب کافی ہونے لگی ہیں۔"

کرِس ٹیگرٹ نے شراب زیادہ نہیں پی تھی اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ وہ دیپالی سین کے سامنے جھینپ کر سُرخ ہو گیا۔ اندر ہال میں یاسمین بلمونٹ مرحومہ کے متعلق تقریریں جاری تھیں۔ دیپالی نے کہا۔ "اچھا گڈ نائٹ۔ اب میں چلتی ہوں۔"

ڈِک نے دہرایا۔ "کیا پتہ اس پلیٹ میں آنٹ ایلس بارلو تلی ہوئی رکھی ہوں یا گریٹ آنٹ میبل ان دو SIZZLE پر تلا گیا ہو۔ چھُن چھُن چھُن۔ ہم سب SIZZLER پر تلے جا رہے ہیں۔ آپ بھی مَیں بھی۔ ہم سب BI ہوں۔ اگر میرے بنگال سویلین امپریلسٹ بارلو بزرگوں کو اور نامور گریٹ گرینڈ فادر سر ایڈورڈ بارلو اور میرے چچا ونگ کمانڈر رچرڈ بارلو کو جن کے اسم گرامی پر میرا نام رچرڈ ایڈورڈ بارلو رکھا گیا۔ معلوم ہو جائے اور میرے خاندان کی ان نامور مرحومہ مشنری خواتین میٹلڈا، میبل، ماڈ، ایلس کو معلوم ہو جائے کہ چارلس بارلو آئی۔ سی۔ ایس کا ایک پوتا ہندو سوامی بن گیا اور جیمز بارلو کا ایک پوتا، چارلس بارلو کا ایک بیٹا GAY ـــ تو ان کی قبروں کے اندر۔ قبروں کے اندر بھونچال آ جائے گا۔ مسز سین آپ اب بھی بہت دلکش ہیں۔ ہم NOW جنریشن والے صاف گو لوگ ہیں۔ ریاکاری آپ لوگوں کا اور آپ کے پرکھوں کا مسلک تھا۔ میرے بارلو بزرگ اور ان کے ساتھی جب MERRY انگلینڈ کے پبلک اسکولوں میں پڑھتے تھے وہ بھی GAY ہوا کرتے تھے۔ مگر ادسکر وائیلڈ کو پرسیکیوٹ کرتے تھے۔ لیڈی چیٹرلیز لور ممنوع تھی مگر معزز خواتین وہی سب کرتی تھیں۔ آپ بہت جاذب نظر خاتون ہیں۔ میں BI ہوں۔ کیا آپ محض HETERO ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو صدمہ پہنچایا۔ آپ غالباً ایک CLOSET CASE ہیں۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر تیز تیز قدم رکھتی واپس کلب کے اندر چلی گئی۔

## (۴۴)

# آتمار شانتی ـــ؟

بنگلہ دیش بمان سے ڈم ڈم پر اُتر کر وہ سیدھی ریلوے اسٹیشن گئی۔ سکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا۔ وہ آزادی کے تیس سال بعد کے ہندوستانی عوام کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ ٹرین کلکتے سے نکلی۔ پرانے مٹھوں اور عہد ایسٹ انڈیا کمپنی کے کائی آلود دو منزلہ بنگلوں کے برابر سے گذرتی بول پور روانہ ہوئی۔ مقابل کی سیٹ پر ایک بوڑھی بنگالی بیوہ بال منڈائے سفید موٹی دھوتی کے آنچل سے سر ڈھانپے اکڑوں بیٹھی بڑے انہماک سے کدو کے بیج نکال رہی تھی۔ نوکیلی مونچھوں والا ایک تنومند لمبا تڑنگا پوربی بھیا گلے میں تعویذ پہنے اپنی چار سالہ بچی کو گود میں بٹھائے کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ بچی کی مانگ میں گہرا سیندور رچا تھا۔ چائیلڈ میرج اب بھی موجود ہے۔ اسے یہ دیکھ کر دھکا سا لگا۔ کونے میں تین طالب علم ایک سیاسی بحث میں مصروف تھے۔ پھر انھوں نے اکتا کر ایک ساتھ لمبی جمائی لی۔ دوسرے کونے میں ایک بدصورت مارواڑی عورت کارچوبی نائیلون کی گلابی ساری کے آنچل کا گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔ ایک اندھا وشنو بھکاری ایک تارہ بجاتا بھیک مانگتا کوریڈور میں سے گذر کر ڈبے میں آیا اور مادھو آچاریہ کا مدھر آشٹک الاپنے لگا ـــ ادھرم مدھرم ودنم مدھرم نینم مدھرم، ستم مدھرم دو مسافروں نے اسے پانچ پانچ پیسے دیئے۔ وہ کچھ دیر متوقع کھڑا رہا۔ پھر ٹٹولتا ٹٹولتا باہر چلا گیا۔ ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ دو مسلمان کسان ـــ بڑی سی چھجے والی تنکے کی ٹوپیاں، چار خانہ تہمدیں چھدری داڑھیاں، ایک کے باہر کو نکلے ہوئے دانت۔ ایک بوری اٹھائے اندر آئے۔ ڈبہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ دونوں فرش پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ ٹرین پھر روانہ ہوئی۔

دونوں طرف دھان کے کھیتوں میں سارس کھڑے تھے۔ سپاٹ غیر دلچسپ لینڈ اسکیپ بنگلہ دیش کے مسحور کن پکچریسک مناظر سے اس قدر مختلف ـــ وہ میرا وطن تھا۔ دیپالی نے سوچا اور اس کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ وہ میرا وطن تھا ـــ مشرقی بنگال۔ جس کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں ـــ اور میں جلاوطن۔

بردوان اسٹیشن آیا اور نکل گیا۔ بول پور پر ٹرین رکی، بیگ اٹھا کر وہ پلیٹ فارم پر اتری۔

سامنے شوکیس میں شانتی نکیتن کی مشہور ریشمی ساریاں رکھی تھیں۔ اور مرشد آباد میں اب بالوچر بوٹے دار ساریاں دوبارہ بنائی جا رہی ہیں۔ روایتی بالوچر کاریگر استاد عبدالباسط خان کو راشٹرپتی کی طرف سے قومی انعام مل چکا ہے ـــــ کلکتہ میں کھوکھو کی بیوی نے اسے بتایا تھا جو کاٹج انڈسٹریز کے محکمے میں ملازم تھی۔ اسٹیشن کے باہر سائیکل رکشاؤں کا ہجوم۔ مدقوق رکشا والے۔ ایک لڑکا دانت نکوسے خالی رکشا چلاتا اس کی طرف آیا۔ سامنے چھوٹا سا بازار، اسلامیہ ہوٹل۔ بڑی مسجد۔ پرانا مانوس شانتی نکیتن۔ چند منحنی سے طلبا، اٹیچی کیس سنبھالے رکشاؤں پر بیٹھے اسٹیشن کی طرف آ رہے تھے۔

"کہاں چلوں دیدی؟" لڑکے پوچھا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آمار نام علی حسین"۔

"علی حسین!" اس نے دہرایا۔ یہ مدقوق رکشا والا علی حسین انڈیا میں بھی موجود تھا۔ بنگلہ دیش میں بھی پاکستان میں بھی۔ اس کے لئے کچھ نہیں بدلا تھا۔

گیسٹ ہاؤس پہنچ کر اس نے اپنے پرانے پروفیسروں کے متعلق دریافت کیا۔ چند مر چکے تھے۔ پروفیسر مرتضیٰ حسین بھی مر چکے تھے جن کے اصرار پر وہ یہاں داخلہ لینے آئی تھی۔ ایک کمرے میں جا کر وہ دھم سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ باہر رات کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ کمرے میں مچھر بھنبھنا رہے تھے۔ اُجاڑ۔ اُجاڑ۔ اُجاڑ۔ جلد از جلد پورٹ آف اسپین اپنے گھر واپس پہنچنا چاہئے۔ اس نے اپنے نفیس شاندار بیڈ روم کا تصور کیا۔ للت اس وقت نہ جانے کیا کر رہے ہوں گے۔ وہاں اس وقت نہ جانے کیا بجا ہوگا۔ اونہہ۔ اب یہ سوچنے میں کون سر کھپائے کہ اس وقت وہاں کیا بجا ہوگا۔

بے رونق ڈائننگ ہال میں جا کر اس نے بدمزہ کھانا کھایا۔ بدمزہ کھانا۔ بے تکے لوگ۔ پہلی بار اسے احساس ہوا جنوبی امریکہ میں اٹھائیس سال گذارنے کے بعد وہ اس جگہ کے لئے اجنبی ہے۔

صبح تیز دھوپ میں وہ اپنی پرانی مادر درس گاہ پہنچی۔ بے رنگ۔ بے رونق۔ معمولی۔ نوعمری میں یہ جگہ خوابستان معلوم ہوتی تھی۔ شانتی نکیتن کا رومانس! علم و فن اور آدرشوں کا گہوارہ! وہ ادھر ادھر ٹہلی ٹیگور کے مکان کا چکر لگایا۔ واپس گیسٹ ہاؤس جا کر کھانا کھایا۔ سوئی۔ شام کو پھر باہر نکلی۔ یہ جگہ اس کے لئے اجنبی تھی۔ تعجب! بے دلی کے ساتھ اس درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئی جہاں وہ اپنے طالب علمی کے زمانے میں بیٹھا کرتی تھی۔ جہاں مہارشی دیبندر ناتھ ٹیگور کو اچانک عرفان حاصل ہوگیا تھا۔

آمار پرانیر آرام

مونیر آنند

آتمار شانتی

غلط۔ بالکل غلط۔ سب فراڈ ہے۔ کیسا عرفان۔ اور کس چیز کا۔

تنے کی اوٹ میں چند لڑکیاں باتوں میں مصروف تھیں۔ وہ ایتابھ بچن اور دھرمیندر کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ سامنے فلم فیئر۔ اسٹار ڈسٹ اور اسٹار اینڈ اسٹائیل رکھے تھے اور ایک ٹرانزسٹر۔ یہ برصغیر ایک ایسا خلا ہے جس میں معلق نوجوان ٹرانزسٹرز پر فلمی گیت سن رہے ہیں۔ ناصرہ نجم السحر اور اس کے جیسے نوجوان شاید بہت جلد اب ان تینوں ملکوں میں انوکھے سمجھے جائیں گے۔ آؤٹ سائیڈرز۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ذرا دقت سے اٹھی۔ سبزے پر سے گذرتی پھاٹک کی سمت بڑھی۔ کلا بھون کے باغ میں مہاتما بدھ کا مجسمہ نظر آیا۔ سارا مجسمہ مٹی کا تھا۔ پاؤں بھی مٹی کے تھے۔

شام ہو گئی سال کے ایونیو کے پرے سنتھال پرگنے کے کسان درانتی لئے اپنے گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ "کنول اور فصل اور دھنک کے دیوا! سوریہ دُرن پر تھوی! تو کہ بیج ہے اور درانتی اور ہمارا ہاتھ۔ اور ہمارا دل اور ہمارا گھر۔ تیری تقدیس ہم نے جھانجھ اور بانسری۔ بجا کر کی۔" وہ جنگل کی طرف بڑھی۔

چاند نکل آیا۔ کنج کنج پھرے شام۔ کنج کنج پھرے ــــ دور ایک گول سفید سمادھی چاندنی میں چمک رہی تھی۔ چاروں طرف سے بند کسی مٹھ کی تہ خانے کی طرح ہیبت ناک گول سمادھی۔ سفید نیچا سا گنبد۔ پچھلے کسی زمانے میں ستی ہونے والی کسی مظلوم بے چاری کی خوفناک یادگار۔ دیپالی نے اپنی پیشانی پر سے پسینے کے قطرے پونچھے۔ دہشت زدہ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کنج سے باہر نکلی اور سڑک پر چلنے لگی۔

بول پور کے ہینڈلوم کارخانے میں باریش مسلمان بنگالی جولاہے کرگھوں پر ساریاں بُن رہے تھے۔ ان کے پُرکھوں نے ڈھاکے کی ململ اور مرشد آباد کا ریشم بُنا تھا۔ "بھور بھئے کرگھے پر بیٹھے، رات پڑے کرگھے پر بیٹھے۔ مور کے پروں ایسے رنگ والی ساریاں بننے والے ــــ کسی مہاراج کماری کے بیاہ کے لئے ساریاں بننے والے جولاہے ــــ او میاں جولاہے ــــ" سروجنی دیبی نے پوچھا تھا ــــ "سرد چاندنی میں۔ اتنے سنجیدہ، گمبھیر بیٹھے کیا بُنتے ہو میاں جولاہے؟"

"شاعرہ! پروں جیسا، بادل جیسا سفید، کسی مرنے والے کا کفن بنتے ہیں ہم ــــ دلہن کی سُرخ ساری اور موت کا سفید کفن۔" تانا بانا ــــ زندگی اور موت ــــ سکھ اور دکھ ــــ نیکی

اور بدی ـــــ امن اور تشدد ـــــ ریحان اور جہاں آرا ـــــ یاسمین اور شہزاد۔ فرقان اور ناصر
نجم السحر۔ چارلس بارلو اور سوامی آتم آنند۔ پادری بنرجی اور رادھیکا سانیال۔ ریحان اور زہرہ ـــــ
ریحان اور دیپالی ـــــ "گوری ـــــ میں نے تمہارے لئے تالاب کھودا ہے۔ اور سبزی باڑی بنائی
ہے۔ میں تمہارے لئے سیندور کی ڈبیا اور ڈھاکے سے سینگ کی چوڑیاں لاؤں گا۔" یاسمین ایک بار
کہہ رہی تھی وہ ایک روز اپنا ٹروپ بنائے گی۔ اور مولوی جسیم الدین کے نوکشی کانتار ماٹھ کا پیلے تخلیق
کرے گی۔" "دیکھو ہم نے اس کتاب پر سروجنی دیبی سے دستخط لئے ہیں۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔" دیپالی
دیدی میں نے ارجمند منزل کے جلسہ گھر میں سروجنی دیبی کے پالکی بردار کا پیلے پیش کیا۔ سہج سہج پالکی
چلے ـــــ پالکی چلے ہو ـــــ ہو۔" "میری اُن کی پریت پرانی اُن بن کل نہ پاؤں۔ جہاں بٹھادے
تاں ہی بیٹھو۔ بیچے تو بک جاؤں" ـــــ ارے وہ تو دھنک کی طرح غائب۔ چاند بجھ گیا۔ چاندنی بجھ
گئی۔

" آدھی رات کا جنگل جہاں ستیہ پرندوں کی آواز میں چہکا اور محبت ستاروں میں جھلملائی
اور شانتی ندیوں کے روپ میں ـــــ خزاں نے گایا۔" الم کے دل پر برستی شفق بادلوں پر پھیلی۔
دھان کے گٹھوں کے سنہرے طوفان کو تیز آندھی نے بادل کی طرح اڑا دیا۔ ہوا نے مجھے آواز دی۔
تم سب کے سارے خواب ان پتوں کی طرح بکھر گئے ـــــ سانپ افیون کے پھولوں میں خوابیدہ
ہیں اور جگنو خاموش چیتے کا راستہ روشن کر رہے ہیں ـــــ" بنگال کے ایک قدیم کوی نے کہا تھا ـــــ
" ہوائیں جنگل کے مندر میں رقصاں ہیں اور خاموش آوازیں دیوتاؤں کو عود لوبان چڑھا رہی ہیں ـــــ"
شہزادی زیب النسار ـــــ نہیں ـــــ بیگم جہاں آرا مرشد زادہ۔ پھول بن میں چھپی کچھ کہہ رہی ہے۔
مگر اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ جہاں آرا اور یاسمین اور گونگی مالا تینوں کائنات کے جلسہ
گھر میں پردے کے پیچھے سے مسلسل چلائے جا رہی ہیں۔ OFF-STAGE۔

" اب صبح کا نارنجی دیشنو بیراگی سورج کا لوٹا ہاتھ میں لئے دریا کی اور بڑھ رہا ہے۔ وہ نیلوفر جو
آنے والی بہاروں میں کھلیں گے۔ وہ ستارے جو آنے والی راتوں میں جگمگائیں گے۔ وہ یاتری جو مستقبل
کے معبدوں کی سمت بڑھیں گے۔ پتوں کی مہک میں ساوتری کا الم اور سیتا کی وفا اور رادھا کا عشق
اور شکنتلا کے آنسو اور دمینتی کا خوف پوشیدہ ہے۔

شاعر نے کہا۔" اور زرد پھول جو بہار کے قدموں کے گھنگرو ہیں۔ اس نیم تاریکی میں کسی پرانے
خواب کے چمکیلے بھوت معلوم ہو رہے ہیں۔ آسمان کی منڈیر پر ستاروں کے دیئے جل رہے ہیں۔ بادل
ہری نوکاؤں کی طرح آسمان کے دریا پر سے گذرتے جا رہے ہیں۔"

بول پور ریلوے اسٹیشن کے سامنے مسجد کے نیچے برگد تلے ایک مسلمان بوڑھی اندھی بھکارن اللہ

اللہ پکار رہی ہے۔

" زندگی کا میلہ جو ابدیت کے میلے کی سمت رواں ہے۔ ایک بوڑھی فقیرنی مسلسل کلمہ پڑھتی رہتی ہے۔ وہ بارش اور دھوپ میں بیٹھی افلاس اور بھوک اور دکھ سے مصروف گفتگو ہے۔ مگر بشاش دنیا اس کی پکار سنے یا نہ سنے اس کا ایمان اس کی حاجت اور مصائب سے زیادہ صاف شفاف ہے۔ لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ محمد رَسُول اللہ" سروجنی دیبی نے کہا۔

ریلوے اسٹیشن کے سامنے رکشاؤں کا ہجوم۔ ہنس مکھ مدقوق علی حسین اسے اپنی رکشا پر گیسٹ ہاؤس سے لے آیا ہے۔ "دیدی اب کب آئیے گا ــــ ؟" وہ بشاشت سے پوچھتا ہے۔

" معلوم نہیں۔" وہ جواب دیتی ہے۔

سامنے مسجد کے زیر سایہ برگد تلے، بوڑھی اندھی بھکارن لوگوں کے قدموں کی چاپ پر دھیان سے کان لگائے بیٹھی ہے۔

(۴۵)

# ونگالہ راگنی

علی پور روڈ کلکتہ اپنی کوٹھی کے برآمدے میں روکنگ چیئر پر بیٹھی کماری اُوما رائے بالکل اپنی مرحومہ والدہ لیڈی پری توش رائے معلوم ہوئیں۔ وہی غصیلا چہرہ۔ وہی جھریاں۔ بائیں ہاتھ میں بڑے سے زمرد کی وہی انگشتری۔ سفید شال۔ برف جیسے سفید بال۔ بالکل کوئی بیوہ مہارانی۔ راج ماتا۔ پہلے جتنی موٹی تھیں، بیماری کی وجہ سے اب اتنی ہی دُبلی ہو گئی تھیں۔

وہ اپنے پوڈلز کو ناشتہ کروا رہی تھیں۔ باغ میں چند کالے کلوٹے ننگے پوربی بچے کھرپی لئے گھاس کھودنے میں مصروف تھے۔ چالیس سال قبل وہ ڈیلینڈز۔ رمنا۔ ڈھاکہ میں بھی یہی منظر تھا۔ کون کہتا ہے کہ دنیا بدل گئی یا "خاموش انقلاب" آگیا۔ یا نکسلائیٹ تحریک چلی۔ اور وہی اوٹو کریٹک ارسٹو کریٹک اُوما دیبی۔ جے کالی کلکتہ والی۔

" نومشکار اوما دیبی۔"

" نومشکار۔ کیسے آئیں"۔ اب وہ زیادہ کرنیکی ہو گئی تھیں۔ دیپالی نے بنگلہ دیش اور انڈیا آنے

کا مقصد بتایا۔

"تم کو معلوم ہے۔ میرا بھائی زیلینڈ شراب پی پی کر مر گیا۔ ریحان مجھے چھوڑ کر بنگلہ دیش چلا گیا۔ دغاباز۔" ان کی جھرجھری آواز بھرا گئی۔ ریحان کی وجہ سے ان کی زندگی کتنی بڑی ٹریجڈی رہی۔ دیپالی نے محسوس کیا۔ وہ خود کنارے پر کھڑی ہلکی پھلکی تماشائی ہے۔

"ریحان اپنی رُوٹس میں واپس گیا اُدمادی۔ ایک وقت آتا ہے جب انسان محسوس کرتا ہے کہ ایک مستقل موہوم تہذیبی تصادم اور بے آرامی سے بہتر ہے کہ انسان اپنی جڑوں میں واپس چلا جائے۔"

"کیا وہ تم سے یا مجھ سے شادی کر لیتا تو کلچر CLASH کا سامنا کرتا؟"

"شروع میں نہیں۔ مگر آخر میں ـــــ بڑھاپے کی طرف بڑھتے ہوئے انسان کو اپنے تہذیبی گہوارے کی ضرورت ہوتی ہے ـــــ وہ اپنی ماں کی تہذیب کا متلاشی ہوتا ہے ـــــ"

"کیا ارجمند منزل اس کا گہوارہ ہے؟" اُدمادیبی نے آگ بگولا ہو کر پوچھا۔ اور غصے سے ہانپ کر کھانسنے لگیں۔

"غالباً ـــــ ایک حد تک۔ ارجمند منزل بھی۔ اور زہرہ بھی۔" دیپالی نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں لڑکپن سے ان سے ڈرتی آئی ہوں۔ اب میں کیوں ڈروں۔ اب یہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔ اب یہ مجھے BULLY نہیں کر سکتیں۔ اب میرے بال بھی سفید ہو چلے ہیں۔ اور اب ریحان الدین احمد بھی درمیان میں نہیں ہے ـــــ نہ ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار ـــــ اور ـــــ اور ـــــ یک لخت اسے ایک انتہائی کمینہ خیال آیا ـــــ اب میں اُدمارائے سے زیادہ دولت مند ہوں ـــــ پورٹ آف اسپین میں میرا کولونیل مینشن ڈوڈ لینڈز سے کم شاندار نہیں ـــــ تو رعب کس بات کا۔؟ کرسی پر آگے کو جھکی کھانستی ہوئی کھجور کی طرح سوکھی چمرخ اُدمارائے بے حد قابلِ رحم اور مضحکہ خیز معلوم ہوئیں کیا ہمیں ان سب کو معاف کر دینا چاہئے۔ جنھوں نے ہمیں اذیتیں پہنچائیں؟ کیا یاسمین نے بھی معاف کر دیا تھا؟ شوا ـــــ شوا ـــــ

"میں نے ریحان کو ہر حال میں دیکھا اور اس کا ساتھ دیا ـــــ" اُدما کھانس کھانس کر کہہ رہی تھیں۔ "جنگ سے پہلے کے لندن میں طالب علم۔ ڈھاکے میں باؤل فقیر کے بھیس میں انڈر گراؤنڈ انقلابی۔ آدرش وادی۔ رومینٹک۔ پارٹیشن کے بعد کلکتے میں سرگرداں پریشان حال۔ پھر کامیاب لیڈر۔ چند روزہ منسٹر۔ اور اب تم اسے بنگلہ دیش کا نیا ٹائی کون دیکھ کر آ رہی ہو ـــــ اب وہ مجھے مدتوں خط بھی نہیں لکھتا۔ پچھلے دنوں اس کا امن پرست شاعر لڑکا کلکتہ آیا تھا۔ میں نے ٹیلی ویژن کے یوتھ پروگرام میں اسے دیکھا۔ مجھ سے ملنے تک نہ آیا۔" اچانک انھوں نے پینترا بدل کر کہا۔

"دیپالی۔ تم بہت خوش قسمت ہو۔ تم مجھ سے ہمیشہ بازی لے گئیں۔"

"آپ کا ایسا خیال ہے اُوما دیدی؟" اس نے سکون کے ساتھ کہا۔ معلوم ہوتا تھا محمڈن اسپورٹنگ اور موہن بگان کے فٹ بال میچ کے خاتمے پر دو خواتین کھیل کے متعلق تبادلۂ خیالات کر رہی ہیں۔

الم ایک مہیب سیاہ پرند کے مانند اُڑتا ہوا آیا اور سر جھکا کر پر پھیلا کر ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔

بیرہ حاضر ہوا۔ "مس صاحب۔ گاڑی تیار ہے۔"

"چلو۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔" اُوما رائے نے دیپالی سے کہا۔

وقت کا کپالک کھوپڑیوں کی مالا پہنے۔ عصا میں گھنٹیاں اور جھنڈیاں لگائے آگے آگے چل رہا ہے۔

"کلب ــــ؟"

"نہیں ــــ مندر ــــ ماں کے مندر۔"

اُوما رائے پہلے لامذہب تھیں۔ اب مذہبی ہو گئی تھیں۔ برہمو خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور ایک بھیانک۔ بے جان، گروٹسک مورتی کی پرستش کرنے کے لئے جا رہی تھیں۔ ان میں اور جاہل بھوتارنی دیبی میں زندگی نے کیا فرق باقی رکھا۔

وہ دونوں برآمدے کی مرمریں سیڑھیاں اتر کر کار میں بیٹھیں۔

"کالی گھاٹ ــــ؟" شوفر نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ بیلور۔" مالکن نے جواب دیا۔

بیلور مٹھ کے ایک مرمریں ہال میں درگا کی بڑی مورتی کے سامنے سندھیا کی آرتی اتاری جا رہی تھی۔ باہر احاطے میں چند تلک دھاری یوروپین اور امریکن سنیاسی ٹہلتے پھر رہے تھے۔ پھاٹک پر کالی کی خوفناک تصویریں بک رہی تھیں۔

پوجا کے بعد وہ دونوں باہر آئیں۔ ایک طرف درختوں کا جھنڈ تھا۔ ڈالیوں پر بندر جھول رہے تھے۔ ایک پیڑ کے نیچے گھنے سیاہ بالوں کا جوڑا کنپٹی پر بنائے ایک یوگنی دھیان میں محو آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔

بھیروی اور "بادلوں کو کھینچنے والی" میگھ رنجنی راگنی کے مانند دنگالی یا بنگالی بھیرو راگ کی ایک بہت قدیم، پراچین بنگال کی راگنی ہے۔ سارے راگ راگنیوں کی طرح اس کے "نادمایا روپ"

سے علیحدہ اس کے "دیوتا مایا روپ" یا سائیکک پیکر کا بھی تصور کیا جاتا ہے یوں کہ بن گالی راگنی شو کی ایک یوگنی ہے جو گھنے بن میں اپنی کٹی کے سامنے ایک مرگ چھالا پر بیٹھی ہے۔ درختوں پر بندر اور مرگ چھالا کے پاس ایک شیر ببر موجود ہے۔

بیلور مٹھ کے کنج میں بیٹھی یہ بنگالی بیراگن بنگالی راگنی نہیں تھی۔ کوئی معمولی کمزور عورت تھی جس نے شاید اپنے گھریلو مسائل سے تنگ آکر یا بیوہ ہونے کے بعد سنیاس لے لیا ہوگا۔ یا وہ بال ودھوا تھی یا کیا پتہ وہ سچ مچ کی عارفہ ہو۔ دیپالی نے حیرت سے سوچا۔ وہ اور اُدما رائے کنج سے گذر کر ایک سنسان صحن میں داخل ہوئیں۔ وہاں بھی مکمل سناٹا تھا۔ وہ ایک منڈیر پر بیٹھ گئیں۔ اُدما رائے نے اپنی سینڈلز نیچے گرادیں۔ پاؤں منڈیر پر رکھ لئے۔ مراقبے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ دیپالی نے بھی اپنے سینڈلز نیچے گرائے پاؤں منڈیر پر سمیٹ لئے۔ ان دونوں کے جوتے سنگی، سپاٹ زمین پر ادھر اُدھر پڑے نہایت مضحکہ خیز اور قابل رحم معلوم ہوئے۔ دیپالی نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ایک لنگور درخت کی شاخ پر بیٹھا اُسے بڑے غور سے ملاحظہ کر رہا تھا۔

"کال راتری!" دیپالی نے ہنس کر کہا۔

"کون ــــ؟" اُدما دیوی نے چونک کر دریافت کیا۔

"کوئی نہیں"۔ دیپالی نے ذرا کینے پن سے کہا۔ "کال راتری۔ شو کے گھر کا ایک بھتنا ــــ لنگور کے روپ میں۔ آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ غائب ہوگیا"۔

اس دہشت ناک بھورے کواڈرینگل میں چاروں طرف آنجہانی مٹھ دھاریوں کے خالی حجرے بہت پُراسرار معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے خالی پلنگوں کے اوپر ان کے کھڑاؤں رکھے تھے۔ ہم اپنے جوتے دنیا ہی میں چھوڑ جاتے ہیں۔

سامنے چوڑا دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کالی اور بھیرو کے دس دس ہاتھوں کے مانند بانہیں پھیلائے کال کی سطح پر بہہ رہے ہیں۔ نروان کی کیا ضرورت ہے۔ کسی نے کہا تھا۔ پانی پانی میں مل گیا۔ میں شکر بننا نہیں چاہتا شکر کھانا چاہتا ہوں۔

اس کی یاد خوشبو کا بھیس بدل کر ہزاروں میل دور رین ٹری کے سائے میں ٹری ٹاپ ہاؤس کے نیچے بھی پہنچے گی۔

اور نگین ناؤ والے ماجھی۔ نہ تو جوار کے ساتھ آیا نہ بھاٹا کے ساتھ۔ شہد جیسے چیت مہینے میں کوئلیں کوکیں۔ پوس کی چاندنی میں مچھیرے مچھلی پکڑنے گئے۔ پُشپ بن میں بھنورے گونجے۔ محبت کی باؤلی تو کا خشکی پر بھی چلتی ہے۔

غلط۔ بالکل غلط۔

ایک قتل کر دی گئی۔ ایک نے خودکشی کر لی۔ ایک جلا وطن ہے۔

اور اُوما رائے برگد تلے منڈیر پر بیٹھی سر جھکائے آہستہ آہستہ دھونکنی کی طرح کھانس رہی ہیں۔

قہرناک کالی ـــــ قہرناک ـــــ رحیم۔ مادر عظیم۔" تیری قربان گاہ میں میں نے پودینے کی پتیوں اور زعفرانی چاول اور موت اور زندگی کے نذرانوں سے انجلی سجائی۔ اُوما ہماوتی۔ میں تیرے لئے کلیاں اور جنگل کی بیریاں لے کر آئی ہوں۔ ابیکا پاروتی۔ سارے سکھ اور سارے دکھ تیرے لئے۔ گری جا شمبھوی۔" درختوں نے سر سرا کر دہرایا۔ ڈالیاں آدمیوں کے ہاتھوں کی طرح ہلنے لگیں۔ شیل پُتری۔ شاردا۔ کانن دُرگا۔ گری دو ہتر۔ دختر کوہ!

جب رام پرشاد سین[1] ماں ماں پکارتے پکارتے عاجز آ گئے تھے تو انھوں نے کہا تھا۔ ماں۔ ماں مت پکارو۔ پتہ نہیں وہ مر چکی ہے۔ ورنہ آتی کیوں نہیں۔

اُوما رائے اپنی دولت اور اپنے پُوڈلز اور اپنے ملازموں کی دسرا تھ میں دنیا میں بالکل تنہا تھیں۔

اچانک انھوں نے سر اٹھا کر بڑے اضطراب سے کہا۔" مجھے کوئی اچھی خبر سناؤ۔ میری زندگی میں اچھی خبریں بہت کم ہیں۔"

" اچھی خبریں میرے پاس بھی بہت زیادہ نہیں ہیں۔ اُوما دیدی۔" دیپالی نے کینے پن سے جواب دیا۔ وہ دو بوڑھی بلیاں تھیں جو ایک سنسان گلی میں برگد تلے اپنے اپنے پنجے تیز کئے ایک دوسرے کے مقابلے پر موجود تھیں۔ چند لمحوں بعد دیپالی نے کہا۔" جہاں آرا مع اپنے سارے خاندان کے گولی سے اڑا دی گئی۔"

" اور کوئی بُری خبر سناؤ۔"

" یاسمین مجید نے خودکشی کر لی۔"

" اور ـــــ"

" اور اس سے پہلے جہاں آرا کی چھوٹی بہنیں ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہوئیں۔ الپس کے پہاڑوں پر جہاز گرا ان کی لاشوں کا پتہ تک نہ ملا۔" وہ ایک مردہ خانہ کے موریڈ چوکیدار کی طرح اب ذرا تفصیل سے بیان کرنے لگی۔" اور جہاں آرا رجب ماری گئی اس کے خون کے چھینٹوں سے سارا کمرہ لال ہو گیا اور اس کا بھیجا نکل کر دیوار سے چپک گیا۔ اور نواب قمر الزماں کو کاٹ کر ٹکڑے

---

[1] اٹھارہویں صدی کا بنگالی شاعر اور کالی بھگت۔ جس سے ایک مرتبہ اس کے گیت شاہی بجرے میں سفر کرتے ہوئے نواب سراج الدولہ نے بھی سنے تھے۔

ٹکڑے ــــ"

"اور کوئی بُری خبر سناؤ۔"

"میرے بابا۔ آپ کے سابق ہینڈسم منگیتر بنوئے چندر سرکار کینسر سے مرے۔ بہت سخت تکلیف سے جان نکلی۔ آخر وقت میں ان کی شکل دیکھی نہ جاتی تھی۔ اور ان سے دو سال پہلے میری پھوپھی بھوتارنی دیبی اندھی ہو کر مریں ــــ اور اتنا شدید بلڈ پریشر کہ پاگلوں کی طرح چیختی تھیں۔"

"اور کوئی بُری طرح خبر سناؤ۔"

"اور ــــ آپ سامنے دیکھ رہی ہیں ــــ وہ ادھر دیکھئے۔ پریتوں[1] کے منہ سے آگ نکل رہی ہے۔ سوچی مکھ بھوت[2] آپ کے تعاقب میں ہیں۔ اور میرے تعاقب میں۔ زمانہ معزور انسانوں کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔"

"اب تم کالی کے روپ میں میرے سامنے ظاہر ہوئی ہو۔" اوما رائے نے خائف ہو کر کہا۔

"ہم اپنی اپنی جونیں اسی طرح بھگتائیں گے۔ کالی بھی مر چکی ہے۔ سورج ٹھنڈا پڑنے والا ہے۔" دیپالی نے سرد مہری سے جواب دیا۔ "میں اپنے باپ اور پھوپھی کی راکھ لے کر ہر دوار جا رہی ہوں۔ راستے کا انت دہی ہے۔ سنیئے اُوما دیبی بیلور مٹھ کے سنیاسی کیا گاتے ہیں۔ میں آپ کو سناؤں ــــ دنیا کے اس ہاٹ میں ماں بیٹھی اپنی پتنگ اڑا رہی ہے۔ لاکھوں ڈوروں میں سے وہ ایک ڈور کاٹ دیتی ہے۔ اور جب پتنگ کٹ کر بیکراں وسعت میں پہنچ جاتی ہے تو ماں ہنس کر تالی بجاتی ہے[3]۔"

## ۴۶

# بھیرو راگ

آخرِ شب کی بیکراں تاریکی میں بوئنگ جٹ فضائے بسیط میں تیر کی طرح نکلتا چلا گیا۔ پھر اس کی جگ مگ کرتی روشنیوں کو گھپ اندھیرے نے نگل لیا۔ تاریکی اور آسمان میں گھرے اس فولادی پنجرے میں کئی سو اجنبی آتماؤں کے ساتھ محصور غیر اہم بے معنی دیپالی سین نے غیر اہم بے معنی یاسمین بلونٹ کی ڈائری ٹٹولی جو اس کے بیگ میں محفوظ تھی۔ اسے میں واپس لے آئی۔ کس کو دوں۔ کوئی اس کا

---

[1] مردہ خور بھوت۔ [2] سوئی جیسے باریک منہ والے بھوت [3] رام پرشاد سین کا ایک بھجن۔

ت نہیں۔ خود میرا دیپالی سین کا کوئی وارث نہیں۔ ہر انسان اپنا آغاز اور انجام خود ہے۔ لیکن
یاسمین بلمونٹ کی ایک وارث موجود ہے ـــــ ناصرہ نجم السحر قادری۔ شاید ـــــ
ٹوکیو۔ ہونولولو۔ لاس اینجلز۔ پورٹ آف اسپین۔ بہت لمبا سفر ہے۔ وقت کا اندرونی سفر
رونی۔ اور اس کے آگے ہڈیاں بہا کر لے جانے والے دریا کا سفر۔ اور قبر کے کیڑوں کی زمین دوز
ت۔ دفعتاً اسے بڑی شدید طمانیت محسوس ہوئی۔ وہ ابھی زندہ ہے۔ زندگی بڑی نعمت ہے۔
ن نے اپنی ڈائری میں ایک جگہ لکھا تھا۔ IT WAS GOOD KNOWING YOU, WORLD۔
اس کے برابر بیٹھے ہوئے امریکن نوجوان نے پوچھا۔ "انڈین ـــــ؟"
"اوور سیز انڈین ـــــ ویسٹ انڈیز۔"
"اوہ۔! جمیکا ـــــ کنگزٹن ٹاؤن ـــــ؟"
"ٹری نیڈاڈ ـــــ پورٹ آف اسپین۔"
اچانک بڑی مسرت کے ساتھ اسے اپنے گھر کا خیال آیا۔ اسپینش کولونیل مینشن۔ وسیع باغ
ین ٹری کا جھرمٹ۔ کلپسو میوزک۔ مسٹریس سرسوتی۔ مسٹریس خیر النسار قابل اعتبار غیر دلچسپ
لت سین۔ اس کی اپنی آرام دہ خوبصورت متمول دنیا۔ خوشگوار موسم۔ موسیقی۔ لذیز کھانے سیر
ت I SHOULD COUNT MY BLESSINGS اس نے یک لخت بے انتہا خوف زدہ
وچا۔ ہوا میرے باپ۔ دھرتی میری ماں۔ اگنی میرے دوست۔ پانی میرے عزیز۔ آسمان
بھائی۔ تمھارے ساتھ رہ کر جنم ملتا ہے۔ انت سے تم کو سلام بھیجتا ہوں۔ یوگیشور[1] نے کہا تھا۔
اور بیسوی صدی کے نصف آخر کے بنگال کی رقاصہ یاسمین حمید نے لکھا تھا۔ مور بڈی نہیں
یں ـــــ ہنڈول۔ موسم بہار کا بیلے۔ ساری کائنات ہے۔
کہ اپنی ساری بدی اور رذالت اور کمینگی کے باوجود دنیا بڑی سہانی جگہ ہے۔ قابل قدر۔
اس نے کھڑکی سے ناک چپکا کر باہر دیکھنا شروع کیا۔ گھپ اندھیری رات۔ چند لمحوں میں
ب۔ نیچے سیاہ سمندر اب نظر آنے لگا۔ اوپر سیاہ آسمان۔ تخلیق کی اولین رات ـــــ ہیبت ناک
یز بھیرو کے سُر۔ آہستہ آہستہ۔ بہت مدھم اُجالا۔ اب میں بھیرو راگ کا دھیان کرتی ہوں۔ اس
یں بند کیں۔ شبھ۔ سپید پوشاک۔ ششی دھر[2] گلے میں مالا۔ حلق میں زہر۔ رکت نیترہ۔ خون سی
آنکھیں۔ کانوں میں جگمگاتے کنڈل۔ بھور بھئے جسے دیوتا گاتے ہیں ـــــ آنکھیں کھولیں۔ افق پر
سپیدی آچلی تھی۔ اپنا رنگھ پھونکتا شدھ بھیرو ساری کائنات ـــــ اُس نے بہت آہستہ آہستہ
سرگیں گنگنانی شروع کیں۔ شو بھیرو۔ دنگالہ بھیرو۔ آنند بھیرو ـــــ غنودگی سی آگئی۔ وہ راگ

[1] صدی بنگال کا سنسکرت شاعر۔ [2] سر پر ہلال۔

کے سُروں پر تیرا کی۔ ۔ اس نے چونک کر باہر دیکھا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ اب مجھے بھیرو راگ میں شو مہا کال کی تقدیس کرنی چاہیئے۔ وہ اندر ہی اندر ایک بنگلہ بھجن گنگنانے لگی۔ پھر باہر نظر پڑی۔ بہت ہی خوب صورت منظر تھا۔ حد نگاہ تک شفاف پانی اور شفاف آسمان۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ کس کا خیال کروں ؟ مہا کال اور مہا کالی پر تو دھیان نہیں جمتا۔ شو اور شکتی، دونوں فیل ہو گئے ؟ اندر ہی اندر بہت سے گپت چتر ہیں۔ کس پر دھیان لگاؤں۔ اور کون سا راگ گاؤں۔ اندر ہی اندر بہت سے گپت راگ ــــ

نیچے بحیرۂ چین کی موجیں پگھلی چاندی معلوم ہو رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ اُجالا پھیلا۔ سورج ٹھاکر سنہرا نوہ ماسک پہنے جاپان کے اوپر نمودار ہو رہے تھے۔

لاکھوں برس سے سورج اسی طرح طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے۔ اور طلوع ہوتا ہے۔ اور غروب ہوتا ہے اور طلوع

---

# ہماری خاص خاص مطبوعات

## اقبالیات

کلیات اقبال اردو (صدی ایڈیشن) ۲۰/-
اقبال معاصرین کی نظر میں وقار عظیم ۵۰/۰۰
اقبال بحیثیت شاعر رفیع الدین ہاشمی ۴۵/۰۰
اقبال کی اردو نثر عبادت بریلوی ۲۰/۰۰
اقبال شاعر اور فلسفی وقار عظیم ۲۰/۰۰
فکر اقبال خلیفہ عبدالحکیم ۴۰/۰۰
تصورات اقبال مولانا صلاح الدین احمد ۱۵/۰۰
بانگ درا (عکسی) علامہ اقبال ۱۰/۰۰
بال جبریل (عکسی) " ۸/۰۰
ضرب کلیم (عکسی) " ۸/۰۰
ارمغانِ حجاز اردو (عکسی) " ۴/۵۰

## غالبیات

غالب تقلید اور اجتہاد پروفیسر خورشید الاسلام ۳۰/۰۰
غالب شخص اور شاعر مجنوں گورکھپوری ۱۵/۰۰
دیوان غالب نورالحسن نقوی ۱۳/۰۰
خطوط غالب کا فنی تجزیہ حامدہ مسعود ۲۰/۰۰
اطراف غالب ڈاکٹر سید عبداللہ ۲۰/۰۰

## فیض

کلام فیض (عکسی) فیض احمد فیض ۲۰/۰۰
نقش فریادی (عکسی) فیض احمد فیض ۶/۰۰
دستِ صبا (عکسی) " ۶/۰۰
زنداں نامہ (عکسی) " ۷/۵۰
دستِ تہِ سنگ (عکسی) " ۶/۰۰

## سرسید

سرسید ایک تعارف پروفیسر خلیق احمد نظامی ۲/۰۰
سرسید اور علی گڑھ تحریک " ۴۵/۰۰
سرسید اور ہندوستانی مسلمان ڈاکٹر نورالحسن نقوی ۲۰/۰۰
انتخاب مضامین سرسید آل احمد سرور ۶/۰۰
مطالعہ سرسید احمد خاں عبدالحق ۱۵/۰۰

## لسانیات وجمالیات

اردو لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری ۱۲/۰۰
اردو زبان اور ادب ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۱۲/۵۰
جمالیاتِ شرق وغرب پروفیسر ثریا حسین ۲۰/۰۰
ادب میں جمالیاتی اقدار ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ۱۰/۰۰

## مثنوی

اردو مثنوی کا ارتقاء عبدالقادر سروری ۱۲/۵۰
انتخاب مثنویات اردو مغیث الدین فریدی ۶/۰۰
مثنوی گلزارِ نسیم ظہیر احمد صدیقی ۶/۰۰
مثنوی سحرالبیان " ۶/۰۰

## افسانے وناول

| | | |
|---|---|---|
| آنگن | خدیجہ مستور | ۳۰/۰۰ |
| خدا کی بستی | شوکت صدیقی | ۴۵/۰۰ |
| چار ناولٹ | قرۃ العین حیدر | ۳۰/۰۰ |
| روشنی کی رفتار | " | ۳۰/۰۰ |
| آخر شب کے ہمسفر | " | ۴۵/۰۰ |
| ایک دن بیت گیا | صلاح الدین پرویز | ۴۰/۰۰ |
| سارے دن کا تھکا ہوا پرش | " | ۳۰/۰۰ |
| چوٹیں | عصمت چغتائی | ۲۰/۰۰ |
| ضدی | " | ۱۲/۰۰ |
| ہمارے پسندیدہ افسانے | مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز | ۱۵/۰۰ |
| راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے | " | ۲۰/۰۰ |
| کرشن چندر اور ان کے افسانے | " | ۱۵/۰۰ |
| اردو کے تیرہ افسانے | " | ۱۲/۰۰ |
| منٹو کے نمائندہ افسانے | " | ۱۲/۰۰ |
| پریم چند کے نمائندہ افسانے | مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس | ۱۲/۰۰ |
| نمائندہ مختصر افسانے | محمد طاہر فاروقی | ۶/۰۰ |

## ڈرامے

| | | |
|---|---|---|
| اردو ڈراما کا ارتقار | عشرت رحمانی | ۴۰/۰۰ |
| اردو ڈراما: تاریخ وتنقید | " | ۲۰/۰۰ |
| یونانی ڈراما | عتیق احمد صدیقی | ۲۰/۰۰ |
| آغا حشر اور اردو ڈراما | انجمن آرا | ۳۰/۰۰ |
| انارکلی | مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن | ۹/۰۰ |

## ادب وتنقید

| | | |
|---|---|---|
| مضامین نو | خلیل الرحمٰن اعظمی | ۲۵/۰۰ |
| تنقیدیں | پروفیسر خورشید الاسلام | ۳۰/۰۰ |
| شناسا چہرے | ڈاکٹر محمد حسن | ۵/۰۰ |
| ادبی تحقیق مسائل وتجزیہ | رشید حسن خاں | ۶/۰۰ |
| تنقیدی تناظر | ڈاکٹر قمر رئیس | [illegible] |
| پریم چند شخصیت اور کارنامے | " | [illegible] |
| احساس وادراک | ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی | ۲۲/۰۰ |
| انیس شناسی | ڈاکٹر فضل امام | ۶/۰۰ |
| چہرہ پس چہرہ | ڈاکٹر ابن فرید | ۲۵/۰۰ |
| میں، ہم اور ادب | " | ۳۰/۰۰ |
| غزل کا نیا منظر نامہ | شمیم حنفی | ۱۰/۰۰ |
| غزل درس غزل | اختر انصاری | ۸/۰۰ |
| اردو قصیدہ نگاری | ڈاکٹر ام ہانی اشرف | ۳۵/۰۰ |
| کلاسیکیت ورومانیت | " | ۱۲/۰۰ |
| نثر، نظم اور شعر | منظر عباس نقوی | ۷/۵۰ |
| ناول کا فن | ابوالکلام قاسمی | ۱۵/۰۰ |
| اردو ادب کی تاریخ | عظیم الحق جنیدی | ۱/۰۰ |
| موازنۂ انیس ودبیر | مقدمہ ڈاکٹر فضل امام | ۱۲/۰۰ |
| مقدمہ شعر وشاعری | مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی | ۱۲/۰۰ |
| امراؤ جان ادا | مقدمہ تمکین کاظمی | ۱۲/۰۰ |
| باغ وبہار | مقدمہ سلیم اختر | [illegible] |
| مجموعہ نظم حالی | مقدمہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی | ۷/۵۰ |
| مولوی نذیر احمد کی کہانی | مرزا فرحت اللہ بیگ | ۳/۷۵ |
| آج کا اردو ادب | ڈاکٹر ابواللیث صدیقی | ۱۶/۰۰ |
| جدید شاعری | ڈاکٹر عبادت بریلوی | ۴۰/۰۰ |
| غزل مطالعہ غزل | " | ۳۰/۰۰ |
| داستان سے افسانے تک | وقار عظیم | ۲۰/۰۰ |
| نیا افسانہ | " | ۲۰/۰۰ |
| شہرت کی خاطر | نظیر صدیقی | ۱۵/۰۰ |

| | | |
|---|---|---|
| تنقید اور احتساب | وزیر آغا | ۱۵/۰۰ |
| ستارہ یا بادبان | محمد حسن عسکری | ۱۵/۰۰ |
| انسان اور آدمی | " | ۱۰/۰۰ |
| اسلوب | سید عابد علی عابد | ۲۰/۰۰ |
| قرۃ العین حیدر اور ناول | پروفیسر عبدالسلام | ۱۲/۰۰ |
| مرزا رسوا اور تہذیبی ناول | " | ۴/۰۰ |
| تنقیدی دبستان | سلیم اختر | ۱۵/۰۰ |
| تحقیقی و تنقیدی مطالعہ باغ و بہار | " | ۱۵/۰۰ |
| باغ و بہار تحقیق و تنقید کے آئینے میں | " | ۶/۵۰ |
| منٹو کا فن | | ۵/۰۰ |
| آب حیات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ | سید سجاد | ۱۰/۰۰ |
| مقدمہ آب حیات | مولانا محمد حسین آزاد | ۶/۵۰ |
| تنقید و تبصرہ امراؤ جان ادا | ڈاکٹر ابواللیث صدیقی | ۴/۰۰ |
| ادب کا مطالعہ | اطہر پرویز | ۲۵/۰۰ |
| ادب اور زندگی | مجنوں گورکھپوری | ۲۰/۰۰ |
| رنگ موہانی | طلعت سلطانہ | ۱۵/۰۰ |

## سیاسیات و تاریخ

| | | |
|---|---|---|
| دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن) | محمد ہاشم قدوائی | ۲۰/۰۰ |
| تاریخ افکار سیاسی (ہسٹری آف پالیٹیکل تھاٹ) | " | ۲۰/۰۰ |
| جمہوریۂ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا) | " | ۱۵/۰۰ |
| مبادیات علم مدنیت (ایلیمنٹس آف سوکس) | " | ۷/۵۰ |
| مبادیٔ سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس) | محمد ہاشم قدوائی | ۱۵/۰۰ |
| تاریخ و تہذیب عالم (ورلڈ ہسٹری) | اے۔ اے۔ ہاشمی | ۲۰/۰۰ |

## متفرق

| | | |
|---|---|---|
| ایڈوانسڈ اکاؤنٹس | ڈاکٹر محمد عارف خاں | ۲۵/۰۰ |
| جدید تعلیمی مسائل | ڈاکٹر ضیاء الدین علوی | ۱۲/۰۰ |
| اصول تعلیم | " | ۱۵/۰۰ |
| عام معلومات | " | ۶/۰۰ |
| ایجادات کی کہانی | " | ۵/۰۰ |
| رہبر صحت | مسرت زمانی | ۷/۰۰ |
| تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے | " | ۱۵/۰۰ |
| علم خانہ داری | " | ۱۵/۰۰ |
| بچوں کی تربیت | " | ۸/۰۰ |
| گلدستہ مضامین و انشاپردازی | ڈاکٹر محمد عارف خاں | ۸/۰۰ |
| اردو صرف | ڈاکٹر محمد انصار اللہ | ۳/۷۵ |
| اردو نحو | " | ۲/۷۵ |
| فیروز اللغات جیبی (عکسی) | | ۷/۵۰ |
| فیروز اللغات اردو جدید (ریگزین) | | ۲۵/۰۰ |
| اردو شکھشک (ہندی کے ذریعہ اردو سیکھئے) | | ۲/۰۰ |
| انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر ایم۔ اے۔ شہید | | ۸/۰۰ |

**آنگن** خدیجہ مستور کا ممتاز ناول

• متوسط گھرانے کے آنگن کی کہانی جو بڑھتے بڑھتے ڈرائنگ روم بن جاتا ہے۔ • اس میں گھر سے باہر ہونیوالے واقعات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ • اس طرح یہ آنگن ایک عہد کی بازگشت بنجاتا ہے۔ قیمت -/۳۰

**خدا کی بستی** شوکت صدیقی کا ناول

• متوسط اور نچلے طبقہ کے کرداروں کی کہانی جو تقسیم کے بعد ایک نئے ماحول سے آنکھیں دوچار کرتی ہے۔

قیمت -/۴۵

**ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱**

## روشنی کی رفتار

قرۃ العین حیدر

- قرۃ العین حیدر کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ جس کے بغیر آج کے اردو افسانے کا مطالعہ نامکمل ہے۔
- جو دنیا کے بہترین افسانوں کی صف میں رکھے جا سکتے ہیں۔

دنیائے ادب میں ایک اضافہ

قیمت : ۳۰/۰۰

## چار ناولٹ

قرۃ العین حیدر

قرۃ العین کے چار ناولٹ :-

- دلرُبا
- سیتا ہرن
- چائے باغ
- اگلے جنم موہے بِٹیا نہ کیجو

اس میں شامل ہیں۔

قیمت : ۳۰/۰۰

## ضِدّی

عصمت چغتائی کا مشہور ناولٹ جو اُن کے افسانوں کی طرح ہمیشہ شوق سے پڑھا جائے گا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس پر فلم بھی بن چکی ہے۔

قیمت -/۱۲

## چوٹیں

عصمت چغتائی کے مطالعہ کے بغیر اُردو افسانوی ادب کا مطالعہ نامکمل ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ میں اُن کے اہم ترین افسانے شامل ہیں۔

قیمت -/۲۰

# نایاب خاص مطبوعات

## اقبالیات

| | | |
|---|---|---|
| کلیات اقبال (اردو) | صدی ایڈیشن | ۲۰/- |
| اقبال معاصرین کی نظر میں | وقار عظیم | ۵۰/- |
| اقبال بحیثیت شاعر | رفیع الدین ہاشمی | ۴۵/- |
| اقبال کی اردو نثر | عبادت بریلوی | ۲۰/- |
| اقبال شاعر اور فلسفی | وقار عظیم | ۲۰/- |
| فکر اقبال | خلیفہ عبدالحکیم | ۴۰/- |
| اقبال حرکت اور فلسفہ | ڈاکٹر نورالحسن نقوی | ۷/۵۰ |
| تصورات اقبال | مولانا صلاح الدین احمد | ۱۵/- |
| بانگ درا عکسی | علامہ اقبال | ۱۰/- |
| بال جبریل عکسی | " | ۸/- |
| ضرب کلیم عکسی | " | ۸/- |
| ارمغان حجاز (اردو) عکسی | " | ۴/۵۰ |

## غالبیات

| | | |
|---|---|---|
| غالب، تقلید اور اجتہاد | پروفیسر خورشید الاسلام | ۳۰/- |
| غالب شخص اور شاعر | مجنوں گورکھپوری | ۱۵/- |
| دیوان غالب | مقدمہ نورالحسن نقوی | ۱۳/- |
| غالب کا فنی تجربہ | حامدہ مسعود | ۲۰/- |
| مصحفی غالب | احمد رضا | ۱۲/- |

## فیض

| | | |
|---|---|---|
| نسخہ فیض عکسی | فیض احمد فیض | ۲/- |
| دست صبا عکسی | " | ۶/- |
| زنداں نامہ عکسی | " | ۶/- |
| دست تہ سنگ عکسی | " | ۷/۵۰ |
| | " | ۶/- |

## سرسید

| | | |
|---|---|---|
| سرسید ایک تعارف | پروفیسر خلیق احمد نظامی | ۲/- |
| سرسید اور علی گڑھ تحریک | " | ۴۵/- |
| سرسید، ہندوستانی مسلمان | ڈاکٹر نورالحسن نقوی | ۲/- |
| منتخب مضامین سرسید | آل احمد | ۶/- |
| سرسید احمد خاں | عبدالحق | ۱۵/- |

## لسانیات وجمالیات

| | | |
|---|---|---|
| لسانیات | ڈاکٹر شوکت سبزواری | ۱۲/- |
| زبان وادب | ڈاکٹر مسعود حسین خاں | ۱۲/۵۰ |
| جمالیات شرق وغرب | پروفیسر ضیا حسین | ۱۵/- |
| تعین جمالیاتی اقدار | ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی | ۱۰/- |

## مثنوی

| | | |
|---|---|---|
| مثنوی کا ارتقا | عبدالقادر سروری | ۱۲/۵۰ |
| مطالعہ مثنویات اردو | مغیث الدین فریدی | ۶/- |
| گلزار نسیم | ظہیر احمد صدیقی | ۶/- |
| سحر البیان | " | ۶/- |

## افسانے وناول

| | | |
|---|---|---|
| ٹوٹا | قرۃ العین حیدر | ۲/- |
| زندگی کی رفتار | | ۲/- |
| حسن شیخ ہمسفر (ناول) | قرۃ العین حیدر | ۴۵/- |
| جھال بستی (ناول) | شوکت صدیقی | ۴۵/- |
| آنگن (ناول) | خدیجہ مستور | ۳۰/- |
| چوٹیں | عصمت چغتائی | ۲۰/- |
| ضدی | " | ۱۲/- |
| ہمارے پسندیدہ افسانے | مرتبہ: ڈاکٹر اطہر پرویز | ۱۵/- |
| بیدی اور بیدی کے افسانے | " | ۱۵/- |
| کرشن چندر اور کرشن چندر کے افسانے | " | ۱۵/- |
| اردو کے تیرہ افسانے | " | ۱۲/- |
| منٹو کے نمائندہ افسانے | " | ۱۲/- |
| پریم چند کے نمائندہ افسانے | مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس | ۱۲/- |
| نمائندہ مختصر افسانے | مرتبہ: محمد طاہر فاروقی | ۶/- |

## ڈرامے

| | | |
|---|---|---|
| اردو ڈراما کا ارتقا | عشرت رحمانی | ۴۰/- |
| اردو ڈراما: تاریخ وتنقید | " | ۲۰/- |
| یونانی ڈراما | عتیق احمد صدیقی | ۲۰/- |
| آغا حشر اور اردو ڈراما | انجمن آرا | ۳۰/- |
| انارکلی | مقدمہ: ڈاکٹر محمد حسن | ۹/- |

## ادب وتنقید

| | | |
|---|---|---|
| مضامین نو | خلیل الرحمن اعظمی | ۲۵/- |
| تنقیدیں | پروفیسر خورشید الاسلام | ۳۰/- |
| شناسا چہرے | ڈاکٹر محمد حسن | ۱۵/- |
| ادبی تحقیق، مسائل وتجزیہ | رشید حسن خاں | ۲۵/- |
| تنقیدی تناظر | ڈاکٹر قمر رئیس | ۲۰/- |
| پریم چند شخصیت اور کارنامے | " | ۳۵/- |
| احساس وادراک | ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی | ۲۲/- |
| انیس شناسی | ڈاکٹر فضل امام | ۱۶/- |
| چہرہ پس چہرہ | ڈاکٹر ابن فرید | ۲۵/- |
| میں ہم اور ادب | " | ۲۰/- |
| غزل کا نیا منظرنامہ | شمیم حنفی | ۱۰/- |
| غزل کی سرگذشت | اختر انصاری | ۸/- |
| اردو قصیدہ نگاری | ڈاکٹر امام باقر اشرف | ۳۵/- |
| کلاسیکیت ورومانیت | " | ۱۲/- |
| نثر نظم اور شعر | منظر عباس نقوی | ۷/۵۰ |
| باغ وبہار | مقدمہ سلیم اختر | ۱۵/- |
| ناول کا فن | ابوالکلام قاسمی | ۱۵/- |
| اردو ادب کی تاریخ | عظیم الحق جنیدی | ۹/- |
| موازنہ انیس ودبیر | مقدمہ: ڈاکٹر فضل امام | ۱۲/- |
| مقدمہ شعر وشاعری | مقدمہ: ڈاکٹر وحید قریشی | ۱۲/- |
| امراؤ جان ادا | مقدمہ: تمکین کاظمی | ۱۲/- |
| مجموعہ نظم حالی | مقدمہ: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی | ۷/۵۰ |
| مولوی نذیر احمد کی کہانی | مرزا فرحت اللہ بیگ | ۳/۷۵ |
| آج کا اردو ادب | ڈاکٹر ابواللیث صدیقی | ۱۶/- |
| جدید شاعری | ڈاکٹر عبادت بریلوی | ۴۰/- |
| غزل مطالعہ غزل | " | ۳۰/- |
| داستان سے افسانے تک | وقار عظیم | ۲۰/- |
| نیا افسانہ | وقار عظیم | ۲۰/- |
| شہرت کی خاطر | نظیر صدیقی | ۱۵/- |
| تنقید اور احتساب | ڈاکٹر وزیر آغا | ۱۵/- |
| ستارہ یا بادبان | محمد حسن عسکری | ۱۵/- |
| انسان اور آدمی | " | ۱۰/- |
| اسلوب | سید عابد علی عابد | ۲۰/- |
| قرۃ العین حیدر اور ناول | پروفیسر عبدالسلام | ۱۲/- |
| مرزا رسوا اور تہذیبی ناول | " | ۴/- |
| تنقیدی دبستان | سلیم اختر | ۱۵/- |
| تحقیقی وتنقیدی مطالعہ باغ وبہار | " | ۱۵/- |
| ادب کا مطالعہ | ڈاکٹر اطہر پرویز | ۲۵/- |
| منٹو کا فن | وقار عظیم | ۵/- |
| آب حیات کا تنقیدی وتحقیقی مطالعہ | سید سجاد | ۱۰/- |
| مقدمہ آب حیات | مولانا محمد حسین آزاد | ۱/۵۰ |
| تنقید وتبصرہ امراؤ جان ادا | ڈاکٹر ابواللیث صدیقی | ۴/- |
| ادب اور زندگی | مجنوں گورکھپوری | ۲۰/- |
| حسرت موہانی | طلعت سلطانہ | ۱۵/- |

## سیاسیات وتاریخ

| | | |
|---|---|---|
| دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن) | محمد ہاشم قدوائی | ۲۰/- |
| تاریخ افکار سیاسی (ہسٹری آف پولیٹیکل تھاٹ) | " | ۲۰/- |
| جمہوریہ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا) | " | ۱۵/- |
| مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالٹکس) | " | ۱۵/- |
| مبادیات علم مدنیت (ایلیمنٹس آف سوشیالوجی) | " | ۷/۵۰ |
| تاریخ وتہذیب عالم (ورلڈ ہسٹری) | ایم۔ اے۔ ہاشمی | ۲۰/- |

## متفرق

| | | |
|---|---|---|
| ایڈوانسڈ کاؤنسلنگ | ڈاکٹر محمد عارف خاں | ۲۵/- |
| جدید تعلیمی مسائل | ڈاکٹر ضیاء الدین علوی | ۱۲/- |
| اصول تعلیم | " | ۱۵/- |
| عام معلومات | " | ۶/- |
| ایجادات کی کہانی | " | ۵/- |
| رہبر صحت | مسرت زمانی | ۷/- |
| تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے | " | ۱۵/- |
| علم خانہ داری | " | ۱۵/- |
| بچوں کی تربیت | " | ۸/- |
| گلدستۂ مضامین وانشاء پردازی | ڈاکٹر محمد عارف خاں | ۸/- |
| اردو صرف | ڈاکٹر انصار اللہ | ۳/۷۵ |
| اردو نحو | " | ۲/۷۵ |
| فیروز اللغات جیبی عکسی | | ۷/۵۰ |
| فیروز اللغات اردو جدید (ریگزین) | | ۲۵/- |
| اردو شکشک (ہندی کے ذریعہ اردو سیکھئے) | | ۲/- |
| انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر | ایم۔ اے۔ حمید | [illegible] |
| نصاب وحیات حصہ اول | ڈاکٹر اقبال حسن خاں | ۶/۵۰ |
| نصاب وحیات حصہ دوم | | ۳/۵۰ |
| نصاب وحیات حصہ سوم | | ۳/- |


## ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱